رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ



نئے اُفق
قیمت=/50روپے
شمارہ ستمبر ۲۰۱۵
رجسٹریشن نمبر – ایس ایس ۱۰

ستمبر 2015ء کے شمارے کی ایک جھلک

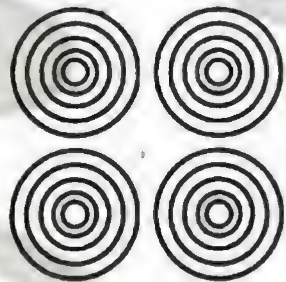


شب ہجر کی پہلی بارش	نازیہ کنول نازی کا نیا سلسلے وار ناول
موم کی محبت	راحت وفا کا سلسلے وار ناول
ٹوٹا ہوا تارا	سمیرا شریف طور کا سلسلے وار ناول
محبت دل کا سجدہ ہے	سباس کا منفرد ناولٹ

معروف مصنفہ راحت جبیں کے ہمراہ ایک نشست

جنوں کی عدالت میں ملیئے ہر دلعزیز مصنفہ ''فاخرہ گل'' سے

سمیرا غزل صدیقی، فصیحہ آصف خان، طلعت نظامی، ندا حسنین کی خوبصورت تحریریں



women.magazine
womenmagazine
aanchalpk.com

مستقل سلسلوں میں پڑھیے

آپ کی صحت، ڈش مقابلہ، بیوٹی گائیڈ، غزلیں نظمیں، بیاض دل، دوست کے پیغام آئے ودیگر

قرآنی آیات کی عام فہم تفاسیر جنہیں

مشتاق احمد قریشی

نے مستند تفاسیر اور حوالوں سے آراستہ کیا ہے

کتاب کا نام	
تفسیر سورۃ اخلاص	تفسیر آیات ربنا اتنا
تفسیر معاذ اللہ	تفسیر سورۃ النصر
تفسیر سورۃ العصر	تفسیر سورۃ الہب
تفسیر سورۃ الکفرون	تفسیر آیات اللہ ذوالجلال
تفسیر سورۃ الفاتحہ	تفسیر سورۃ الشمس
تفسیر سورۃ کلمہ طیبہ	تفسیر سورۃ القریش
تفسیر سورۃ معوذتین	لقد خلقنا الانسان
تفسیر سورۃ الکوثر	تفسیر سورۃ القدر
تفسیر آیات السلام علیکم	آسمانی صحیفے اور قرآن
تفسیر آیات یایھا الذین امنو	تفسیر سورۃ الماعون
امام اعظم حیات و فقہی کارنامے	

ملنے کا پتا: نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز، 7 فرید چیمبر عبداللہ ہارون روڈ کراچی

اسلامی کتب خانہ۔ فضل الٰہی مارکیٹ چوک اردو بازار، لاہور



0314-8250376



رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رُکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رُکن چیمبر آف کامرس





مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی

مدیر
عمران احمد

مدیر معاون
اقبال بھٹی

مدیر منتظم
طاہر احمد قریشی

معتمد
نور الدین

پاکستان (فی پرچہ)..........50 روپے
پاکستان (سالانہ)..........600 روپے

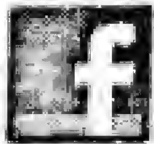
اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242



جلد	39
شمارہ	10
ستمبر	2015

aanchalpk.com

aanchalnovel.com


naeyufaqonlinemagzine

aanchalpk.com/blog

onlinemagazinepk.com/recipes



دستک — مشتاق احمد قریشی — 10

گفتگو — عمران احمد — 12

اقرأ — طاہر قریشی — 22

سرگوشیاں — ڈاکٹر ایم اے قریشی — 24

رقابت — خلیل جبار — 48

ساتواں قتل — دستگیر شہزاد — 64

قلندر ذات — امجد جاوید — 70

زندگی — شاہد جمیل احمد — 108

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

تیسرا راستہ — ریاض بٹ — 118

پھالگنی — مہرافروز — 130

روپ بہروپ — سلیم اختر — 138

زلیخا — کشاف اقبال — 196

بنت غزہ — زریں قمر — 206

انصاف — اقبال بھٹی — 240

ذوق آگہی — سباس گل — 244

خوشبوئے سخن — نوشین اقبال نوشی — 248

فلسطین — الماس ایم اے — 262

خط و کتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2

فیکس: 021-35620773 برائے اشتہارات: افق پبلی کیشنز ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

پاکستان کی حج پالیسی بھی امریکہ سے آتی ہے

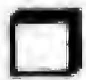
ملک کا انتظام وانصرام چلانے کے لئے اب تک تمام پالیسیاں امریکہ کی منشاومرضی سے ہی بنتی رہی ہیں چاہے اقتصادی پالیسیاں ہوں معاشی یا معاشرتی۔ یہاں تک کہ دینی مدارس سے نمٹنے کی پالیسی بھی امریکہ ہی نافذ کرتا رہا ہے کیونکہ امریکہ اوران کے کلیسا دنیا کے تمام مسلمان ممالک خصوصاً پاکستان جس نے امریکی اجازت کے بغیر جوہری توانائی حاصل ہی نہیں کی بلکہ ایٹمی دھماکہ کرکے تمام کلیسائی ایوانوں کو ہلاکر رکھ دیا اس وقت سے ہی پاکستان خصوصاً ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئے ہیں۔ یہود ونصاریٰ کی اسلام دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ خود رب کائنات نے قرآن حکیم میں بہت واضح اور کھلے کھلے الفاظ میں تاکید کردی ہے کہ یہود ونصاریٰ تمہارے دوست نہیں ہوسکتے۔

پاکستان جو ایک خالص اسلامی ملک ہے اس کی آبادی کا نوے فی صد اہل اسلام پر مشتمل ہے جو اپنے دینی معاملات میں خاصے راسخ العقیدہ بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے دینی اسلامی معاملات اور فرائض کی ادائیگی بڑے ذوق وشوق اور لگن سے کرتے ہیں جو یقیناً امریکی پالیسی سازوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ پہلے انہوں نے اسلام کے نام پر پاکستان کے ذریعے روس جیسے سفید ریچھ کو شکست سے دوچار کرکے افغانستان سے مار بھگایا پھر خود افغانستان جہاں اسلامی ریاست کے قیام کی ابتدائی کوشش کی جارہی تھی اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تاکہ مسلمان اپنی مذہبی فرائض کو بھول کر اپنے زخم چاٹنے میں لگ جائیں۔ جب اس پر بھی بس نہیں چلا تو پاکستان کے ان علاقوں خصوصاً جہاں راسخ العقیدہ مسلمانوں کی اکثریت رہتی بستی ہے اور جو اپنے دین اپنے ایمان کی سلامتی کے لیے جانیں نثار کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں پر روز وشب حملے کرکے انہیں پامال کرنا شروع کردیا اور ساتھ ہی ساتھ پاکستان کے حکمرانوں کو اپنی قوت کے نشے میں چور ہوکر دینی مدارس کو دہشت گردی کے اڈے قرار دلوانے کی پرزور مہم شروع کردی تاکہ دہشت گردی کا الزام لگا کر ان کا بھی تیاپانچا کردیا جائے۔

اہل پاکستان کو ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو جو عقیدت ونسبت حرمین شریفین سے ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ مسلمانوں کا اتنا بڑا پرشکوہ اجتماع ہر سال مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں ہوتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جس نظم وضبط کا مسلمان اظہار کرتے ہیں جس سلیقے یگانگت بھائی چارے سے حج کے تمام عرصے میں رہتے ہیں وہ بھی ان کلیسائی ناخداؤں کے حلق میں ہڈی بن کر اٹکا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سعودی حکومت پر اپنا دباؤ براہ راست تو نہیں ڈالتے لیکن دائیں بائیں سے مشوروں کی صورت میں حجاج اور خصوصاً پاکستانی حجاج کے بارے میں ان کے رویوں کو سخت کرنے اور اتنے بڑے اجتماع کو پرامن پرسکون رہنے اور دہشت گردی سے بچانے کے نام پر پاکستانی زائرین حج وعمرہ پر زیادہ سے زیادہ سخت رویہ اختیار کرنے کا مشورہ ان کے اپنے مفاد میں دیتے رہتے ہیں اور ادھر پاکستان شریف میں تو ان کی گیلی سوکھی سب جلتی ہے اور جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام انہیں خوب آتا ہے۔ پاکستان کی سرکاری فضائی کمپنی جو امریکی منصوبہ سازوں کے دباؤ میں مشوروں پر عمل کرتے ہوئے نا صرف ہر سال حج کرایوں میں بے پناہ اضافہ کردیتی ہے بلکہ زائرین عمرہ جو ربیع الاول سے ہی عمرے کی سعادت کے لئے سعودی عرب جانا شروع

کردیتے ہیں کے کرایوں میں غیر معمولی اضافہ کردیتی ہے جبکہ دنیا بھر کی تمام فضائی کمپنیوں میں کہیں ایسا نہیں ہوتا اور خود امریکہ اپنے مذہبی تہوار کرسمس کے موقع پر تمام اشیاء کی قیمتوں میں خاطر خواہ کمی کرتا ہے بلکہ ہوائی سفر کے کرایوں میں بھی پچیس سے پچاس فی صد چھوٹ دی جاتی ہے۔ جبکہ پڑوسی ملک بھارت جو خالص ہندو مذہبی ملک ہے وہ اگر ایسا کرے تو کسی کو حیرت نہ ہو لیکن وہ اپنے مسلمان شہریوں کو ان کے مذہبی فریضے حج اور عمرے کے لئے بڑی بڑی سہولیات مہیا کرتا ہے۔ نہ صرف فضائی کمپنی کرایوں میں اضافہ نہیں کرتی بلکہ رعایتی نرخوں پر سفر حج کا بندوبست کرتی ہے۔ پاکستان کا وہ ٹوٹا ہوا بازو جواب بنگلہ دیش بن چکا ہے وہ بھی اپنے حجاج کرام کو وہ وہ سہولتیں دیتا ہے جو پاکستانی حجاج کو کہیں دور دور نظر نہیں آتیں۔

امریکہ جس کے تمام اقتصادی معاشی ماہرین اور منصوبہ ساز پالیسی میکر سب کے سب یہودی ہیں جو مسلمانوں اور خصوصاً پاکستان کے جانی دشمن ہیں وہ ہر طرح سے پاکستان کو معاشی واقتصادی طور پر نقصان پہنچانے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے ان کی ہی اقتصادی معاشی پالیسیوں پر ہمارے حکمران عملدرآمد کرتے رہے ہیں اور پیٹرولیم مصنوعات میں اضافہ کے نام جو مہنگائی کا طوفان امڈ پڑتا ہے۔ اس کا وہ کہیں ذکر نہیں کرتے اور تیل کی قیمتوں میں عالمی سطح پر اضافہ کو بنیاد بنا کر پاکستان میں مہنگائی کا طوفان کھڑا کردیتے ہیں جبکہ تیل کی قیمت میں اضافہ صرف پاکستان کے لئے نہیں ہوا ہوتا تمام بین الاقوامی فضائی کمپنیوں کے لئے بھی ہوتا ہے وہ تو اپنے مسافروں کو جو سہولتیں اور آرام پہنچاتے ہیں ان میں کوئی کمی نہیں کرتے اور نہ ان کے کرایوں میں اس قدر غیر معمولی اضافہ ہی کیا جاتا ہے جس سے عوام میں بے چینی اور بے یقینی پیدا ہوتی ہے اور حکمرانوں پر سے اعتماد بھی اٹھتا ہے۔ اس طرح یہ امریکی منصوبہ ساز ایک تیر سے کئی شکار کرلیتے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شاید ہماری حج پالیسی بھی امریکہ سے ہی بن کر آتی ہے تب ہی تو حجاج کرام کو نت نئی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کبھی کرایوں میں بے جا اور بے پناہ اضافہ کردیا جاتا ہے تو کبھی حجاج کرام کو مہیا کی گئی سہولتیں کو پامال کردیا جاتا ہے۔ رہائشی مکانات دور دراز دیئے جاتے ہیں دیگر ممالک کے حجاج کو ملنے والی سہولیات کا تو ذہر ہی کیا پاکستانی حکمران اگر سوچیں سمجھیں تو پاکستان کی قومی فضائی کمپنی جو پاکستان کے قومی پرچم بردار بھی ہے جبکہ دنیا بھر کی فضائی کمپنیاں جن سے کاروباری مسابقت کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ تمام دنیا کی فضائی کمپنیوں کے کرائے خصوصاً حج فلائٹ کے کرائے کے مقابلے میں بہت کم ہیں جبکہ ہماری قومی فضائی کمپنی والے بھی وہی تیل وہی پیٹرول استعمال کرتے ہیں جو دوسرے فضائی کمپنیاں کرتی ہیں وہ پیٹرولیم میں قیمتوں کے اضافے سے اپنے جہازوں کے کرائے نہیں بڑھاتے۔ اس بارے میں ہمارے حکمرانوں کو سوچنا چاہئے اور اس کا کوئی نہ کوئی معقول اور مناسب تدارک کرنا ہوگا اور خصوصاً سعودی حکمرانوں سے بھی اس سلسلے میں گفتگو کی جاسکتی ہے۔ سعودی عرب سے حج سیزن کے لئے خصوصی مراعات حاصل کی جاسکتی ہیں اور سعودی عرب سے حج فلائٹ کے لئے پیٹرولیم مصنوعات بھی کم نرخوں پر حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح پاکستانی حجاج کو زیادہ اور بہتر سہولیات مہیا کی جاسکتی ہیں۔ اللہ ہمارے حکمرانوں اور حج وعمرے کے انتظامات کرنے والوں کو زائرین کی خدمت کا مناسب بندوبست کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین



گفتگو

عمران احمد

''حضرت صفوان بن سلیمؓ سے روایت ہے حضورؐ نے فرمایا خبردار! جس شخص نے اس شخص سے ظلم کیا جس سے اس کا معاہدہ ہو چکا ہے یا اس کے حق کو ضرر پہنچایا یا اس کی طاقت سے زیادہ اسے تکلیف دی یا اس کی رضامندی کے بغیر اس سے کوئی چیز لی تو میں اس سے قیامت کے دن جھگڑوں گا۔'' (ابوداؤد)

عزیزان محترم...... سلامت باشد!

ستمبر کا نئے افق حاضر مطالعہ ہے امید ہے آپ کے ذوق پر پورا اترے گا۔ نئے افق کوئی ادبی پرچہ نہیں یہ خالصتاً ایک تفریحی ڈائجسٹ ہے۔ ہماری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ ہم اپنے قارئین کو ایسی تحریریں فراہم کریں جو نہ صرف ہلکی پھلکی تفریح بلکہ تعمیری نوعیت کی ہوں۔ جنہیں پڑھ کر وہ نہ صرف قانون کا احترام کرنا سیکھیں بلکہ ملک وقوم سے محبت کا جذبہ بھی پیدا ہو۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم بڑی حد تک اس میں کامیاب رہے ہیں۔ اس کا ثبوت ہمارے وہ قارئین ہیں جو گزشتہ چالیس سال سے ہم سے وابستہ ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے بھی ہیں جنہوں نے نئے افق پڑھ کر لکھنا شروع کیا اور آج وہ بطور مصنف نئے افق سے وابستہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ قارئین نے نئے افق میں ہونے والی حالیہ تبدیلیوں کو پسند کیا اور ہمیں اپنی تجاویز سے نوازا انشاء اللہ ہم نئے افق کو آپ کی آرا کے مطابق سجاتے سنوارتے رہیں گے۔

اب آیئے اپنے خطوط کی طرف۔

(اس ماہ کا انعام یافتہ خط)

طاہرہ جبین تارا...... لاہور۔ محترمی عمران صاحب! آداب امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے کافی عرصے سے محفل میں حاضر ہونا چاہتی تھی مگر کالج کی مصروفیت کی وجہ سے چاہتے ہوئے بھی نئے افق میں حاضری نہیں دے سکی کافی عرصے سے بہت مثبت تبدیلیاں نظر آرہی ہیں نہ صرف سرورق کے حوالے سے بلکہ فہرست میں بھی خوبصورتی دکھائی دیتی ہے کافی محنت کا نتیجہ ہے البتہ بہت سے پرانے ساتھی غائب ہیں کہاں ہیں سب؟ کوئی ڈھونڈ کے لائے انہیں۔ اس مہینے کا نئے افق عید کے بعد ملا اس دفعہ تو عید اپنے ساتھ آنسوؤں کی برسات لائی پہلے لوڈشیڈنگ نے لاشوں کے انبار لگائے اور اب سیلاب کی تیز وتند لہریں جانوں کے ساتھ مال واسباب کو بہالے جارہی ہیں یہ آفات یہ قہر اللہ کی طرف سے اشارہ ہے کہ اے امت محمدی سنبھل جا صراط مستقیم کی طرف لوٹ آ ورنہ خس وخاشاک کی مانند بہہ جائے گا۔ دستک انکل مشتاق نے سیاسی لیڈرز زرداری کے بارے میں سچ کہا ہے یہ سب لٹیرے ہیں لوٹ کر بھی مزید لوٹنے کے لیے بے چین اللہ انہیں ہدایت دے گفتگو میں بہت سے نئے ساتھی مگر پرانے ساتھی غائب ہیں۔ کہانی پسند کرنے کا شکریہ مثبت رائے رائٹر کا حوصلہ بڑھاتی ہے اور تنقید اسے مزید بہتری کی طرف گامزن کرتی ہے۔ اقراء اللہ کے نام دل میں نور اور روشنی بھر دیتے ہیں'' کیچڑ کا کنول'' ایم اے قریشی بازی لے گئے۔ زبردست تحریر ہے پرائیویٹ اسکول کالج میں فی میل ٹیچرز پڑھاتی ہیں۔ انہیں ایسے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسٹوڈنٹ اور اسکول اونر دونوں گھٹیا پن پر اتر آتے ہیں اور اپنے مذموم مقصد کے لیے بہت سے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔'' کاغذی رشتے'' تھیم تو اچھا تھا مگر کہانی میں ربط نہیں تھا جس کی وجہ سے کوئی تاثر قائم نہیں کرسکی'' احساس'' عجیب ترین کہانی جس کا نہ سر نہ پیر پلیز مائنڈ نہ کریں۔ کہانی وہ ہو جو کوئی اچھا نقش چھوڑے جوان اولاد کے ہوتے ہوئے محبت کا کھیل کھیلنا اچھی بات ہے؟ اس سے آپ قاری کو کیا سبق دینا چاہ رہے ہیں۔ محبت قربانی اور ایثار کا نام ہے دھوکا دہی اور دلگریٹی کا نام نہیں میریڈ عورت اگر گناہ کی مرتکب ہوتی ہے اپنے شوہر کو دھوکا دیتی ہے تو وہ ان میریڈ کی نسبت زیادہ سزا کی مستحق ہے۔'' اسیر غم'' کہاں کی بات کہاں ٹھہری ربط کی کمی آپ سب سوچ رہے ہوں گے کہ اتنا عرصہ غائب رہنے کے بعد حاضری دی بھی تو تنقید۔ نئے افق ہمارا اپنا ہے اس کی بہتری کے لیے اگر تنقید کرنی پڑے تو جائز ہے کہانیاں ایسی ہونی چاہیے جو معاشرے سے متعلق ہوں اور مثبت سبق دیں محض خانہ پری نہ ہو'' نظر فریب'' بہت اچھی معاشرے کے تقاضوں

کو پورا کرتے ہوئے یہ ہمارا المیہ ہے اور قیامت کی نشانی ہے کہ گندگی نے نام نہاد شرفا کو اپنے حصار میں لے رکھا ہے اور انہیں اپنے ان گناہوں کا کوئی احساس نہیں کوٹھے سے لے کر امرا کی کوٹھیوں تک غلاظت بھری ہے لیکن اس کے ساتھ میں حسام بٹ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اللہ کے کاموں میں دخل دینا درست نہیں۔ علم اپنی جگہ مگر ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں بتانا میں پامسٹری جانتی ہوں ہاتھ کی لکیروں سے آشنا ہوں کالج اور یونیورسٹی کے دور میں بہت سے ہاتھ دیکھے مگر جب ایک فیچر پڑھا کہ ہاتھ دیکھنا اور دکھانا گناہ ہے اور چالیس نمازیں ضائع ہو جاتی ہیں کیونکہ انبیا کو بھی مستقبل کے بارے میں بتانے کی اجازت نہیں اللہ کے راز اللہ جانتا ہے تو میں نے توبہ کرلی اس کے بعد میں نے کبھی کسی کا ہاتھ نہیں دیکھا آسٹرولوجی بھی علم ہے لیکن ان کہانیوں سے لوگوں میں ماضی حال اور مستقبل جاننے کی خواہش پیدا ہورہی ہے۔ ریحانہ میری سسٹر عمران صاحب سے قریشی صاحب کا نمبر لینا چاہ رہی تھی کہ میں اپنا مستقبل جان سکوں بہرحال جہاں تک میری رائے ہے مستقبل کے بارے میں بتانا اللہ کے کاموں میں دخل دینا ہے اس فیچر میں احادیث کے حوالے تھے جو مجھے یاد نہیں مکمل طور پر ورنہ میں وہ احادیث لکھتی آپ ان کہانیوں کو کسی اور طریقے سے بیان کریں کیونکہ یہ معاشرتی کہانیاں ہیں اور سبق آموز بھی "منک کوٹ" مزے کی کہانی تھی گلی میں بیچنے والے پٹھان بھی اسمگلنگ کا مال سستے داموں بیچ دیتے ہیں اور عورتیں وہ چیزیں خرید لیتی ہیں اور خوش ہوتی ہیں کہ سستی چیزیں لے لیں "روپ بہروپ" آغاز تو بہت اچھا ہے کہانی پر گرفت بھی ہے۔ انجام خدا جانے۔ "عروس آزادی" کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد اور ہندوؤں کے مظالم پر ایک اچھی تحریر تھی۔ اگر اس میں رشتوں کے تقدس کا خیال رکھا جاتا تو مزید اچھا تاثر پیدا کرتی فرناز کا اپنے ہی ہونے والے بہنوئی سے عشق چہ معنی دارد؟ یہ ذہنی اختلال کی نشانی ہے اور اسلام کے نقطہ نظر سے ناجائز ہے ایک ہی شخص سے دونوں سگی بہنوں کا عشق ایک کا تو فیا سی ہے مگر دوسری......؟ سمجھ نہیں آئی کہ اتنے اچھے ٹاپک میں محبت کی فضول ترجمانی کس لیے؟ فریال کی حد تو ٹھیک ہے مگر فرناز نے رشتے کا تقدس کیوں پامال کیا؟ فلسطین تاریخی کہانی ہے جو فلسطینیوں کی کوششوں اور اسرائیلی مظالم کی روداد ہے اب ہو جائے "قلندر ذات" پر بات یہ کہانی شروع میں بہت اچھی تھی معاشرے کی عکاس ناول کے کردار ہمارے اردگرد سے لیے گئے تھے مگر اب یہ مافوق الفطرت عناصر بنتے جارہے ہیں۔ ساحل ابڑو نے اردو ادب کا طالب علم نہ ہوتے ہوئے بھی ناول اور داستان میں فرق بیان کردیا ہے۔ اردو ادب پڑھانے والے جانتے ہیں کہ اب داستان کا رواج ختم ہو گیا ہے اب تو افسانے کہانیاں اور ناول لکھے جارہے ہیں جن کے کردار معاشرے کے عکاس ہے داستان تو ملا وجہی تک ہی محدود رہی اس لیے قلندر ذات کو داستان نہ بنائیں۔ اب مافوق الفطرت عناصر کا دور نہیں نہ ہم الف لیلوی دور کے باشندے ہیں۔ اسے ناول ہی رہنے دیں "دلی کے بانکے" رنگیلی مزا آگیا ہمارے سر تحسین فراقی دبستان دلی اور دبستان لکھنو پڑھاتے تھے۔ دونوں زبانوں کی مٹھاس مزہ دیتی تھی۔ اس سلسلے کو جاری رکھیں۔ دلی کے ساتھ لکھنوی زبان پر بھی قلم اٹھائیں۔ ایک افسانہ اور غزل ارسال خدمت ہے قارئین کی آرا کا انتظار رہے گا اور پلیز پرانے ساتھی لوٹ آئیں کیونکہ اب نئے افق نئی آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے اور پلیز میری تنقید کو مثبت لیں منفی نہیں میرا مقصد کسی کی دل آزاری کرنا نہیں بلکہ اپنے ساتھی رائٹرز کو بہتری کی طرف لانا اور نئے افق کو صفِ اول کا بنانا ہے۔ نئے افق کو سجانے اور سنوارنے والوں کی خدمت میں آداب دعاؤں میں یاد رکھیں۔

☆ تارا! دیر بعد آپ کی آمد اچھی لگی۔ آپ کی تنقید اور تعریف ان سطور کے ذریعے مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔ آپ کی غزل مل گئی ہے البتہ افسانہ سے محروم ہیں۔ ہاں آپ کو خوب صورت خط پر پانچ سو روپے کا انعام مبارک ہو۔

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ عیدالفطر کے چوتھے دن اگست کا نئے افق عید کی مبارکبادیں بکھیرتا ہوا ملا۔ گویا عید کے بعد دوسری عید، سرورق کے بارے میں ہماری گزارشات کی شاید آپ یخنی بنا کر پی گئے ہیں کیونکہ اس دفعہ بھی سرورق کسی اودھ بلاؤ کی تصویر سے مزین تھا۔ اللہ سے بہتری کی توقع ہے۔ محترم و مکرم قریشی صاحب کی دستک بہت زوردار تھی۔ مگر یہ بات یاد رہے کہ زرداری صاحب کو اپنی شان میں لکھے گئے قصیدے ہضم کرنے میں مہارت حاصل ہو گئی ہے۔ یتیم اور لاوارث ملک پاکستان کے اربوں روپے ڈکارنے والا آصف زرداری اب خود پر ہونے والی تنقید سے نہیں گھبراتا مگر اس کی اور اس کے شاطر حواریوں کی مکار آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ آنے والے وقت میں ان کے گرد شکنجہ مضبوط ہونے والا ہے۔ سو حفظ ماتقدم کے طور پر وہ ملک کے دفاعی اداروں کے خلاف زہر اگل کر انہیں ڈرانے دھمکانے کی کوشش کررہے ہیں۔ مگر پہلے تجربے کی ناکامی نے انہیں یہ ضرور سکھا دیا ہوگا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں، اہالیان وطن خاطر جمع رکھیں کرپشن، لینڈ مافیا، ٹارگٹ کلنگ اور بھتہ خوروں کے جادوگر جلد ہی اپنا سب کچھ کھایا پیا اگلنے والے ہیں (یہ میں محض ہوا خوری کے لیے نہیں کہہ رہا بلکہ وطن عزیز کی

دفاعی غلام گردشوں میں آج کل یہی تیاریاں ہو رہی ہیں ان شاء اللہ بہر حال بڑھتے ہیں محفل یاراں کی جانب، چند مخصوص ساتھی شامل محفل تھے۔ ریاض بٹ بھائی خوش آمدید، نیک تمناؤں کا شکریہ آپ کا بھرپور تبصرہ اہمیت کا حامل تھا۔ ابن مقبول صاحب میری تجویز کی حمایت کرنے کا شکریہ انشاء اللہ ہم جلد ہی نئے افق میں بہتر تبدیلیاں دیکھیں گے کہانیوں کی بات کی جائے تو ابتدائی صفحات پر قریشی صاحب کی کہانی کا آنا ایک طرح سے نیک شگون ہوتا ہے نئے افق کے قارئین کے لیے یہ بات خوش آئند ہے کہ رسالے کے مدیر اعلیٰ اور بانی ادارہ خود اپنے قارئین کے لیے وقت نکالتے ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ پامسٹ وسیم قریشی کی موشگافیوں کے متعلق مجھے شک ہے کہ یہ سب فرضی داستانیں گھڑی جارہی ہیں۔ ویسے بھی خیر سے قلم حسام بٹ کا ہے اور وہ رائی کا پہاڑ بنانے میں خاص مہارت رکھتے ہیں اب بھلا مسٹر خاتون کے حسن و جوانی اور نشیب و فراز کا زاویہ نمایاں کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر آپ کوئی سچا واقعہ احاطہ تحریر میں لا رہے ہیں اور اس کے کردار ابھی زندہ جاوید ہیں تو پھر آپ کو تھوڑا خیال کرنا چاہیے کہ حقیقت بناوٹ کے غلاف میں چھپ نہ جائے اب اگر آپ کسی خاتون کی کمرے میں انٹری کو یوں بیان کریں گے کہ تازہ گلاب سے چہرے والی عورت، غزالی آنکھیں ہونٹوں پر رقص کرتی مسکان، میرے دفتر میں داخل ہوئی تو گویا خوشبوؤں کا طوفان آ گیا اور وہ بڑی مستانی سی چال چلتی ہوئی میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ اس طرح تو قاری سمجھے گا کہ شاید آپ بیتی بیان کرنے والے صاحب انتہا درجے کے ٹھرکی واقع ہوئے ہیں جو خاتون موصوف کے ہر اٹھتے قدم پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ خاص طور پر پیشہ ورانہ آپ بیتی کو تو انتہائی سنجیدہ پیرائے میں ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ میری پیاری بہنا ریحانہ سعیدہ نے اس موضوع اور اس علم میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ یہاں تک کہ پامسٹ صاحب کا نمبر لینے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ بہنا شاید آپ کو نہیں معلوم کہ ہمارا دین اسلام اس علم کے بارے میں کیا حکم دیتا ہے۔ قرآن و حدیث میں ستارہ شناس اور علم نجوم وغیرہ کے بارے میں سخت ممانعت آئی ہے اور یہاں تک کہ اسے شرک کا درجہ دیا گیا ہے۔ چلیں پڑھنے پڑھانے کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن باقاعدہ دلچسپی لینا اور اس کے متعلق کھوج لگانا حرام ہے باقی محترم قریشی صاحب زیادہ جانتے ہیں سلسلے وار ناول کے متعلق عرض کروں گا کہ چاہے آپ قارئین سے ووٹنگ کرا لیں قلندر ذات ناول کے بارے میں آپ کو یہی رائے ملے گی کہ اس کو سمجھنے کے لیے حکیم سعید صاحب کی معجون برائے مقوی دماغ استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک مسئلہ کلیئر نہیں ہوتا اور ہیرو صاحب مزید پانچ دس پھڈے لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں بے شمار دفعہ امجد جاوید صاحب کو دردمندانہ مشورے دے چکا ہوں مگر وہ اپنے عمل سے یہی کہتے نظر آتے ہیں کہ میں نہ مانوں خوشبوئے سخن میں نوشین بہنا نے اپنے بھیا کی غزل کو آخر انعام یافتہ قرار دے ہی دیا۔ نوازش جناب کی مگر مدیر صاحب اتنا تو بتا دیں کہ انعام کیا ہوگا اور ہم تک کیسے پہنچے گا؟ ریاض قمر صاحب آپ خود غیر حاضر ہوتے ہیں یا نوشی آپی ہاتھ دکھا جاتی ہیں۔ قدیر رانا صاحب آپ اگر انتخاب کر کے بھیجتے ہیں تو اصل شاعر کا نام بھی لکھا کریں۔ آپ کسی اور کی شاعری میں اپنے نام کا ٹانکا فٹ کر کے جو کمال کرتے ہو وہ ادبی لحاظ سے بہت غلط ہے اگر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا تو میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں تمام تر ثبوتوں کے ساتھ تمہیں کھڈے لائن لگوا دوں گا پھر اپنی سرورق شدہ شاعری گاؤں کی بھینسوں کو سناتے رہنا ویسے آل کیونکہ نئے افق میں جوڑ توڑ کے ماہرین کی گنجائش نہیں ہے ادبی صارفین کو واجد نگینوی کا انجام یاد رکھنا چاہیے جسے عمران بھائی نے بلیک لسٹ کی ایسی کک لگائی کہ وہ آج تک لاپتا ہے آخر میں اتنا بتا دیں کہ ناول فلسطین کے مصنف کا نام پہلے شماروں میں ایم الیاس لکھا گیا تھا جبکہ اب الماس ایم اے چل رہا ہے، تمام ساتھیوں کے لیے دعائیں۔

☆ محترم عمر فاروق خوب صورت خط کا شکریہ، انعام آپ کو اب تک بذریعہ منی آرڈر مل چکا ہوگا۔ حسام بٹ بڑے کہنہ مشق ادیب ہیں ہم آپ کی تنقید ان سطور کے ذریعے ان تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے وہ خود جواب دیں گے۔

پرویز احمد دولو...... میاں چنوں۔ السلام علیکم! نئے افق اتنی جلدی آیا جتنی جلدی صفر پر آؤٹ ہونے والا کھلاڑی پویلین واپس لوٹتا ہے سرورق کی حسینہ کے شوق نرالے ہیں بالوں پر اتنی مہندی تھوپی کہ لال سے پیلے ہو گئے۔ آنکھیں حسینہ کی کم اور ڈریکولا کی زیادہ لگ رہی ہیں۔ دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی صاحب سابق صدر اور پیپلز پارٹی کے ''کو'' چیئر مین جناب آصف علی زرداری صاحب پر کھل کر برسے انہوں نے تو جناب محترم ذوالفقار مرزا کو بھی پیچھے چھوڑ دیا جہاں تک میرا خیال ہے سندھ میں جناب آصف علی زرداری صاحب کی حکومت ہے اور قومی اسمبلی میں ان کا اپوزیشن لیڈر ہے کراچی کی بلند و بالا عمارات اور منوڑہ کے اندر آبادی سے لے کر گلگت، چترال کی برف پوش چٹانوں تک ان کے کروڑوں چاہنے والے اور ووٹر ہیں اور یہی ووٹر پیپلز پارٹی اور جناب آصف علی زرداری کا اثاثہ ہیں۔ جناب آصف علی زرداری صاحب نے دوبئی بھاگنے کی بجائے لانڈھی جیل کراچی میں گیارہ سال

قیدکاٹی میموگیٹ اسکینڈل سرے محل اسکینڈل اور کتنے ہی الزامات ان پر لگائے گئے۔ اب ان کی حکومت گئے تو تین سال گزر چکے ہیں۔ آج تک دوبارہ تحقیق نہیں ہوئی۔ رینٹل پاور کیس کو ضخیم فائلوں کے نیچے دبا دیا گیا۔ کچھ لوگ لندن بھاگ چکے ہیں۔ کچھ پر تقریباً ایک سو پچاس ایف آئی آر بھی کٹ چکی ہیں۔ کچھ لوگ سرحدوں کے محافظ جوانوں کے ساتھ وطن عزیز کے بارے میں بہت کچھ کہہ چکے ہیں۔ ان کے بارے میں اسی طرح وضاحت کے ساتھ آپ لکھیں گے پلیز، ہم نے محبتوں کے پھول کھلانے ہیں۔ ٹی وی چینل پر بیٹھ کر کہنا آسان ہے مگر کسی بھی رسالے میں جس کو ہر ماہ ہر سیاسی پارٹی اور ہر مذہبی فرقے سے تعلق رکھنے والا قاری پڑھتا ہو یقیناً یہ ان قاریوں کے ساتھ سخت زیادتی ہے۔ بجلی کی کمی تو تھر کول منصوبے سے دور ہو سکتی ہے اگر گورکن نے ایک قبر کے پچاس ہزار روپے لیے اس میں جناب آصف علی زرداری صاحب کا کیا جرم ہے دو کروڑ پچاس لاکھ کی آبادی والے اس شہر میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس گورکن سے بات کرتا۔ اگر پیاس کی شدت سے لوگ شہید ہوئے ہیں تو کروڑوں گاڑیاں اسی شہر میں موجود ہیں جن کو روزانہ پانی سے دھویا جاتا ہے کتنی ہی جگہوں پر پانی بلاوجہ ضائع ہو رہا ہوتا ہے۔ اگر ہم لوگ سچے مسلمان اور محب وطن پاکستانی بن جائیں ہر مسلمان دوسرے کو اپنے بھائیوں کی طرح عزیز سمجھے اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھے تو پوری دنیا مل کر ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ بس ہم ہی اپنے اسلاف کو بھولے ہوئے ہیں۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے تین ہزار مجاہدین کے لشکر کی مدد سے لاکھوں رومیوں کو شکست دی۔ اقرا جناب طاہر قریشی کا ایمان افروز تبلیغی سلسلہ بہت پسند آیا۔ ''کیچڑ کا کنول'' ڈاکٹر ایم اے قریشی کی تحریر لازوال ہے۔ اگرچہ ترجمہ شدہ ہے مگر ہمارے معاشرے کی عکاسی ہے، بہت سے مفاد پرست ہمارے معاشرے میں بھی پائے جاتے ہیں جو مقاصد کے حصول کے لیے کچھ بھی بچا کر نہیں رکھتے۔ کاغذی رشتے عامر زماں عامر کی معاشرے کی بے حسی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ سب کچھ جانتے ہوئے بوجھتے ایک حوا کی بیٹی کو امتحان کی بھٹی میں جھونک دیا گیا۔ محترم امجد جاوید تو ہمارے پیارے محبوب لکھاری ہیں ان کی تحریریں پڑھ کر مجھے تو پڑھنے کا فن آیا۔ محمد جاذب کا منگ کوٹ سسپنس سے بھرپور تحریر تھی چور کو پکڑنے کے لیے بہت ذہانت کا استعمال کیا گیا اگر اختتام پر انسپکٹر اور کمیلری کی شادی کرا دی جاتی تو تحریر اور زیادہ نکھر جاتی۔ اپنے روحانی استاد محمد سلیم اختر کی تحریر پر تبصرہ کرنا میرے قلم میں اتنی جرأت نہیں۔ ان کا قلم لفظ کم اور موتی زیادہ بکھیرتا ہے ان موتیوں کو ماہر جوہری ہی چن سکتا ہے اور ان کا مول لگا سکتا ہے۔ زریں قمر کی کشمیر کے موضوع پر بہترین تحریر تھی مسلمانوں کو جب بھی نقصان ہوا تحقیق پر پتا چلا کسی اپنے نے پیٹھ پر چھرا گھونپا ہے۔ زریں قمر کا یہ فقرہ ''ہمیں سادہ، سستا اور مقامی لباس پہننا چاہیے'' بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گیا ہم تو پینٹ شرٹ اور ٹائی کے علاوہ اور کچھ پہننا توہین سمجھتے ہیں۔ فلسطین کی خون رلانے والی تحریر جناب الماس ایم اے کی شاہکار تحریر تھی جانے کب ہم مسلمان متحد ہوں گے اور کشمیر فلسطین آزاد ہوگا۔ آخری گزارش کہ کم از کم دو صفحات اشعار کے لیے لازمی مختص فرمائیں، بہت شکریہ۔

☆ پرویز صاحب! ہم معذرت خواہ ہیں کہ دستک سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہر ایک کا اپنا نکتہ نظر ہوتا ہے۔ بہت سوں نے اسے پسند بھی کیا ہے۔ بہر حال ہم آپ کے خیالات ان سطور کے ذریعے محترم مشتاق احمد قریشی تک پہنچا رہے ہیں۔

سلیم اختر...... راولپنڈی۔ محترم اقبال بھٹی صاحب آداب امید ہے آپ بخیریت ہوں گے آپ کے حکم کی تعمیل تبصرہ لیے حاضر ہوں۔ اگست کے شمارے کا سرورق اور گیٹ اپ بڑا ہی دلکش اور پرکشش ہے عرصہ بعد ایک نہایت ہی خوب صورت اور دیدہ زیب ٹائٹل دیکھنے کو ملا ہے کہ کچھ قارئین محض سرورق دیکھ کر پرچہ خریدنے پر مجبور ہو جائیں گے دلکش آنکھوں اور سنہری بالوں والی حسینہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اپنا جلوہ دکھا رہی ہے، بہت خوب۔ کہانیوں کی فہرست میں ڈاکٹر ایم اے قریشی کی ''کیچڑ کا کنول'' دیکھ کر اور پھر گفتگو میں انعامی خط کا سلسلہ دیکھ کر بہت کچھ یاد آ گیا یعنی ادارے کا ایک اور پرچہ ''نیا رخ'' جو اسی کی دہائی میں شائع ہوتا تھا میں اس وقت محض ایک قاری تھا گر ساتھ ساتھ لکھنے کا محض شوق ہی تھا میں تب سے ڈاکٹر ایم اے قریشی، ابن صفی، سید احتشام اور ابن آدم (مرحوم) وغیرہ کی تحریریں شوق سے پڑھا کرتا تھا (ابن آدم) راجہ بنارس (مرحوم) میرے علاقے کے تھے۔ ان سے ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں انہوں نے مجھے کہانی لکھنے کے ٹپس بھی دیے تھے۔ اب نئے افق میں ڈاکٹر ایم اے قریشی کو پڑھ کر ایک خوشی کا احساس ہو رہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ نیا رخ میں بات چیت میں بھی بہترین خطوط پر انعامات دیے جاتے تھے اور اب آپ نے وہی سلسلہ نئے افق میں شروع کر کے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کو تو میں تب بھی جانتا تھا جب آپ بزم سخن سجاتے تھے اور انعامات سے بھی نوازتے تھے مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ آپ نے نئے افق میں تبدیلیاں شروع کر دی ہیں۔ ہر ماہ دستک میں قریشی صاحب ہمارے احساس پر دستک دیتے ہیں مگر اس ماہ کی دستک کچھ سیاسی رنگ لیے ہوئے ہے اس لیے کوئی تبصرہ نہیں۔ ساحل ابڑو انعام یافتہ خط پر مبارک باد قبول ہو مگر اس کے خط میں میرا تذکرہ کچھ اچھا نہیں لگا اس نے مجھے خوامخواہ کا اشتہار بنا

دیا۔ ساحل ابڑو سے گزارش ہے کہ وہ آئندہ اس معاملہ میں احتیاط کریں مجھے خودنمائی قطعی پسند نہیں ہے۔ بہن ریحانہ سعیدہ خوب تبصرہ کرتی ہیں اس ماہ بھی انہوں نے بھرپور اور جاندار تبصرہ کیا ہے۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی تو نئے افق کی جان ہیں ان کا تبصرہ اور تحریریں اتنی مضبوط اور جاندار ہوتی ہیں کہ ان سے نئے افق کی سج دھج میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کے قلم میں ایک جادو ہے جو قاری کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے میں ان کی تحریروں کا فین ہوں اور ان کا احترام کرتا ہوں۔ عمر فاروق ارشد کی کھری اور سچی باتیں بھلی لگتی ہیں اور دل پر اثر کرتی ہیں اس ماہ بھی ان کا تبصرہ شاندار اور جاندار رہا انہوں نے جن غلطیوں اور خامیوں کی نشان دہی کی ہے برائے کرم ان کو دور کرنے کی کوشش کریں کیونکہ بھائی عمر فاروق ارشد سچ کہہ رہے ہیں اور سچ کا ساتھ دینا تو سب کا کام ہے۔ بھائی ریاض بٹ صاحب طویل تبصرہ کے ساتھ جلوہ گر ہیں میں ان کی تحریریں پسند کرتا ہوں اور شوق سے پڑھتا ہوں یہ الگ بات ہے کہ کبھی خط لکھ کر اس کا اظہار نہ کرسکا۔ ریاض بٹ کی تحریریں نئے افق کی پہچان ہیں ریاض بھائی آپ بہت ہی اچھا لکھتے ہیں اور جس موضوع پر آپ لکھتے ہیں وہ آپ ہی کا خاصا ہے۔ بہت ساری دعائیں اور محبتیں آپ کے لیے۔ عالیہ انعام الٰہی بہنا جی گھر لوٹ آؤ آپ کے بغیر گفتگو سونی سونی لگتی ہے آپ تو نئے افق کا مان ہیں آپ کی تحریر سے نئے افق سج جاتا ہے۔ ''کیچڑ کا کنول'' ڈاکٹر ایم اے قریشی کا ایک خوب صورت اور یادگار ناولٹ ہے ہمیشہ کی طرح ان کا قلم اپنی جولانیاں دکھا رہا ہے۔ ''کاغذی رشتے'' ایک معاشرتی تحریر ہے جسے عامر زمان نے خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے آج کل کے دور میں رشتوں کی ڈوری کمزور ہوتی جارہی ہے۔ اسی لیے رشتوں نے کاغذ کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ قلندر ذات ابھی تک دلچسپی قائم رکھے ہوئے ہے مصنف کی گرفت مضبوط چلی آرہی ہے۔ ''اسیر غم'' سندھ کے وڈیرہ شاہی اور جاگیردارانہ نظام کی عکاسی ہے۔ جسے رائٹر نے بڑی خوب صورتی سے لکھا ہے۔ خوش آمدید بہن ''سکینہ نسیم صدف'' آپ کا ادب کی دنیا میں ایک نام اور مقام ہے آپ کی تحریریں حقیقت سے قریب تر ہوتی ہیں آپ ہمیشہ نازک اور حساس موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں کہ پڑھنے والا بھی حساس ہو جاتا ہے بلاشبہ آپ بہترین مصنف ہیں آپ کی تحریر احساس بھی دل کے تاروں کو جھنجوڑ دینے والی تحریر ہے۔ دو کشتیوں میں سوار ایک عورت کے احساس اور جذبات کو آپ نے بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ ''نظر فریب'' حسب معمول متاثر کن رہی۔ زرین قمر کی ''عروس آزادی'' کشمیر کی آزادی کے لیے نیا جذبہ اور دلولہ پیدا کرنے والی تحریر ہے۔ فلسطین حسب معمول اچھی جارہی ہے۔ ''دلی کے بانکے'' کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن میں آپ کا انتخاب عمدہ ہوتا ہے اس سلسلہ کو جاری رکھیں اور صفحات میں اضافہ کریں۔

☆ محترم سلیم اختر یا آوری کا شکریہ، ریاض بٹ واقعی ہمارے پرچے کا جھومر ہیں۔ ان کا سادہ انداز تحریر قارئین کو بہت پسند ہے۔ آپ کے ساتھ، ہم بھی عالیہ انعام الٰہی کے خط کا انتظار کررہے ہیں۔ امید ہے وہ جلد رابطہ کریں گی۔

عبدالغفار عابد...... چیچہ وطنی۔ محترم مشتاق احمد قریشی صاحب، اقبال بھٹی صاحب، بھائی عمران احمد، نئے افق کی پوری ٹیم اور لکھاری و قارئین کو بندہ ناچیز کا سلام پہنچے عزیز ساتھیو اس پررونق محفل میں پہلی بار شرکت کررہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ لوگ حوصلہ افزائی کریں گے۔ ماہ اگست کا پرچہ نئے افق 15 جولائی بروز بدھ اخبار مارکیٹ لاہور سے خریدا۔ نائٹ ڈیوٹی کے دوران کچھ مطالعہ کیا۔ اگلے دن جمعرات کو اپنے گھر چیچہ وطنی کے لیے روانہ ہوا گھر پہنچ کر رات بھر مطالعہ کیا۔ اس کے بعد عید کی مصروفیت شروع ہوگئیں یہ مصروفیت منگل تک جاری رہی آپ عظیم لوگوں کے لیے یہ سطریں بدھ کی صبح لکھ رہا ہوں اپنے تبصرے کا آغاز محترم مشتاق احمد قریشی کی دستک سے کرتا ہوں۔ قریشی بھیا جو کچھ آپ نے لکھا ہم سو فیصد اس سے اتفاق کرتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یہاں پارسا کوئی نہیں۔ قائداعظمؒ کے بعد ہمارے سبھی لیڈروں نے ملکی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا ان لیڈروں میں بھٹو کا نام شامل نہیں میرے خیال میں اگر آپ کسی سیاستدان کا نام لیے بغیر اپنی بات کی وضاحت کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ نئے افق پاکستان کا مقبول ترین ڈائجسٹ ہے اگر کوئی جیالا (قاری) اس کالم کو پڑھ کر ہم سے روٹھ گیا تو یہ ادارے کی جیت نہیں بلکہ ہار ہوگی یا خدا میری ہمدردیاں پیپلز پارٹی کے ساتھ نہیں اور نہ ہی سابق صدر میرا لیڈر ہے۔ ہاں البتہ نئے افق کے ساتھ محبت اور اس کے قارئین کے ساتھ ہمدردی ضرور ہے۔ نئے افق کے پلیٹ فارم پر ہم سب ایک ہیں کسی ایک کے قلم یا زبان سے کسی ایک کا بھی دل ٹوٹ گیا تو یہ انسانیت کی توہین ہوگی ہم نے تو ہر سو محبتیں تقسیم کرنی ہیں کیونکہ یہی نئے افق کا منشور ہے اور یہی اس محفل کا حسن ہے اب کچھ ذکر کہانیوں کا ہو جائے سب سے پہلے نئے افق میں نئے لکھنے والے لکھاری عامر زمان عامر اور مہر پرویز احمد دولو کی تحریروں کا کرتا ہوں ''کاغذی رشتے'' اور ''اسیر غم'' ان دونوں تحریروں میں عورتوں پر ہونے والے مظالم کی درجہ بدرجہ نشاندہی کی گئی ہے۔ اسلام نے عورت کو زندگی دی عزت و مقام دیا لیکن افسوس کہ آج کے دور میں انہیں پستیوں میں دھکیلا جارہا ہے کہا جاتا ہے کہ عورت کی نظر میں شرم وحیا

نہیں ہوتی لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ ہمارے معاشرے میں مردوں کی آنکھ میں کتنی شرم وحیا ہے۔ عورت اپنی عزت اور حفاظت کے لیے کیا کچھ نہیں کرتی لیکن یہ معاشرہ اور اس معاشرے کے لوگ ہر لحاظ سے عورت کی عزت کو پامال کرنے کی کوشش کرتے ہیں عورت خدا کی بڑی نعمتوں سے ایک نعمت ہے۔ عورت دنیا کے خوب صورت چہرہ کی ایک آنکھ ہے اس لیے عورت دنیا میں پیار، محبت کا تاج محل ہے پھر اس کے ساتھ دھوکہ کیوں، زیادتی کیوں موجودہ دور کے ہر دل عزیز رائٹر محترم سلیم اختر کی تحریر ''روپ بہروپ'' کی پہلی قسط پڑھی اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کو سمجھنا، انسان کے بس میں نہیں ہے۔ جو لوگ دوسروں کو قائل کرنے کے لیے کئی کئی روپ اپناتے ہیں وہ شیطانیت کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور جو لوگ اپنی مثبت سوچ کے ساتھ ایک ہی روپ رکھتے ہیں وہ لوگ انسانیت کو زندہ کرتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ میدان عرفات کی کامیابی ہمارا مقدر بنے تو پھر ہمیں دوسروں کو دھوکا دینے والے روپ چھوڑنا ہوں گے نسیم سکینہ صدف کی تحریر ''احساس'' نے ذرا بھی متاثر نہیں کیا ساری تحریر پڑھنے کے بعد بھی پتا نہیں چلا کہ اس کا مرکزی خیال کیا تھا۔ زریں قمر کی تحریر ''عروس آزادی'' بہت سبق آموز تحریر تھی آزادی کی قدر کوئی کشمیر اور فلسطین کے لوگوں سے پوچھے یہاں مسلمانوں کو سانس لینے کا بھی حق حاصل نہیں انسانی سوچ ہی ہوتی ہے جو انسان کو جانور یا انسان بناتی ہے جو انسانی زندگیوں سے فٹ بال کی طرح کھیلتے ہیں وہ بھی انسان ہیں جو انسانی زندگیوں کو بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیلتے ہیں وہ بھی انسان ہیں۔ جب تک انسانوں کو بچانے کے لیے یہ انسان موجود ہوں گے انسانی جانوں سے کھیلنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوں گے انشاء اللہ کشمیر ایک دن ضرور آزاد ہوگا۔ طاہر قریشی کی اقرا پڑھنے سے ایمان تازہ اور اس میں اضافہ بھی ہوا ڈاکٹر ایم اے قریشی کی تحریر ''کیچڑ کا کنول'' بہت ہی لاجواب تحریر تھی یہاں بھی مرد کو بہتری حاصل رہی عورت، عورت ہونے کی بنا پر ہار گئی اگر ہم انسانیت کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں تو عورت کے لیے اپنی سوچ کو مثبت رکھیں اور منفی سوچ کو ترک کردیں میری دلی دعا ہے کہ نیا شائع ہونے والا ماہنامہ حجاب بھی نئے افق اور آنچل کی طرح مقبولیت حاصل کرے اور آپ بھی لوگ سدا سکھی رہیں آمین۔

☆ عبدالغفار خوش آمدید ہمارے قاری جو اپنا قیمتی وقت نکال کر پرچے پر خوب صورت تبصرہ اور تنقید کرتے ہیں وہ نئے افق کا سنگھار ہیں امید ہے آپ کی آمد اس سنگھار میں اضافہ کا باعث بنے گی۔

منعم اصغر...... ڈیرہ غازی خان۔ سب سے پہلے نئے افق کے تمام لکھنے پڑھنے والوں اور اسٹاف کو میرا سلام، کیسے ہیں جناب آپ سب، امید ہے سب خیریت سے ہوں گے۔ نئے افق میں ''گفتگو'' اور نئے افق کے باقی تمام سلسلوں میں پہلی بار شرکت کررہا ہوں امید ہے کھلے دل سے ویلکم کیا جائے گا۔ نئے افق کا اگست کا تازہ شمارہ 21 تاریخ کو ملا سرورق بہت ہی خوب صورت تھا۔ سب سے پہلے خطوط پڑھے ساحل ابڑو صاحب کا بھرپور تبصرہ انعام کا حق دار ٹھہرا میری طرف سے مبارکباد۔ سب کے ہی تبصرے جاندار تھے۔ اس کے بعد کہانیوں کی طرف بڑھے۔ کیچڑ کا کنول، ڈاکٹر ایم اے قریشی کی بہت ہی خوب صورت طویل کہانی تھی۔ پڑھ کر بہت ہی اچھا لگا۔ کاغذی رشتے، عامر زمان عامر صاحب کی ہلکی پھلکی دلچسپ تحریر تھی۔ احساس نسیم سکینہ صدف صاحبہ کی مختصر اور اچھی کہانی تھی۔ نظر فریب حسام بٹ کی انتہائی دلچسپ و معلوماتی تحریر تھی۔ سید ھادل میں اتر گئی عرصہ تک یاد رہے گی۔ منک کوٹ بھی اچھی کہانی تھی۔ عروس آزادی، قلندر ذات ماورائی ہورہی ہیں بہت ہی زیادہ۔ نیا ناول روپ بہروپ، فلسطین، دلی کے بانکے لفظ لفظ سے مہک آتی ہے۔ بہت ہی زبردست دیلڈن ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن میں عمر فاروق ارشد، عبید ایوب کو دلی مبارک باد۔ پورا رسالہ زبردست تھا۔ اگلے ماہ تک کیلئے اجازت اللہ حافظ۔

☆ منعم اصغر خوش آمدید آپ کی بھرپور آمد اچھی لگی امید ہے آپ ہر ماہ آتے رہیں گے۔

اشفاق شاہین...... کراچی۔ شمارہ عید بروقت مل گیا لیکن یہ کیا سرورق عید کی مناسبت سے بالکل نہ تھا ذرا اچھا سا بنا دیتے چاند، چوڑیوں والا خیر دستک میں قریشی صاحب نے آصف زرداری کو ضرب آئینہ دکھایا ہے گفتگو میں پہنچے بہت کم تعداد تھی کہاں گم ہیں سب ساتھی آ جاؤ یار پچھلے ماہ پنجاب جانے کی وجہ سے میں بھی نہ لکھ پایا۔ اب حاضر ہوں ساحل ابڑو انعامی خط کے ساتھ موجود تھے گریٹ جی، ریحانہ سعیدہ، عمر فاروق کے خط بھی عمدہ تھے اور ریاض بٹ بھائی ضرور ہماری کوشش تو ہے کہ ناچیز رائے دیتے آئے ہیں آتے ہیں تبصرے کی طرف، کیچڑ کا کنول سسپنس سے بھرپور قریشی صاحب کا خوب صورت شاہکار تھا۔ ہماری سیاست کا حال بھی ایسا ہی ہے جس پر گماں تک نہیں ہوتا وہی گروہ کے سرغنہ نکلتے ہیں اللہ سب کو ہدایت دے کاغذی رشتے میں عامر زمان عامر نے خوب لفاظی کی تحریر بھی معیاری تھی گڈ، قلندر ذات دوست امجد جاوید خوب لکھ رہے ہیں۔ نسیم سکینہ صدف کا احساس بھی کافی حساس اور سبق آموز تھا بہت اچھا پرویز دولو کے قلم میں بڑی روانی آ گئی ہے۔ اسیر غم بہت پیارا تھا۔ نظر فریب آسٹرولوجسٹ کا

خوب نمونہ تھا خوب بیچ تھا سسپنس بھرا۔ سلیم اختر نے تو کمال کر دیا روپ بہروپ کا اتنا شاندار آغاز بہت زبردست بہت دلچسپ مزہ آ گیا اور مختصر بھی نہیں سپر حاصل تھا کریڈٹ سلیم بھائی۔ عروس آزادی بہترین خصوصاً فرناز کا کردار، ذوق آگہی میں سپاس گل بہترین انتخاب لائیں اور خوشبوئے سخن میں نوشین اقبال نوشی کا انتخاب بھی لاجواب تھا خصوصاً مینا سید کی لحہ اور ریحانہ سعیدہ کی بے سبب باتیں۔ تجاویز کافی دوست احباب دے رہے ہیں۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک کالم ہو جس میں ہم قارئین ایک دوسرے کو مخاطب کرسکیں پسندیہ شعر کا کالم بھی ہونا چاہیے آئندہ ماہ تک کی اجازت۔

☆ محترم اشفاق صاحب آپ گفتگو کی محفل میں ایک دوسرے سے گفتگو کرسکتے ہیں لیکن تہذیب کے دائرے میں اور شائستہ انداز میں۔

عامر زمان عامر...... بوبے والا۔ قابل قدر محترم جناب عمران احمد صاحب سلام خلوص آپ بمعہ جملہ اسٹاف، معزز رائٹرز صاحبان اور قارئین نئے افق کو گزشتہ عید کی بہت بہت مبارک ہو۔ نئے افق سے متعارف کرانے اور پاکستان کے صف اول کے معیاری جریدے سے مستقل ناتہ جوڑنے کا سہرا بلاشبہ معروف تبصرہ ونثر نگار برادر عزیز عبدالغفار عابد کے سر جاتا ہے۔ دور حاضر میں جہاں بڑے سے بڑے نامور، مقبول ادبی پرچے مارکیٹ سے غائب ہو کر ہمیشہ کے لیے گمنامی کے اندھیروں میں ڈوب رہے ہیں اور جس طرح پرآشوب کٹھن دور میں ذوق مطالعہ اور پڑھنے کا ذوق قدرے کم ہو رہا ہے ایسے دور میں نئے افق کی صورت علمی و ادبی شمع روشن کر کے اجالے کی تحریک پیدا کرنا قابل صد فخر لائق تحسین ہے کئی دہائیوں سے نئے افق کی بلاتعطل اشاعت ادب پروری اور فروغ علم وادب کی واضح دلیل ہے۔ جس کے لیے ادارہ نئے افق کی تمام ٹیم داد کی مستحق ہے دعا ہے یہ ادبی کارواں ہمیشہ سوئے منزل گامزن رہے احقر کی اولین تحریر افسانہ "کاغذی رشتے" کو سند اشاعت سے نوازنے پر اس بندہ پروری اور عزت افزائی کے لیے انتہائی سپاس گزار ہوں اگست کا شمارہ بروقت مہیا کرنے پر آپ کے خلوص کا مقروض ہوں قوی امید ہے نئے افق نے جو مان دیا ہے وہ تادم آخر برقرار رہے گا۔ "ماہنامہ حجاب" کی صورت میں آنچل کی قارئین و رائٹرز خواتین کے لیے نئے پرچے کے اجرا پر ڈھیروں دلی مبارکباد قبول کیجیے دلی دعا ہے کہ آنچل اور نئے افق کی طرح یہ پرچہ بھی کامیاب مرد وخواتین میں یکساں مقبول ہو اور دنیائے ادب میں خوش گوار اضافہ ہو۔ سحرانگیز سرورق کے ساتھ اگست کا شمارہ بے حد پسند آیا۔ دستک محترم مشتاق احمد قریشی صاحب کا خوب صورت اداریہ ہے۔ جس میں انہوں نے وطن عزیز کی دوسری بڑی سیاسی مقبول ترین جماعت پر مکمل کرا اپنے مشاہدے اور رائے کا مکمل کر اظہار کیا بہت خوب کاش کہ آپ کے یہ جملے ازلوں سے خوب غفلت میں سوئی سیاسی قوتوں کے لیے صور اسرافیل کا کام کریں ہمارے ملک میں عدل وانصاف قانون جمہوریت کی بالادستی ہو پانچ دہائیوں سے زائد عرصے پر محیط غلام ابن غلام عوام کو ان نام نہاد سیاسی رہنماؤں سے صحیح معنوں میں آزادی نصیب ہو مگر محترم قریشی صاحب میری ناقص رائے کے مطابق آپ اپنے نشتر قلم سے کسی بھی سیاسی رہنما کا نام لے کر براہ راست مخاطب کرنے کی بجائے اجتماعی طور پر موجودہ سندھ کے سیاسی منظر کی عکاسی کرتے تو زیادہ بہتر تھا۔ میری رائے سے اتفاق یا انحراف کا مکمل اختیار آپ کو حاصل ہے۔ علاوہ ازیں آپ کے مدعے سے میرے سمیت ہر لکھاری اور ذی شعور قارئین اتفاق کرتا ہے۔ اس ضمن میں مزید عرض ہے کہ "مکالمہ انسان کو زندگی کے تمام شعبوں اور شکلوں سے ممتاز کرتا ہے انسان وحیوان میں زندگی کے جملہ پہلوؤں میں ایک واضح خط کھینچتا ہے۔ مہر پرویز بھائی بحیثیت افسانہ نگار میں آپ کی رائے سے اتفاق نہیں کرتا بقول آپ کے میں نے نئے افق کے لیے اولین افسانہ کاغذی رشتے آؤٹ اسٹینڈنگ ارسال نہیں کیا ہے تو برادر عزیز زندگی کے ہر میدان میں ہر شخص اپنی دانست اور مشاہدے کی بنا پر باتوں کی بساط بچھا کر لفظوں کے مہرے آگے پیچھے کرنے میں لگا ہوا ہے۔ ادب میں ہر موضوع پر بے لاگ تبصرے بحث مباحثہ ہو رہا ہے۔ زندگی کے ہر پہلو ہر زاویہ پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے نئے نقطے تلاش کر کے نئے سرے سے باتوں کے جال بچھائے جا رہے ہیں نثر نگار سے اس کی تالیف کردہ تخلیقات میں بیسٹ کے انتخاب کا معاملہ ایسے ہی ہے جیسے والدین سے تقاضا کیا جائے کہ وہ اپنی اولاد میں سے ایک بہترین بچے کا انتخاب کریں افسانے کا حسن تقاضہ ہے کہ کردار جاندار پلاٹ مضبوط اور پرکشش ہو۔ انداز بیان میں سہل طریقہ بھی ضروری ہے مگر پیارے بھائی افسانے میں دلچسپی کا عنصر سسپنس بھی ازحد ضروری ہے ورنہ کہانی برائے نام کہانی اور آپ بیتی رہ جاتی ہے امید ہے اشارہ سمجھ گئے ہوں گے علاوہ ازیں افسانے میں مضمون اور پلاٹ کھوکھلا رہ جاتا ہے آپ نے میرے افسانے پہ تبصرہ کیا۔ اس کے لیے انتہائی مشکور ہوں۔ روح پرور تحریر سورۃ بقرۃ کی تفسیر وترجمہ پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ ایسے ایمان افروز مضامین اور مذہب سے آگاہی کے تمام ادبی سلسلے قابل تحسین ہیں۔ طاہر قریشی خداوند کریم آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔ ڈاکٹر ایم اے قریشی کا

خوب صورت ناولٹ ''کیچڑ کا کنول'' انسان و حیوان کے درمیان واضح خط کھینچتا ہے۔ مغربی معاشرے کے طرز زندگی کی خوب عکاسی کرتا ہے اشرف المخلوقات میں سے جب کوئی انسان اخلاق کی بلندیوں سے گرتا ہے تو وہ جانور سے بدتر تصویر پیش کرتا ہے حسن و شر وزن اور منفی رویوں کی ناقابل فراموش روداد پڑھ کر ڈاکٹر صاحب کے زور قلم انداز بیان کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ کاغذی رشتے پر آپ سب کی تنقید و تبصرے کا منتظر رہوں گا۔ قلندر ذات امجد جاوید کی اچھی تخلیق ہے۔ نسیم سکینہ صدف کی احساس عام سی روایتی تحریر تھی الفاظ کے تانے بانے، کردار کشی اور پلاٹ کے تانے بانے میں غیر موزوں جملوں سے کہانی میں دلچسپی کا پہلو تشنہ رہ گیا۔ امید ہے سکینہ بہن مثبت تنقید کی روشنی میں آئندہ پر اثر تحریر سے قارئین کو نوازیں گی۔ اسیر غم کے خالق پرویز احمد معاشرے کی پس پردہ تصویر پیش کر رہے ہیں یہ ظلم و بربریت کی سیاہ چادر اوڑھے اس کہانی کے تمام کردار ہمارے گرد منڈلا رہے ہیں کہانی داستان اور روانی کے لحاظ سے تو زبردست رہی مگر پرویز بھائی کہانی کے پلاٹ کی ترتیب اور قارئین میں انہماک سے گونتی دلچسپی کے رنگ بھرنے میں ابھی اناڑی ہیں۔ مثلاً پورا گاؤں خوشیوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا سے مضمون کا آغاز کرتے تو جملہ پلاٹ سمیٹنے تک غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو سکتی تھی۔ محترم حسام بٹ زندگی کی بساط پر کردار کے مہرے گھماتے عمدہ انداز سے نقطۂ آغاز سے انجام تک کامیاب رہے پڑھ کر مزہ آ گیا ویل ڈن، انکل سلیم اختر کی تحریر ''روپ بہروپ'' کی پہلی قسط پڑھی زبردست منہ بولتے کردار، نفیس اور عمدہ مضمون امید ہے اگلی اقساط میں بھی حسب روایت سلیم اختر انکل یونہی اپنے اچھوتے قلم کے جوہر ایسے ہی دکھائیں گے۔ زریں قمر کے قلم سے عروس آزادی کے زریں باب پڑھنے کو ملے ادبی جذبوں کو ڈھیروں تقویت میسر آئی۔ ذوق آگہی میں تمام اقتباس قابل تعریف اور معیاری تھے۔ محترم سپاس گل کی زیر ادارت یہ سلسلہ روز بروز نکھرتا جا رہا ہے۔ خوشبوئے سخن میں عمر فاروق ارشد، ساحل ابڑو کا کلام بے حد پسند آیا تاریخ کے جھروکوں سے کشید کر کے ایم اے الماس لائے عمدہ تاریخی کہانی فلسطین زبردست، دل کے بانکے کی صورت مشتاق قریشی زبانوں کے ارتعاع اور تاریخ کے بارے میں معلومات میں اضافے کا باعث بنے، بہت اعلیٰ اسٹاف سمیت تمام رائٹر و قارئین کی نذر خلوص کے گلدستے۔

☆ عامر زمان عامر آپ کے خوب صورت تبصرے کا شکریہ۔

ظلک شیر ملک...... رحیم یار خان۔ جناب مشتاق احمد قریشی اور بھائی عمران صاحب سدا مسکراتے رہو اور گلابوں کی طرح مہکتے رہو۔ تین سال سے نئے افق پڑھ رہا ہوں آج دل نے چاہا تو خط لکھ رہا ہوں۔ یہ ایک معیاری رسالہ ہے کوئی مسئلہ نہیں تھوڑی بہت کمی بیشی بھی ہو جاتی ہے۔ پرفیکٹ ذات تو اللہ پاک کی ہے۔ اب اس میں بہت بہتری آ گئی ہے۔ سرورق پر بھی بھی کسی مسلمان ہیروز میں سے بھی کسی کی تصویر چسپاں کر دیا کریں جن کی بدولت ہمیں یہ آزادی ملی امید ہے آپ غور کریں گے۔ عید الفطر گزر گئی مگر پاکستان کے عوام میں ایثار کا وہ جذبہ دیکھنے میں نہیں آیا جو 1965ء میں نظر آیا تھا مہنگائی نے کمر توڑ دی، دکاندار روزہ رکھ کر بھی روزہ داروں کو لوٹتے رہے، آگے عید قرباں آئے گی۔ نئے افق کے توسط سے عرض کروں گا ارباب اختیار سے بھی اور پاکستانی عوام سے بھی کہ ہمارا ملک غریب لوگوں سے بھرا ہوا ہے انہیں بھی اپنی خوشیوں میں شامل کریں اپنی اپنی بساط کے مطابق کوشش کریں قربانی کا گوشت فریج میں جمع کرنے کے بجائے مستحق افراد تک پہنچائیں یہی تو جذبہ قربانی اور مقصد قربانی ہے جو سرکار مدینہ اور صحابہؓ کا شیوہ تھا۔ اپنا حصہ رکھ کر باقی بانٹ دو، اصل روحانی خوشی یہی ہے کہ ایک غریب مسلمان آپ کے دیے ہوئے مال سے مستفید ہو۔ قریشی صاحب اقرا پڑھ کر روحانی سکون حاصل ہوتا ہے جن مبارک آیات کریمہ کا آپ نے ذکر کیا ان کی فضیلت کمال ہے ایسے دینی علوم سے نوازتے رہیے گا اس سلسلے کو بند نہ کرنا پلیز تاکہ ایمان تازہ رہے۔ عمران صاحب آپ بھی کمال کی گفتگو کرتے ہیں ہمارے گناہ اس قدر زیادہ ہو چکے ہیں ڈرتا ہوں کہیں سورج اور زمین کی پوری چادر پھاڑ کر سوا نیزے پر نہ آ جائے خدا بزرگ و برتر ہمیں معاف کرے اور اس ملک کو کوئی ایسا حکمران عنایت کر دے جو حضرت عمرؓ جیسا انصاف والا حضرت علیؓ جیسا بہادر، حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسا سچا اور مخلص اور حضرت عثمان غنیؓ جیسا دل والا ہو جو ہمیں ان بحرانوں سے نکالے جن میں آج ہم سب پھنسے ہوئے ہیں کسی کی عزت محفوظ نہیں تو کسی کی جان، کسی کا گھر محفوظ نہیں تو کسی کی دکان۔ قتل و غارت، غنڈہ گردی عام ہو گئی ہے۔ کوئی محکمہ دیکھ لیں بے بس نظر آتا ہے بجلی، پانی، تیل، گیس، بس ہماری معیشت تباہ ہو رہی ہے۔ یہ نظام بدلنا ہوگا جمہوریت کے ذریعے عوام کے ذریعے۔ اب کچھ تبصرہ کہانیوں پر کرتا ہوں قریشی صاحب کی تحریر کیچڑ کا کنول پڑھی ہمیشہ سچ ہی کی جیت ہوتی ہے۔ سانچ کو آنچ نہیں، بہت زبردست انداز میں آپ نے لکھا مبارکباد دیتا ہوں۔ عامر زمان عامر نے کاغذی رشتے میں ایک اچھا سبق دیا ہے۔ والدین کو اپنی اولاد سے بھی غفلت نہیں برتنا چاہیے۔ خصوصاً جب وہ جوانی کی حدود میں پہنچ رہے ہوں ایک اچھی کوشش تھی۔ امجد جاوید کی قلندر ذات بہت پسند آئی ہے

بس دعا ہے کہ اللہ کوئی ایسا ہی قلندر عطا کردے مرد قلندر جو کفر کی طاقتوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیے۔ نسیم سکینہ صدف کی احساس من پسند تحریریں تھیں (ناراضگی معاف) محمد جاذب کے منک کوٹ نے بھی متاثر نہیں کیا کوشش کرتے رہیں۔ مہر پرویز نے وڈیرہ راج کو اچھی طرح اجاگر کیا ہے اسیر غم ہر لحاظ سے پرفیکٹ تحریر ہے۔ اس وڈیرہ نظام کو ختم کرنا ہو گا ورنہ غریب ہاری کبھی ترقی نہیں کرے گا۔ نظر فریب کو میں نے پسند نہیں کیا حسام بٹ صاحب آپ جس علم یعنی آسٹرولوجسٹ کی طرف ہمیں کھینچ رہے ہیں یہ کوئی حقیقت نہیں ہے میرا واسطہ بہت سے آسٹرالوجی نجومیوں اور عاملوں سے پڑ چکا ہے۔ سب فضول ہے غیب وہ جانتا ہے جس نے کن فیکون سے سب کچھ بنایا (پلیز ناراض نہ ہونا) یہ ستاروں وغیرہ کا کوئی علم نہیں جو ماضی، حال، مستقبل کی نشاندہی کرے۔ سلیم اختر صاحب کی روپ بہروپ کی پہلی قسط اچھی لگی دوسری کا انتظار رہے گا۔ زریں قمر صاحبہ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جنھوں نے تحریک آزادی کشمیر کو بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیا۔ ان کا انداز بیان دل کو شاد کر کے لگا الماس ایم اے صاحب کی فلسطین اچھی جا رہی ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے بھی اور معلوماتی لحاظ سے بھی ٹھیک ہے۔ فلسطین میں بربریت کا جو بازار گرم ہے سن کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ فلسطین ہمارا وہ ملک ہے جہاں ہمارا قبلہ اول ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آرام گاہ (قبر مبارک) ہے یاسر عرفات کے بعد کوئی ایسا دلیر مرد مجاہد سامنے نہیں آیا جو فلسطین کو یہودیوں سے آزاد کرا سکے۔ دعا ہی کر سکتا ہوں۔ ذوق آگہی اچھا سلسلہ ہے اور خوشبوئے سخن بھی اچھی کاوش ہے۔ ان کے صفحات کو کچھ بڑھا دیں تو بہتر ہے۔ آخر میں مشتاق احمد قریشی صاحب نے دلی کے بانکے میں پرانی یادیں تازہ کر دیں۔ جب اسکول کورس کی کتاب میں لکھنو کے بانکے پڑھی تھی واہ مزہ آ گیا۔ ہو بہو وہی انداز اپنایا جو وہاں کی زبان کے عین مطابق تھا شکریہ ایم اے قریشی صاحب آپ کے فن کو سلام کرتا ہوں۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ قابل احترام مدیر منتظم عمران جی و اقبال بھٹی السلام علیکم۔ خوب صورت چہرے والی عجیب سی مخلوق کی چہرہ لیے اور پیچھے بالوں سے لے کر پہاڑوں تک آتش فشاں کا لاوا لال سرخ ہے کو لیے دیکھتے یہ جھیل کتنی پرسکون ہے۔ یہ عکاسی ہماری بھی ہونی چاہیے کہ اردگرد کتنے بھی گمبھیر حالات ہوں دنیا اور افراد پورے شیطانی حربوں پاکستان کو کمزور کرنے کی لال سرخ کوشش کرتے رہیں لیکن ہم عوام خواص کو ایک دوسرے کا خیال رکھ کر جھیل ہی کی طرح گہرا اور پر سکون ہونا چاہیے۔ ترجیحات کے لیے ہم حکومت پر سخت تنقید کرتے ہیں مگر ہم اردگرد اپنے ہی دیکھیں تو انفرادی طور پر ہم کتنے خود غرض، بے حس اور ظالم ہیں کہ اپنی ترجیحات سب پر مقدم رکھتے ہیں کوئی کسی کی دلجوئی نہیں کرتا یہ سوچنے کے لیے خاصا مواد ہے سوچیے اور عمل کیجیے۔ عید نمبر خوب رہا اور میگزین صحیح سمت جا رہا ہے۔ کہانیوں کے حساب سے ہمیں دلچسپ لکھنے والے محترم ڈاکٹر ایم اے قریشی محترم مشتاق احمد قریشی جناب حسام بٹ تو مستقل ہمارے لکھاری ہیں۔ ان تینوں کی بہترین کاوشیں تو دل کے اندر اتر گئیں، حسام بٹ کا پامسٹ زبردست جا رہا ہے اور ڈاکٹر ایم اے قریشی کی کہانی بے حد زبردست رہی اور آخری صفحات پر دہلی کی ٹکسالی زبان میں لکھا گیا انشائیہ پڑھ کر تو بے اختیار مسکرا اٹھے۔ ویل ڈن اسی طرح احساس کا غذی رشتے، اسیر غم، منک کوٹ، روپ بہروپ اور عروس آزادی بھرپور تاثر چھوڑنے والی کہانیاں اور داستانیں ہیں۔ پڑھتے پڑھتے مزہ آ گیا۔ یہ تمام انتخاب آپ لوگوں کی کڑی محنت اور انتہائی گہری سوچ کی عکاسی کرتا ہے فلسطین تو سدا کا سدا بہار ناول ہے اور الماس ایم اے کے انتخاب قلم کا انمول نمونہ ہے۔ قلندر ذات حسب معمول قاری کو لے کر چلنے والا سلسلہ ہے اور امجد جاوید صاحب خوب محنت سے کہانی کو بڑھا رہے ہیں۔ ذوق آگہی تو واقعی سیاس گل کی محنت سے چمک رہی ہے اور عبید ایوب آپ کو انعام مبارک ہو۔ تمام قارئین اس کے لیے خوب محنت سے چیزیں بھیجیں۔ خوشبوئے سخن کو تو نوشی صاحبہ نے چار چاند لگا دیے ہیں صحیح شاعری مل رہی ہے پڑھنے کو اور عمر فاروق ارشد کو انعام مبارک اور ہاں آپ کی غزل منفرد اور گہرائی لیے ہوئے تھی۔ یہ ڈاکٹر خادم حسین کھوکھر مسیحا ہونے پر بھی اتنی غمگین شاعری ذرا مریضوں کا ہی خیال رکھ لیں۔ گفتگو میں جن لکھاریوں نے یاد کیا بے حد شکریہ اور ریاض بٹ جی آپ کی صحت کے لیے خصوصی دعا ہے ساحل ابڑو بھئی آپ نے بہترین تبصرہ کیا اور انعام یافتہ کہلائے آپ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اتنا گہرا مطالعہ کرنے والا اور زبردست اردو لکھنے والا اتنی خشک اور غیر آباد زمین کا باسی کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن ماحول نے آپ کو مطالعہ کا شوقین بنا کر کندن بنا دیا ہے آپ کی غزل پڑھ کر حیرت ہوئی محسوس ہوا کہ آپ 26 کے نہیں بلکہ 62 کے ہیں اور 15 سال سے یہ سب ہو رہا ہے آگے آگے آپ خوب شہرت کمائیں گے ذرا لکھنا جاری رکھ کر نئے افق میں آتے رہیں باقی تبصرے بھی خوب تھے۔ محترم مشتاق احمد صاحب دستک میں زرداری نے سب کو مشکل میں ڈال دیا ہے اب بعد کے حالات و واقعات کو دیکھیں تو سب پرسکون ہیں اور خود زرداری ہی اپنی پارٹی کے لیے قاتل بنتے جا رہے ہیں ان شاء اللہ یہ سب ملبہ ان ہی کے اوپر گرے گا اور جناب یہ حجاب ماہنامہ کب مارکیٹ ہو رہا ہے مطلع کیجیے گا ہمارے آنچل کے قاری بے چینی

سے انتظار کررہے ہیں۔ آپ کو تجاویز تو اب بھی ملتی ہوں گی مگر خدارا سلسلے وار کہانیوں کے صفحات ضرور کم کریں بے تحاشہ طویل ہوتی ہیں اور ان صفحات کو ہماری تجاویز سے مزین فرمائیں چند اور تجاویز حاضر خدمت ہیں۔ کوئی بھی اچھا سا منفرد سا سفرنامہ ضرور شروع کریں۔ روحانی ڈاک آپ کے مسائل ہمارے مشورے (یہ طب یا ہومیو پیتھی کے ہوں)۔ کسی بھی نمایاں شخصیت کسی بھی طرح کے شعبے سے ہو، حالات زندگی اور انٹرویو ٹائپ۔ چند صفحات سوال وجواب کے مختص ہوں اور جوابات محترم مشتاق احمد قریشی کے ہوں۔ میری کوشش ہے کہ ہر ماہ چند مستقل قاری بناؤں جو نئے افق کو ہر ماہ پڑھیں اور آگے بھی دوستوں کو پیش کریں۔ تمام احباب محفل کو سلام محترم مشتاق احمد قریشی کو خصوصی سلام وآداب، دلی کے بانکے کی طرح کے صفحات ہمیشہ کے لیے مختص کریں، انتہائی دلچسپ اور معلوماتی ہے اور کوئیشنز بھی انعام کے لیے زیر غور رکھیں، شکریہ اللہ حافظ۔

☆ جاوید صاحب اچھی تجاویز اور تعاون کا شکریہ آپ کی تجاویز پر غور کا وعدہ رہا۔

ایم ارشد وفا...... گوجرانوالہ۔ قابل احترام ذی اعلیٰ وقار جناب عمران احمد اور بھائی طاہر احمد قریشی صاحب دعاؤں اور سلام کے گلدستے کے ساتھ حاضر خدمت ہیں۔ قبول فرما کر خدمت کا موقع دیں تو سب سے پہلے بات کی جائے نئے افق کی تو میرے پاس نہ تو وہ الفاظ ہیں اور نہ ہی وہ قلم ہے، جس سے میں اس عظیم پرچے کی محبت کا قرض اتار سکوں۔ پرچہ تو بڑی دور کی بات ہے، ہم اس کے اسٹاف اس کے نگران اس کے مدیر اعلیٰ، مدیر، مدیر معاون، مدیر خصوصی، اس پرچے کی کمپوزنگ والے بھائی جان، سرکولیشن منیجر کے جتنا بھی اس کا اسٹاف ہے وہ سب محبتوں اور دعاؤں کے مستحق ہیں سمجھ میں نہیں آرہا کہ کون سے الفاظ استعمال کروں۔ اگر آپ کو برا نہ لگے تو چند الفاظ میں آپ کی نظر کرنا چاہتا ہوں۔

ان راستوں پر چل کر آسکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں

عقل سے بالاتر سوچوں کو مفلوج کردینے والے اتنے پیارے لوگ سب کو کھلے عام دعوت امیری غریبی کا فرق بھول کر ذات پات رنگ ونسل شکل کو بھول کر راضی خدا کے احکام کو سامنے رکھ کر سب کے دلوں پر قبضہ جمائے جارہے ہیں۔ مجھے ایک بات یاد آگئی ہمارے پیارے نبی پاک کا ارشاد ہے"تم میں سے بہتر وہ ہے، جس کی وجہ سے کسی کا دل نہ دکھے" تو پھر آج میں کیوں نا کہوں کہ آپ دنیا کے ساتھ ساتھ دین میں بھی اعلیٰ مقام حاصل کررہے ہیں۔ تو ذی اعلیٰ وقار اب بات کی جائے شمارے کی ماہ اگست کا شمارہ 20 جولائی کو بندہ ناچیز کے ہاتھوں کی زینت بنا۔ ٹائٹل انتہائی دلپسند تھا دستک اپنے ساتھ بہت سی یادیں چھوڑ گئی۔ گفتگو میں ساحل ابڑو کو انعام ملنے پر ازحد مبارک باد ریحانہ سعیدہ اچھا پیغام لیے حاضر خدمت تھی۔ ابن مقبول، عمر فاروق ارشد، ریاض بٹ میرے لیے کوئی نئے نام نہیں ماشاء اللہ سے چوٹی کے لکھاری ہیں سب، ہم نئے افق کے لکھاریوں کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ اقرا سے دلوں کو راحت بخشی بہت زبردست سلسلہ ہے طاہر بھائی۔ کہانیوں میں کاغذی رشتے بس ٹھیک ہی تھی۔ کہیں کہیں الفاظ کا تسلسل ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا مگر نظر ثانی کرنے والے نے کافی حد تک معیاری بنالیا۔ نظر فریب کچھ سمجھ نہ آئی یہ کس ٹائپ کی کہانی تھی۔ روپ بہروپ اپنے ساتھ کبھی نہ بھولنے والی یادیں اور بہت سے پس منظر چھوڑے اس کے اندر سب کچھ شامل تھا۔ پراسرار بھی، محبت نفرت واردات بہت خوب استاد جی۔ باقی جن اسٹوریوں کے نام نہیں لکھ پایا وہ زیر مطالعہ ہیں۔ ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن سے اس شمارے میں بہت سے لوگوں نے حصہ لیا۔ جوان کے لیے قابل فخر والی بات ہے۔ اگر میرے الفاظ سے کسی کو تکلیف پہنچی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں کیونکہ میرے الفاظ تنقید کے لیے نہیں اصلاح کیلیے ہیں۔ زندگی نے وفا کی تو ان شاء اللہ اب اس کا دامن نہ چھوٹے گا تب تک کے لیے خدا حافظ۔

☆ ارشد وفا یاد آوری کا شکریہ، آپ کو پرچہ پسند آیا یعنی ہماری محنت رنگ لائی، اللہ کا شکر ہے ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہم ایسی کہانیوں کا انتخاب کریں جنہیں پڑھ کر قاری بے ساختہ کہہ اٹھے ویل ڈن پیسے وصول ہوگئے۔ آپ کے بھرپور تبصرے کا انتظار رہے گا۔

سانحۂ ارتحال

بروز جمعرات 6 اگست کو اپنے ایک محنتی اور پرانے کارکن مبارک احمد سے محروم ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ مبارک احمد ذیابیطس کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ ادارہ اور ان کے تمام ساتھی مرحوم کے پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

اللہ

اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی ایک اور صفت شامل آیت ہے۔ ''الباری'' یعنی ہر چیز کا موجد۔ یہ صفتِ الٰہی بھی اللہ تعالیٰ کے خالقیت سے ہی مشترک ہے اور اس کے بعد آنے والی صفت الٰہی ''المصور'' یعنی اپنی تخلیق کردہ مخلوقات کی طرح طرح کی صورتیں بنانے والا کے ہیں۔ یہ صفتِ الٰہی بھی اللہ تعالیٰ کی الخالق صفت سے جڑی ہوئی ہے جب اللہ تعالیٰ اپنی کسی بھی مخلوق کو پیدا کرنا چاہتا ہے یا کچھ ایجاد کرنا چاہتا ہے تو پہلے اس کی شکل وصورت اور اس کے افعال واعمال کا تعین فرمادیتا ہے۔ یہی صفاتِ الٰہی سورۃ الحشر میں بیان کی گئی ہیں جبکہ سورۃ البقرۃ کی آیتِ الکرسی میں بھی صفاتِ الٰہی بیان کی گئی ہیں۔

ان تمام آیاتِ مبارکہ کے ذریعے انسان سوچ اور سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ عالی کیا ہے اس کی قوت اس کا غلبہ واقتدار کیسا ہے اور کس لئے ہے۔ اس حقیقت کے اظہار سے شرک کی بنیادوں پر کاری ضرب لگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم اور خصوصاً ان آیات کے ذریعے اپنی غیر محدود حاکمیت اور اپنے مطلق اختیارات کا تصور پیش کرکے یہ بتادیا ہے کہ اس کی حکومت میں نہ تو کوئی بالاستقلال اس کا شریک ہے اور نہ ہی کسی کا اس کی سلطنت الٰہی میں کسی طرح کا زور چلتا ہے۔ اپنی مصلحتوں کو وہ خود مالک الملک خوب اچھی طرح جانتا ہے۔ انسان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنی آخرت اور دائمی زندگی کی بہتری اور بھلائی کے لئے اللہ کی عطا کردہ رہنمائی پر عمل پیرا ہو کر اپنی دنیا کی مختصر اور عارضی زندگی کو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں اور احکامِ الٰہی کے مطابق بسر کرے اور ہر دم اللہ کی قوت وہیبت اور عظمتِ جلال سے لرزتا رہے۔

اسلام میں سب سے اہم اور بنیادی عنصر اللہ کی ذاتِ حق کی موجودگی کا یقین ہے۔ وہ ذاتِ عالی جو حی ہے قیوم ہے اس کی تمام صفاتِ اعلیٰ ایسے کمالاتِ بے مثال کی حامل ہیں جن میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہوسکتی' وہ ہر ہر طرح سے پاک ہے۔ ایک مسلمان یا مومن کے دل ودماغ میں اللہ جل شانہ کی تعریف بالکل ویسی ہی ہونی چاہئے جیسی کہ خود باری تعالیٰ نے ارشاد فرمائی ہے اور جس کی نبی آخر الزماں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تصدیق فرمائی ہے۔ اہلِ ایمان کو یہ یقینِ کامل ہونا چاہئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ عالی پیکرِ علم وحیات ہے۔ وہی سمیع وہی بصیر ہے' یعنی بہت دیکھنے والا ہے ایسا دیکھنے والا جو اپنی ہر صفت میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس ذاتِ عالی کا ہر حال میں موجود ہونا برحق ہے۔ اس کی موجودگی کا یقین ایسا ہونا' جیسے کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ جس طرح ہم کسی بھی چیز کو دیکھ کر اس کی موجودگی کا یقین کرتے ہیں۔ ایسے ہی اس ذاتِ عالی کا صناع وحکیم ہونے کا یقین یعنی صاحب تدبیر دامر ہونا اپنی نوعیت میں بالکل منفرد' بے مثال اور الگ ہونا۔

مومن کا عقیدہ ایسے تمام شبہات سے پاک صاف وشفاف ہونا چاہئے جس میں اللہ تعالیٰ کی کسی بھی صفتِ عالی کو کسی بھی صورت مخلوقات میں سے کسی سے مشابہت دی جائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے وجود کو کسی بھی طرح مادی ٹھوس وجود کی صورت تصور کرنا یا کوشش کرنا سب قطعی غلط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''مادہ'' چونکہ تغیر پذیر ہوتا ہے۔ جو سکڑتا

پھیلتا ہے۔ مگر اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات اپنی تمام صفات وکمالات میں دائم وقائم ہے اور وہ ذات عالی ہر قسم کے تغیر وتبدل کے عمل سے پاک وصاف ہے۔ اسلام میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں ہر قسم کی تقسیم وتخلیق کا تصور بھی غلط ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے معبود برحق ہونے کے بارے میں اہلِ ایمان کے عقیدے کی اصلاح کے لئے قرآن حکیم میں کھلے کھلے اور صاف الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے۔

ترجمہ: آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے کہ وہ اللہ تعالیٰ ایک (ہی) ہے۔ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے نہ اس سے کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔ (سورۃ اخلاص۔ ۱ تا ۴)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے معبود حقیقی ہونے کے بارے میں قرآن حکیم کی سورۃ الانبیاء میں اس طرح ارشاد فرمایا ہے تاکہ اہل ایمان کے عقیدہ کی اصلاح ہوسکے۔

ترجمہ: کیا ان لوگوں نے زمین (کی مخلوقات میں) سے جنہیں معبود بنا رکھا ہے وہ زندہ کردیتے ہیں (مرنے کے بعد) اگر آسمان وزمین میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور بھی معبود ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہوجاتے۔ پس اللہ تعالیٰ عرش کا رب' ہر اس وصف سے پاک ہے جو یہ مشرک بیان کرتے ہیں۔ (الانبیاء۔ ۲۱۔ ۲۲)

تفسیر: آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ ایسے تمام لوگوں کو مخاطب کرکے دریافت فرمارہا ہے کہ جن جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کے ساتھ کسی بھی طرح اگر کسی اور ہستی کو اپنی عبادات وپرستش یا اپنی دعاؤں میں شامل کرلیا ہے تو ان سے دریافت کیا جارہا ہے کہ جنہیں تم شریک بنارہے ہو کیا ان میں اتنی صلاحیت' قوت ہے کہ وہ تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کردیں؟ اور آگے ارشاد ہورہا ہے کہ اگر واقعی زمین وآسمان میں دو یا زیادہ معبود ہوتے اور نظامِ کائنات میں تصرف کا اختیار رکھتے تو دونوں کا ارادہ وشعور اور اپنی مرضی کارفرما ہوتی' اور جب دو ہستیوں کا ارادہ اور فیصلہ کائنات کا نظام چلاتا تو وہ اس طرح قطعی قائم نہ رہ سکتا اور نہ یوں ابتدائے آفرینش سے بغیر کسی ادنیٰ توقف کے چلتا نہ چلاتا آتا۔ کیونکہ دونوں معبودوں کے ارادے اور خیال کبھی نہ کبھی ایک دوسرے سے ٹکراتے' ان کی مرضی میں تصادم ہوتا' دونوں اپنے اپنے اختیارات ایک دوسرے کی مخالفت میں استعمال کرتے جس کا نتیجہ ابتری وفساد ہوتا اور جب ایسا ہوتا تو سارا نظام کائنات' سارا کا سارا نظام حیات درہم برہم ہوکر بکھر جاتا۔

اس طرح یہ بات بھی صاف اور یقینی ہوجاتی ہے کہ کائنات کا سارا نظام صرف اور صرف ایک ہی عظیم ترین اختیارات واقتدار والی ہستی چلارہی ہے۔ جس کا ارادہ اور مشیت سے ہی جو کچھ ہوتا ہے ہورہا ہے صرف اسی کے حکم سے ہورہا ہے کائنات کا نظامِ حیات اس بات پر دلیل اور حجت ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ ذوالجلال میں اس کا کوئی کسی طرح سے شریک نہیں ہے۔

ترجمہ: یہ ہے اللہ تعالیٰ تمہارا رب! اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں' ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے' تو تم اس کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز کا کارساز ہے۔ (الانعام۔ ۱۰۲)

(جاری ہے)



سرگوشیاں

ڈاکٹر ایم اے قریشی

دنیا کا ایسا کون سا شخص ہوگا جو دوسروں کے ذہن میں جھانکنے اور اس میں پلنے والے خیالات پڑھنے کا خواہش مند نہ ہو. یہ خواہش قبل از تاریخ کے انسانوں میں بھی موجود تھی۔ آئیے ہم آپ کو ایک ایسے شخص سے ملوائیں جو کئی گز دور بیٹھے شخص کے دل میں جھانکنے اور دل ہی دل میں ہونے والی سرگوشیاں سننے کا ماہر تھا.



''تم نے کیا سوچا ہے؟''
''کس بارے میں؟''
''ڈیڈی نے تم سے کہا تھا کہ فٹ بال کھیلنا چھوڑ دو اور انشورنس کا کام شروع کردو۔ اس میں بہت فائدہ ہے۔''

''میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ میں یہ کام نہیں کرسکتا۔ تم اپنے ڈیڈی کو یہ بات سمجھا کیوں نہیں دیتیں؟''

''ٹھیک ہے' جیسی تمہاری مرضی۔''

ہوجو کوئی بہت مشہور فٹ بالر نہیں تھا لیکن اسے اس کھیل سے جنوں کی حد تک لگاؤ ضرور تھا۔ وہ میدان میں مڈل لائن بیکر کی پوزیشن پر دفاع کرتا تھا اس کے بائیں جانب جونی کھیلتا تھا جو اسے ہدایات بھی دیتا جاتا کہ گیند کو کدھر پھینکنا ہے چنانچہ ہوجو' جونی کی رفاقت میں اچھا کھیل لیتا تھا۔

ایک دن ہوجو کو یوں لگا جیسے اس کے بائیں جانب کے لوگ سرگوشیاں کررہے ہوں۔ ان کی باتوں کی آواز مدھم پڑتی جارہی ہے۔ چنانچہ سیزن ختم ہونے پر اسے محسوس ہوا جیسے اس کا بایاں کان بے کار ہوگیا ہے مگر اس نے کسی پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ وہ کسی محفل میں جاتا تو اپنے سر کو ادھر ادھر گھماتا رہتا تاکہ سب کی باتیں سن سکے۔ سوبی کے ساتھ بیٹھتے وقت بھی وہ اس کے بائیں جانب والی نشست پر بیٹھتا تاکہ وہ دائیں کان کی مدد سے اس کی باتیں سن سکے' مگر اب یوں لگتا تھا جیسے یہ معاملہ زیادہ عرصے تک نہیں چل سکے گا' سال کے آخر میں جب سوبی اپنے والدین سے ملنے چلی گئی تو اس نے ڈاکٹر سے معائنہ کرانے کا وقت لے لیا۔

ڈاکٹر شبان' ہنگری کا باشندہ تھا اور اپنے کام میں ماہر جانا جاتا تھا۔ اس نے ہوجو کے کان کو پوری توجہ سے معائنہ کیا۔

''اکثر لوگ بس یہی خیال کرتے ہیں کہ ان کی سماعت ٹھیک ہے حالانکہ ان کے کان میں کوئی نقص پیدا ہوجاتا ہے۔ ویسے تم نے عقلمندی کی ہے کہ بہرے پن کا احساس ہوتے ہی میرے پاس آگئے۔''

پھر ڈاکٹر نے اس سے اس وقت کے بارے میں دریافت کیا جب اس نے ایک کان کی سماعت جاتے ہوئے محسوس کی۔ اس نے مختصراً پوری روداد سنادی۔ اسے تو بس یہ فکر کھائے جارہی تھی کہ وہ کہیں جونی کی ہدایات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم نہ ہوجائے۔ کھیل کے میدان میں ان کا فاصلہ دس گز ہوتا تھا۔ ہوجو چاہتا تھا کہ اس کی آواز بالکل واضح سن سکے ورنہ اس کا مستقبل خطرے میں پڑجائے گا۔ اور پھر لازماً اسے سوبی کے والد کے ساتھ انشورنس کا کام کرنا پڑے گا۔

''مس کیٹی!'' ڈاکٹر نے نرس کو آواز دیتے ہوئے کہا' ''ہم مسٹر ہوجو کا آپریشن کل کریں گے۔''
''ٹھیک ہے' میں سارے انتظامات کررکھوں گی۔''
''لیکن ......!'' ہوجو نے کچھ کہنا چاہا مگر ڈاکٹر شبان نے اسے خاموش کردیا۔
''مطمئن رہو' تمہیں فکرمند ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ بس تم کل تین بجے کلینک پہنچ جانا۔'' یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر کمرے سے باہر نکل گیا۔
''تم خواہ مخواہ گھبرا رہے ہو۔ ڈاکٹر اپنے کام میں اتنا ماہر ہے کہ تم اپنے دوسرے کان کا آپریشن بھی کرانے دوڑے آؤ گے۔'' کیٹی نے ہنستے ہوئے کہا۔



آپریشن کے بعد جب اسے ہوش آیا تو ڈاکٹر کے چہرے سے طمانیت کے آثار ظاہر تھے ''تمہارے کان کی ہڈیاں بہت عجیب اور انوکھی ہیں' میں نے بہت

کچھ دریافت کیا ہے۔ اتنا بہترین آپریشن میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار کیا ہے۔ جی چاہتا ہے تم سے ایک پائی بھی نہ لوں۔"

لیکن دوسرے دن ہوجو کو جب ڈاکٹر کی طرف سے پانچ سو ڈالر کا بل موصول ہوا تو اس کی سٹی گم ہوگئی۔ اسی دن سوئی بھی واپس آ گئی۔ لیکن ہوجو بل کی ادائیگی کر چکا تھا۔ اسے اتنی بڑی رقم ادا کرنے پر ذرا ملال نہ ہوا کیوں کہ اب اس کا بایاں کان بالکل ٹھیک تھا۔ اسے یقین ہوگیا کہ اب وہ پورا سیزن اطمینان کے ساتھ کھیل سکے گا۔



سیزن شروع ہونے سے قبل جب انہوں نے پریکٹس کا آغاز کیا تو ہوجو نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ ہوجو اپنی اس کارکردگی پر خوش تھا۔ جب نمائشی میچ ہوا' تب بھی ہوجو کی کارکردگی مناسب رہی اور اتوار کے روز ہونے والے آخری میچ کے بعد تو کوچ نے اسے باقاعدہ شاباش دی اور اس کے کھیل کی تعریف بھی کی۔

سیزن کا پہلا میچ ختم ہونے میں ابھی چند منٹ باقی تھے کہ ہوجو کی ٹیم اٹھارہ کے مقابلے میں اکیس گول سے جیت رہی تھی۔ اس وقت بہت نازک صورت حال درپیش تھی' تماشائیوں کے پرجوش نعروں سے کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی ہوجو پر پریشانی طاری ہونے لگی۔ اس قدر شور میں اگر وہ جونی کی ہدایت نہ سن سکا تو کیا ہوگا؟ یہ سوال اس کے لیے انتہائی تشویشناک تھا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ اسی لمحے کھیل کی ابتدا ہوگئی' ہوجو نے پوری توجہ سے اپنے کان جونی کی طرف لگا دیے۔ مگر اچانک ہی ہوجو کو اپنے کان میں پیدا ہونے والی تبدیلی کا احساس ہوا۔ تماشائیوں کے فلک شگاف نعروں کے شور میں

مخالف کھلاڑیوں کی آوازیں اس تک پہنچ رہی تھیں۔ مقابل ٹیم کا کھلاڑی جو اس سے پندرہ گز کے فاصلے پر تھا اس کی ہدایت بھی ہوجو کو واضح سنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا' اب میں کنزر پہلو کی طرف کک لگاؤں گا' خدا کے لیے اس پر نظر رکھنا۔"

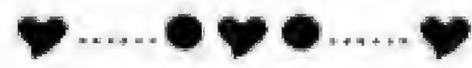
پھر اسی لمحے اس کے کانوں میں جونی کی آواز آئی۔ "یہ سائڈ محفوظ ہے' تم آخری حصے کی طرف لپکو۔" دونوں اطراف سے گیند پر قابو پانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہوجو نے حریف ٹیم کے کھلاڑی کی آواز سنی اور پھر وہ بالکل مشینی انداز میں پیچھے گھوم گیا۔ تماشائیوں کی تالیاں پورے زور سے جاری تھیں۔ اب سارا زور ہوجو کی سائڈ پر تھا' اس نے حملہ آور کھلاڑی بریڈی کا پاس کلیئر کردیا اور اس کے ساتھ ہی کھیل کا وقت ختم ہوگیا۔ ہوجو کی ٹیم جیت چکی تھی۔

لاکر روم میں تمام کھلاڑی ہوجو کی تعریف کررہے تھے۔ کوچ نے کہا۔ "ہوجو! تم نے اب کھیل کی روح کو سمجھا ہے۔" ہوجو کے لیے یہ تعریف اس کے اندازے سے سوا تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ جونی بھی حیران تھا کہ ہوجو نے کس طرح اچانک دفاع کیا ہے۔ خود ہوجو بھی اس بات پر حیران تھا کہ اسے اس طرح محسوس ہوا جیسے اس کے کان میں کسی نے بٹن دبا دیا ہو اور اس نے مخالف ٹیم کے کھلاڑی کا ارادہ بھانپ لیا ہو۔

اگلے اتوار کو حسب معمول ہوجو کھیل میں شریک تھا۔ اسے گزشتہ ہفتے کا بہترین کھلاڑی تسلیم کیا گیا تھا۔ کھیل شروع ہوا تو مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں نے اس کی ٹیم کی پشت پر کافی دباؤ ڈالا۔ اچانک ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی پشت پر کوئی بٹن سا دب گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی مخالف ٹیم کی پوری منصوبہ بندی اس کے ذہن میں واضح ہوگئی تھی۔ اس

نے نہایت چابکدستی سے گیند کلیئر کر دی۔ اس طرح مخالف ٹیم کا حملہ کارگر نہ ہو سکا۔

کھیل ختم ہونے میں صرف دو منٹ رہ گئے تھے اور ہوجو کی ٹیم دس کے مقابلے میں چودہ گول سے جیت رہی تھی۔ مخالف ٹیم کا کھلاڑی ڈیزی پاس لینے میں بہت تیز تھا۔ اس نے میں گز کے فاصلے سے اپنے ساتھیوں کو پوری بات سمجھائی کہ وہ کس طرح گیند کو چھیننے کی کوشش کرے گا۔ ہوجو ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ اس نے اپنی ٹیم کے دوسری کھلاڑیوں کی طرف دیکھا مگر وہ اس آواز سے بالکل بے بہرہ دکھائی دیتے تھے۔ ڈیزی لپک کر آیا۔ اس کا انداز بالکل ایسا تھا کہ وہ کوئی اقدام نہیں کرے گا' وہ فوراً آگے بڑھ کر آیا تاکہ جونی سے پاس چھین سکے مگر ہوجو کو اس کے ارادے کا علم تھا' وہ فوراً آگے بڑھتا چلا گیا اور گیند ہوجو کے قبضے میں آ گئی۔ ہوجو نے زندگی میں پہلی بار کسی پاس میں مداخلت کی تھی۔



اسی ہفتے ایک اخبار میں اس کی تصویر چھپی تھی جس میں اس کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے اور چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ اس تصویر کے ساتھ ہوجو کا تفصیلی انٹرویو چھپا تھا' مضمون کی ہیڈ لائن میں لکھا تھا۔ ''عظیم کھلاڑی'' سوبی نے یہ مضمون اور تصویر کاٹ کر اپنے باپ کو بھیج دی جو اکثر کہا کرتا تھا کہ ہوجو فٹ بال کا اچھا کھلاڑی کبھی نہیں بن سکتا' اس لیے اسے چاہیے کہ میرے ساتھ انشورنس کا کام سنبھال لے۔ ہوجو کی سماعت حیرت انگیز طور پر بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ اس کی سوچوں میں بھی انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ پورا ہفتہ اس کا انہی تجربات سے دوچار ہوتے گزر گیا۔

آج اتوار تھا اور ہوجو کے لیے آج کا دن بہت عجیب و غریب ثابت ہوا۔ میچ کے دوران اس نے نہ صرف مخالف ٹیم کے اشارے واضح طور پر سنے بلکہ اب ان باتوں کا مطلب بھی اس کی سمجھ میں آتا گیا اور پھر ہوجو نے حیرت انگیز طور پر اپنی مقررہ جگہ چھوڑ دی اور گیند کے پہنچنے سے پہلے دوسری جگہ جا پہنچا۔ اس نے دو تین پاس لیے اور دوسروں کے پاسوں میں مداخلت بھی کی۔ ہوجو کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کیونکہ اس سے قبل وہ اس قسم کے کھیل کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس پورے کھیل کے دوران اسے جونی کی کسی بھی ہدایت کی ضرورت نہ پڑی۔ اس نے خود ہی اپنے طور پر کھیل کھیلا۔ میچ ختم ہونے کے بعد کوچ نے پورے کھیل کی فلم دیکھی اور خصوصاً ہوجو کے کھیل اور اقدامات کو تو اس نے سلو موشن میں بار بار دیکھا۔ وہ بار بار فلم کو دیکھتا اور کہتا۔ ''ایک بار پھر'' ہوجو کو یوں لگا جیسے وہ اپنی ٹیم کا ہیرو ہے اور اسے اپنے ساتھیوں کے سامنے مزید نمایاں کیا جا رہا ہے۔ ایسے موقعوں پر کوچ کو حکم ملا تھا کہ کوئی تبصرہ نہ کیا جائے' اس لیے ہوجو اپنے دیگر ساتھیوں کے خیالات سے آگاہ نہ ہو سکا۔

جونہی فلم ختم ہوئی کوچ نے فوراً ہی اسے اشارہ کیا۔

''میرے دفتر میں آؤ۔'' یہ کہہ کر کوچ آگے بڑھ گیا اور ہوجو کا دل ایک نامعلوم اندیشے سے دھڑک اٹھا۔ چند لمحوں بعد وہ کوچ کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی کارکردگی کے ناقص پہلوؤں کے بارے میں ضرور باز پرس ہو گی مگر کوچ بڑے اطمینان سے اپنی قمیص کا کالر ڈھیلا کرنے میں مصروف تھا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' کوچ نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہوجو سے کہا۔

ہوجو ایک لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی چھڑی سامنے رکھ دی۔

''تم نے جب سے اس کلب میں شمولیت کی

ہے میری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ مجھے کہیں سے تمہارا متبادل ملے تو تمہاری چھٹی کردوں۔ اگر مجھے کوئی آدمی عارضی طور پر بھی مل جاتا تو آج تم یہاں نہ ہوتے لیکن خیر اب تو دوسری بات ہے۔ میں اپنی کوشش میں ناکام رہا ہوں جب کہ تم نے مسلسل تین بار ہماری ٹیم کو شکست سے بچایا ہے۔ یہ بات ہمارے لیے جہاں باعث مسرت ہے وہاں کوتاہیاں بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔'' اس کے بعد کوچ نے ہوجو کو ست' نکما اور نہ جانے کیا کچھ کہہ ڈالا۔ ہوجو نے ان سب باتوں کے جواب میں صرف اتنا ہی کہا۔

''آپ نے جو کچھ کہا ہے ممکن ہے درست ہو مگر میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔''

''اب چھوڑو بھی یہ قصہ' چونکہ تم نے ہماری ٹیم کو شکست سے بار بار بچایا ہے اس لیے تمہاری تنخواہ میں ایک ہزار ڈالر فی سیزن اضافہ کررہا ہوں لیکن خبردار جو کسی دوسرے کھلاڑی کے کانوں میں اس کی بھنک بھی پڑی۔''

''ٹھیک ہے جناب! میری زبان اس معاملے میں بندر ہے گی۔ آپ بے فکر رہیں۔'' ہوجو نے کوچ کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر اب یہاں سے چلتے بنو۔'' کوچ نے رکھائی سے اسے چلے جانے کو کہا۔ ہوجو اٹھ کھڑا ہوا تو کوچ نے کہا۔ ''چھڑی مجھے دے دو۔'' ہوجو نے اپنی چھڑی اس کے ہاتھ میں تھمادی۔ کوچ نے اس کے ٹکڑے کرکے پرے پھینک دیا۔ ''مجھے کاہل آدمیوں سے سخت نفرت ہے۔ آئندہ تمہارے ہاتھ میں چھڑی نہیں ہونی چاہیے۔''

اتوار کے دن کھیل شروع ہوا تو مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں نے انتہائی جارحانہ انداز اختیار کیا۔ ہوجو نے حسب معمول ان کی باتوں پر اپنے کان لگادیئے۔

مگر کہیں سے کوئی آواز یا اشارہ سنائی نہ دیا۔ اس کی نظر کوارٹر بیک کے ہلتے ہوئے لبوں پر تھی۔ پھر ہوجو کو اچانک یوں لگا جیسے وہ مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں کے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات سن رہا ہو......

کوارٹر بیک نہ جانے کیا کرنا چاہتا تھا۔ مگر ہوجو کو اس کے ایک ایک قدم کا اندازہ تھا چنانچہ ہوجو نے آگے بڑھ کر گیند کو روکا اور مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں کے پاس میں مداخلت کی۔ اچانک ہوجو کی گردن پر مخالف ٹیم کے کھلاڑی کا گھٹنا لگا اور پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

ہوجو کو ہوش آیا تو وہ ایک بینچ پر پڑا تھا۔ ڈاکٹر اس کو طبی امداد دے رہا تھا۔ اس کی گردن کا ایک مہرہ اپنی جگہ سے کھسک گیا تھا۔ اس لیے وہ کھیل کے قابل نہیں رہا۔ جب ہوجو کی ٹیم ایک گول سے ہار گئی تو کوچ کو اس کی اہمیت کا احساس ہوا مگر اس وقت تک وہ طیارے میں بیٹھا واپسی کا سفر کررہا تھا۔

برابر کی نشست پر چند افراد پوکر کھیل رہے تھے۔ انہوں نے ہوجو کو بھی کھیلنے کی دعوت دی جسے اس نے قبول کرلیا۔ اگرچہ اس کی گردن میں کافی تکلیف تھی تاہم وقت گزاری کے لیے یہ ایک اچھا مشغلہ تھا۔ ہوجو اس طرح اپنے تکلیف دہ لمحات کی گود سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا ہوجو بہت حیران ہوا کہ اس کے ذہن میں اس طرح خیالات آرہے تھے جیسے کوئی سرگوشیاں کررہا ہو۔ کینس اس کے بائیں جانب بیٹھا تھا۔ ہوجو کو یوں محسوس ہوا جیسے کینس اس کی طرف جھک کر اسے تمام پتے بتارہا ہے۔ اس طرح کھیل کے اختتام پر ہوجو تیس ڈالر جیت چکا تھا۔

یہ خیال رہ رہ کر اسے ستانے لگا کہ وہ دھوکے باز ہے۔ اور وہ یہ سارے فوائد سرگوشیوں سے حاصل کررہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگا۔ اسے یوں محسوس کرنے لگا جیسے اس نے کینس سے تیس ڈالر نہیں جیتے

بلکہ اس کی جیب کاٹی ہے۔ اس خیال کے ساتھ اس کا دھیان آج کے کھیل کی طرف چلا گیا۔ اس نے اس بار بھی مخالف ٹیم کے اشاروں کی مدد سے کھیل کا اندازہ بھانپ لیا تھا لیکن جب وہ ٹیم میں شامل نہ رہا تو نتیجہ مختلف نکلا۔ اس نے سوچا کہ وہ پوکر کھیلنا ترک کر دے گا تاکہ اس کی ذات سے کسی کو مالی نقصان نہ پہنچے مگر فٹ بال' وہ تو اس کا پیشہ تھا۔ اس کی گزر اوقات کا ذریعہ۔ اسے وہ کیونکر چھوڑ سکے گا؟

ہوجو کو یہ باتیں بہت پریشان کرنے لگیں اس کا تعلق ایک کٹر مذہبی گھرانے سے تھا۔ اس نے نہ تو کبھی سگریٹ پیا تھا اور نہ ہی شراب کو ہاتھ لگایا تھا اس کے علاوہ آخرت پر بھی یقین رکھتا تھا۔

طیارے سے اتر کر وہ سیدھا گھر نہیں گیا کیونکہ سوبی اپنی ایک بہن کی شادی میں شکاگو گئی ہوئی تھی۔ کینس ایک ماہر پوکر کھلاڑی تھا۔ اس نے ہوجو کے علاوہ دو اور آدمیوں کو بھی کھیلنے کی دعوت دی۔ وہ سب ایک بار میں آگئے یہاں بہت بھیڑ تھی اور ایک طوفان بدتمیزی برپا تھا۔ ہر طرف رنگین مزاج لڑکوں کے گرد سنہرے بالوں والی دوشیزائیں منڈلا رہی تھیں ہوجو کے لیے یہ ماحول بالکل اجنبی تھا تاہم وہ کینس کے پیچھے عقبی کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ برابر کی ایک میز پر چند آدمیوں کے ساتھ کچھ لڑکیاں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک لڑکی بالکل نوخیز تھی' یوں لگتا تھا جیسے اس کلی کو ابھی تک کسی نے بھی اپنے کالر میں نہیں سجایا' اس کے باوجود وہ شگفتہ پھول کی طرح مہک رہی تھی۔

"آخاہ! یہ معصوم صورت لڑکا آج میرا مہمان رہے گا" اس نے ہوجو کو دیکھتے ہوئے اونچی آواز سے کہا۔ اس نے آواز کی سمت نظر دوڑائی تو ایک سنہرے بالوں والی لڑکی مسکراتی نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

ہوجو کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس لڑکی کے خیالات سن رہا ہے۔ "لڑکے! آج رات میں تمہیں ایک نئی دنیا کی سیر کراؤں گی۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔" ہوجو نے اس کے ذہن کی آواز سنتے ہی لڑکی کی طرف دوبارہ گھور کر دیکھا۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا لیکن لڑکی مسکرائے جا رہی تھی۔

ہوجو اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکا' لڑکی کی بے حد تیز نظریں اس کے جسم کے پار ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ بھاگ کر عقبی کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر گر گیا۔ ویٹر لپک کر اس کے پاس آیا۔

"بوربن!" ہوجو نے ہانپتے ہوئے آرڈر دیا۔

"بہت خوب! ہوجو کیا بات ہے؟ تم نے آج تک جنجر سے زیادہ تیز شراب کبھی نہیں پی آج بوربن طلب کر رہے ہو' خیریت تو ہے۔" کینسن نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

ویٹر گلاس لایا تو اس نے ایک ہی سانس میں اپنے حلق میں اتار لیا مگر بوربن کا تلخ ذائقہ اس کے وجود کی حدت کم نہ کر سکا۔ اس نے ایک اور گلاس منگوایا اور غٹا غٹ پی گیا لیکن اب بھی اس کے اعصاب قابو میں نہیں تھے۔ اسے رہ رہ کر لڑکی کی وہ باتیں یاد آنے لگیں جو ہوجو نے اس کا ذہن پڑھ کر معلوم کی تھیں۔ یہ سوچ کر اس کے اعصابی تناؤ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس کے اعصاب پھر جواب دینے لگے اور اس نے ایک اور بوربن منگوائی اس کی نگاہیں اٹھیں تو سامنے میز کے قریب وہی لڑکی کھڑی تھی۔ سویٹر سے اس کا سراپا ابلا پڑ رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی ہوجو کے حلق میں شراب کا گھونٹ اٹک کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور بدن حدت کے مارے چٹخنے لگا۔

"پیارے! تم کس کا انتظار کر رہے ہو اب تو رات بھی کافی ہو چکی ہے۔" لڑکی سے نظریں ملتے ہی ہوجو

کو یوں لگا جیسے اس کی سوچ آواز کی صورت میں منتقل ہوگئی ہو۔

اس نے بوربن کا گلاس ختم کرتے ہوئے پریشانی سے سوچا۔ ”اف میرے خدا میں تو بلانوش بنتا جارہا ہوں۔“ اس بار بوربن نے اس کے اعصاب پر واقعی کوئی اثر نہیں کیا تھا۔

”میں تو اب گھر چلوں گا۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“ ہوجو نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ کینس اور اس کے ساتھیوں سے اجازت لے کر باہر کی طرف بڑھا۔ بار کے قریب پہنچ کر اس کے قدم آپ ہی آپ تیز ہوگئے گویا وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہو۔ اس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ اب دوبارہ اس لڑکی کی طرف نہیں دیکھے گا۔ کیونکہ اس کی سوچیں ہوجو کے سینے میں آگ سی لگا رہی تھیں۔

جب وہ باہر نکلا تو بارش ہو رہی تھی اور دور دور تک کوئی ٹیکسی نہ تھی۔ ابھی اس نے کسی سمت بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ اس کی پشت پر بار کا دروازہ اتنی تیزی سے آ ٹکرایا کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور ہوگیا۔ وہی لڑکی دروازے میں کھڑی تھی گویا وہ بھی جانے کے لیے باہر نکلی ہو۔ اس نے بھی ٹیکسی کی تلاش میں سڑک پر نظر دوڑائی مگر اتنی تیز بارش میں ٹیکسی کہاں مل سکتی تھی۔

”تمہاری کار کہاں ہے مسٹر......؟“ اس نے ہوجو کے قریب آ کر بے باکی سے کہا کہ وہ حیران رہ گیا۔ اس کم عمری میں یہ طور طریقے......

اسی دوران ایک ٹیکسی آ کر رکی تو وہ دونوں ایک ساتھ ٹیکسی کی طرف لپکے۔ ”کیا تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو گی۔“ ہوجو نے لڑکی کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

”اوہ تم کس قدر پیارے ہو۔“ یہ کہتے ہی وہ دروازہ کھول کر ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

♥......●♥●......♥

......صبح کے وقت جب ہوجو اپنے گھر جا رہا تھا تو زندگی میں پہلی بار اس نے شدت سے محسوس کیا کہ کاش وہ کیتھولک گھرانے میں پیدا ہوا ہوتا اور کسی پادری کے سامنے اعتراف گناہ کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا۔

♥......●♥●......♥

گھر پہنچ کر وہ ناشتے کی تیاری میں مصروف تھا کہ سوبی کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کے والدین نیویارک کی سیر کو جا رہے ہیں اور اسے بھی اپنے ساتھ لے جانے کے لیے مصر ہیں۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید ہوجو اسے وہاں رکنے کی اجازت نہ دیتا' لیکن اب تو وہ خود نئی دلچسپیوں میں مصروف ہوگیا تھا لہٰذا اس نے سوبی سے کہا۔

”ٹھیک ہے ہنی! تم اپنے ممی ڈیڈی کے ساتھ چلی جاؤ' ان چھٹیوں کا خوب لطف اٹھاؤ اور جب تک جی چاہے وہیں رہو۔ میں تمہاری تفریح میں حارج نہیں ہونا چاہتا۔“

”اوہ ہوجو! تم کتنے پیارے ہو' میرا کس قدر خیال ہے تمہیں' میں خوشی سے کہیں بے ہوش نہ ہو جاؤں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔“ سوبی مارے خوشی کے پاگل ہو رہی تھی۔ ہوجو نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

اپنی بیوی کا والہانہ پن ہوجو کے رگ و پے میں مسرت بن کر چھا گیا۔ اس کے انگ انگ میں محبت کا جذبہ کروٹیں لینے لگا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے ابھی ابھی سوبی کو چاہنے کی ابتدا کی ہو مگر جب اپنے کرتوتوں کی طرف دھیان گیا تو اس نے اپنا سر دیوار پر دے مارا۔ مارے درد کے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ”اب میں اس لڑکی کے قریب بھی نہیں پھٹکوں گا۔ کیا نام ہے اس کا' ہاں یاد آیا سلویا' کتنی بری

ہے وہ آدمی بھی بعض اوقات کس قدر بچ حرکات کرتا ہے کیا ہوا جو سوبی یہاں نہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی تو نہیں کہ میں ادھر ادھر بھٹکتا پھروں۔

اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک بہت بڑے ڈبل بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور اس کے قریب سلویا کا دمکتا ہوا سراپا بے سدھ پڑا تھا۔

کمرے میں ہلکی ہلکی سی روشنی تھی اس نے سر گھما کر بیڈ سائڈ کی گھڑی میں دیکھا صبح کے چار بج رہے تھے۔ آج تو اس کی پریکٹس کا دن تھا اور اسے دس بجے وہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ ایک گھنٹے بعد اس نے اپنی سانسوں کو ترتیب دیتے ہوئے اس کا بازو ہلایا اور اپنے جانے کے بارے میں اطلاع دی۔

"جار ہے ہو پیارے اچھا گڈ نائٹ! آج خود کو ان وحشی کھلاڑیوں سے بچا کے رکھنا احتیاط سے کھیلنا...... کہیں زخمی نہ ہو......" وہ نیند میں کہے جا رہی تھی۔ "اور ہاں! سویٹ آج شام جب آؤ تو ایک چھوٹا سا تحفہ تو لیتے آنا...... سینوورڈ اسٹریٹ پر ماٹر کے ہاں بہت اچھے تحفے ملتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا! اچھا گڈ نائٹ! میں تمہارا انتظار کروں گی۔" پھر وہ کروٹ بدل کر نیند کی وادیوں میں گم ہو گئی۔

اور جب رات کی تاریکی میں ہوجو واپس اپنے گھر جا رہا تھا تو اسے سلویا کی فرمائش یاد آئی۔ "یہ لڑکیاں بھی کتنی جذباتی ہوتی ہیں اظہار محبت کے لیے چھوٹی چھوٹی چیزوں کو کتنی اہمیت دیتی ہیں۔ خواہ پھول یا مٹھائی کے پیکٹ ہی کیوں نہ ہوں۔" اسے سنیفورڈ اسٹریٹ ماٹر کی دکان یاد نہیں آ رہی تھی۔ "ہو سکتا ہے یہ کوئی ٹافیوں یا مٹھائی کی دکان ہو۔" اس نے سوچا کہ وہ سلویا کے لیے پانچ پونڈ کا پیکٹ لے جائے گا خواہ اس کی کتنی ہی قیمت کیوں نہ ہو۔

سہ پہر کو جب ہوجو سنیفورڈ اسٹریٹ میں ماٹر کی دکان تلاش کر رہا تھا تو تھکاوٹ سے اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ اچانک ہی اس کی نظر ایک شیشے کی کھڑکی پر پڑی جس پر "ماٹر" لکھا ہوا دکھائی دیا۔ یہ ٹافیوں یا مٹھائی کی نہیں بلکہ زیورات اور ہیرے جواہر کی دکان تھی۔

ہوجو دکان میں داخل نہیں ہوا بلکہ وہ سیدھا چلتا گیا اور ایک مٹھائی کی دکان سے پانچ پونڈ چاکلیٹ کا ڈبا خرید لیا...... پندرہ ڈالر ادا کرنے کے بعد جب کلرک اس کے پیکٹ پر ایک چمکدار کاغذ لپیٹ رہا تھا تو ہوجو اس فضول خرچی پر دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔

آج کی رات ہوجو سلویا کے اپارٹمنٹ میں دس منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہر سکا کیونکہ سلویا کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ اس نے ٹافیوں کا پیکٹ کھولنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی لیکن دوسرے دن وہ پریکٹس سے واپسی پر سیدھا ماٹر کے ہاں گیا اور اس نے تین سو ڈالر کا سونے کا بریسلیٹ خریدا۔ "مجھے تم جیسے دوست ہی پسند ہیں۔" بریسلیٹ دیکھتے ہی سلویا کھل اٹھی اور اس کی بانہیں ہوجو کے گلے کا ہار بن گئیں۔

تین سو ڈالر کوئی معمولی رقم نہ تھی لیکن سلویا کی ہستی میں کشش ہی کچھ ایسی تھی کہ وقتی طور پر وہ بے خود سا ہو گیا تھا۔ رقم ادا کرتے وقت بھی اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا لیکن اب تو یہ سلسلہ چل نکلا تھا۔ بہر حال کوئی نہ کوئی بندوبست تو ہونا ہی چاہیے۔ اچانک ہی اسے کینس یاد آ گیا۔ اس کے ہاں ہر منگل کو پوکر کھیلی جاتی تھی اور اتفاق سے کل منگل تھا۔ ہوجو نے ادھر ہی کا رخ کیا اور تین گھنٹے کے اندر چار سو سولہ ڈالر جیت لیے۔ اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار اتنی خطیر رقم ایک ہی رات میں جیتی تھی۔ یہ رقم اسے اپنی مخفی صلاحیت کی بنا پر حاصل ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ دھوکے بازی ہے لیکن سلویا کا سر درد دور کرنے کے لیے اسے یہ سب کچھ

کرنا پڑ رہا تھا۔



جمعے کے دن سوبی واپس آ گئی۔ اسے اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ جمعے کی رات کو ہوجو لیونگ روم میں کاؤچ پر سوتا تھا تاکہ اتوار کے کھیل کے لیے اس کی توانائی بحال ہو جائے۔ اسے خدشہ تھا کہ سوبی اس کے بدلے بدلے انداز اور کھلنڈرے پن کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے گی اور پھر اس کا فطری جذبہ تجسس اسے سوچنے پر مجبور کر دے گا لیکن وہ تو اپنی روداد سنانے میں مصروف رہی اور متشکرانہ نگاہوں سے ہوجو پر نثار ہوتی رہی جس نے اسے چھٹیوں سے بھرپور لطف اٹھانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ کافی دیر تک اپنی روداد سناتی رہی اور ہوجو پوری توجہ سے اس کی رام کہانی سنتا رہا پھر وہ سونے کی تیاری کرنے لگے۔

اگلی صبح جب سوبی اس کے لیے ناشتے کی ٹرے لے کر آئی تو اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگا۔ اتنی وفاشعار بیوی تو شاید ہی کسی کو ملی ہوگی۔ چنانچہ وہ اس کی چاہت کے نشے میں سرشار پریکٹس کے فوراً بعد ماٹر کے ہاں جا پہنچا اور پچاسی ڈالر کی ایک موتیوں کی زنجیر خریدی۔ سوبی کے لیے یہ تحفہ شب عروسی کے تحائف سے زیادہ خوشی کا باعث بنا۔

اتوار کا دن بھی ہوجو کے لیے بہت خوش کن ثابت ہوا' بے پناہ شور کے باوجود اپنے کان میں آنے والی آوازوں پر عمل کرتا رہا۔ اس نے مخالف ٹیم کے ایک کھلاڑی کے پاس میں مداخلت کی اور جب بال اس کے کنٹرول میں آ گئی تو اس نے میدان پر ایک نگاہ ڈالی' میدان کا دایاں حصہ اسے بالکل خالی نظر آیا۔ اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں دیر نہیں کی۔ وہ بال لے کر آگے بڑھا اور گول کے قریب پہنچ کر اس نے ایک زوردار کک لگائی' بال گول کے اندر جا گری'

اس کامیابی نے نہ صرف اس کی ٹیم کو جتوا دیا بلکہ یہ اس کی کھیل کی زندگی کا پہلا گول تھا۔ تماشائیوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور بہت دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ یہ کھیل کا آخری لمحہ تھا۔ اس کے اس گول نے اس کی ٹیم کو فتح سے ہمکنار کر دیا تھا۔

کھیل ختم ہوتے ہی اسے ٹیلی ویژن کے نمائندوں نے گھیر لیا اور وہ اسے ایک عارضی اسٹوڈیو میں لے گئے جو عمارت کے ایک کمرے میں بنایا گیا تھا۔ اس کا انٹرویو شام کی نشریات میں دکھایا گیا' اس کے دوستوں نے اس کی بہت تعریف کی کیونکہ اسکرین پر وہ کچھ زیادہ ہی حسین لگ رہا تھا۔

اب اس کی زندگی ایک نئے دور میں داخل ہو چکی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے پیچھے تمام دروازے بند کرتا ہوا ایک بہتر جگہ پر آ گیا ہو۔

ہر ہفتے اس کی تصاویر کے ساتھ اخبارات میں اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مضامین چھپتے۔ اخباری نمائندے اس سے ملاقات کے لیے آگے پیچھے پھرتے رہتے' وہ اس سے سوالات کرتے کہ تمہاری کامیابی کا راز کیا ہے؟ تو وہ مسکرا دیتا۔ ''میری کامیابی کا راز بس یہی ہے کہ میں اپنے مقابل آنے والے کھلاڑیوں کی تکنیک کا پورا مطالعہ کرتا ہوں۔ کیونکہ فٹ بال لیگ ایسی جگہ نہیں جہاں محض اندازے سے کام چلایا جائے۔''

صرف اسی پر بس نہیں' اب تو مختلف اشتہاری کمپنیوں نے اس کی شہرت اور ساکھ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی ایک اشتہاری فلمیں بنا ڈالیں جن میں وہ ہیئر کریم' سویٹر' غسل کے لباس میں لوگوں کو مصنوعات کی طرف راغب کرتا اور اپنی پسند کا اظہار کرتا۔ بعض اوقات وہ تنہائی میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتا کہ امریکہ میں ایک معمولی سی مسکراہٹ

کے ذریعے بھی کس قدر روپیہ کمایا جا سکتا ہے۔

اسپورٹس السٹریٹڈ کے ٹائٹل پر اس کی تصویریں چھپتیں' فٹ بال گراؤنڈ کے داخلی دروازے پر لڑکوں کا ہجوم اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اکٹھا ہو جاتا' کئی منچلے تو اس کے آٹوگراف لینے کے لیے فٹ بال آگے بڑھا دیتے۔ ٹیکسی ڈرائیور اگر اسے پہچان لیتا تو مارے عقیدت کے اس سے کرایہ تک وصول نہ کرتا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ سوبی کے ساتھ کسی ریسٹورنٹ میں گیا اور ادائیگی کے وقت جب اس نے چیک دیا تو منیجر نے مسکراتے ہوئے چیک پھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اب تو اس نے شیمپئین بھی پینا شروع کر دی تھی۔

اس کی شہرت یہاں تک بڑھی کہ کھیل کے سپر اسٹار بروس فیلون نے بھی اسے اپنے گھر آنے اور برج کھیلنے کی دعوت دی۔

چنانچہ بروس' اس کی بیوی نورا' ہوجو اور سوبی رات گئے تک بروس کے شاندار لیونگ روم میں برج کھیلتے رہے۔ ہوجو کے کان بیدار تھے اور وہ ان کی آوازوں پر پوری توجہ دے رہا تھا۔ جب کھیل ختم ہوا تو ہوجو آٹھ سو ڈالر جیت چکا تھا۔

''میں نے لوگوں سے تمہاری پوکر کا شہرہ تو سنا تھا مگر آج پتہ چلا کہ تم پتوں کے بادشاہ ہو۔'' بروس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

جب وہ بروس کا دیا ہوا آٹھ سو ڈالر کا چیک اپنی جیب میں ڈال کر گھر جانے کے لیے اٹھا تو نورا نے اس سے کہا کہ کیوں نہ ہر ہفتے یہاں ایسی محفل سجائی جائے' ہوجو اس کی تجویز پر اتفاق کرتے ہوئے مکان سے باہر آ گیا۔

انہی دنوں سوبی نے اسے خوشخبری سنائی کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ ہوجو تو شادی کے فوراً بعد ہی بچے کی خواہش کرنے لگا تھا لیکن سوبی کا خیال تھا...... کہ فی الحال انہیں اس نعمت سے گریز کرنا چاہیے۔ اب پتہ نہیں کیا بات ہوئی کہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہوجو کو بچوں کی نعمت سے محروم نہیں رہنے دے گی۔ ہوجو بہت خوش تھا' ایک نامعلوم سے احساس کے تحت اس کے لبوں پر ہر دم مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ تاہم وہ قیمتی جواہرات سے مرصع نیکلس لانا نہ بھولا' جسے اس نے سوبی کے گلے میں ڈالتے ہوئے ہزاروں بلائیں لے ڈالیں۔

بروس پیدائشی جوہری تھا۔ اس نے ہوجو کی مہارت سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں غور کیا اور اسے بتایا کہ شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں ہفتے میں ایک بار بڑے پیمانے پر پوکر کھیلی جاتی ہے۔ جس میں شہر کے بڑے بڑے صنعت کار حصہ لیتے ہیں۔ اتنے بڑے لوگوں کے ساتھ پوکر کھیلنے سے نہ صرف لطف دوبالا ہو گا بلکہ رقم بھی زیادہ ہاتھ آئے گی۔ جب بروس اسے اپنے ساتھ ہوٹل کے اس مخصوص سویٹ میں پہنچا تو میز پر رقم کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور دھوئیں کے مرغولے پورے کمرے میں تیرتے پھر رہے تھے۔ بروس بہت لالچی آدمی تھا۔ اس نے ہوجو کے ساتھ پہلے ہی معاملہ طے کر لیا تھا کہ وہ جو کچھ جیتیں گے' اس کا آدھا آدھا آپس میں تقسیم کر لیں گے اور اگر اتفاق سے ہار گئے تو بھی نصف نصف نقصان میں بھی شریک ہوں گے۔

ہوجو اسے غیر اخلاقی حرکت سمجھتا تھا کیونکہ اس طرح دوسروں کو دھوکا دینے والی بات تھی کہ انہیں ان کے خفیہ معاہدے کا کوئی علم نہ تھا۔

میز کے گرد بیٹھے ہوئے آدمیوں نے جب بروس اور ہوجو کو دیکھا تو وہ ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ ابھی کھیل شروع نہیں ہوا تھا۔ بروس نے جو تعارف کرایا تو انہوں نے بڑی گرمجوشی سے اس سے

مصافحہ کیا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ’’ہمارے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ فٹ بال کا ایک معروف کھلاڑی ہمارے ساتھ کھیلنے آیا ہے۔ اور ایک دوسرے آدمی نے جب ہوجو کے لیے کہا جانے والا مشہور فقرہ ’’گیند میری طرف پھینک دو ہوجی!‘‘ کہا تو تمام لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے ہوجو بھی دبی دبی آواز کے ساتھ ہنس پڑا۔

وہ رات کے دو بجے تک کھیلتے رہے۔ ہوجو نے چھ ہزار بیس ڈالر اور بروس نے ایک ہزار ایک سو پچھتر ڈالے جیتے۔ وہ اپنی گاڑی نہیں لائے تھے لہٰذا ہوٹل سے باہر نکلتے ہی انہوں نے ٹیکسی لے لی۔ راستے میں بروس نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

’’ہوجو! کیا تم نے سیف ڈپازٹ باکس لے رکھا ہے؟‘‘

’’نہیں!‘‘ ہوجو نے مختصر جواب دیا۔

’’تو پھر ایسا کرو کہ دن نکلتے ہی تم ایک سیف ڈپازٹ باکس لے لو۔‘‘

’’وہ کس لیے؟‘‘ ہوجو پوری بات جاننا چاہتا تھا۔

’’انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے۔‘‘ بروس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ’’تم نہیں جانتے انکل سام کو سب پتہ چل جاتا ہے۔‘‘ اس نے آہستہ سے کہا۔ ’’صبح ان چیکوں کو بھنا کر تمام رقم سیف ڈپازٹ باکس میں منتقل کر دینا اور ہاں ایک بات کا خاص طور سے خیال رکھنا‘ یہ باکس تم اپنے بینک میں نہ لینا‘ کسی دوسرے بینک کا رخ کرنا۔‘‘ بروس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

’’ٹھیک ہے‘ میں ایسا ہی کروں گا۔‘‘

ٹیکسی نے پہلے ہوجو کو اس کے گھر پر اتارا۔ پھر آگے بڑھ گئی۔ وہ اپنے گھر میں داخل ہوا۔ سوبی بستر پر خرگوش کے مزے لے رہی تھی۔ وہ بستر پر دراز

ہو گیا۔

اگلے ہفتے جب انہوں نے پوکر کھیلی تو ہوجو کچھ زیادہ رقم نہیں جیت سکا۔ اس نے کچھ بے ایمانی سے بھی کام لینے کی کوشش کی تھی اور پھر بڑی دلیری کے ساتھ داؤ پر داؤ لگاتا چلا گیا حالانکہ اسے علم تھا کہ مقابل بیٹھے ہوئے آدمی کے پاس زیادہ بہتر پتے ہیں۔ آخر کار وہ صرف دو ہزار ڈالر جیت سکا' جب کہ بروس نے پانچ سو ڈالر ہار دیے۔ یہ قسمت کا کھیل تھا' وہ ایک دوسرے کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے تھے۔

کھیل ختم ہونے کے بعد گاڑیوں کے ڈیلر کونرس نے ہوجو کو تھوڑی دیر ٹھہرنے کے لیے کہا اور وہ نیچے اتر کر لابی کے ایک سنسان گوشے میں جا بیٹھے۔ کونرس نے اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اسپورٹس کار کی ایک ایجنسی کھول رہا ہے' اور ہوجو کا نام استعمال کرنا چاہتا ہے۔

"اس سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا' بس ہفتے میں دو ایک بار سہ پہر کو آ جایا کرنا' پورچ میں تمہاری تصویر آویزاں رہے گی اور اس کے عوض میں تمہیں ایک سال میں دس ہزار ڈالر ادا کروں گا۔"

ہوجو نے مسکراتے ہوئے اپنا سر کھجایا اور ذرا سا گھوم کر اپنا بایاں کان کونرس کی طرف کر دیا۔ کونرس اپنے ذہن میں سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے پچیس ہزار ڈالر دینا پڑیں تو بھی برا نہیں۔

"میں سال کے پچیس ہزار ڈالر لوں گا اور منافع میں سے دس فیصد اس کے علاوہ ہوں گے۔ اگر منظور ہو تو ٹھیک ہے۔" ہوجو نے کہا۔

کونرس ہنس پڑا۔ "کہیں تم نے میرا ذہن تو نہیں پڑھ لیا۔" اس نے ہوجو سے ہاتھ ملایا اور اگلے دن سے اس کی ملازمت شروع ہو گئی۔

پوکر کھیلنے والوں میں سے ہارٹ رائٹ جو ریس کے گھوڑوں کا مالک تھا اس نے بھی ہوجو کو بلا بھیجا اور راز داری کی قسم دیتے ہوئے کہا کہ وہ اور اس کے کچھ ساتھی شہر کے مضافات میں ایک سپر مارکیٹ تعمیر کرنے کے لیے زمین خرید رہے ہیں اور اندرون خانہ معلومات کے مطابق شہر سے ایک ہائی وے نکالی جا رہی ہے جو اتفاق سے اس زمین کے پاس سے گزرے گی۔

"تمہارے لیے یہ زمین سونے کی کان ثابت ہو گی۔" رائٹ نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔ "میں نے دوسرے لوگوں سے بات کی ہے اور ہم سب کا متفقہ خیال ہے کہ یہ زمین خرید لو۔ اگر تمہارے پاس اتنی رقم نہیں ہے تو ہم تمہیں قرض بھی فراہم کرنے کو تیار ہیں۔"

خوش نصیبی گویا ہوجو کے قدم چوم رہی تھی۔ اس نے پچاس ہزار ڈالر قرض لے کر وہ زمین خرید لی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے لوگ اس پر دولت اور عنایات کی بارش کر کے خوش ہوتے ہوں۔ یہاں تک کہ سوبی کے ڈیڈی نے بھی اس کی شہرت سے متاثر ہو کر اعلان کیا کہ وہ ہوجو کے ہاں بچے کی خوشی میں انہیں آٹھ کمروں کا ایک نیا مکان لے کر دے گا اور اس میں سوئمنگ پول بھی ہو گا اور یہ رہائش گاہ شہر کے بہترین حصے میں ہو گی۔

آئندہ ہفتوں میں ہوجو کے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا۔ اخبارات میں ایک بار پھر ہوجو کی ٹیم کا تذکرہ ہونے لگا کیونکہ ان کی ٹیم چیمپئن شپ کے لیے مقابلہ کرنے والی تھی۔ ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ اسی روز بروس اور ہوجو دونوں زخمی ہو گئے۔ بروس کی کہنی کا جوڑ سرک گیا جبکہ ہوجو کے سر کی ہڈی مضروب ہوئی تھی اس بنا پر ہوجو کھیل میں شریک نہ ہو سکا۔ اس کی ٹیم ہار گئی۔

واپسی پر وہ جہاز میں بھی اس صورت حال سے خاصا دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ کوچ بھی اپنی سیٹ پر بیٹھا منہ بسور رہا تھا۔ پھر اچانک ہی ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس سے اس کے ذہن پر سوار فٹ بال دور ہو گیا۔

اس کے بائیں کان میں بڑی واضح آواز آ رہی تھی۔ کوئی مرد بول رہا تھا۔ ''وی ایچ ایف نمبر ایک خراب ہو گیا ہے۔'' فوراً ہی ایک دوسری آواز آئی۔ ''وی ایچ ایف نمبر ۲ بھی خراب ہو گیا اور ہمارا ریڈیو رابطہ منقطع ہو چکا ہے۔''

ہوجو نے اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ کچھ لوگ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کچھ کتابیں رسالے وغیرہ پڑھ رہے تھے اور بعض لوگ اونگھ رہے تھے۔

''یہ تو بہت برا ہوا۔ یہاں سے فاؤنڈ لینڈ تک دھند چھائی ہوئی ہے۔'' ہوجو نے کیپٹن کی آواز پہچان لی جو تشویش آمیز لہجے میں اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔ اس نے پردہ ہٹا کر دیکھا باہر گہری تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہوجو نے احتیاطی تدبیر اختیار کرتے ہوئے اپنی سیٹ بیلٹ باندھ لی۔

کیپٹن نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اپنے دوسرے ساتھیوں کو صورت حال سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ''خدا کا شکر ادا کرو کہ ہم بھٹکنے سے بچ گئے اب اگر تم میں سے کسی کو نیچے امریکہ کا کوئی علاقہ نظر آ جائے تو میرے کندھے کو چھو کر اشارہ کر دینا۔''

مسافروں کے حصے میں مکمل سکون تھا۔ کوئی بھی آدمی مضطرب یا بے چین نظر نہیں آتا تھا انہیں طیارے کی خرابی کا کوئی علم نہ تھا۔

کاک پٹ کا دروازہ کھلا اور ایک ہوسٹس باہر نکلی۔ اس نے اپنے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجا رکھی تھی تاکہ چہرے پر طاری دہشت کا مسافروں کو علم نہ ہو سکے۔ وہ اسی طرح مصنوعی مسکراہٹ سجائے طیارے کے آخری حصے کی جانب بڑھتی چلی گئی اور ایک سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ کوئی بھی مسافر اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تو اس نے چپکے سے سیٹ بیلٹ باندھ لی۔

طیارے نے ذرا سا غوطہ کھایا تو تمام مسافر اپنی گھڑی دیکھنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ دس منٹ کے اندر اندر طیارہ زمین پر اتر جائے گا۔ اسی لمحے مسافروں والے حصے میں لگے ہوئے اسپیکر سے کیپٹن کی آواز آنے لگی۔ ''میں طیارے کا کیپٹن بول رہا ہوں' مجھے افسوس ہے کہ ہمیں نیچے اترتے ہوئے تھوڑی تاخیر ہو جائے گی' کیونکہ سامنے سے تیز ہوا چل رہی ہے۔ آپ حضرات سے درخواست ہے کہ سیٹ بیلٹ باندھ لیں۔'' اس کے ساتھ ہی طیارے میں ہلکی سی کلک کی آواز ابھرنے لگی۔ تمام مسافر اپنی اپنی پیٹیاں باندھ رہے تھے۔ یہ آخری آواز تھی جو ہوجو کے کانوں میں آئی کیونکہ اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔



شاید اس کے دائیں کان میں کچھ درد سا اٹھا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ طیارہ اب آہستہ آہستہ زمین کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے پردہ ہٹا کر باہر دیکھا' اب وہ بادلوں سے بہت نیچے تھے' شاید زمین کا فاصلہ اب چار سو گز رہ گیا تھا کیونکہ نیچے روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو حیران رہ گیا۔ طیارہ تین گھنٹے کی تاخیر سے لینڈ کر رہا تھا۔

طیارے کے تمام مسافر تیار ہو چکے تھے اور زمین پر اترنے کے منتظر تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ کس

قدر خوش قسمت ہیں۔ اس تلخ حقیقت کے احساس کے ساتھ ہی ہوجو کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے کہ اگر طیارہ کسی حادثے سے دوچار ہوجاتا تو زمین پر گرتے ہی ان کے چیتھڑے اڑ جاتے۔

طیارہ زمین پر اتر چکا تھا۔ مسافر اطمینان سے باہر آنے لگے۔

"مجھے امید ہے کہ آپ کا سفر خاصا خوشگوار گزرا ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگوں کو کچھ دیر ہوگئی ہے۔ اچھا خدا حافظ۔" کیپٹن کی آواز مسافروں کو الوداع کہہ رہی تھی لیکن وہ سب اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ کیپٹن کے ساتھ وہ تمام موت کے جبڑوں سے سلامت واپس آ گئے ہیں۔ سفر کے دوران ہوجو کی سماعت تمام کیفیات اور مراحل گویا دیکھ رہی تھی۔ اسے بہت حیرانی ہوئی کیونکہ سیٹ سے کاک پٹ کا فاصلہ کافی تھا اور پھر طیارے میں لوگوں کی باتوں اور انجن کا ہلکا ہلکا شور بھی شامل تھا۔ اس کے باوجود وہ سب کچھ بڑی آسانی سے سنتا رہا تھا۔



سوبی اپنے رشتے داروں سے ملنے فلوریڈا گئی ہوئی تھی۔ اس نے سلویا سے کہا تھا کہ وہ واپس آتے ہی سیدھا اس کے پاس آئے گا۔ ہوجو نے ٹیکسی لی اور سلویا کے گھر کی طرف چل دیا۔ میچ ہارنے اور طوفان میں گھرے طیارے کی صعوبتوں کو یاد کرتے ہوئے اس کا دھیان پھر سلویا کی طرف چلا گیا۔ اگرچہ وہ بہت مہنگی تھی لیکن وہ اپنے مشغلے میں مہارت رکھنے کی وجہ سے ہوجو کے لیے بہت پرکشش تھی۔

اس نے گھنٹی بجائی تو کافی دیر کے بعد سلویا نمودار ہوئی۔ اس کے چہرے پر کبیدگی کے آثار دیکھ کر ہوجو سمجھ گیا کہ اسے آج پھر "سر درد" شروع ہوگیا ہے۔ اس نے ہوجو کو اندر بھی نہیں آنے دیا' ذرا سا دروازہ کھول کر اس سے کہا۔ "میں نیند کی گولیاں کھا کر بستر میں لیٹی ہوئی تھی' مجھے نیند آ رہی ہے کیونکہ میں بہت تھک گئی ہوں۔"

"اوہ! ہنی" ہوجو کے منہ سے کراہ سی نکل گئی۔ وہ کیا کیا امیدیں اور خواب لے کر آیا تھا مگر یہ سلویا تو بالکل مختلف لگ رہی تھی جس نے اس کے ساتھ سیدھے منہ بات بھی نہیں کی۔ اس کے نائٹ گاؤن سے اٹھتی ہوئی خوشبو نے ہوجو کے دل میں آگ سی بھر دی تو وہ بے تابانہ دروازے کی طرف آگے لپکا۔

"رات بہت ہو چکی ہے' اور پھر تم کس قدر تھکے تھکے سے نظر آ رہے ہو۔" سلویا نے فوراً دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "تم اس وقت گھر جا کر سو جاؤ۔" اور پھر ہوجو نے دروازے میں زنجیر لگنے کی آواز سنی' اس کا مطلب تھا کہ آج رات وہ سلویا کے فلیٹ میں گھس بھی نہیں سکتا۔ سلویا کے اس رویے سے مایوس ہو کر وہ پلٹا اور سڑک پر آ کر اس نے بڑی بے چارگی سے ایک نظر اپارٹمنٹ کی جانب دیکھا۔ جو چوتھی منزل پر واقع تھا۔ اس کی کھڑکی سے پردوں کے پیچھے سے روشنی کی ایک باریک سی لکیر باہر آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ سلویا سو نہیں رہی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا تھا۔ شدید سردیوں کی رات میں اس نے ہنسی کی آواز سنی۔ ہوجو کا بایاں کان اس آواز کو پوری طرح سن رہا تھا۔ یہ ہنسی یہ قہقہہ بھرپور اور گرمجوشی کا مظہر تھا جس کو سن کر وہ غصے سے بل کھانے لگا۔

اس کے قدم اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگے مگر وہ اسقدر دل برداشتہ اور پریشان تھا کہ اپنے پیچھے آنے والی ایک سیاہ کار کو نہ دیکھ سکا جو اس کے پیچھے شروع سے لگی ہوئی تھی۔ گھر پہنچ کر اس نے ایک کاغذ' پنسل لی اور اب تک سلویا پر جتنی رقم خرچ کی تھی اس کی تفصیلات لکھنے لگا۔ اس نے حساب لگایا تو کل رقم

ساڑھے تین ہزار ڈالر بنی۔ ہوجو نے کاغذ پھاڑ کر ٹوکری میں پھینک دیا اور بستر میں لیٹ گیا۔ اسے ٹوٹ کر نیند آئی۔

اگلے روز پریکٹس کے دوران بارش ہونے لگی تو ہوجو کا پاؤں پھسل گیا اور برف ملی مٹی میں لتھڑ گیا۔ اسے بہت غصہ آیا کہ اس نے فٹ بال کا پیشہ کیوں اپنایا تھا؟ تھوڑی دیر بعد جب وہ شاور کے نیچے نہاتے ہوئے اپنی ڈاڑھی سے کیچڑ صاف کر رہا تھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اسے غور سے دیکھے جا رہا ہے۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو دوسرے شاور کے نیچے ٹیم کا فل بیک کروکر کھڑا نظر آیا جو سر پر صابن ملتے ہوئے ہوجو کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ رقصاں تھی پھر اچانک ہوجو نے کروکر کی سمت سے ایک قہقہے کی آواز سنی جس سے وہ بے چین ہو گیا۔ ''یہ آواز تو اس نے کل رات بھی سنی تھی۔'' ہوجو نے سوچا۔ یوں لگتا تھا جیسے کروکر نے وہ ہنسی اپنے ذہن میں ٹیپ کر لی ہو اور اپنی مرغوب موسیقی کی طرح بار بار اس کو دہرا رہا ہو۔

''ہوں، تو یہ کروکر تھا۔'' ہوجو کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ کل رات جب وہ سلویا کے اپارٹمنٹ سے نیچے آ کر سڑک پر کھڑا ہوا تھا تو یہی قہقہہ اسے سنائی دیا تھا۔ ''اسی وجہ سے وہ اپنی ٹیم کے ساتھ بھی نہیں گیا تھا۔'' ہوجو کو ایک بات یاد آ رہی تھی۔ وہ ہر اتوار کو غائب ہو جاتا ہے جب کہ اس کے دوسرے ساتھی سردھڑ کی بازی لگا کر میچ جیتنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

گرتے ہوئے پانی کے شور میں اس نے ایک بار پھر کروکر کے ہنسنے کی آواز سنی اور اس کے منہ سے بے ساختہ گالی نکل گئی۔ وہ لاکر روم سے نکلنے کے لیے جلدی جلدی تیار ہو گیا مگر جب وہ دروازے سے باہر نکلنے لگا تو ٹریننگ انچارج نے اسے بلا لیا اور کہا۔ ''تمہیں کوچ بلا رہا ہے۔''

ہوجو، کوچ پرونتو کو کچھ زیادہ اچھا نہیں سمجھتا تھا کیونکہ اس کا مزاج دوسروں سے کافی مختلف تھا۔ وہ پرونتو کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہ دروازے کی طرف پیٹھ کیے بیٹھا تھا۔ ''دروازہ بند کرو، ہوجو۔'' اس نے مڑے بغیر کہا۔

ہوجو نے دروازہ بند کر دیا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' کوچ نے بڑے خشک لہجے میں کہا۔ اس کی پشت ابھی تک ہوجو کی طرف تھی اور وہ دیوار پر لگی ایک معروف فٹ بالر کی تصویر کو گھور رہا تھا۔ ہوجو ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

''ہوجو! میں تم پر دو سو پچاس ڈالر جرمانہ کر رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' جیسے وہ پہلے ہی اس بات کی توقع کر رہا ہو۔ کوچ نے ایک جھٹکے سے کرسی سیدھی کی اور گھوم کر اپنا چہرہ ہوجو کی طرف کر لیا اور اپنا کالر ڈھیلا کرتے ہوئے بولا۔ ''ہوجو! کیا تم کاؤنٹ را کی کے پاس بھی گئے ہو؟''

''جناب! میں تو اسے جانتا بھی نہیں ہوں۔''

''ہوں، تو پھر یہ بتاؤ کہ تم کئی راتوں سے صبح تک کہاں رہتے ہو۔ تمہاری نگرانی کی جاتی رہی ہے، ہوجو! جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرنا۔'' کوچ نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

ہوجو کو یاد آ گیا کہ رات کو اسے متعدد مرتبہ اپنے پیچھے ایک سیاہ کار نظر آئی۔ اس کا دھیان فوراً سوبی کی طرف گیا تو ہوجو بجھ کر رہ گیا۔ ہوسکتا ہے اسے مجھ پر شک ہو گیا ہو لیکن اس کے پاس کسی سراغ رساں کی خدمات حاصل کرنے کے لیے اتنی رقم آخر کہاں سے آئی؟ ہوجو انہی خیالات میں کھو کر رہ گیا۔

کوچ کا ہتھوڑے جیسا ہاتھ زور سے میز کی سطح پر ٹکرایا تو ہوجو کو اچانک ہوش آ گیا کہ وہ کوچ کے سامنے بیٹھا ہے۔ ''کیا سوچ رہے ہو بدکردار بھیڑیے؟''

ہوجو بوکھلا گیا۔ ''نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''بکواس بند کرو۔'' کوچ دہاڑا۔

''ٹھیک ہے جناب!'' ہوجو نے گویا ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ بڑی مشکل میں گرفتار تھا کہ ان باتوں کا اب کیا جواب دے۔

''یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا بلکہ معاملہ بہت بڑھ گیا ہے اور ہمیں یہ اطلاع کمشنر کے دفتر سے موصول ہوئی ہے۔''

ہوجو کے سینے میں اٹکی ہوئی سانس ایک لمبی سی آہ کے ساتھ خارج ہوئی۔ گویا اس کے دل پر سے ایک بوجھ اتر گیا ہو۔ کیونکہ وہ سوبی پر شک کر رہا تھا۔ اس نے سوبی کے بارے میں کس قدر غلط رائے قائم کی تھی۔

''کمشنر اور اس کا عملہ ایک عرصے سے تمہاری سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے ہے کیونکہ ان کا کام ہی یہی ہے کہ کھیل کو اس قسم کے اسکینڈلوں سے پاک رکھا جائے۔ اس تمام عرصے میں میں ان کے ساتھ رہا ہوں اور سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس لیے ان کی طرف سے غلطی کا کوئی بھی امکان نہیں۔ اچھی طرح کان کھول کر سن لو کہ میں اپنے کلب میں کسی بدکردار کھلاڑی کو...... برداشت نہیں کرسکتا۔'' کوچ کی باتیں اس کے کانوں میں پگھلتے ہوئے سیسے کی طرح اترتی جارہی تھیں۔

''کوچ!'' ہوجو نے بالآخر کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''بکواس بند کرو۔'' کوچ نے اسے ڈانٹ کر خاموش کردیا۔ ''جب کوئی تم جیسا بدمعاش کھلاڑی یکے بعد دیگرے اچھے کھیل کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے تو کمشنر بورڈ کے ارکان اس پر شک کرنے لگتے ہیں کہ اس کی سرگرمیوں اور کارکردگی کا محرک کیا ہے؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی میز کی دراز کھینچی اور ایک فائل میز پر ڈال دی اور عینک لگا کر پڑھنا شروع کردیا۔ ''یہ رپورٹ کمشنر آفس کی طرف سے ہے۔'' پھر اس نے چند باتوں پر نظر ڈالی اور حیرت سے اپنا سر ہلایا۔ ''تمہاری اس بے راہ روی سے متعلق ایسی باتیں ہیں کہ اخلاقی طور پر مجھے پڑھنا زیب نہیں دیتا لیکن گزشتہ اتوار کے بعد تم نے جس انداز سے اپنی چھٹیاں گزاری ہیں ان پر مجھے انتہائی حیرت ہے۔''

اب ہوجو کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا کیونکہ اس کی ایک ایک مصروفیت کوچ کے علم میں تھی۔ لہٰذا اس نے خاموش رہنے ہی میں عافیت جانی۔

''شاید تم اس معاملے میں بھی خوش قسمت ثابت ہوئے ہو کیونکہ یہ کاغذات ابھی تک اخبار والوں کے ہاتھ نہیں لگ سکے ورنہ تمہارا استارہ ڈوب چکا ہوتا لیکن اگر کسی وجہ سے اس کا ایک لفظ بھی لوگوں کو معلوم ہوگیا تو میں تمہاری وہ درگت بناؤں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔''

''میں سمجھ گیا ہوں جناب! آپ بے فکر رہیں، میں پوری طرح احتیاط برتوں گا؟'' ہوجو نے منمناتے ہوئے کہا۔

کوچ نے اپنی میز پر رکھے ہوئے کاغذات کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور کہنے لگا۔ ''تم کھیل میں مشہور ہونے کے ساتھ خواتین میں بھی بے حد مقبول ہو اور بیش قیمت زیورات میں بھی تمہاری دلچسپی بڑھتی

جارہی ہے۔ صرف اس شہر میں دو ماہ سے بھی کم مدت میں تم نے ایک دکان سے تین ہزار ڈالر سے زیادہ مالیت کے زیورات خریدے ہیں۔ اسی دوران تم نے آٹھ کمروں اور سوئمنگ پول والا ایک خوبصورت مکان خریدا' اپنی بیوی کو چھٹیوں کے دوران مہنگی تفریح کے لیے ملک کی سیر پر بھیجا اور پچاس ہزار ڈالر کی جائیداد اس کے علاوہ خریدی' معلوم ہوا ہے کہ تم شہر کے نامور جواریوں کے ساتھ بڑے وسیع پیمانے پر تاش کھیل رہے ہو اور ایک سیف ڈپازٹ باکس میں ہر ہفتے خاصی رقم جمع کر رہے ہو' ہوجو! میں جانتا ہوں کہ تمہاری تنخواہ کتنی ہے' اس کے باوجود تمہاری یہ عیاشیاں اور سرمایہ کاری کیا مجھے یہ تحقیقات کرنے سے باز رکھ سکتی ہیں کہ حال ہی میں کسی بیرونی ذریعے سے تمہاری آمدنی میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے؟"

کوچ نے فائل بند کر کے اپنا چشمہ اتارا اور کرسی سے ٹیک لگا کر خاموش ہو گیا۔ ہوجو نے وضاحت کرنے کے لیے منہ کھولنا چاہا مگر الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ جن باتوں کو وہ ایک دلچسپ کھیل اور زندگی کی مسکراتی بہار سمجھ رہا تھا' اب اس کے خلاف بدعنوانی اور ناجائز منافع کا ثبوت بن کر اس نیلی فائل میں محفوظ ہو گئی تھیں جو کوچ کی دراز میں پڑی تھی۔

"ہوجو! مجھے صرف ایک بات بتاؤ' اور اگر مجھے پتہ چل گیا کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے تو......" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ "تم جواریوں سے کس طرح معلومات حاصل کر رہے ہو؟"

ہوجو مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا۔ اس نے آج تک کبھی اس امکان پر غور نہیں کیا تھا۔ ذلت کے احساس سے اس کے منہ سے سسکی سی نکل گئی۔

"میں اپنی ممی کے سر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے آج تک کسی جواری سے بات بھی نہیں کی۔"

"مجھے تمہاری ممی کے سر کی ضرورت نہیں۔"

ہوجو کی ہچکیاں تھم گئیں تو اس نے جانے کی اجازت دیتے ہوئے کوچ نے کہا۔ "ایک بات یاد رکھنا تم ہر وقت نگرانی میں ہو۔ محتاط رہنا۔"

ہوجو نے اپنی آنکھیں اچھی طرح پونچھ لیں اور جلدی سے کوچ کے دفتر سے باہر آ گیا۔

وہ سڑکوں پر آوارہ اور بے مقصد گھومتا رہا۔ کوچ سے ہونے والی گفتگو نے اس کا موڈ غارت کر دیا تھا اور وہ ناخوشگوار باتیں اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھیں لیکن اس کا ذہن بار بار ان باتوں کی طرف مڑ جاتا تھا' پھر اچانک ہوجو کے قدم خود بخود سٹی ہال کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں پولیس کا ہجوم تھا کیونکہ ایک لڑکے نے اپنا ڈرافٹ کارڈ جلا دیا تھا اور بہت سے لوگ نعرے بازی میں مصروف تھے۔ بالآخر پولیس نے پکڑ دھکڑ شروع کی تو ہوجو سب سے پہلے قابو میں آ گیا۔ اسے عدالت میں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اتفاق سے برونسکی وہاں موجود تھا جس کی سفارش کام دے گئی ورنہ آج کی رات اسے جیل میں رہنا پڑتا۔ مجسٹریٹ نے اس پر ایک تیکھی نگاہ ڈالی ......اور ناگواری سے بڑبڑانے لگا مگر ہوجو کا بایاں کان ایسے موقعوں پر خوب کام کرتا تھا۔ اس نے مجسٹریٹ کی باتیں سن لیں۔ اس کا جواب دینے کے لیے وہ اپنا منہ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ پاس کھڑے برونسکی نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"یہ مقدمہ ختم کیا جاتا ہے۔" مجسٹریٹ کی آواز آئی اور برونسکی اسے گھسیٹ کر باہر لے آیا۔

"شریف آدمی! تمہیں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو خیریت گزری کہ میری ان سے جان پہچان ہے ورنہ کل کے اخبارات میں صفحہ اول پر تمہاری خبر چھپتی اور پھر تمہیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔"

''ہوں تو یہ رشوت کا بازار گرم ہے۔'' ہوجو نے سوچا پھر اس کا ذہن خود بخود کڑیاں ملاتا چلا گیا۔ اس نے اخبارات اور عدالتوں کی باہمی بدعنوانیوں کی جو داستانیں سن رکھی تھیں' ان کو نہ صرف آنکھوں سے دیکھ لیا بلکہ اس کا شکار بھی ہوا۔

سوبی ہفتے کے دن فلوریڈا سے واپس آ گئی' ہوجو اسے لینے کے لیے ایئرپورٹ پر موجود تھا۔ طیارے سے اترتے ہوئے وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس نے نیا فرکوٹ پہن رکھا تھا جو اس کے والد نے اسے خرید کر دیا تھا۔ ہوجو نے اپنے سر کی چوٹ چھپانے کے لیے ہیٹ پہن لیا تھا۔ اگرچہ اس نے کبھی ہیٹ نہیں پہنا تھا تاہم اسے یقین تھا کہ سوبی اس اچانک تبدیلی کو محسوس نہیں کر سکے گی۔ اس کا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ گھر پہنچ کر بھی سوبی نے اس کے زخم کی طرف نہیں دیکھا حالانکہ یہ اتنا بڑا تھا کہ سر کے درمیان بالکل واضح نظر آ رہا تھا مگر وہ فلوریڈا کی سیر کے متعلق باتیں کرتی رہی۔

سوبی نے اس سے کہا کہ آج گھر ہی ڈنر کر لیں کیونکہ وہ بہت تھک گئی ہے۔ چنانچہ ہوجو نے اپنے تمام پروگرام منسوخ کر دیئے۔ نو بجے تک وہ تمام کاموں سے فارغ ہو گئے۔ سوبی نے انگڑائیاں لینی شروع کر دیں اور پھر لباس تبدیل کرنے کے لیے چلی گئی۔ ہوجو نے بستر ٹھیک کرنا شروع کر دیا اور نئے غلاف تبدیل کرنے لگا۔ ابھی وہ تکیے کا غلاف بدل رہا تھا کہ سوبی واپس آ گئی لیکن وہ دروازے ہی میں رک گئی۔

''آج ہفتے کی رات ہے' سوبی۔'' ہوجو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا وہ آج بھی بے انتہا پرکشش نظر آ رہی تھی حالانکہ وہ صرف گاؤن پہنے ہوئے تھی لیکن اس کے باوجود پتہ تک نہیں چلتا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ چونکہ وہ ایک عرصے سے ہفتے کی رات مکمل آرام کرنے میں گزارتا چلا آ رہا تھا اس لیے وہ منہ پھیر کر سو گیا۔



آج کا وعظ بھی اتفاق سے جنس اور تشدد کے موضوع پر تھا کیونکہ دنیا میں یہی دو چیزیں اہمیت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ ہوجو کو یہ وعظ بہت پسند آیا آج کے معاشرے میں وہ جس قسم کی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کرتا تھا وعظ میں نہایت صراحت سے بیان کی گئی تھیں۔

جذباتیت کے موضوع پر بات کرتے ہوئے وعظ کا انداز یکسر بدل گیا اور وہ مزے لے لے کر معاشرے کی خرابیوں کی نشاندہی کرنے لگا۔ اس نے کہا ہمارے معاشرے میں بہت سی برائیاں جڑ پکڑ چکی ہیں جن کی وجہ سے جنسیات میں بے راہ روی کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے۔ بک اسٹالوں پر مختلف جنسی رسالے' بچوں کی جنسی تعلیم' برتھ کنٹرول' اسی قسم کی بہت سی چیزیں' برائیوں کے اضافے کا باعث بن رہی ہیں صرف یہی نہیں مخلوط تعلیم ...... نہانے کے لباس' منی اسکرٹ اور اسی قسم کی تمام چیزیں معاشرے کے زوال میں معاون ثابت ہو رہی ہیں۔

ہوجو نے یہ باتیں پوری شرح و بسط کے ساتھ انتہائی اطمینان سے سنیں' اس کا دل خوشی کے جذبات سے لبریز تھا کیونکہ وہ اخلاقیات کا درس لینے کے ارادے سے چرچ میں آیا تھا۔ واعظ نے دعا مانگنی شروع کی تو اس کے ہر دو ایک فقروں کے بعد ہوجو صمیم قلب سے باآواز بلند ''آمین'' کہہ کر اس کا ساتھ دینے لگا۔

پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ ہوجو کا بایاں کان بیدار ہو گیا اور بڑی معنی خیز آواز اس کی سماعت

کو چھونے لگی۔ ہوجو نے فوراً پہچان لیا کہ یہ آواز واعظ کی ہے۔ واعظ سوچ رہا تھا کاش تیسری قطار میں' بائیں جانب چوتھی نشست پر بیٹھی ہوئی لڑکی ہفتے کی شام کو روحانی تسکین حاصل کرنے کے بہانے میرے پاس آجایا کرے۔ ہوجو کے ذہن میں مذہبی اور گھٹیا خیالات کی آوازیں گڈمڈ ہونے لگیں اور پھر اس نے واعظ کی مزید سوچیں سنیں۔ ''اور پانچویں قطار میں بیٹھی ہوئی مسز...... کیا نام ہے تمہارا' اس وقت یاد نہیں آرہا...... دعاؤں کی کتاب پڑھتی رہتی ہو اور نن بننے کا پروگرام بنا رہی ہو...... مجھے معلوم ہے کہ جب تمہارا شوہر گھر پر نہیں ہوتا تو تمہیں کون سی بات ستاتی ہے۔ کاش تم اپنی ذاتی ڈائری میں میرا خفیہ فون نمبر بھی لکھ لو اور کبھی کبھی مجھے طلب کرلیا کرو۔''

ہوجو عجیب سی کوفت محسوس کرنے لگا۔ واعظ بہت باتونی تھا' اس کی زبان پر مذہبی باتیں تھیں لیکن اس کا ذہن اپنے حقیقی خیالات کا اظہار کررہا تھا۔

ہوجو وہاں تماشا نہیں بننا چاہتا تھا کیونکہ واعظ کے خیالات سن کر اس کا جی چاہا کہ ایک سیکنڈ بھی وہاں نہ رکے مگر وہ اپنی کیفیت پر قابو نہ پاسکا اور غصے کے عالم میں اپنا بایاں کان پیٹ ڈالا جو اس قسم کی ناقابل برداشت باتیں اسے سناتا رہتا تھا۔ اس کے کان میں سائیں سائیں ہونے لگی اور وہ کچھ نہ سن سکا۔ بے شمار لوگ ایک ساتھ ہوجو کی طرف دیکھنے لگے' انہوں نے ہوجو کے تھپڑ کی آواز سن لی تھی اور ناپسندیدہ نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔ اس کے کان میں گھنٹوں کا شور تھما تو وعظ ختم ہوچکا تھا اور واعظ دعائیں پڑھ رہا تھا۔ اس نے بڑی بے دلی سے دعا میں حصہ لیا' مگر اب اس کا دھیان چرچ کی موسیقی میں نہیں تھا بلکہ اسے اپنی والدہ کا فونوگراف یاد آگیا جس پر وہ موسیقی کے ساتھ بھی دعائیں سنا کرتا تھا۔

محبت

کبھی کبھی زندگی اس قدر مشکل ہوجاتی ہے کہ جینے کا تصور بھی خوفزدہ کردیتا ہے' کبھی ایسا وقت بھی آجاتا ہے کہ زندگی ایسے لوگوں سے جاٹکراتی ہے جو ہماری منزل نہیں بن سکتے' لیکن وہی لوگ آنکھوں میں اس طرح سماجاتے ہیں کہ ہم انہیں نکالنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔

زین الدین...... کراچی

ابھی دعا ختم نہیں ہوئی تھی کہ ہوجو بیزار ہونے لگا۔ خیالات کے تضاد نے اسے سخت بدل کردیا تھا' اب اس کے لیے ایک پل رکنا بھی دشوار تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو تمام لوگ حیرانی سے اسے دیکھنے لگے لیکن وہ کسی کا خیال کیے بغیر اٹھ کر چلا آیا۔



وہ کافی دیر تک گھنٹی بجاتا رہا مگر کوئی جواب نہ ملا تو اس کی جھنجلاہٹ عروج پر پہنچ گئی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تم اندر موجود ہو' دروازہ کھول دو ورنہ میں دروازہ توڑ دوں گا۔'' کوئی جواب نہ آنے پر وہ کندھے کی ضرب سے دروازہ توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر کسی نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

''یہ کیا ہورہا ہے؟'' مس کیٹی اندر سے برآمد ہوئی اور اس کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی کیونکہ وہ اندر کی طرف لپکا تھا۔

''اتوار کے روز کلینک بند رہتا ہے۔''

''لیکن آج بند نہیں رہے گا۔'' ہوجو نے مشتعل ہوتے ہوئے کہا۔ اور کیٹی کو پرے دھکا دیا۔ وہ ایک طرف لڑھک گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہوجو نے کسی خاتون کے ساتھ گستاخی کی تھی۔

''وہ رومانیہ گیا ہوا ہے۔'' کیٹی نے اس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اسے فوراً خیال آگیا

کہ شاید اسے ڈاکٹر سے ملنا ہو۔

''اسے میں رومانیہ کی سیر کراؤں گا۔ مجھے اس کا پتہ بتاؤ۔'' ہوجو نے چیختے ہوئے کہا اور کھلے دروازے سے اندر کی طرف دوڑا۔ کیٹی اس کے پیچھے لپکی۔

جب اس نے چوتھا دروازہ عبور کیا تو وہ ایک لائبریری میں تھا اور ڈاکٹر شبان ایک کرسی پر بیٹھا مطالعے میں مصروف تھا۔

''اوہ! مسٹر ہوجو!'' ڈاکٹر شبان نے چہکتے ہوئے کہا۔ ''خیریت تو ہے کیسے آنا ہوا؟''

''میں تم سے بہت سی باتیں کرنے آیا ہوں۔'' ہوجو نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔

''کیا تم دوسرے کان کا بھی آپریشن کرانا چاہتے ہو؟'' ڈاکٹر شبان نے انتہائی نرمی سے پوچھا۔

ہوجو نے آگے بڑھ کر ڈاکٹر شبان کا گریبان پکڑ کر اسے اوپر اٹھالیا۔ ڈاکٹر سبان دیکھنے میں کافی موٹا تازہ لگتا تھا مگر اس کا وزن صرف ایک سو چالیس پونڈ تھا۔ ''مجھے کان کا آپریشن نہیں کروانا۔'' ہوجو نے زور سے بولتے ہوئے کہا۔

''کیا میں پولیس کو طلب کروں؟'' کیٹی نے فون پر ہاتھ رکھا اور ڈاکٹر شبان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ہوجو نے ڈاکٹر کو چھوڑ دیا تو وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گرا لیکن پھر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ ہوجو نے ٹیلی فون اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ عام حالات میں وہ کسی کی ذاتی اشیا کو ہاتھ تک نہیں لگاتا تھا مگر اس وقت وہ غصے میں پاگل ہورہا تھا۔

''کیا تمہارا کان دوبارہ خراب ہوگیا ہے جو یوں شور مچا رہے ہو مگر مجھے اس کا یقین نہیں کیونکہ میں نے آج تک جتنے بھی آپریشن کیے ہیں وہ کامیاب رہے ہیں اور کبھی کسی کو شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ ویسے تم پریشان نہ ہو میں ابھی دیکھے لیتا ہوں۔''

ہوجو نے ایک ہاتھ سے ڈاکٹر شبان کا گلا پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے کیٹی کو پرے دھکا دیا۔ ''میری بات دھیان سے سنو تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے اس کی تفصیل بھی سن لو۔'' ہوجو نے کہا۔

''میرا دم گھٹ رہا ہے خدا کے لیے گردن تو چھوڑ دو۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ہوجو نے اس کی گردن چھوڑ دی۔

''میرے نوجوان دوست! اطمینان سے بتاؤ کہ تم کس وجہ سے پریشان ہو۔'' ڈاکٹر نے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اس سے کہو باہر چلی جائے۔'' ہوجو نے کیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کیونکہ وہ باتیں...... کسی عورت کی موجودگی میں نہیں بتائی جاسکتی تھیں۔

''مس کیٹی! پلیز......'' ڈاکٹر شبان نے کہا۔

''وحشی!'' کیٹی نے پھنکارتے ہوئے کہا اور دروازہ کھول کر باہر چلی گئی اور دروازہ بند کردیا۔

ڈاکٹر ہوجو کی پہنچ سے باہر نکل کر میز کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔ ''میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ تمہارا کان بہت شاندار طریقے سے کام کررہا ہے۔''

''شاندار طریقے پر!'' ہوجو کو ڈاکٹر کے ساتھ اپنی زیادتی کا اب افسوس ہورہا تھا۔

''اب تو تم اپنی ٹیم کے اشارے بہت واضح طور پر سن لیتے ہو گے کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''کاش! میں صرف یہی کچھ سن سکتا۔'' ہوجو نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔

''اوہ!'' خوشی کے مارے ڈاکٹر کا چہرہ کھل اٹھا۔

''تمہاری سماعت عام لوگوں سے زیادہ بہتر ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ تمہارے کان کی ساخت غیر معمولی طور پر مختلف ہے۔ میں نے ایک جگہ پر معمولی سی صفائی کرکے فالتو مادہ کاٹ دیا تھا...... تمہارا ایسزن

نہایت شاندار رہا نا!''

''سیزن جائے جہنم میں۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

''میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو میں جو کچھ کرسکتا تھا' وہ تمہاری بہتری کے لیے کیا اور اس کا صلہ تم نے یہ دیا کہ آتے ہی میرا گلا گھونٹ کر مارنے کی کوشش کی۔ کیا تم اس بات کی وضاحت کروگے؟''

''میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ تم نے میرے ساتھ کچھ زیادہ ہی بھلائی کرڈالی ہے لیکن مجھے یہ بتاؤ تم نے طبی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟ کیا تم کانگو میں پڑھ کر آئے ہو؟''

ڈاکٹر شبان تن کر کھڑا ہوگیا۔ ''میں نے کارنیل میڈیکل اسکول میں پڑھا ہوں۔'' اس نے فخریہ انداز میں کہا۔ ''اب تم مجھے یہ بتادو کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔''

''میں چاہتا ہوں کہ تم میرے کان کو پہلے والی حالت میں واپس کردو۔'' ہوجو نے کہا۔

''کیا تم دوبارہ بہرے ہونا چاہتے ہو؟'' ڈاکٹر نے اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! میں دوبارہ بہرا ہونا چاہتا ہوں۔''

ڈاکٹر شبان سر جھٹک کر رہ گیا۔ ''میرے عزیز دوست! میں ایسا نہیں کرسکتا کیونکہ ایسا کرنا طبی اصولوں کے منافی ہے۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا کہ میں نے تمہیں بہرا بنادیا ہے تو پورے امریکہ میں مجھے کبھی پریکٹس کرنے کی اجازت نہیں ملے گی۔''

''مجھے اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ تم کہاں کے گریجویٹ ہو تمہیں میری بات ماننا پڑے گی۔''

''مسٹر ہوجو! تم حد سے بڑھتے جارہے ہو۔'' ڈاکٹر نے کہا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دراز سے ایک کاغذ اور پین نکال کر سامنے رکھا اور کہنے لگا۔ ''اب

تم اطمینان سے مجھے تمام حالات بتاؤ تاکہ میں تمہارے متعلق کوئی فیصلہ کرسکوں۔"

ہوجو کچھ دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا تاکہ وہ پرسکون ہوجائے اور اپنی باتوں کو ترتیب وار بیان کرسکے کیونکہ اس کے دل میں ڈاکٹروں کے لیے بہت احترام تھا۔

"اس کا آغاز اس وقت ہوا۔" ہوجو نے اپنی بات شروع کی۔ "جب میں نے اپنی ٹیم کے اشاروں کے علاوہ مخالف ٹیم کے اشارے بھی سن لیے۔"

ڈاکٹر شبان نے اقرار میں سر ہلایا اور نیچے کوئی چیز دیکھنے لگا۔

"بہت زیادہ بھیڑ میں بھی......"

"یہ بھیڑ کیا ہوتی ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا تو ہوجو نے اپنی امکانی حد تک کوشش کرکے اسے بھیڑ کا مطلب سمجھایا۔

"ان کا مجھ سے پندرہ گز کا فاصلہ تھا اور آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے۔ چاروں طرف سے تقریباً ساٹھ ہزار افراد کے شور وغل کی آواز تھی لیکن میں نے پھر بھی ان کے اشارے سن لیے۔"

"میری زندگی میں یہ سب سے بہترین آپریشن تھا جو مکمل طور پر کامیاب رہا ہے۔ بلکہ اس اس کے نتائج تو کچھ زیادہ ہی اچھے برآمد ہوئے ہیں۔" ڈاکٹر شبان نے خودستائشی کے انداز میں کہا۔ "یہ بات تو تمہارے پیشے کے لیے بے حد مفید ہے میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ میں اس آپریشن سے متعلق آئندہ منعقد ہونے والی طبی کانگریس کے لیے ایک مقالہ تحریر کروں گا اور یہ انتہائی دلچسپی سے سنا جائے گا۔"

"بکواس بند کرو۔" ہوجو نے غصے سے دہاڑتے ہوئے کہا لیکن فوراً ہی معذرت کرکے اپنی بات آگے بڑھائی اور پھر بتایا کہ اس نے مخالف ٹیم کے اشارے نہ صرف سن لیے بلکہ ان کا مطلب بھی اس کی سمجھ میں آگیا۔ حالانکہ یہ اشارے ہر ٹیم کے اپنے ہوتے ہیں اور ان کو خفیہ کوڈ کہا جاتا ہے۔ کوئی بھی ٹیم دوسری ٹیم کے اشاروں کا مطلب نہیں جانتی۔ ڈاکٹر نے یہ باتیں سننے کے بعد نوٹس لینے چھوڑ دیئے اور پھر جب اس نے بتایا کہ اس نے مخالف ٹیم کے کوارٹر بیک کی سوچ پڑھ لی تو ڈاکٹر نے اپنا قلم میز پر رکھ دیا اور پرخیال انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اب وہ ہوجو میں کچھ زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔

پوکر کھیلنے کی تفصیل سن کر ڈاکٹر نے کندھے اچکادیے...... "اس دور میں ویسے بھی انسان ماورائی احساسات کے تحت نامعلوم باتیں جان لیتا ہے۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ ڈیوک یونیورسٹی میں اس موضوع پر تحقیق ہورہی ہے؟"

"میری بات خاموشی سے سنتے جاؤ۔" ہوجو نے ڈاکٹر سے کہا جو اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی مختلف تاویلیں کررہا تھا پھر اس نے جلدی جلدی باقی واقعات بھی تفصیل سے اس کے گوش گزار کردیئے۔

ڈاکٹر شبان خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا اور رحم دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا سر بار بار افسوس آمیز انداز میں ہلاتا رہا۔ پھر اس نے ہوجو کا ہاتھ تھپتھپایا اور کہا۔ "میرے دوست! مجھے یقین ہے کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ مجھے اس بات میں ذرا بھی شک نہیں کہ یہ واقعات تمہارے ساتھ حقیقتاً پیش آئے ہیں۔ کھیل کے دوران جو معاملات پیش آئے انہیں بڑی آسانی سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ تم اس کھیل کے اس قدر ماہر ہوچکے ہو کہ تمہاری پیشہ ورانہ سوجھ بوجھ قدم قدم پر تمہاری رہنمائی کرتی ہے اور تمہیں یوں لگتا ہے جیسے مخالف ٹیم کے اشاروں کو سن رہے ہو حالانکہ یہ

تمہارے اندر کی آواز ہے۔ سلویا کے ساتھ تمہارے جو معاملات ہوئے ان سے ایک نوجوان کو جسے سفلی تقاضے پورے کرنے کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی ہو عموماً واسطہ پڑتا ہے اور اپنا مقصد حاصل نہ ہونے پر اسی قسم کی سوچیں ذہن میں گھر کر لیتی ہیں۔ شاید تم سراب کی سی کیفیت میں مبتلا ہو چکے ہو۔ تمہیں جو کچھ سنائی دیتا ہے حقیقت میں ایسا نہیں بلکہ تمہاری خواہشات اور ذہن کی پیداوار ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم کسی ماہر نفسیات سے مل لو میرا ایک دوست ہے میں اسے فون کر دیتا ہوں تم اس کے پاس چلے جاؤ وہ تمہیں بہتر مشورہ دے گا۔"

مارے غصے کے ہوجو کے منہ سے کوئی بات نہیں نکل رہی تھی۔ وہ بڑبڑانے لگا ڈاکٹر کی سمجھ میں اس کی کوئی بات نہ آئی تو اس نے دوبارہ اسے متوجہ کیا مگر وہ بڑبڑاتے ہوئے کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر بھی اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا...... مگر اب وہ واقعی بہت متفکر تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ایک پانچ سالہ بچہ لان میں چلتا ہوا برابر والے مکان کے گیراج کی طرف جا رہا تھا۔

دونوں آدمی خاموشی سے کھڑے دیکھتے رہے تب ڈاکٹر نے ایک لمبی سی سانس لی اور ہوجو سے کہا۔ "آؤ میرے آپریشن روم میں آؤ۔"



تقریباً ایک گھنٹے بعد جب ہوجو ڈاکٹر شبان کے کلینک سے رخصت ہو کر واپس گھر جا رہا تھا تو اس کے بائیں کان کے پیچھے پٹی بندھی ہوئی تھی لیکن وہ بہت خوش تھا حالانکہ اس کا کان کارک لگی ہوئی بوتل کی طرح محسوس ہو رہا تھا جیسا کہ شروع میں تھا۔



چاروں طرف عجیب سناٹا طاری تھا اسٹیڈیم میں خاموشی حیرت زدہ نگاہیں ساکت ہو کر رہ گئی تھیں ہوجو کسی بھی پاس میں مداخلت نہیں کر رہا تھا۔ جونی کی آواز اس کے بائیں کان سے ٹکرا کر واپس جا رہی تھی مگر ہوجو اپنے ہی دھیان میں تھا۔ دائیں بائیں لڑھکتی ہوئی گیند کے ساتھ وہ پہلے کی طرح کسی کارکردگی کا مظاہرہ نہ کر سکا۔ دو دن کھیل کے بعد جونی نے اس سے بات چیت کرنا چھوڑ دی اب وہ شام کے وقت سیر کو نکلتا تو اس کے ساتھ دوسرے لڑکے ہوتے۔ سیزن ختم ہو گیا اور جب نئے سیزن کا آغاز ہوا تو ہوجو کا نام فہرست میں شامل نہیں تھا کیونکہ اس کے معاہدے کی تجدید نہیں ہوئی۔ کوچ نے اخبار والوں کے اطمینان کے لیے ایک مختصر وضاحت جاری کر دی کہ ہوجو کے سر پر لگنے والی چوٹ اتنی شدید ہے کہ دوبارہ چوٹ کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا کیونکہ ہوجو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذہنی طور پر ناکارہ ہو سکتا ہے۔

اس دوسرے آپریشن کا معاوضہ پانچ سو ڈالر ادا کرنا پڑا مجسٹریٹ کوچ اور اخبار والوں کی لایعنی باتوں سے بچنے کے لیے اسے ایک ہزار ڈالر کی رشوت الگ دینا پڑی...... لیکن اس کے باوجود وہ بہت مسرور تھا۔

جنوری کا مہینہ شروع ہوتے ہی اس نے اپنے سسر کی کمپنی کے لئے انشورنس فروخت کرنے کے کام کا آغاز کر دیا لیکن بات چیت کرنے کے لیے اب وہ ہمیشہ لوگوں کے بائیں جانب بیٹھتا ہوجو جو عظیم فٹ بالر کی حیثیت سے ابھرا تھا لوگ اب اس کا نام بھولتے چلے گئے۔



رقابت

خلیل جبار

اگر میاں بیوی کے درمیان محبت ہو تو ان کا رشتہ فولاد سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے اگر اعتماد میں دراڑ پڑجائے تو یہ کچے دھاگے سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوتا ہے۔
ایک جوڑے کا حوال' ان کے درمیان ایک شیطان آگیا تھا۔

ایں جیسے ہی گھر میں داخل ہوا' کمرے میں زیبو نہیں تھی۔ باتھ روم سے شاور سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی وہ یقیناً نہارہی تھی۔ مجھے پر اس شدید غصہ آرہا تھا' غصے کی وجہ تھی ان دنوں زیبو بے پروا ہوگئی تھی وہ ایسا کیوں کررہی تھی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی۔ میں جب بھی فیکٹری سے گھر آتا تھا دروازہ اندر سے لاک ہوتا تھا مگر اب اکثر دروازہ لاک نہیں ملتا تھا۔ دروزہ لاک نہ ہونے سے کوئی بھی جرائم پیشہ شخص گھر میں داخل ہوکر ہمیں نقصان پہنچا سکتا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا یا وہ جان بوجھ کر ایسا کررہی تھی کہ دروازہ لاک نہیں ہوتا تھا۔ میں جب بھی غصے سے اس کی بے پروائی کی طرف توجہ دلاتا وہ ہنس دیتی۔

''کیا واقعی میں نے دروازہ اندر سے بند نہیں کیا؟''

''ہاں۔'' میں غصے سے کہتا۔

''اوہ سوری میں بھول گئی ہوں گی۔''

''تم اپنے بھولنے کا اچھی طرح سے علاج کرالو ورنہ کسی دن ہمیں کسی بڑے نقصان سے دوچار ہوجانا پڑے گا۔'' میں کہتا۔

''ہمارے گھر میں ضرورت کے سامان کے علاوہ کچھ ہے نہیں جو وہ چور لے جائے۔'' زیبو کہتی۔

''اب پہلے جیسے چور نہیں ہے جو ہلکی سی آہٹ ہونے پر بھاگ جایا کرتے تھے۔ آج کے چور اسلحہ کے زور پر دیدہ دلیری سے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ گھر سے مال برآمد نہ ہونے پر گولی چلاتے ہوئے بھی دیر نہیں لگاتے۔''

''وہ کیوں؟''

''وہ اس لیے کہ آج کے دور میں مال نہ ہونا سب سے بُرا ہے۔ وہ کہتے ہیں ہمارا قیمتی وقت ضائع ہوگیا ہے' تمہیں گھر میں اتنا سامان ضرور رکھنا چاہیے کہ انہیں چوری میں ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔''

''ہاں یہ ایک نیا ٹرینڈ چل نکلا ہے' راہ چلتے ہوئے جیب میں اچھا موبائل ضروری ہے ورنہ ڈکیت موبائل نہ ملنے پر سامنے والے کو یہ کہہ کر گولی مار دیتے ہیں کہ تم نے فضول میں ہمارا وقت ضائع کیا۔'' زیبو کہتی۔

''اس بنا پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ دروازہ اندر سے لاک رکھا کرو ورنہ یہ غریبی ہمیں ڈاکوؤں' چوروں کے ہاتھ مروادے گی۔'' میں کہتا۔ میرے کہنے پر وہ ایسے سرہاں میں ہلادیتی جیسے اب یہ ایسا نہیں کرے گی۔

میسج کی ٹون بجنے پر میں چونکا اور بے اختیار سنگھار میز پر رکھا زیبو کا موبائل اٹھالیا اور میسج پڑھنے لگا۔ میسج پر کوئی خاص بات نہیں تھی جس طرح نصیحتیں بھرے میسج ہوتے ہیں یہ بھی اس طرح کا تھا۔ مگر جس نمبر سے وہ آیا تھا' سے دیکھ کر ایک لمحے کو مجھے جھٹکا لگا۔

یہ نمبر اصغر کا تھا وہی اصغر جو میرے جگری دوست ہونے کا دعویدار تھا۔ یہ حقیقت ہے اصغر کے مجھ پر کئی احسانات تھے اور میں اس کے احسانوں تلے دبا ہوا تھا۔ میرا تعلق اندرون سندھ کے گاؤں شہداد پور سے تھا' کراچی آنے سے قبل



میری ایک شادی کی تقریب میں ملاقات ہوئی تھی میں ان دنوں روزگار کی تلاش میں تھا۔ اصغر نے ہی مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں کراچی آجاؤں وہاں روزگار کے بہت ذرائع ہیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں میں اس کے مشورے پر آنکھ بند کرکے کراچی چلا آیا اور اصغر سے رابطہ کیا۔ اس نے اپنی فیکٹری کے منیجر سے بات کرکے کام دلا دیا۔ ہم دونوں بظاہر ایک ہی فیکٹری میں ملازم تھے مگر ڈیپارٹمنٹ الگ الگ تھے۔ فیکٹری کے قریب مکان ملنے سے مجھے یہ فائدہ ہوگیا تھا کہ بسوں کے بدل بدل کر فیکٹری پہنچنے سے بچ گیا تھا۔ ورنہ لوگوں کی اکثریت دور دراز سے آتی تھی ایسے میں میں اپنے آپ کو خوش نصیب تصور کرتا تھا کہ بسوں کی جھنجٹ سے بچ گیا تھا اور کرائے کی مد میں پیسے ضائع ہونے سے بھی بچ گئے تھے۔ فیکٹری سے ملنے والی تنخواہ اتنی تھی کہ میں آسانی سے اپنی فیملی کو یہاں لاکر رکھ سکتا تھا۔

میری فیملی تھی ہی کتنی ایک بیوی اور ایک چھوٹی بچی شمائلہ جو ابھی دودھ پیتی تھی۔ شادی سے قبل میرے والد حبیب کی دکان بہت اچھی چلتی تھی' شادی کے چند ماہ بعد دکان کی سیل بھی بہت کم ہوکر رہ گئی تھی۔ میرے لیے اب یہ ضروری ہوگیا تھا کہ میں والد صاحب کا ہاتھ بٹانے کی بجائے الگ سے کوئی کام شروع کردوں یا کہیں نوکری کرلوں۔ ایسے میں اصغر میرے لیے فرشتہ ثابت ہوا جب تک میری پہلی تنخواہ نہیں مل گئی وہ مالی طور پر میری مدد کرتا رہا۔ وہ

جب بھی مجھے فکر مند دیکھتا خاموشی سے میری جیب میں کچھ رقم ڈال دیتا۔ مجھ پر اس کا یہ احسان کم تھا کہ کراچی میں بلا کر نوکری دلائی' رہائش بھی دلا دی اور اب وقفے وقفے سے مالی مدد بھی کر رہا تھا۔ میں بظاہر رقم لینے سے انکار کرتا تھا مگر وہ بھی سمجھدار تھا اس لیے ایسے موقع پر وہ ہنستے ہوئے کہتا۔

''رقم کے لیے انکار مت کیا کرو جب تم اس پوزیشن میں آ جاؤ مجھے رقم واپس کر دینا۔''

میں بچپن سے جذباتی اور بات بات پر بھڑک جاتا تھا' اس عادت کے سبب مجھ سے ایک غلطی سرزد ہوگئی اور اصغر نے اس غلطی کا ازالہ ایسے کیا کہ مجھے دنیا کی نظر میں بدنام ہونے سے بچا لیا تھا اور وہ راز کسی کو پتا نہیں چل سکا۔

اصغر کے میسج زیبو کے موبائل پر آنے سے مجھے الجھن سی ہونے لگی تھی۔ میں نے اصغر کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ زیبو کو آئندہ میسج نہ کرے' مجھے اس کا زیبو کے موبائل پر میسج کرنا اچھا نہیں لگتا۔ میری بات پر وہ مسکرا دیا اور بولا۔

''میں اصلاحی میسج کرتا ہوں اگر تمہیں یہ پسند نہیں ہے تو آئندہ میں یہ میسج نہیں کروں گا۔''

اس کی یقین دہانی پر میں مطمئن ہو گیا اور اس کے میسج زیبو کے موبائل پر آنا بند ہو گئے تھے' میں بھی مطمئن ہو گیا تھا لیکن آج اس کا میسج آنا میرے لیے تشویش کی بات بن گئی' اصغر نے میسج کرنا نہیں چھوڑا تھا اور زیبو میرے گھر پر آنے سے قبل تمام میسج ڈیلیٹ کر دیتی تھی۔ میں ابھی ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ زیبو باتھ روم سے نکل آئی اور میرے ہاتھ میں اپنا موبائل دیکھ کر ایک لمحے کو وہ چونکی اور پھر سنبھلتے ہوئے بولی۔

''ارے کیا ہوا میرے موبائل کو اس طرح کیوں گھور کر دیکھ رہے ہو؟''

''اصغر نے تمہیں میسج بھیجا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس میں اتنا فکر مند کیوں ہو وہ تمہارا دوست ہے۔ میسج بھیج کر اس نے کوئی جرم تو نہیں کیا نا۔'' وہ بولی۔

''میں نے اسے منع کیا تھا کہ آئندہ تمہیں میسج نہ کرے اور اس نے یقین دہانی بھی کرائی تھی کہ وہ تمہیں میسج نہیں کرے گا۔'' میں نے زیبو کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اصغر کے تم پر بے شمار احسانات ہیں اور آخری احسان ایسا ہے کہ جسے ہم زندگی بھر نہیں بھلا سکتے۔''

''جانتا ہوں' اس لیے فکر مند ہو گیا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''تمہیں یاد ہے نا جب میں نے تمہیں غصے میں طلاق دے دی تھی تو اصغر نے حلالہ کے لیے خود کو پیش کر دیا تھا' میں نے بھی اسے غنیمت جانا کہ اس طرح بدنامی سے بچ جاؤں گا اور یہ راز راز ہی رہے گا۔''

''اس بات کے لیے تمہیں اس کا احسان مند ہونا چاہیے۔'' اس نے اس کی پوری قیمت وصول کر لی تھی۔ بات یہ طے ہوئی تھی کہ وہ تمہیں اپنے نکاح میں دو دن رکھے گا مگر جب اس نے ایک ہفتے تک طلاق نہیں دی تو مجھے غصہ آ گیا اور جب میں نے اصغر سے غصے میں بات کی اس نے بتایا کہ اس کی بیوی کے ڈلیوری ہوئی ہے اور گھر میں اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے اس لیے میں ایک ہفتے مزید صبر کروں۔ دوسرے ہفتے بھی اصغر نے ایک ہفتے کی مہلت مانگ لی' وہ کسی طور پر تمہیں طلاق دینا نہیں چاہ رہا تھا جب میں نے بہت احتجاج کیا تو ایک ماہ پورا ہونے پر اس نے تمہیں طلاق دی تھی۔''

مجھے زیبو کی اصغر کی وکالت کرنے پر غصہ آ گیا۔

''میں اس وقت اصغر کی شرعی بیوی تھی وہ چاہتا تو مجھے کئی ماہ اور بھی رکھ سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔''

''میری اس سے تمہیں دو دن نکاح میں رکھنے

کی بات ہوئی تھی۔" میں نے غصے سے کہا۔
"ہاں ہوئی تھی تم اتنا شور کیوں کر رہے ہو اس وقت حالات ایسے ہو گئے تھے کہ اسے اپنی بیوی کی دیکھ بھال کے لیے میری اشد ضرورت پڑ گئی تھی اس لیے اصغر نے ایسا کیا۔ تمہیں اتنا خود غرض بن کر سوچنا نہیں چاہیے۔" زیبو غصے میں آتے ہوئے بولی۔
"تم نے آج بھی دروازے کو اندر سے لاک نہیں کیا' خدانخواستہ کوئی بھی ڈکیت گھر میں آ سکتا تھا۔" میں نے موضوع کو بدلنے کی کوشش کی۔
میں غصے کا تیز ہوں اور میں نہیں چاہ رہا تھا کہ غصے کی شدت میں تیزی آ جائے اور پھر وہ پہلے والی غلطی سرزد ہو جائے۔ میں اب اس واقعے کے بعد غصے کی حالت میں خود پر کنٹرول کرنے لگا تھا۔
"میں نہانے جا رہی تھی ایسے میں خیال آیا کہ تمہارے آنے کا وقت ہو گیا ہے میں باتھ روم میں چلی گئی تو تم دیر تک دروازہ پیٹتے ہی رہو گے' اس لیے دروازے کو لاک نہیں کیا۔"
"میرے آنے کا انتظار کر لیتیں پھر نہانے چلی جاتیں۔" میں نے کہا۔
"ٹھیک ہے آئندہ خیال رکھوں گی۔" وہ بولی۔
اس وقت میں نے بات کو درگزر کر دیا تھا لیکن میرے دل میں ایک بات بیٹھ گئی تھی کہ گڑبڑ ضرور ہے۔ میرے دل میں جو چور تھا اس لیے وہ دل ہی دل میں ڈر رہا تھا۔ اصغر نے جب تک زیبو سے نکاح نہیں کیا تھا وہ اصغر کے سامنے آنے سے کتراتی تھی' میرے بہت زیادہ اصرار پر وہ اصغر کے سامنے آ جاتی تھی مگر جلد ہی کسی بہانے سے اٹھ کر کمرے میں چلی جاتی تھی۔ اکیلے میں اس سے وجہ دریافت کرنے پر وہ کہتی تھی کہ اسے اصغر سے خوف آتا ہے۔ وہ اس کی نظروں میں تپش محسوس کرتی ہے' میں اس کی بات سمجھنے سے قاصر تھا' اس لیے ایک دن غصے سے پھٹ پڑا۔
"زیبو کیا بات ہے تم اصغر کے سامنے آنے سے کیوں کتراتی ہو' حالانکہ تمہیں معلوم بھی ہے کہ اس کے مجھ پر کتنے احسانات ہیں' میں اصغر کے ایک احسان کا بھی بدلہ نہیں اتار سکا ہوں۔"
"کیا میرے اصغر کے سامنے آنے سے بدلہ اتر جائے گا۔" وہ بولی۔
"میں نے کب کہا ہے کہ تمہارے اس کے سامنے آنے سے بدلہ اتر جائے گا' مجھے اچھا نہیں لگتا کہ اصغر ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا اور تم اس کے سامنے نہ آؤ۔"
"مجھے تمہارے دوست کے سامنے آنے پر کوئی اعتراض نہیں بس مجھے اس کی آنکھوں کو دیکھ کر ایک خوف سا محسوس ہوتا ہے۔"
"خوف...... کیسا خوف؟"
"جیسا کسی اجنبی شخص کی ہوس بھری نظروں کو دیکھتے ہوئے ہوتا ہے۔"
"میرا دوست ایسا نہیں ہے وہ بہت اچھا انسان ہے۔" میں نے اصغر کی حمایت کی۔
"تم اس کے سامنے بے خوف ہو کر آ جایا کرو' ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے زیبو کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
میرے سمجھانے پر زیبو اصغر کے سامنے آنے لگی تھی' وہ اصغر سے بات کرتے ہوئے نظریں نیچی رکھتی تھی پھر وہ ہو گیا جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایک رات اس نے اپنے گھر جانے کی ضد کی' میرا دل اسے بھیجنے کو نہیں چاہ رہا تھا وہ بضد تھی کہ اپنے گھر جائے گی۔ بات اتنی بڑھی کہ میں نے غصے میں آ کر زیبو کو طلاق دے دی۔ طلاق دینے پر مجھے احساس ہوا کہ یہ میں کیا حماقت کر بیٹھا۔ زیبو بھی ہکا بکا رہ گئی اسے بھی مجھ سے ہرگز ایسی توقع نہیں تھی۔

پوری رات ہم دونوں اس بات پر سوچ بچار کرتے رہے کہ کیا کریں' رشتے داروں کو اس کا علم ہوگیا تو ہماری بڑی بدنامی ہوگی۔ صبح ہونے پر ہم نے یہی حل نکالا کہ میں اسے میکے بھیج دوں اور پھر جب وہ میکے سے آئے گی اور میں اس کا نکاح کسی ایسے شخص سے کرادوں گا جو ہمارے رشتے داروں کو نہیں جانتا ہوگا۔ دو دن بعد زیبو اس سے طلاق لے کر آجائے گی اور کمرے کے ایک حصے میں پردہ کرکے بیٹھ جائے گی۔ عدت پوری ہونے پر میں زیبو سے دوبارہ نکاح کرلوں گا میں نے جب اصغر سے رات کے واقع اور اپنے آئندہ کے منصوبے کے بارے میں بتایا تو وہ پہلے میری بات سن کر پریشان ہوگیا اور پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔

''شادی کے بعد لڑکی کے ایک ماہ سے زیادہ دن میکے میں رکنے پر رشتہ دار باتیں بنانا شروع کردیتے ہیں اور ممکن ہے کہ جو بات تم چھپانا چاہ رہے ہو وہ کھل جائے۔ لڑکی کے والدین حلالہ کی بجائے کسی اور اچھی جگہ زیبو کی شادی کردیں۔''

اصغر کی بات میں وزن تھا میں بھی سوچ میں پڑگیا' میں کسی صورت میں زیبو کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔

''پھر میں کیا کروں؟'' میں نے کہا۔

''تم فکر نہ کرو سوچتے ہیں اس کا حل بھی نکالنا پڑے گا۔'' اصغر نے کہا۔

کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اصغر نے ایک حل نکال ہی لیا کہ وہ اس کے گھر میں رہ کر عدت پوری کرسکتی ہے ایسے میں اگر کسی رشتے دار کے آجانے پر ایک کال کرکے زیبو کو گھر بلا بھی سکتا تھا' اصغر کی یہ تجویز مجھے پسند آگئی۔ اس کے گھر میں کئی کمرے تھے' زیبو کسی بھی ایک کمرے میں رہ کر عدت پوری کرسکتی تھی۔ اصغر کے گھر میں رہ کر زیبو نے عدت پوری کرلی' اب اس کے نکاح کا مرحلہ آنے پر اصغر نے خود کو نکاح کے لیے پیش کردیا۔ میں اصغر پر آنکھ بند کرکے اعتماد کرسکتا تھا اس لیے میں فوراً راضی ہوگیا۔ نکاح کے دوسرے دن اصغر کی پہلی بیوی کے تیسرے بچے کی ڈلیوری ہوگئی اس لیے میں مصلحتاً خاموش رہا۔ ایک' دوسرا' تیسرا ہفتہ گزر جانے پر اصغر کے زیبو کو طلاق نہ دینے پر میں نے شور شرابا شروع کردیا۔ ایسے میں اصغر کی بیوی مہوش نے بھی میری حمایت کی اور اصغر پر زور ڈالا مہوش کے کہنے پر اور میرے شور کرنے سے بالآخر ایک ماہ ہوجانے پر زیبو کو اصغر نے طلاق دے دی۔ مجھے اصغر کی نیت پر اب شک ہونے لگا تھا اس لیے میں نے کمرے کے ایک حصے میں پردہ ڈال کر ہی زیبو کو عدت کرائی اور عدت پوری ہونے پر زیبو سے نکاح کرلیا۔

میرے دل میں اصغر کے بارے میں خیالات تبدیل ہوگئے تھے' اس کے گھر آجانے پر میں اس سے بددلی سے ملتا تھا جبکہ زیبو اس کے آگے بچھی جاتی تھی۔ مجھے زیبو کو دیکھ کر حیرت تھی کہ یہ وہی زیبو ہے جو اصغر کی آنکھوں سے ڈرا کرتی تھی۔

رات کھانے میں کچھ ایسی چیز آگئی تھی جس سے طبیعت میں بھاری پن محسوس ہورہا تھا۔ صبح ہونے پر میرا دل کام پر جانے کو نہیں کررہا تھا۔ زیبو نے مجھے وقت ہوجانے کام پر جانے کو کہا جس پر میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بیگم آج جانے کا موڈ نہیں ہورہا ہے' رات سے طبیعت میں بھاری پن ہے۔''

''طبیعت میں بھاری پن ہوجاتا ہے مگر بلاوجہ چھٹی کرنا بھی اچھا نہیں' بلاوجہ پیسوں کی کٹوتی ہوگی۔'' زیبو نے کہا۔

''دیکھ لو میں چاہ رہا تھا کہ آج کا دن بیگم کے نام کردوں۔'' میں نے کہا۔

''رات کافی نہیں ہوتی۔''

''ہاں رات ہوتی ہے کبھی کبھی دن میں دل چاہتا ہے کہ بیگم کے ساتھ وقت گزارا جائے۔''

''دل بہت چاہتا ہے مگر انسان کی مجبوری پیسہ ہے' پیسے کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔''

''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو' ہمیں پیسے کی قدر کرتے ہوئے وقت کو فضول میں ضائع نہیں کرنا چاہیے' ہم پیسے کمانے کے لیے ہی گاؤں سے شہر آئے ہیں۔''

''پھر وقت کو فضول میں ضائع نہ کریں۔''

''میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں۔'' میں مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

فیکٹری آنے پر بھی میری طبیعت میں بھاری پن ٹھیک نہیں ہوسکا اچانک کام کرتے ہوئے مجھے چکر آ گیا اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مجھے اس طرح بیٹھتا دیکھ کر میرے ساتھی میرے پاس آ گئے مگر میں فوری اٹھ گیا۔

''فکر کی کوئی بات نہیں ہے بس ایسے ہی بیٹھ گیا تھا۔'' میں نے بات بنائی۔

میں نہیں چاہ رہا تھا کہ انہیں میری طبیعت خراب ہونے کا پتا چلے ورنہ وہ ضد کر کے میری آج چھٹی کرا دیتے۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی' تم آج چھٹی کر لیتے۔'' ایک ساتھی نے کہا۔

''ہاں ایک دن آرام کر لینے سے طبیعت کو بہت سکون ملتا ہے۔'' دوسرے ساتھی نے اس کی بات کی تائید کی۔

''بھئی مجھے کچھ نہیں ہوا تمہیں پتا ہے میری طبیعت خراب ہونے پر میں ضرور چھٹی کر لیتا ہوں۔'' میں زبردستی مسکراتے ہوئے بولا۔

اس وقت حقیقت میں مجھے تکلیف ہو رہی تھی پھر بھی محض اس لیے مسکرا رہا تھا کہ ساتھیوں کو پتا نہ چلے۔ دوپہر میں کھانے کا وقفہ ہو جانے پر مجھے دوبارہ تے ہو گئی' میں نے بہتر یہی سمجھا کہ چھٹی لے کر گھر چلا جاؤں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میں جب گھر پہنچا دروازہ اندر سے لاک تھا۔ میں خوش ہو گیا کہ زیبو نے میری بات کو اہمیت دیتے ہوئے دروازے کو لاک کیا ہوا ہے' میں ابھی دروازہ بجانے والا تھا کہ اندر سے کسی مرد کے قہقہے لگانے کی زوردار آواز آئی۔ قہقہہ لگانے کا انداز اصغر جیسا تھا' میری غیر موجودگی میں اصغر کا کیا کام یہ سوچتے ہی میں نے زور سے دروازہ بجایا۔ پہلی' دوسری دستک پر دروازہ نہیں کھلا' تیسری بار دستک پر دروازہ کھل گیا۔ زیبو کچھ گھبرائی سی معلوم ہو رہی تھی۔

''کیا بات ہے زیبو! تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نن.......نہیں......ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ بولی۔

''تمہارے چہرے سے خوف جھلک رہا ہے جیسے تمہیں میرا اس وقت آنا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔'' میں اس کے چہرے کی طرف ہی غور سے دیکھ رہا تھا۔

''وہ......وہ صبح تمہاری طبیعت خراب تھی اس لیے تمہیں اس وقت دیکھ کر پریشان ہو گئی ہوں۔'' زیبو نے بات بنائی۔

''تم دروازے میں کیوں کھڑی ہو' مجھے اندر آنے دو' میں کوئی غیر نہیں تمہارا شوہر ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں ہاں آؤ۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے راستہ چھوڑ دیا۔ میں نے گھر میں داخل ہو کر پہلے باتھ روم' صحن اور پھر کمرے میں لپک کر جائزہ لیا گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔

''تم کیا تلاش کر رہے ہو؟'' زیبو نے پوچھا۔

''مجھے گھر کے اندر سے کسی مرد کے قہقہہ لگانے کی آواز آئی تھی۔''

''یہ محض تمہارا وہم ہوگا' دیکھو یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔'' زیبو زبردستی مسکرائی۔

میری پریشانی بجا تھی' میرے کان دھوکا نہیں کھا سکتے تھے۔ میں نے خود اصغر کے قہقہہ لگانے کی آواز سنی تھی مگر اندر وہ موجود نہیں تھا۔ بے اختیار میری نظر کھڑکی پر چلی گئی' کھڑکی کھلی ہوئی تھی میں لپک کر کھڑکی کے پاس گیا۔ کھڑکی دوسری گلی میں کھلتی تھی' گلی کے نکڑ پر کوئی مرد تھا جو تیز تیز قدم چلتا ہوا موڑ مڑ گیا۔ اس مرد کا پچھلا حصہ دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ وہ اصغر ہی تھا۔ چوں کہ میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا' اسی لیے میں سو فیصد یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اصغر تھا' میرا اندازہ تھا۔ زیبو نے کھڑکی کے راستے سے اصغر کو بھگا دیا تھا تاکہ یہ راز نہ کھل جائے کہ وہ میری غیر موجودگی میں یہاں آتا ہے۔

''زیبو مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ یہاں اصغر موجود تھا اور وہ ابھی اس کھڑکی سے باہر چلا گیا ہے۔''

''اصغر یہاں کیوں آئے گا' جب اسے معلوم ہے کہ تمہاری ڈیوٹی صبح میں چل رہی ہے۔ تمہیں نا جانے کیوں اصغر پر شک ہونے لگا ہے کہ وہ تمہاری غیر موجودگی میں یہاں آتا ہے۔'' میں نے خود اصغر کی آواز سنی تھی۔

''تمہیں میں نے جو کام کہا ہے وہ کرتے نہیں ہو' اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اصغر بھرپور مردانہ صلاحیت رکھتا ہے تمہارا ابھی علاج ہوسکتا ہے۔ تم اپنے علاج پر خصوصی توجہ دو اور کسی دوسرے چکر میں نہ پڑو۔ تم ایسے ہی مجھ پر شک کر کے پریشان کرتے رہے تو میں یہ گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں گی۔'' زیبو سے بولی۔

اس کی دھمکی پر میں خاموش ہوگیا' غلطی میری تھی کہ میں بچپن میں غلط صحبت اختیار کر کے اصل قوت سے محروم ہوگیا تھا۔ زیبو بھی مردانہ طاقت سے ناواقف تھی اس لیے میرا اور اس کا نبھا چل رہا تھا۔ میرے طلاق دینے اور اصغر سے اس کا نکاح ہوجانے پر وہ میری کمزوری سے آشنا ہوگئی تھی اور اس نے مجھے دوبارہ نکاح میں آجانے پر اپنا علاج کرانے کا مشورہ دے دیا تھا۔ میں اس کی بات سن کر پریشان ہوگیا تھا اور میں نے سنجیدگی سے اپنا علاج شروع کرا دیا تھا مگر ابھی تک میرا علاج ایسا نہیں ہوا تھا کہ جیسا ہونا چاہیے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کس حکیم کے پاس جاؤں جو میری کھوئی ہوئی طاقت کو فوری بحال کردے۔ زیبو کو میری کمزوری ہاتھ آگئی تھی اس لیے وہ کبھی بھی مجھے بلیک میل کر کے اپنی من مانیاں کرسکتی تھی۔ آج پھر اس نے مجھے کمزوری کا طعنہ دے دیا تھا۔ دوسرے روز میری طبیعت بہتر ہوگئی تھی اور میں فیکٹری چلا آیا تھا' وہاں آ کر میرے اصغر کے ڈیوٹی کے بارے میں معلوم کرنے پر پتا چل گیا کہ اس کی رات ڈیوٹی چل رہی ہے۔ اس کی ڈیوٹی کا پتا چل جانے پر میرا شک یقین میں بدل گیا کہ گھر پر اصغر موجود تھا اور میرے اچانک آجانے پر زیبو نے اسے کھڑکی کے راستے فرار کرا دیا تھا۔ میں اب فوری طور پر اصغر اور زیبو کو رنگے ہاتھوں پکڑ نہیں سکتا' کیوں کہ وہ اب ہوشیار ہوچکے تھے اور جلد ملاقات کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ میری یہ خواہش کہ انہیں رنگے ہاتھوں پکڑوں پوری نہ ہوسکی۔ ہوا یہ کہ میں فیکٹری سے تھکا ہارا جب گھر پہنچا زیبو میلے کچیلے کپڑے پہنے کام میں مصروف تھی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی حالانکہ میں جب بھی گھر آتا تھا' وہ اپنے کام سے فارغ ہوکر بنی سنوری ملتی تھی۔

''کیا بات ہے آج تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔'' میں نے کہا۔

''بن سنورنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' زیبو نے بے زاری کے انداز میں کہا۔

''فائدہ کیوں نہیں ہے تمہیں اتنا اچھا شوہر ملا ہوا ہے۔''میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''ایسے شوہر کا کوئی فائدہ نہیں میں کب سے تمہیں کہہ رہی ہوں کہ اپنا علاج کراؤ مگر تم سنتے ہی نہیں۔ ایک اصغر ہے جسے کسی علاج کی ضرورت نہیں ہے۔''وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

اس کی معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر بے اختیار مجھے شدید غصہ آ گیا اور میں نے زیبو کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ جب میرا غصہ کم ہوا میں کمرے میں چلا گیا۔ زیبو کی صحن سے ابھی تک سسکیاں سنائی دے رہی تھیں مگر مجھے اس کی سسکیوں کی کوئی پروا نہیں تھی میں نے دل میں یہ سوچ لیا تھا کہ آئندہ پھر بھی اس کی زبان پر اصغر کا نام آیا تو میں پھر زیبو کی ایسی درگت بناؤں گا کہ وہ اصغر کا نام لینا ہی بھول جائے گی۔

صبح ہونے پر میں بغیر ناشتا کیے ہی فیکٹری چلا آیا تھا' دن بھر میرے ذہن میں رات کی بات سوار رہی۔ شام گئے جا کر میرے ذہن سے یہ بات ختم ہوئی اور میں نارمل حالت میں آ گیا تھا اور میں یہ سوچتے ہوئے گھر جا رہا تھا کہ زیبو کو پیار سے سمجھاؤں گا کہ آئندہ مجھ سے ایسی بات نہ کرے کہ مجھے شدید غصہ آ جائے۔ وہ میری بیوی تھی میری بات کیوں نہیں سمجھ سکتی تھی وہ ضرور میری بات کو سمجھتے ہوئے آئندہ ایسی بات نہیں کرے گی کہ جسے سن کر غصہ آ جائے۔ گھر پہنچ کر میں نے دروازہ کو ہلکا سا زور دیا' دروازہ اندر سے لاک نہ ہونے کی بناء پر کھل گیا۔ زیبو رات کی پٹائی بھولی نہیں تھی اسی لیے زیبو نے غصے میں دروازہ لاک نہیں کیا تھا میں چوں کہ فیکٹری سے ہی یہ سوچ کر آیا تھا کہ زیبو کو پیار سے سمجھاؤں گا۔ اس لیے میں نے اپنا رویہ ٹھیک رکھا' وہ صحن میں نہیں تھی' کمرہ بھی خالی تھا۔ باتھ روم اور چھت بھی دیکھ لی زیبو کا کچھ پتا نہیں تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زیبو اس وقت کہاں چلی گئی میں نے موبائل جیب سے نکال کر زیبو کو کال کی پہلی دوسری کال اس نے اٹینڈ نہیں کی' تیسری کال پر اس نے کال اٹینڈ کر لی۔

''کیوں کال کی ہے؟''زیبو کی غصے بھری آواز سنائی دی۔

''میں شوہر ہوں تمہارا' تم مجھ سے اس لہجے میں بات کرو گی؟''میں نے کہا۔

''شوہر ایسے ہوتے ہیں جو بیوی پر جلادوں کی طرح ہاتھ اٹھاتے ہیں۔''

''میں مانتا ہوں کہ میں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا' میں کوشش کروں گا کہ آئندہ ایسا نہ ہو تم یہ بتاؤ کہ اس وقت کہاں ہو؟''

''میں اپنے گھر ہالا میں ہوں۔''زیبو نے کہا۔

''یہ تم نے کیا کر دیا' تمہیں اس طرح ہالا نہیں آنا چاہیے تھا اس طرح بات اور بڑھے گی۔''میں نے فکر مندی کہا۔

''تمہارے فیکٹری جانے پر اصغر آ گیا تھا۔''

''وہ کیوں گھر آیا تھا؟''نا چاہتے ہوئے بھی مجھے غصہ آ گیا۔

''مجھے کیا پتا وہ تم سے ملاقات کرنے آیا تھا' میری حالت دیکھ کر وہ سب سمجھ گیا تھا کہ رات میرے ساتھ کیا ہوا ہے اس نے ہی مجھے یہ مشورہ دیا تھا کہ میں ہالا چلی جاؤں' جب تمہارا غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو تم مجھے لینے آ جاؤ گے۔''

''دیکھو زیبو! اصغر ہمارا خیر خواہ کسی صورت میں نہیں ہو سکتا' ہونا یہ چاہیے تھا کہ وہ تمہیں اور مجھے سمجھانے کی کوشش کرتا کہ اب ایسا ہو گیا ہے آئندہ نہیں ہونا چاہیے مگر اس نے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کیا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''میاں بیوی میں جھگڑا ہو ہی جاتا ہے' یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ تمہارے اس طرح میکے

آجانے سے ہمارے جھگڑے کی بات تمہارے والدین اور بھائیوں کو بھی ہو جائے گی' اب بات بڑھے گی ختم نہیں ہو گی۔'' میں نے کہا۔

''جتنی سمجھ داری کی بات تم ابھی کر رہے ہو' رات کر لیتے تو ایسا ہرگز نہ ہوتا۔''

''مجھے اصغر کے نام سے چڑ ہو گئی ہے' نہ چاہتے ہوئے بھی تمہارے منہ سے اصغر کا نام سن کر میرے جذبات قابو میں نہیں رہتے' یہی کل ہوا۔ مجھے اتنا شدید غصہ آیا کہ میں تمہاری پٹائی کر بیٹھا۔'' میں نے کہا۔

''تم مجھے لینے ابھی نہیں آنا گھر والے غصے میں ہیں۔'' زیبو بولی۔

''مجھے اس بات کا اندازہ ہے' میں تم سے موبائل پر رابطہ رکھوں گا جیسے ہی حالات سازگار ہوئے میں تمہیں لینے آجاؤں گا۔'' میں نے رابطہ منقطع کرتے ہوئے کہا۔

پوری رات میری بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے گزری' ایک پل کو بھی آنکھ نہیں لگی تھی۔ مجھے رہ رہ کر اصغر پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا وہ میرا اچھا دوست بن گیا تھا مگر اس کی میری بیوی کے معاملے میں نیت صاف نہیں تھی اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر نکاح کی آڑ میں میری بیوی سے جسمانی تعلقات پیدا کر لیے تھے اور نکاح ختم ہو جانے پر بھی وہ زیبو سے جسمانی تعلق رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ ایسی اوچھی اور گری ہوئی حرکت کر رہا تھا وہ میرا اچھا ہرگز نہیں چاہ رہا تھا جبھی اس نے زیبو کو ہالا جانے کا مشورہ دے دیا تھا۔ جبکہ اسے معلوم تھا کہ میں اس وقت فیکٹری میں مل سکتا ہوں پھر وہ میرے گھر کیوں آیا' زیبو نے اصغر کو اپنا ہمدرد سمجھ کر رات کا واقعہ سنایا ہو گا اور اس نے جلتی آگ پر تیل چھڑکنے والا مشورہ دے دیا تھا۔ ہمارے درمیان علیحدگی ہونے کی صورت میں اصغر کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ وہ آسانی سے زیبو کے گھر والوں سے ہمدردی جتلا کر

اقوال خلیل جبران

مجھ سے وہی لوگ حسد اور دشمنی کرتے ہیں جو میرے مقابلہ میں کمتر ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی سے بڑھ کر نہیں ہوں۔

اور میری تعریف یا توہین وہی شخص کر سکتا ہے جو مجھ سے بڑھ کر ہو لیکن آج تک نہ کسی نے میری تعریف کی اور نہ توہین اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی سے کم تر نہیں ہوں۔

اگر بادل میں بیٹھ جاؤ' تو تمہیں دو ملکوں کے درمیان حدِ فاصل اور کھیتوں کے درمیان سنگِ فاصل بالکل نظر نہ آئے۔

لیکن افسوس تو اسی کا ہے کہ تم بادل پر بیٹھ نہیں سکتے۔

جب میں ایک شفاف آئینہ بن کر تمہارے سامنے کھڑا ہوا تو تم مجھے دیر تک غور سے دیکھتے رہے اور تمہیں میں اپنی صورت نظر آئی

پھر تم نے مجھ سے کہا۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

لیکن درحقیقت تم نے مجھ سے نہیں اپنی ذات سے محبت کی تھی۔

جو آدمی جتنا زیادہ بولتا ہے اتنا ہی ناسمجھ ہوتا ہے اور ایک خطیب اور دلال کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔

جب تمہارا غم یا خوشی حد سے بڑھ جائے' تو دنیا تمہاری نظروں میں حقیر ہو جائے گی۔

نوشین اقبال نوشی...... گاؤں بدر مرجان

سہ رنگا پوسٹر

محبت......! وہ شخص کر سکتا ہے جو اندر سے خوش ہو مطمئن ہو اور پر باش ہو محبت کوئی سہ رنگا پوسٹر نہیں کہ کمرے میں لگا لیا سونے کا تمغہ نہیں کہ سینے پر سجا لیا...... پگڑی نہیں کہ خوب کلف لگا کر باندھ لی اور بازار میں آ گئے طرہ چھوڑ کر۔ محبت تو روح ہے' آپ کے اندر کا اندر' آپ کی جان کی جان...... محبت کا دروازہ صرف ان لوگوں پر کھلتا ہے جو اپنی انا' اپنی ایگو اور اپنے نفس سے جان چھڑا لیتے ہیں۔

(اشفاق احمد' من چلے کا سودا صفحہ 283)

انتخاب: محمد زبیر...... پاپوش نگر

زیبو کو اپنانے کی بات کرتا۔ زیبو کی مرضی ہاں میں ہونے پر ان کا نکاح آسانی سے ہوجاتا کس خوب صورتی سے اصغر نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ میں اس کی ذہانت پر داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اب مجھے احساس ہورہا تھا کہ شہداد پور میں پہلی ملاقات میں ہی اصغر میرا اتنا اچھا دوست بن گیا تھا کہ اس نے مجھے فیکٹری میں نوکری اور گھر کا بندوبست کردیا۔ ضرور اس میں اصغر کا لالچ تھا اس نے زیبو کو دیکھ لیا ہوگا' اسے پانے کی جستجو میں اس نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھادیا اور حالات اس کے موافق آتے گئے وہ جو چاہ رہا تھا وہ ہوتا چلا گیا۔

عورتوں میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ غیر مردوں کی آنکھوں میں جھانک لیتی ہیں کہ وہ اس سے کیا چاہتا ہے اس لیے زیبو ابتدا میں اصغر کے سامنے آنے سے کتراتی تھی اسے اصغر کی آنکھوں میں ہوس نظر آتی تھی۔ میرے سامنے اب ہر چیز ایک ایک کر کے واضح اور شفاف ہوتی جارہی تھی۔ میرے دل میں اصغر کے لیے نفرت ہی نفرت تھی وہ کسی بھی صورت دوستی کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے دل میں یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اصغر سے کسی بھی قسم کا تعلق نہیں رکھوں گا۔ چاہے وہ مجھے نوکری سے بھی کیوں نہ نکلوادے۔

زیبو کی جدائی میں ایک ایک پل بھاری بن کر گزر رہا تھا' ایک ہفتہ پہاڑ بن کر جیسے تیسے گزر گیا۔ اس دوران میری دوبار ہی زیبو سے موبائل پر بات ہوئی تھی اور اس نے اس بات کا اشارہ دے دیا تھا کہ برف پگھل رہی ہے ابھی کچھ اور وقت لگے گا میں اس امید پر کچھ دن اور گزر جائیں زیبو پھر سے میرے پاس ہوگی۔ دوسرے ہفتے زیبو نے مجھے ایسی بات بتائی کہ میرا غصہ برداشت سے باہر ہوگیا۔ اصغر نے زیبو سے اس کے بھائی مشرف کا موبائل نمبر لے لیا تھا اور اب وہ میرے خلاف زہر اگل رہا تھا جس سے میرا بنتا کام بگڑنے لگا تھا۔ اس نے مشرف کو یہ بھی بتادیا تھا کہ زیبو ایک مہینے اس کے نکاح میں رہتی ہے۔ اصغر نے میرے ساتھ یہ اچھا نہیں کیا تھا اس نے میرا بنتا کام بگاڑ دیا تھا۔ غصہ مجھے زیبو پر بھی آرہا تھا کہ اس نے آخر اصغر کو مشرف کا موبائل نمبر کیوں دیا لیکن میں اس پر غصہ کر کے کام کو پیچیدہ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ میرے لیے اصغر بھی بہت بھاری پڑ رہا تھا۔ ایسے میں زیبو کی ناراضگی کام کو بالکل ہی خراب کردیتی۔ مجھے ان حالات میں زیبو سے بنا کر رکھنی تھی تبھی حالات میرے قابو میں رہ سکتے تھے۔

اس بات کو دو دن گزرنے پر میرے غصے کی شدت میں کمی آنے سے میں اب یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ اصغر سے دوبارہ دوستانہ تعلقات بحال کیے جائیں اور وہ زیبو سے جسمانی تعلقات قائم رکھنے کی غرض سے میں جو اسے کہوں گا وہ مان لے گا۔ اس طرح جب زیبو میرے پاس آجائے گی میں چپکے سے فیصل آباد نکل جاؤں گا۔ اس فیکٹری سے کئی لوگ کام چھوڑ کر فیصل آباد میں جا کر کام کررہے تھے۔ میری ان سے فیکٹری میں اچھی دوستی ہوگئی تھی اور میرا اب بھی ان سے موبائل پر رابطہ تھا اور جب میں نے ان سے مذاق میں کام دلانے کی بات کی تھی تو انہوں نے مجھے بھرپور کام دلانے کی یقین دہانی کرائی تھی اس لیے مجھے زیبو کو فیصل آباد لے جانے کا خیال آگیا تھا۔

فیکٹری سے چھٹی ہونے پر راستے میں ہی میری ملاقات اصغر سے ہوگئی' میں اس سے باتیں کرتا ہوا اپنے گھر لے آیا۔ فیکٹری کے کسی بھی مزدور نے ہمیں ملاقات کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

''اصغر! آخر تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''میں تم سے کچھ نہیں چاہتا۔''

''پھر تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ تم زیبو کے بھائی کو میرے خلاف کیوں اُکسا رہے ہو۔ تم میرے دوست ہو تمہیں معاملات کو سلجھانے میں میری مدد کرنی چاہیے۔''

''تم نے خود معاملات الجھائے ہیں، تمہیں ضرورت کیا تھی زیبو کو بُری طرح پیٹنے کی۔'' وہ بولا۔

''مجھ سے غلطی ہوگئی تھی تم دوست ہو تمہارا فرض تھا کہ اسے سمجھاتے مگر تم نے الٹا اسے میرے خلاف بھڑکا کر میکے جانے کا مشورہ دے دیا۔''

''ظاہر ہے وہ کوئی غلط فیصلہ کر کے خود کو نقصان پہنچاتی، میں نے بہتر یہی جانا کہ اسے میکے جانے کا مشورہ دے دیا۔''

''اسے کہتے ہیں دوستی، تم نے میری پیٹھ میں خنجر گھونپا ہے۔ میں نے غصے میں آ کر زیبو کی پٹائی کر بھی دی تھی تو میں اس کا شوہر ہوں۔ تم زیبو کو اتنے ہی اچھے ہمدرد بنتا چاہ رہے تھے تو مجھے بلا کر معاملے کو رفع دفع کرتے تم نے نا صرف اسے میکے بھجوا دیا اور اب مشرف کو میرے خلاف بھڑکانے میں مصروف ہو۔'' نا چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔

''میں نہیں چاہتا کہ زیبو تم جیسے جنگلی کے پاس رہے۔'' اصغر نے کہا۔

''میں جنگلی ہوں؟'' میں غصے سے چیخا۔

''ہاں تم جنگلی ہو، جبھی تم نے زیبو کی اس طرح درگت بنائی ہے۔ انسان کم از کم اپنی بیوی سے اس طرح کا سلوک نہیں کرتا۔''

''اصغر تم باز آ جاؤ اور میرا گھر خراب کرنے کی کوشش مت کرو۔'' میں نے التجا کی۔

''میں پہلے بھی ایک کوشش کر چکا ہوں زیبو سے نکاح میں نے اس غرض سے کیا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور تمہارا کام بن جائے مگر تم نے

دعا

اے اللہ ہم عاجز بندے ہیں تیری پاکی بیان کرتے ہیں اور تیرے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ اے اللہ ہمارے صغیرہ کبیرہ چھوٹے بڑے ظاہر باطن اگلے پچھلے سارے گناہوں کو معاف فرما دے ہماری خطاؤں کو درگزر فرما ہم سچے دل سے توبہ کرتے ہیں ہماری خطاؤں کو معاف فرما۔ اے اللہ جو جان کے گناہ کیے ہیں اور جو انجانے میں ہوئے ہیں سب کو اپنے حبیب پاک ﷺ اور قرآن پاک کے صدقے میں معاف فرما۔ اے اللہ ہمیں نجات عطا فرما تیری معافی بڑی چیز ہے۔ اے اللہ اگر تو نے معاف نہ کیا تو ہم کس کے در پر جائیں گے۔ اے اللہ تیرا در اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک ہمیں معافی نہ مل جائے اے اللہ اگر تو نے معاف نہ کیا تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اے اللہ بے روزگار کو روزگار عطا فرما۔ اے اللہ ہمارے نگہبان ہمارے جان و مال عزت و آبرو مکان دکان سب چھوٹے بڑوں کی پوری طرح حفاظت فرما۔ اے اللہ ہمیں ہر قسم کی بلاؤں سے ناگہانی آفتوں اور مصیبتوں سے بچا اور اچانک موت سے بچا۔ ہمارے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ فرما۔ اے اللہ ہماری گھریلو مشکلات کو حل فرما ہمارے گھروں میں خیر و برکت عطا کر اے اللہ ہم سب کے گھر والوں میں سچی محبت اور پیار عطا فرما۔ اے اللہ! ماں باپ، بہن بھائیوں خاوندوں بیویوں میں سچی محبت دے اے اللہ بچھڑے ہوؤں کو ملا دے روٹھے ہوئے کو منا دے۔ اے اللہ ہماری دلی تمنائیں پوری فرما۔ اے اللہ ہمارے لڑکے لڑکیوں کو پاک دائمی نصیب فرما نیک ازواج نصیب فرما۔ ہم سب کا نصیب اچھا کر دے۔ اے قدرت والے ہماری ساری الجھنوں کو دور کر دے اور ہماری نیک مرادیں پوری کر دے اے اللہ ہم سب مسلمانوں کو دیس اور پردیس میں چین امن و سلامتی عطا کر۔ اے اللہ تنگ دستوں کی تنگدستی دور فرما۔ اے اللہ بے اولاد کو نیک اور صالح اولاد عطا فرما۔ اے اللہ حضرت آدمؑ جیسی توبہ نصیب فرما۔ اے اللہ ہمیں حضرت یعقوبؑ جیسی گریہ و زاری عطا فرما۔ اے اللہ حسن یوسفؑ جیسا حسن عطا فرما۔ اے اللہ حضرت ابراہیمؑ جیسی دوستی نصیب فرما۔ اے اللہ حضرت ایوبؑ جیسا صبر عطا فرما۔ اے اللہ حضرت داؤدؑ جیسا سجدہ شکر نصیب فرما۔ اے اللہ حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسا سچا بنا۔ اے اللہ حضرت عمرؓ جیسی خدمت اسلام رعب و دبدبہ شان و شوکت عطا فرما۔ اے اللہ حضرت عثمانؓ جیسی شرم و حیا اور خزانہ عطا کر۔ اے اللہ حضرت علیؓ جیسی شجاعت بہادری و سخاوت عطا فرما۔ اے اللہ حضرت محمد ﷺ جیسے تمام عمل نصیب فرما۔

محمد حسان محمد فرقان..... نارتھ کراچی

میرے خلوص کی قدر کرنے کی بجائے مجھ پر ہی شک کرنا شروع کر دیا۔''

''میں بھی انسان ہوں اور غلطی انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔ مجھ سے غلطی ہوگئی کہ میں نے تمہارے خلوص پر شک کیا اب ان باتوں کو بھلا دو اور میرے بگڑے کام کو سنوار دو۔'' میں نے کہا۔

''تم نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی تھی میں پھر بھی تمہاری التجا پر غور کروں گا۔'' وہ بولا۔

میں اس کی باتوں میں آ گیا اور اصغر کو اپنا ہمدرد سمجھ کر توقع کرنے لگا تھا کہ وہ ہمیں دوبارہ ملانے میں اہم کردار ادا کرے گا مگر یہ محض میرا خیال تھا حقیقت یہ ہی تھی کہ اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور اسے فائدہ جبھی ہو سکتا تھا جب ہم دونوں میں علیحدگی ہو جاتی۔ میں جب زیبو سے موبائل پر بات کرتا تو وہ ہر دفعہ ایک نئی بات کہہ دیتی تھی۔ اس نے کھل کر زیبو کو کہہ دیا تھا کہ وہ ہر صورت میں اسے اپنانا چاہتا تھا جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میں محسوس کر رہا تھا کہ زیبو کے لہجے میں اپنائیت پن ختم ہوتی جا رہی ہے اور مجھ سے بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ ایسا ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتی ہے مجبوراً میرے کال کرنے پر بات کر لیتی ہے۔ میرے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اس راہ کے کانٹے کو ہی ہٹا دوں اس دوران میں نے اصغر سے اپنا رویہ اچھا رکھا ہوا تھا اس لیے کسی کو مجھ پر کسی بھی قسم کا شک نہیں ہو سکتا تھا۔

میں فیکٹری جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اصغر آ گیا' مجھے اتنی صبح اسے دیکھ کر حیرت ہوئی۔

''خیریت ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بھئی خیریت ہی ہے' میں گھر سے فیکٹری کو نکلا تھا کہ راستے میں مجھے خیال آیا کہ میری موٹر سائیکل کے کاغذات رات تمہارے گھر ہی بھول گیا تھا' وہ کاغذات لینے آیا ہوں۔''

''ہاں ہاں آؤ۔'' میں نے اسے راستہ دیا اور ایک نظر گلی پر ڈالی۔ گلی میں مکمل سناٹا تھا' اصغر کی موٹر سائیکل بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

''اصغر تمہاری موٹر سائیکل کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''موٹر سائیکل میں کوئی خرابی ہو گئی ہے اس لیے میں بس سے آیا ہوں۔'' اصغر نے بتایا۔ ''ارے یہاں تو کاغذات نہیں ہیں۔''

''کیا تمہیں اچھی طرح سے یاد ہے کہ کاغذات یہاں رکھے تھے۔'' میں نے سنگھار میز کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بھئی مجھے اچھی طرح سے یاد ہے میں جب رات تم سے ملنے آیا تھا میں نے کاغذات یہاں ہی رکھے تھے مگر اب نہیں ہیں۔''

''تم اچھی طرح سے دیکھ لو' ہو سکتا ہے کہیں اور تم نے کاغذات رکھے ہوں۔ میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں۔'' میں کچن کی طرف بڑھ گیا۔

''چائے کا تکلف نہیں کرو' میں گھر سے ناشتا کر کے نکلا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں ایک چائے اور سہی۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

رات کو جب میرے پاس سے اصغر گیا تھا میں نے اسی وقت ذہن بنا لیا تھا کہ میں ہر صورت میں اس کانٹے کو ہٹا کر رہوں گا اس مقصد کے لیے میں خواب آور گولیاں بھی لے آیا تھا۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ میں اتنی جلدی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اصغر کے راستے سے ہٹ جانے سے پھر کوئی بھی زیبو یا اس کے بھائی کو بہکانے والا نہیں ہوگا پھر میرا کام بہت آسان ہو جائے گا۔ میں نے چائے کی پیالی میں خواب

آور گولیاں ملادی تھیں' چائے پینے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا میں چلتا ہوں۔''

''وہ کاغذات مل گئے؟''

''نہیں بھئی وہ کاغذات میں کہیں اور ہی بھولا ہوں۔''

''ایک بار پھر کوشش کر لیتے ہیں ہوسکتا ہے کہ نیچے کہیں گر گئے ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں مسہری کے نیچے جھانکا۔ میری دیکھا دیکھی وہ بھی ایک بار پھر ادھر اُدھر کاغذات تلاش کرنے لگا تھا اس دوران خواب آور گولیوں نے کام دکھایا اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اسے بے ہوش دیکھ کر خوشی کے مارے میری باچھیں کھل اٹھیں۔ میں نے بلاتا چھرے سے خیر وار کر کے اصغر کی گردن الگ کردی' اس کے جسم کو پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر تھیلی کا منہ اچھی طرح منہ کر دیا تاکہ خون باہر نہ پھیل سکے اور سر کو بھی ایک چھوٹی تھیلی میں بند کر کے کمرے کی اچھی طرح سے صفائی کر دی۔ فیکٹری جانے سے پہلے میں اصغر کی لاش کو مسہری کے نیچے چھپانا نہیں بھولا تھا' فیکٹری میں سارا دن میں اپنی کارروائی پر خوش بھی ہو رہا تھا اور خوف زدہ بھی کہ کہیں میں قتل کے الزام میں دھر لیا نہ جاؤں۔ مجھے رات ہی میں لاش کو ٹھکانے لگانا تھا' فیکٹری میں کوئی بھی ذرا تیز بولتا میں گھبرا جاتا۔ میرے دل میں چور تھا اس لیے بھی خوف زدہ تھا۔

شام کب ہوئی پتا ہی نہیں چلا' ہر لمحے مجھے یہ دھڑکا لگا رہا کہ اب پولیس مجھے گرفتار کرنے آئی' اب پولیس گرفتار کرنے آئی۔ چھٹی ہونے پر میں پُرسکون ہو کر فیکٹری سے نکل آیا۔ رات کو جیسے تیسے میں نے کھانا کھایا اور لوڈ شیڈنگ کا انتظار کرنے لگا' ہمارے علاقے میں لوڈ شیڈنگ کا وقت رات میں گیارہ بجے سے ایک بجے کا تھا۔ لاش ٹھکانے

لگانے کے لیے اس سے اچھا وقت کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ لاش کو میں نے کپڑے میں لپیٹ کر گٹھڑی نما بنا کر اپنے کاندھے پر رکھ لیا' گندا نالا میرے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا پھر بھی میرا ایک ایک قدم من من بھر کا ہو رہا تھا۔ ساتھ ساتھ مجھے یہ خوف بھی تھا کہ کہیں کوئی پولیس موبائل نہ آ جائے وہ رات کی تاریکی میں مجھے مشکوک سمجھ کر چیک کر سکتی تھی۔

گھر سے گندے نالے تک کا سفر میں نے جیسے تیسے کر کے طے کر ہی لیا۔ میں نے سب سے پہلے اصغر کا سر گندے نالے میں پھینکا پھر اس کا جسم مگر یہ کیا وہ پانی کے اوپر ہی گرا نظر آ رہا تھا۔ پانی کی تہہ میں نہیں جا رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے گندے نالے میں جھانکا' گندے نالے میں بروقت صفائی نہ ہونے کے سبب کچرے کی تہہ پانی کی اوپری سطح پر جم گئی تھی۔ اس لیے اصغر کا جسم پانی کی تہہ کے اندر نہیں جا سکا۔ دور مجھے گاڑی کی بتیاں نزدیک آتی دکھائی دیں۔ میرے پاس اب اتنا وقت نہیں تھا کہ اصغر کی لاش کو گندے نالے میں سے نکال کر ایسی جگہ ڈال سکوں کہ وہ پانی کی تہہ میں چلا جائے میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک گلی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے پلٹ کر آنے والی گاڑی کو دیکھا' وہ پولیس موبائل تھی۔ موبائل دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے اور ہاتھ پاؤں پھول گئے اب میرا پکڑا جانا یقینی تھا۔ اس وقت وہاں میں ہی تھا پولیس شک کی بنیاد پر مجھے پکڑ لیتی اور میں پکڑا جاتا۔ میں اپنی سوچوں میں غرق تھا کہ پولیس موبائل تیزی سے وہاں سے گزر گئی وہ شاید جلدی میں تھے۔ اس لیے انہوں نے اِدھر اُدھر نظریں نہیں دوڑائیں ورنہ میرا پکڑا جانا یقینی تھا۔ پولیس موبائل کے چلے جانے پر میں سکون کے ساتھ گلی میں آہستہ آہستہ بڑھتا ہو گھر کو چل گیا۔ میں لاش کو ٹھکانے لگا چکا تھا اگر اصغر کی لاش پولیس کو مل بھی جائے تو کوئی بھی مجھ پر شک نہیں کر سکتا تھا کیونکہ کسی نے بھی اصغر کو میرے گھر آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور اس کی لاش بھی پولیس کو فیکٹری کے نزدیک ملنے پر وہ گمنام ملزم کو تلاش کرتی پھرے گی میں نے اپنے طور پر بہت اچھا کام کیا تھا پھر بھی ایک انجانا سا خوف مجھے خوفزدہ کیے ہوئے تھا' میں مجرم تھا میں نے اصغر کو قتل کیا تھا۔

رات بھر مجھے نیند نہ آ سکی' آنکھ لگتی اور پھر ایک جھٹکے سے کھل جاتی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے پولیس دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے وہ مجھے گرفتار کرنے کو بے قرار ہے۔ صبح جب میں نے اپنی صورت آئینے میں دیکھی ایسا لگا کہ جیسے میں برسوں کا بیمار ہوں۔ آنکھوں میں سرخی تھی' ناشتا کرتے ہوئے میں ایک فیصلہ کر چکا تھا' اس سے پہلے کہ پولیس مجھے شک کے الزام میں گرفتار کر کے سچ اگلوائے یہ شہر چھوڑ دینا چاہیے۔ میں فیصل آباد جانے والی کوچ کے اڈے پر پہنچا' کوچ فیصل آباد جانے کو تیار کھڑی تھی میں ٹکٹ لے کر کوچ میں سوار ہو گیا۔

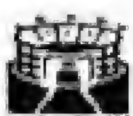
میں کتنے دن کے لیے فیصل آباد جا رہا ہوں یہ مجھ کو بھی خبر نہیں تھی۔ بس اتنا پتا تھا جب پولیس اصغر کے قتل کے مقدمے کی فائل کو بند کر دے گی اور زیبو کے گھر والے ناراضگی ختم کر دیں گے اس وقت میں خاموشی سے ہالا جاؤں گا اور زیبو کو لے کر فیصل آباد آ جاؤں گا۔

فیصل آباد پہنچ کر میں نے وسیم سے رابطہ کیا' فیکٹری میں وہ میرا بہت اچھا دوست بن گیا تھا۔ میرے کال کرتے ہی وہ مجھے لینے بس اسٹاپ پہنچ گیا اور اپنے گھر لے گیا۔ اپنے گھر والوں سے میرا تعارف کرایا' وہ بھی مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے' دو تین دن میرے گھومنے پھرنے میں گزرے پھر

میں بھی فیکٹری کام کرنے جانے لگا تھا۔ وسیم نے فی الحال میرے رہنے کا بندوبست بیٹھک میں ہی کر دیا تھا۔ گھر والوں کو میں نے یہ بتایا کہ میں فیکٹری کے کام سے چند ماہ کے لیے لاہور جا رہا ہوں۔ لاہور سے آ کر میں خود ہی رابطہ کر لوں گا۔ موبائل بند کر کے رکھ دیا تھا' ایک ماہ کا عرصہ بیت جانے پر میں نے موبائل کو دوبارہ آن کر دیا تھا میں تقریباً روزانہ ہی زیبو سے بات کرتا تھا۔ زیبو کی زبانی مجھے علم ہوا کہ اصغر کا قتل ہو چکا ہے اور پولیس ملزم کو تلاش کر رہی ہے۔ میں نے اس بات کو اہمیت نہیں دی کیونکہ اصغر کو قتل کرنے والا میں خود ہی تھا اور میں اس کے قتل میں دلچسپی لے کر پھنسنے والے کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ زیبو کے گھر والے بھی مجھ سے ناراضگی ختم کر چکے تھے کبھی کبھار وہ بھی مجھ سے بات کر لیتے تھے اور پوچھتے رہتے تھے کہ میں کب آ رہا ہوں میں انہیں جلد آنے کا کہہ کر ٹال دیتا تھا۔ مجھے بھی یہ علم نہیں تھا کہ میں کب زیبو کو لینے جاؤں گا۔ مجھے صرف اصغر کے قتل کے مقدمے کی فائل کے بند ہو جانے کا انتظار تھا یہ انتظار طویل ہوتا جا رہا تھا۔ پولیس جلدی سے ہار ماننے کو تیار نہیں تھی یہ سب باتیں زیبو کے ذریعے ہی معلوم ہوتی تھیں۔ زیبو کے پڑوس میں ہی اصغر کی خالہ کا گھر تھا اور اصغر کی خالہ کا ان کے گھر خوب آنا جانا تھا۔

ایک شام کو میں فیکٹری سے چھٹی ہو جانے پر گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک مزدور بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ منیجر صاحب مجھے بلا رہے ہیں میں جب منیجر کے آفس میں گیا وہاں چار پولیس والے بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ منیجر صاحب نے میرا تعارف ان سے کرایا' مجھے حیرت ہوئی کہ وہ پولیس سے میرا تعارف کیوں کرا رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں انہوں نے مجھ سے اگلوا لیا کہ میں کراچی کی کسی فیکٹری میں کام کرتا رہا ہوں میں نہ بھی بتاتا تو منیجر خود بتا دیتا کیونکہ اسے بھی یہ معلوم ہوتا کہ اچانک پولیس کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے اور دو سپاہیوں نے آگے بڑھ کر میرے دونوں ہاتھوں میں آہنی کڑیاں لگا دیں اور بتا دیا گیا کہ مجھے اصغر کے قتل کے شبے میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ جس دن اصغر کی لاش پولیس کو ملی تھی اس دن سے میں فیکٹری میں وجہ بتائے بغیر غیر حاضر تھا اور پولیس مجھے تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ میں موبائل کی رینج سے پکڑ میں آ گیا تھا اگر میں موبائل بند رکھتا تو کبھی بھی پولیس کے قابو نہیں آ سکتا تھا۔ کراچی پہنچ کر میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اپنے قاتل ہونے کا کسی صورت میں بھی اقرار نہیں کروں گا مگر پولیس نے مجھ سے قتل کا اقرار کرا کے ہی دم لیا۔

مجھے عدالت میں پیش کر کے پہلے پولیس نے ریمانڈ حاصل کیا اور پھر اپنی پوری تفتیش کر کے جیل بھجوا دیا۔ میرا جرم ثابت ہو چکا تھا' عدالت سے سزا ملنی ہی تھی آج نہیں تو کل سزا ہونی تھی۔ ہاں میں نے پولیس کے تمام تر تشدد کے باوجود انہیں قتل کی وجہ نہیں بتائی تھی کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس قصے میں زیبو کا نام آئے حالانکہ وہ ایک بار بھی مجھ سے ملنے عدالت نہیں آئی تھی۔



ساتواں قتل

دستگیر شہزاد

ایک ایسے شخص کا احوال' وہ رزق حلال کے چکر میں قاتل بن گیا تھا مظلوم سے ظالم بن جانے والے ایک نوجوان کی سرگزشت' جو آپ کو ہلا کر رکھ دے گی۔
مختصر مگر خوب صورت تحریر' گداز دلوں کے لیے بطور خاص۔

15 ستمبر 2012ء کی بات ہے صبح 7:05 پر تھانہ پھول پور کے لینڈ لائن فون کی گھنٹی بجی اس وقت ایس آئی علی جان ڈیوٹی پر تھے انہوں نے فون اٹھا کر کان سے لگایا دوسری طرف سنجیدہ آواز میں کہا گیا' میرا نام عرفان جٹ ہے۔

''بتایئے جٹ صاحب! آپ کہاں سے بول رہے ہیں اور ہم آپ کی کیا سیوا کر سکتے ہیں۔'' علی جان نے پوچھا۔

''سیوا تو میں پولیس والوں کی کر چکا ہوں' سیوا بھی ایسی سردار حمزہ سنے گا تو اپنے بال نوچ لے گا۔'' تلخ لہجے میں کہا گیا۔ یہ براہ راست پولیس کی توہین تھی' علی جان نے پوری بات بتا کر فون سردار حمزہ کو پکڑا دیا۔

''سچ بتا تُو ہے کون اور یہ کیسی بکواس کر رہا ہے؟'' سردار حمزہ کو غصہ آ گیا۔

''سن......'' دوسری طرف سے شیطانی قہقہہ لگایا گیا۔ ''رات کو میں نے ایک قتل کیا ہے' پہلے رسّی سے گلا گھونٹا چھرے سے اس کا سر دھڑ سے الگ کر دیا۔ سچ ایسا کرنے میں مجھے بہت لطف آیا' اس کے بعد دھڑ کو میں سینٹرل جیل کے سامنے پھینک آیا۔'' بات پوری کرنے کے بعد اس نے پھر سے شیطانی قہقہہ لگایا۔

''مقتول کا سر کہاں ہے؟''

''ساری باتیں مجھ سے ہی پوچھے گا' کچھ اپنے کرنے کے لیے بھی تو باقی رکھ۔ پیسہ عوام کا ہو یا سرکار کا تم پولیس والوں کو بغیر محنت کیے حرام کھانے کی عادت پڑ گئی ہے' تم لوگ خود پتا کرو کہ سر کہاں ہے۔ ایمانداری سے ڈھونڈو گے تو مل جائے گا۔'' اس کے بعد عرفان جٹ نے سردار حمزہ سمیت پوری پولیس فورس کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ جواب میں سردار حمزہ نے ایک گالی دی تو دوسری طرف انہیں سو گالیاں سننے کو ملیں' فون کرنے والے نے ایک شعر بھی سنایا۔

پیدا ہوئی پولیس تو شیطان نے کہا
لو آج ہم بھی صاحب اولاد ہو گئے

سردار حمزہ نے دماغی گھوڑے دوڑائے تو انہیں لگا کہ فون کرنے والا کوئی سنکی' پاگل یا چرسی ہے جو انہیں مسلسل گالیاں دیئے جا رہا ہے۔ انہوں نے فون رکھ دیا۔

عرفان جٹ کے فون پر سردار حمزہ نے سنجیدگی سے سوچا جب پندرہ منٹ بعد ہی سات بج کر بیس منٹ پر بذریعہ وائرلیس اطلاع آئی کہ سینٹرل جیل کے گیٹ نمبر 3 کے سامنے بوری میں لاش ملی ہے۔ بوری سے خون بھی رس رہا ہے' موقع پر پہنچ کر مناسب کارروائی کی جائے۔ اطلاع روزنامچہ میں درج کرنے کے بعد سردار حمزہ نے ایس آئی شاہد علی' کانسٹیبل زاہد حسین کو ساتھ لیا اور سینٹرل جیل کے گیٹ نمبر 3 کے سامنے پہنچ گئے وہاں سڑک کنارے حقیقت میں ایک بورا رکھا ہوا تھا جس پر مکھیوں نے بھنبھنانا شروع کر دیا تھا۔ سردار حمزہ نے بورا کٹوایا تو اس میں سے ایک لاش نکلی' کسی نوجوان کی سر کٹی لاش۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ عرفان جٹ کی کال فرضی نہیں تھی' قاتل اپنا جرم بھی چھپانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے پولیس کو بھی فون کر دیا تھا معاملہ اب معمولی نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے سنجیدہ شکل اختیار کر لی تھی' اس لیے ایس ایچ او شہرام بٹ جتنی جلدی ہو سکتا تھا انسپکٹر احتشام حسن کو ساتھ لے کر سینٹرل جیل کے گیٹ نمبر 3 کے سامنے پہنچ گئے۔

وہ سر کٹی لاش قاتل کی حیوانیت کا جیتا جاگتا ثبوت تھی۔ شہرام بٹ سوچنے لگا قاتل نے کسی کا قتل کر ہی دیا تھا تو اس کی پوری لاش کو ہی ٹھکانے لگا سکتا تھا اس کے ٹکڑے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ قاتل نے لاش کے ٹکڑے بے مقصد نہیں کیے ہوں گے' شہرام بٹ ابھی لاش کا معائنہ کر ہی رہے تھے کہ ان کے سیل فون کی گھنٹی بجی' شہرام بٹ نے لیس کا بٹن دبا کر فون کان سے لگا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف شیطانی قہقہہ سننے کو ملا اس بدتمیزی پر شہرام بٹ کا موڈ خراب ہو گیا۔

"ابے کون ہے تو......؟"

"عرفان جٹ......" جواب ملا۔ "سر کٹی لاش دیکھ رہے ہو نا' کیسی لگی؟ میں ایکسپرٹ تو نہیں ہوں پھر بھی گردن صفائی سے کاٹنے کی کوشش کی ہے تاکہ تم پولیس والوں کو دیکھنے میں کٹی گردن بری نہ لگے۔ یہ بھی جان لو کہ سر کٹی لاش کسی اور نے نہیں میں نے ہی سینٹرل جیل کے گیٹ نمبر 3 کے سامنے پھینکی ہے۔" اس کے بعد فون کرنے والے نے شہرام بٹ کو بھی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ شہرام بٹ جانتا تھا کہ گالیاں سننے سے فائدہ نہیں اس لیے انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد مقتول کی شناخت اور قاتل کا سراغ ڈھونڈنے کے لیے شہرام بٹ نے موقع پر کرائم ٹیم بلالی' کرائم ٹیم کے ساتھ پھول پور پولیس نے لاش کا باریکی سے معائنہ کیا تو پتا چلا کہ اس کے بائیں شانے پر بچھو کا ٹیٹو بنا تھا' ایسا ہی ٹیٹو دائیں ہاتھ پر بھی بنا تھا اور اس کے ساتھ اردو میں نام گدا ہوا تھا ثمر چوہدری...... اس سے یہ امکان پیدا ہوا کہ مقتول کا نام ثمر چوہدری رہا ہو گا حالانکہ یہ بھی ممکن تھا کہ ثمر چوہدری مقتول کا نام نہ ہو اور اس کے کسی رشتہ دار کا ہو۔

تقدیر کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ اپنی ہر اچھائی کو مناسک اللہ سمجھو لیکن برائی کے ضمن میں کوئی جواز پیش کرنے کے بجائے ایک واضح احساس پشیمانی کے ساتھ کہو کہ یہ سب کچھ میرا اپنا کیا دھرا ہے۔ وہ بورا جس میں لاش رکھ کر پھینکی گئی تھی اس کی بھی اچھی طرح سے تلاشی لی گئی تو اس کے اندر نیلی پولی تھین رکھی ملی' پولی تھین کھول کر دیکھنے پر اس میں ایک خط ملا پولیس کو چیلنج دینے والا یہ خط اردو میں لکھا تھا۔

"پولیس والو! پہلی لاش کا میرا تحفہ قبول کرو' ہر پندرہ دن میں میں تمہیں ایسی ہی کئی لاشوں کے تحفے دیتا

رہوں گا۔" اب کوئی شبہ نہیں رہ گیا کہ قاتل کوئی سر پھرا یا سنکی ہے۔ اسی دوران علی جان کو مدعی بنا کر مقدمہ قتل کے تحت معاملہ درج کرلیا گیا۔ موقع پر موجود پولیس کو پنچ نامہ بنا کر لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجنے کی ہدایت دے کر شہرام بٹ نے اس نمبر پر کال بیک کی جس سے فون کر کے انہیں گالیاں دی گئی تھیں۔ رابطہ قائم ہونے پر امید کے مطابق وہ نمبر پی سی او کا تھا' پتا پوچھ کر شہرام بٹ اور احتشام حسن پی سی او جا پہنچے جو پھول پور میں ہی تھا اور اس کا مالک عبدالقدیر تھا۔ پی سی او پر قدیر کا نوکر وارث علی ملا' ہاتھ جوڑ کر وہ بولا۔

"صاحب! میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ آدمی فون پر کسی کے قتل کی بات کرے گا اور آپ لوگوں کو گالیاں دے گا۔" شہرام بٹ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"تم اسے روک سکتے تھے۔"

"سر جی! میں نے اسے منع کیا تھا کہ ایسی باتیں ہمارے یہاں مت کرو' مگر وہ مجھے بھی دھمکی دینے لگا جیسے اس کے ٹکڑے کر کے پھینکے ہیں ویسے ہی تیرے بھی ٹکڑے کردوں گا۔ فون کرنے کے بعد اس نے پیسے بھی نہیں دیئے اور مجھے گالیاں دیتا ہوا چلا گیا۔"

"یہ بتاؤ دوسری بار بھی تو وہ آدمی تمہارے یہاں فون کرنا آیا تھا۔"

"ہاں صاحب آیا تھا۔" وارث علی نے بتایا۔ "اس کی دھمکی سے میں اس قدر ڈرا ہوا تھا کہ اسے منع نہیں کرسکا۔ فون پر اس نے پھر قتل کی بات کی' گالیاں دیں اور پہلے کی طرح مجھے گھورتے ہوئے چلا گیا۔"

"وہ دیکھنے میں کیسا تھا؟"

"عام آدمیوں جیسا تھا مگر اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی اور آنکھوں میں جیسے خون بھرا ہوا تھا۔ پولیس کو گالیاں دینے کے بعد وہ خوش نظر آرہا تھا۔"

"تم ہمارے ساتھ چلو اور اپنی یادداشت سے اس حیوان کا اسکیچ بنواؤ۔" وارث علی فوراً راضی ہوگیا' اس نے پی سی او بند کیا اور پولیس کی گاڑی میں بیٹھ گیا' پولیس اسے آرٹسٹ کے پاس لے گئی۔ تھوڑا وقت ضرور لگا مگر اسکیچ بن گیا۔

پھول پور پولیس نے اس اسکیچ کی بنیاد پر قاتل کو پکڑنے کی مہم چلائی' اخباروں میں اشتہارات دیئے' نیوز چینل پر نشر کرایا' پوسٹر چھپوا کر عوامی مقامات پر لگوائے مگر نتیجہ صفر رہا چونکہ قاتل نے ہر پندرہ دن میں پولیس کو کٹی ہوئی لاشوں کا تحفہ دینے کے لیے خط لکھا تھا' اس لیے صرف پھول پور ہی نہیں ضلع کے سب ہی علاقوں میں پولیس گشت بڑھادی گئی۔

پندرہ دن بعد پولیس کو کوئی سر کٹی لاش تو نہیں ملی لیکن اس دوران خود کو عرفان جٹ بتانے والے قاتل کا سراغ بھی نہیں ڈھونڈ پائی۔ وقت گزرنے کے ساتھ پولیس کا جوش بھی ٹھنڈا پڑنے لگا اور تفتیش بھی ٹھنڈی ہوگئی۔

ثمر چوہدری کی سر کٹی لاش ملنے کے تقریباً 8 مہینے بعد سنکی قاتل نے پولیس کے سامنے پھر سے چیلنج کیا۔ 24 اپریل 2013ء کی صبح آٹھ بجے جیل کے حفاظتی گارڈ فرخ رانا نے سنٹرل جیل گیٹ نمبر 3 پریڈ گراؤنڈ کے نزدیک ایک کارٹن لاوارث پڑا دیکھا۔ وہ کارٹن لاوارث ہونے کے ساتھ مشتبہ بھی تھا' فرخ رانا نے یہ بات اپنے ساتھ کام کرنے والے ذیشان کو بتائی اور اس نے 8 بج کر 28 منٹ پر پولیس ہیڈ کوارٹر فون کردیا۔ بذریعہ وائرلیس مذکورہ اطلاع تھانہ پھول پور کو دی گئی' وہاں سے اے ایس آئی کوثر علی اور کانسٹیبل تنویر احمد فوراً موقع پر پہنچے۔ احتیاط کے ساتھ کارٹن کھول کر دیکھا تو اس میں سفید چادر میں لپٹا ہوا بیس تیس سالہ نوجوان کا دھڑ ملا۔ مقتول کا سر' ہاتھ پیر کٹے ہوئے تھے اور اس کا عضو تناسل بھی کاٹ کر جسم سے الگ کردیا گیا تھا۔

یقینی بات تھی کہ مقتول کے باقی اعضاء کو کہیں اور ٹھکانے لگایا گیا تھا' بہرحال موقع پر پہنچی پولیس نے ضروری کارروائی کرنے کے بعد دھڑ کو سول اسپتال کے

مردہ گھر میں محفوظ رکھوا دیا۔ اس قتل کا تھانہ پھول پور میں کیس رجسٹرڈ کرلیا گیا۔ اسی دن نعمان قریشی نے کوکیرہ پل نہر کے قریب ایک بیگ دیکھا جس میں کسی شخص کے کٹے ہوئے پیر رکھے تھے۔ نعمان قریشی نے پولیس کو اطلاع دے دی تو اسلام پورہ چوکی سے ایس آئی قمر عالم موقع پر پہنچے انہوں نے وہ پیر تحصیل اسپتال کے مردہ گھر میں رکھوا دیے۔

اسی روز فروٹ مرچنٹ آفتاب کو اس کی ریڑھی کے پاس لاوارث کارٹن ملا۔ آفتاب کی اطلاع پر تھانہ گلبرگ سے ایس آئی مبشر حسین وغیرہ موقع پر پہنچے انہوں نے کارٹن کھولا تو اس میں سے کسی مرد کے کٹے ہوئے ہاتھ اور عضو تناسل ملا۔ کٹے ہوئے اعضاء کو ایک مقام پر جمع کرکے جوڑا گیا تو علم ہوا کہ تین جگہوں سے ملنے والے کٹے ہوئے وہ اعضاء ایک ہی شخص کے تھے۔ قتل کرنے کے بعد مقتول کے ان اعضاء کو بے رحمی سے کاٹ کر انہیں جسم سے الگ کردیا گیا تھا۔ اپنی طرف سے پولیس نے ساری کوششیں کرلیں لیکن نہ تو لاش کی شناخت ہوسکی نہ قاتل کا سراغ مل سکا۔

اسی طرح 28 مئی کو بھی ٹکڑوں میں ایک تیسری لاش ملی قاتل نے اس لاش کے بھی ٹکڑے الگ الگ جگہوں پر پھینکے تھے۔ اس لاش کے ساتھ ہی پولیس کو ایک خط ملا جس میں ہر پندرہ دن میں ایک لاش ٹکڑوں میں تحفہ دینے کی بات کہی گئی تھی۔ اس لاش کے بعد تو پھول پور میں دہشت کی پرچھائیاں قائم ہوگئیں۔ پولیس نے بھی مان لیا کہ لاشوں کے ٹکڑے کرکے پھینکنے والا سیریل کلر قانون وانتظامیہ کے لیے ایک چیلنج تھا' اس کا آزاد رہنا لوگوں کے لیے خطرناک تھا۔ اس لیے اسے پکڑنے کے لیے پولیس نے اپنی پوری طاقت جھونک دی' اس اسکیچ کا بھی سہارا لیا جو شمر چوہدری کے قتل کے بعد وارث علی نے بنوایا تھا۔ اس بار پولیس کی محنت کارگر ثابت ہوئی ایک مخبر کی اطلاع پر 29 مئی 2013ء کا نشاط آباد کے قریب سے سیریل کلر کو گرفتار کرلیا گیا۔ پوچھ گچھ کرنے پر اس نے اپنا

ماں کے نام

سکھی رکھنا میری ماں کو اے خدا
میرے لب پر رہتی ہے بس یہ دعا
اس کی دعا سے ہوں سرخرو
اس کی بھلائی میری آرزو
ملے گی جہاں میں نہ ماں جیسی چیز
خدا کو بھی ہے اس کی ہستی عزیز
اے میری پیاری ماں (کوثر بتول)

عروسہ پرویز...... کاسیس

......☆☆☆......

دعا

قدم قدم پر ملے اِک نئی خوشی تم کو
اندھیری رات میں مل جائے روشنی تم کو
ہے میری دعا لگ جائے تم کو
مل جائے میرے حیات کے لمحوں کی زندگی تم کو

پلوشہ گل...... کوٹ ادو

نام ابوسفیان بتایا' ابوسفیان کو جس ٹیم نے پکڑا اس میں اسپیشل اسٹاف کے انسپکٹر احتشام حسن' انسپکٹر ابوذر ایس آئی علی حسن اور اے ایس آئی ناظم حسین شامل تھے۔

ابوسفیان کو کسی خفیہ مقام پر رکھ کر پوچھ گچھ کی گئی اس کے سینے میں دفن راز نفرت اور باغی جذبے سامنے آگئے۔

41 سالہ ابوسفیان ولد علی اکبر راجہ جنگ کا باشندہ تھا' اس کا باپ سرکاری ملازمت میں تھا اور ماں ٹیچر تھیں۔ اس کے باوجود ابوسفیان کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ صرف ساتویں تک ہی وہ اسکول گیا تھا' ماں باپ نے بہت کوشش کی مگر وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ ابوسفیان نے جو ایک بار اپنا بستہ کھونٹی پر ٹانگا تو پھر اسے اتار کر دیکھنے پر بھی تیار نہ ہوا۔ کچھ عرصہ تک ابوسفیان گاؤں میں رہ کر مٹر گشتی کرتا

رہا اس کے بعد روزگار کی تلاش میں پھول پور آ گیا۔ ابو سفیان نے پھول پور میں رہ کر سالوں تک چھوٹے موٹے کام کیے، نوکری بھی کی۔ اسی دوران کسی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ کاروبار شروع کر دے اس نے ریڑھی پر سبزی رکھ کر گلی گلی فروخت کرنا شروع کر دی۔ اسے یہ کام راس آ گیا' اس دھندے میں منافع بھی اچھا تھا اور کوئی اس پر حکم چلانے والا نہیں تھا۔ اسی دوران مناہل سے ابو سفیان کی آنکھیں چار ہوئیں' ان دنوں مناہل کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ مناہل کے والد پان کی دکان چلاتے تھے' پہلی ملاقات میں ہی دونوں ایک دوسرے کے ہو گئے اور دونوں نے شادی کر لی۔

یہ 2006ء کی بات ہے' ازدواجی زندگی کی شروعات کے لیے ابو سفیان نے علی پور میں واقع راؤ ضمیر کے مکان میں ایک کمرہ پہلے ہی کرائے پر لے رکھا تھا' مناہل کو وہ وہیں پر لے گیا۔ سال بھر گزرتے گزرتے ان کے گھر ایک بیٹی نے آنکھیں کھول دیں' بیٹی ہوئی اور اخراجات اور بڑھ گئے۔ کنبے کے خرچ پورے کرنے اور اسے سکھ سے رکھنے کے لیے ابو سفیان بڑی محنت کرنے لگا' پائی پائی بچاتا' پولیس والے تھے کہ اس کی کمائی پر دانت گاڑے رہتے۔ ہر جگہ کانسٹیبل اسے روک کر بھتہ وصول کرتے' یہی نہیں ریڑھی سے سبزی بھی اٹھا کر اپنے تھیلے میں رکھ لیتے۔

ڈے گشت پولیس کی گاڑی ملتی تو بہت سارے پولیس والے بھی اس سے ریڑھی پر سبزی فروخت کرنے کی رنگداری وصول کرتے۔ سبزی بیچنا مجبوری تھا' پولیس والوں کو پیسہ دینا بھی مجبوری تھی نہ دیتا تو وہ ان کے علاقے میں دھندا نہیں کر سکتا تھا۔ مجبوری میں وہ پیسہ اور سبزی مفت میں تو دے دیتا مگر اس کا دل خون کے آنسو رونے لگتا۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ ابو سفیان دن بھر میں اتنا پیسہ کما بھی نہیں پاتا تھا جتنا سبزی اور نقدی کے طور پر پولیس والے اس سے وصول لے جاتے۔

محنت کش ابو سفیان کب تک برداشت کرتا اس کے دل میں اس وصولی کے خلاف بغاوت پیدا ہونے لگی اس نے احتجاج کرنا شروع کیا تو زور آور پولیس والوں کو یہ کہاں برداشت کرتا۔ کوئی اس پر لات گھونسے برساتا' کوئی ڈنڈا پھٹکارتا تو کوئی تھانے میں لے جا کر حوالات میں بند کر دیتا۔ اسی کے نتیجے میں ابو سفیان کو جیل جانا پڑا۔

ابو سفیان کو جیل کی سیر کرنا پڑی تو اسے پولیس سے نفرت ہو گئی۔ دل ہی دل میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس کے ساتھ ناانصافی بھلے ہی چند پولیس والوں نے کی ہو لیکن وہ پوری پولیس فورس کو ایسا سبق سکھائے گا کہ تگنی کا ناچ ناچنے لگے۔ پھول پور میں مناہل کے علاوہ ابو سفیان کا کون تھا' اس نے ہی اپنی کوششوں سے اسے ضمانت پر رہا کرایا۔

جیل سے رہائی کے بعد ابو سفیان نے سبزی بیچنے کا دھندا بند کر دیا اور اتوار بازاروں میں پلاسٹک کا گھریلو سامان فروخت کرنے لگا چونکہ ڈھیر سارا سامان لے کر دور جانا پڑتا تھا تو ابو سفیان نے رکشہ خرید کر اس میں اسکوٹر کا انجن لگوا لیا۔ دھندا تو بدل گیا مگر پولیس والوں کی وصولی کا طریقہ نہیں بدلا۔ اتوار بازاروں میں بھی وہ دکان لگانے والوں سے پیسہ وصول کرنے آ جاتے تھے۔ پیسے کے ساتھ ضرورت کی چیزیں بھی اٹھا کر لے جاتے۔ ایک طرف ابو سفیان پولیس کی زیادتیوں سے پریشان تھا۔ ادھر مناہل لگاتار بیٹیاں پیدا کر رہی تھی اس کی پانچ بیٹیاں تھیں۔ اس کی آمدنی کا بڑا حصہ پولیس والوں کی جیب میں جا رہا تھا۔

اس لیے مایوسی' ناامیدی اور اپنے اندر کی تڑپ مٹانے کے لیے اس نے لاشوں کے ٹکڑے کر کے پولیس کو چیلنج دینے کا فیصلہ کر لیا اس نے شاہ پور میں ایک مکان کرائے پر لے لیا اور مارشل آرٹ میں استعمال میں لایا جانے والا نن چکو (ایک زنجیر جس میں دونوں طرف مضبوط ڈنڈے لگے ہوتے ہیں) اور ایک چھرا لا کر کمرے میں رکھ دیا۔ پوری تیاری ہو گئی تو ابو سفیان نے شکار پھانسنا شروع کر دیا' وہ ایسے لوگوں کا انتخاب کرتا جو روزگار کی تلاش میں

پھول پورآتے تھے۔

وہ انہیں اپنے ساتھ کام پر لگاتا' کھلاتا پلاتا پھران کی کوئی بات اسے کھٹکتی تو وہ انہیں قتل کرکے لاشوں کے ٹکڑے کرکے پھول پور میں مختلف جگہوں پر پھینک آتا اس کام کے لیے وہ اپنے رکشہ کا استعمال کرتا تھا۔

پولیس کی پوچھ گچھ میں ابوسفیان نے ساتوں قتل کا جرم قبول کیا اس نے بتایا کہ پندرہ ستمبر 2012ء سنٹرل جیل گیٹ پر جو لاش ملی تھی وہ ثمر چوہدری کی تھی جسے ابو سفیان نے اس کے جھوٹ زیادہ بولنے کی سزا کے طور پر مارا تھا۔ 24 اپریل 2013ء کو پولیس کو جو دھڑ اور اس کے ٹکڑے ملے تھے وہ علی زیب کے تھے۔ علی زیب کا قصور اتنا تھا کہ وہ رنگین مزاج تھا' خوب صورت اور نوجوان لڑکیوں کو دیکھتے ہی اس کی رال ٹپکنے لگتی تھی۔

رنگین مزاجی پر قتل کے بعد اس نے علی زیب کا عضو تناسل بھی سزا کے طور پر کاٹ دیا تھا۔ 18 مئی کو ملنے والی لاش فرحت شاہ کی تھی اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ گوشت خور تھا۔ فرحت شاہ کا گوشت کھانا ابوسفیان کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا' اس لیے اس نے اس کے بھی ٹکڑے کردیئے۔ ابوسفیان سے گہری تفتیش کے بعد پولیس نے اسے عدالت میں پیش کرکے آگے پوچھ گچھ کے لیے ریمانڈ لے لیا۔

ابوسفیان کی نشاندہی پر پولیس نے گلبرگ سے اظہر علی کی کھوپڑی برآمد کی اور اگلے دن اس نے راوی کے کنارے سے ایک کھوپڑی اور جبڑا برآمد کرلیا۔ اس کے مطابق یہ کھوپڑی اور جبڑا فرحت شاہ کا تھا۔ 25 مئی کو ابو سفیان نے الٰہ آباد میں واقع اسٹیٹ بینک کے پاس اس جگہ کی شناخت کی جہاں اس نے علی زیب عرف زیبو کا دایاں ہاتھ اخبار میں لپیٹ کر پھینکا تھا۔

اس دن یعنی 25 مئی کو ابوسفیان نے شالیمار باغ ریلوے پھاٹک کے پاس ایک مکان کی نشاندہی کی اس مکان میں اس نے وسیم نامی نوجوان کا قتل کرکے لاش سدھو پور کے گندے نالے میں پھینکی تھی۔ مجموعی طور پر ابوسفیان نے سات قتل کرنا قبول کیے' ان معاملوں پر عدالتوں میں کیس کی شنوائی ہوتی رہی آخر میں اسے مختلف مدت کی سزا اور جرمانے کے ساتھ سزائے موت بھی دے دی گئی۔

عدالت نے پولیس پر سخت ریمارکس دیئے کہ ان کی وجہ سے معصوم لوگ خطرناک مجرم بن جاتے ہیں۔ اس جنونی قاتل نے سات قتل کیے تھے اور آٹھویں لاش اس کی اپنی تھی جو پھانسی کے پھندے سے لٹک گئی۔



اچھی بات

- پھول نے وقت سحر آسمان سے فریاد کی کہ مجھ سے میری شبنم چھینی جارہی ہے' اسے کیا معلوم کہ آسمان اپنے ستارے کھو رہا ہے۔
- پانی بنو جو اپنا راستہ خود بناتا ہے' پتھر نہ بنو جو دوسروں کا راستہ روک لیتا ہے۔
- اگر غلط فہمیاں دور نہ کی جائیں تو وہ نفرتوں میں بدل جاتی ہیں۔
- اہمیت دکھ کی نہیں بلکہ دکھ دینے والے کی ہوتی ہے' دور بھاگیے ایسے دوستوں سے جو کھیل ہی کھیل میں زندگی سے کھیل جاتے ہیں۔
- دنیا میں بہترین انسان وہ ہے جس کے لیے کوئی روئے اور بدترین انسان وہ ہے جس کی وجہ سے کوئی روئے۔
- انسان خود انمول نہیں ہوتا بلکہ اس کا کردار اسے انمول بناتا ہے۔
- اپنے آپ کو اچھی صفات اپنانے پر مجبور کرو کیونکہ بُری صفات تمہاری فطرت میں شامل ہی نہیں۔

محمد اسامہ...... کراچی

قسط نمبر30

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الہیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر' ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا تسخیر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔



دل سے ماحول گونج اٹھا تھا۔ موت جب ، ہوتی ہے تو انسان اس سے بچنے کے لیے کیا کچھ کرتا ہے، یہی کچھ وہاں ہو رہا تھا۔ انہیں اپنا آپ بچانے، اپنی بقا کے لیے حملہ آوروں سے بھڑ جانا چاہئے تھا، مگر ایسا نہیں ہوا تھا، وہ سب کے سب کہیں نہ کہیں چھپ جانے کو ترجیح دے رہے تھے۔ حملہ آوروں کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس لیے وہ پوری یکسوئی سے فائرنگ کر رہے تھے۔ وہ چھ کے چھ وہیں ڈھیر ہو چکے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ملازم بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس ساری کارروائی میں دو سے تین منٹ لگے۔ جیسے ہی انہیں یقین ہو گیا کہ وہ سب ختم ہو چکے ہیں۔ وہ وہاں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رُکے، یکے بعد دیگرے پلٹے اور اندھیرے میں گم ہو گئے۔ وہ وہاں سے کیسے نکلے؟ یہ کہانی انہی کے ساتھ وقت کے اندھیرے میں دفن ہو گئی تھی۔ اس فارم ہاؤس میں موت رقص کر رہی تھی۔ کتنی دیر تک کوئی ان تک نہیں پہنچا تھا۔ یہی وہ غنیمت وقت تھا جس میں حملہ آور وہاں سے نکلے تھے۔

☆......☆......☆

''مشن مکمل ہو گیا ہے۔'' اروند سنگھ نے مجھے بتایا تو میں بیڈ پر پڑا اٹھ گیا۔

''اس کے بعد جو کرنا ہے کرو۔'' میں نے اسے اجازت دے دی تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

''مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آ رہی، اب تک اپنی خفیہ تنظیم کا نام ہی نہیں رکھا، کیا ہونا چاہئے نام؟''

''ایسا نام ہو جس میں ہندوانداز جھلکتا ہو۔'' میں نے اسے مشورہ دیا تو اس نے چند لفظ مجھے بتائے، اس کے ساتھ ساتھ ان کے مطلب بھی تھے۔ مجھے ان میں سے ایک نام پسند آیا۔ وہ نام تھا ''ویرتا''۔ اس لفظ کا مطلب تھا ایسا دلیر اور بہادر جسے اپنی دھرتی سے محبت ہو۔ اس نے یہی نام رکھا اور ایک ای میل چلا دی، جس میں ان تینوں کا قتل ذمے لے لیا۔ اس سے پہلے منندر سنگھ، اشوک مہرہ اور ہرنیت سنگھ کو بھی انہوں نے ہی مارا ہے۔ وجہ اس کی یہ بتائی کہ یہ لوگ ہندو مفادات کے لیے کام کر رہے تھے، لیکن اب انہوں نے غداری کی تھی سو ان کا انجام بھی یہی ہونا تھا۔ اس کے ساتھ دھمکی دی کی اب ان ہندوؤں کی باری ہے جو دھرتی ماتا سے غداری کر رہے ہیں۔ اب انہیں چھوڑا نہیں جائے گا۔ اروند نے اپنی ساری کارروائی مجھے بتائی اور خاموش ہو گیا۔ میں بیڈ سے اٹھا اور اس کے پاس جانے کو تیار ہو گیا۔

دو گھنٹے گزر جانے کے باوجود کسی بھی بھارتی چینل پر یہ خبر نشر نہیں ہوئی۔ میں اسی انتظار میں اروند سنگھ اور فہیم کے ساتھ بیٹھا اس کے پلان کو سمجھتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک چینل نے خبر نشر کر دی۔ اس میں ان اہم لوگوں کے قتل کے بارے میں اطلاع تھی اور بتا دیا گیا تھا کہ نامعلوم قاتل فرار ہو چکے ہیں۔ انہیں پکڑنے کے لیے ہائی پروفائل پلان بنا لیا گیا ہے۔ کچھ ہی گھنٹوں میں وہ لوگ پکڑے جائیں گے۔ وہی باتیں جو ایسے وقت میں تسلی اور دلاسے کے لیے کہی جاتی ہیں، وہی دہرائی جا رہی تھیں۔

''یہ چینل ''را'' کا ہے اور یہ لوگ یہیں سے دھمکیاں دے رہے ہیں۔'' اروند سنگھ نے اسکرین پر نگاہیں جمائے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

''باقی چینل یہ خبر کیوں نہیں دے رہے ہیں؟''

''ممکن ہے وہ لوگ اس کی پس پردہ کہانی نہ بتانا چاہ رہے ہوں، ابھی تھوڑی دیر میں معاملہ سامنے آ جائے گا۔ مجھے بس اتنا انتظار ہے کہ وہ لوگ محفوظ جگہ پہنچ جائیں۔'' اروند نے کافی حد تک جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

''اگر وہ یہاں نہیں پکڑے گئے تو نکل جائیں گے۔'' میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں تیزی سے اسکرین پر دیکھتے ہوئے کام کر رہے تھے۔اچانک فہیم بولا۔

''اروند۔! یہ لو، اجلاس شروع ہوگیا ہے۔''

''سنو، اسے ریکارڈ کرلینا، ہم دیکھتے ہیں ان کو اب۔'' اروند نے تیزی سے کہا اور کال ملانے لگا، جیسے ہی کال ملی اس نے پوچھا۔

''مال پہنچا کہ نہیں ابھی تک؟'' پھر چند لمحے سنتے رہنے کے بعد بولا۔

''ٹھیک ہے، بتانا تھا نا۔اوکے۔'' اس سے پہلے کہ میں پوچھتا اس نے خود ہی بتا دیا۔

''عین وقت پر انہوں نے اپنا پلان بدل لیا، انہوں نے جہاں جانا تھا، وہاں نہیں گئے، بلکہ کسی دوسری جگہ ہتھیار رکھ کر اپنے اپنے علاقوں کو نکل گئے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے وہ خاصے سیانے لوگ ہیں۔'' فہیم نے تبصرہ کیا جس پر اروند نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں ایک بہت بڑا دھماکا کرنے جارہا ہوں، مجھے آپ کی اور جسپال سنگھ کی مدد چاہئے؟''

''بولو۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر دیوانہ وار کہا۔

''میرا پلان یہ ہے کہ یہ جو اجلاس کرنے والے آفیسر ہیں، امرتسر میں، انہیں اُڑا دیا جائے، ابھی۔''

''ظاہر ہے انہوں نے یہاں کوئی فیصلہ کرنا ہے، یہ پانچ چھ لوگ ہیں، ان کا فیصلہ آنے سے پہلے......''

''اس کا کوئی فائدہ نہیں، ہاں مگر ایک کام کا فائدہ ہوسکتا ہے، اگر وہ ہو جائے تو؟'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو وہ میری طرف دیکھتے ہوئے خاموش رہا تو میں بولا۔

''وہ آفیسر جو انہیں احکام دے گا، وہ اڑا دیا جائے اور اس اجلاس میں وہ جن لوگوں کا نام ڈن کریں، مرنے والوں کی جگہ انہیں اُڑا دیا جائے تو پھر اس معاملے میں اگلا اجلاس بہت سوچ سمجھ کر ہوگا۔''

''ڈن۔'' اس نے انگوٹھا دکھا کر میری بات کی تائید کردی۔تو فہیم بولا۔

''اب جسپال جی سے بات......؟'' اس نے کہا۔

''نہیں اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں، میں دیکھ لیتا ہوں سب۔'' اروند سنگھ نے کہا اور رونیت سے رابطہ کیا، وہ اس وقت تنہا بیٹھی اسی معاملے کو دیکھ رہی تھی۔اسی کے پاس جسپال بیٹھا ہوا تھا۔جیسے ہی انہیں پلان بتایا گیا تو انہوں نے بھی ڈن کردیا۔اس پر رونیت کور اور فہیم کے ساتھ اروند اس کام پر لگ گیا۔ میں انہی کے پاس بیٹھا رہا، میں دیکھنا چاہ رہا تھا کہ وہ کیا کرتے ہیں۔

اجلاس اسی انسٹیٹیوٹ میں ہورہا تھا۔جہاں اس وقت سیکورٹی بہت زیادہ تھی۔رات کا دوسرا پہر ختم ہو جانے کو تھا۔اس اجلاس میں قتل ہونے کی وجہ اور اس کی دیگر تفصیلات کے علاوہ یہ بھی جائزہ لیا گیا کہ فوری طور پر کن لوگوں کو تعینات کیا جائے۔مجرم پکڑنے کی ذمہ داری کس کی ہوگی اور سب سے اہم یہ سوال تھا کہ یہ کس نے کیا ہے، ابھی تک سیکورٹی والوں کی طرف سے ایسا کچھ نہیں بتایا گیا تھا، یہ کون ہیں؟ اس پر سب سے زیادہ بحث ہوئی تھی۔بہت سوں کے ذمے بہت سارے کام لگ گئے۔لیکن اس دوران جسپال نے اپنا کام مکمل کرلیا تھا۔امرتسر کے قرب و جوار ہی سے لوگ اپنی اپنی جگہ پہنچ چکے

تھے۔ انہیں اچھی طرح پتہ چل گیا تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔

اجلاس کی صدارت کرنے والا ایک ہندو ریٹائرڈ آرمی آفیسر تھا، جواب ''را'' کے لیے اپنی خدمات سر انجام دے رہا تھا۔ وہ انسٹیٹیوٹ سے نکلا تو اس کے ساتھ ایک گاڑی سیکورٹی کی تھی۔ اسے اپنے فارم ہاؤس نما بنگلے میں جانا تھا، جہاں اس کے انتظار میں دو ''را'' والے بیٹھے ہوئے تھے۔ چند منٹوں میں ان لوگوں نے طے کرلیا تھا کہ ایکشن کی جگہ کون سی ہوگی اور کس نے کیا کرنا ہے۔ جیسے ہی وہ اپنی اور سیکورٹی والی گاڑی میں انسٹیٹیوٹ سے نکلا، ہر طرف خبر مل گئی۔ انسٹیٹیوٹ اور اس کے بنگلے کا درمیانی فاصلہ کوئی چھ کلومیٹر کے لگ بھگ تھا اور ایکشن والی جگہ تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔

ان کی گاڑیاں تیزی سے اس جگہ تک پہنچ رہی تھیں۔ جیسے ہی ان گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹس دکھائی دیں وہ لوگ الرٹ ہو گئے۔ ان کا جو ہیڈ تھا، اس کے کان کے ساتھ فون لگا ہوا تھا، انہیں بتایا جا رہا تھا کہ وہ کتنے فاصلے پر آ گئے ہیں۔ جیسے ہی وہ گاڑیاں ان کی رینج میں آئیں، انہوں نے راکٹ لانچر داغ دیئے، ایک دم سے تین اطرف سے ایک ساتھ راکٹ لانچر داغے گئے۔ اگلے لمحات میں وہاں خوف ناک دھماکے ہوئے، ان کی گاڑیاں پھٹ گئیں، جیسے ہی انہوں نے راکٹ لانچر داغے، وہ وہاں نہیں ٹکے، لمحوں میں نکل گئے۔ انہوں نے یہ بھی دیکھنے کی زحمت نہیں کی کہ وہاں پر کیا ہوا؟

انہی لمحات میں امرتسر کے پوش علاقے کے مین روڈ پر موجود ایک بنگلے میں سردار نہال سنگھ اروڑہ اپنے بیڈ روم میں پڑا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے فون سنا تھا جس میں اسے اس انسٹیٹیوٹ کا انچارج بنانے کی نوید سنائی گئی تھی۔ وہ بھی ایک آرمی آفیسر تھا اور ''را'' کے لیے خدمات سر انجام دے چکا تھا۔ اس کی بھی دیرینہ خواہش تھی کہ اس انسٹیٹیوٹ پر راج کرے، وہاں کیا کچھ نہیں تھا، عورت، شراب، دولت اور حاکمیت سب کچھ تھا۔ وہ اس وقت اپنے گھر میں پڑا یہی سوچ چلا جا رہا تھا کہ اب اس نے کرنا کیا ہے۔ ایسے میں اسے باہر سے اطلاع ملی کہ چار بندے آئے اور فوری طور پر آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔

''یہ پوچھا کہ وہ مجھ سے کیوں ملنے چاہتے ہیں اور اس وقت ہی کیوں؟'' اس نے اپنے سیکورٹی انچارج سے پوچھا تو سیکورٹی انچارج نے کہا۔

''سر جی وہ آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔''

''اچھا کراؤ بات۔''

چند لمحوں بعد ایک بھاری آواز فون میں گونجی

''سر ہم انسٹیٹیوٹ سے ہیں اور ہمیں آپ کی سیکورٹی کے فرائض سونپے گئے ہیں۔''

''اوہ اچھا، ٹھیک ہے، آپ اسی انچارج سے ملیں، وہ آپ کو رہنے کے لیے جگہ دکھا دیتا ہے۔''

''سر۔! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، لیکن ہمارا آپ سے ملنا بہت ضروری ہے، پھر آپ کا جو حکم ہوگا۔'' اس نے فون پر سنا تو چند لمحے سوچ کر بولا۔

''ٹھیک ہے، فون سیکورٹی انچارج کو دو۔''

چند لمحے بعد سیکورٹی انچارج بولا۔

''جی سر۔''

''انہیں لان ہی میں بٹھاؤ، میں آ رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے فون بند کیا اور باہر جانے کے لیے اٹھ گیا۔

وہ لان میں آیا تو چار نوجوان بہترین تراش کے سوٹ پہنے الرٹ کھڑے تھے۔ وہ ان کے پاس آیا تو چاروں نے فوجی انداز میں سلیوٹ کیا، نہال سنگھ

نے ان سے ہاتھ ملائے تو ایک نوجوان بولا۔
''سر۔! ہمیں حکم ملا ہے کہ اگر آپ ابھی انسٹیٹیوٹ کا چارج لینا چاہیں تو چلیں، وہاں لوگ آپ کے منتظر ہیں۔''
''یار اتنی جلدی کس لیے، میں صبح آجاؤں گا۔'' اس نے حاکمانہ لہجے میں کہا۔
''سر۔! وہ آپ کی مرضی، لیکن وہاں کچھ ضروری معاملات ہیں، جن کے لیے آرڈرز چاہئیں۔ دوسرا اب آپ کی سیکورٹی ہمارے ذمے ہے، چاہیں تو اپنی نجی سیکورٹی بھی رکھ سکتے ہیں۔''
''وہ تو ٹھیک ہے۔ آپ لوگ یہاں آرام کرنا چاہو یا جانا چاہو......''
''نو سر۔! ہم ادھر ہی رہیں گے۔ ہم آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔'' اس نوجوان نے فوجی انداز میں کہا تو نہال سنگھ زیر لب مسکرا دیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہی پرانے حاکمیت کے دن لوٹ آئے ہیں۔ اس نے ان چاروں کی طرف دیکھا اور پھر حاکمانہ لہجے میں کہا۔
''ٹھیک ہے آپ اپنی ڈیوٹی کرو۔''
''یس سر۔'' جیسے ہی نوجوان نے کہا تو ان چاروں نے اپنی پشت ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ لی، جس وقت وہ ایک دوسرے کے ساتھ پشت جوڑ رہے تھے، اسی دوران انتہائی سرعت سے انہوں نے اپنے پسٹل نکالے، جو نوجوان بات کر رہا تھا، اس نے نہال سنگھ کے سر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ وہ سیکورٹی پر مامور لوگوں کا جائزہ لے چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتے، انہوں نے فائر کھول دیا۔ نہال سنگھ لان میں گر کر تڑپ رہا تھا، ایک گولی نے ہی اس کی کھوپڑی میں سوراخ بنا دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے۔ ان کا رخ گیٹ کی طرف تھا۔ جب تک فائرنگ کا تبادلہ ہوتا تھا، وہ گیٹ پار گئے۔ ان کی گاڑی باہر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس میں بیٹھے اور انتہائی سرعت کے ساتھ وہاں سے نکل گئے۔ جس وقت وہ وہاں سے نکل رہے تھے، اسی نوجوان نے فون کر کے بتا دیا کہ مشن پورا ہو گیا ہے۔ تھوڑی دور جا کر انہوں نے وہ گاڑی چھوڑی اور دو دو میں بٹ کر پیدل چل پڑے، وہ سڑک سے اتر کر اندھیرے میں غائب ہو گئے تھے۔
''اب میں انہیں دوں گا دھمکی؟'' اروند نے پورے جوش سے کہا۔
''کسے دو گے دھمکی اور کیا دو گے؟'' فہیم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔
''ویریتا کی طرف سے ''را'' کے لوگوں کو دھمکی ہو گی کہ ہم اس وقت میدان میں ہیں، اگر ہمارے مطالبات نہ مانے گئے تو ہم اگلے چوبیس گھنٹوں میں اس سے بھی زیادہ لوگ ماریں گے۔'' اس نے کہا اور پہلے سے لکھی ہوئی ای میل کر دی۔
''لیکن مطالبات کیا ہوں گے؟'' رونیت کی آواز ابھری، جس میں تجسس کے ساتھ طنز بھی تھا۔
''وہ بھی سوچ لیتے ہیں۔ دیکھ لینا ابھی ان کے ساتھ مذاکرات ہوں گے۔''
''چلو دیکھتے ہیں۔'' اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔
''اوئے فہیم یہ خبر سارے چینلز کو بھیج دی ہے؟'' اروند نے پوچھا تو اس نے ہاں میں سر ہلا دیا۔
''لو بھئی تم لوگ کرو کام، میں سونے کے لیے جا رہا ہوں، اگر ضرورت ہو تو مجھے جگا لینا۔'' میں نے کہا اور ان کے پاس سے اٹھ کر اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔

☆......☆......☆

دن نکلنے سے پہلے کی نیلگوں روشنی ہر طرف پھیل گئی تھی۔ جسپال سنگھ کمرے سے اٹھ کر باہر لان

میں آ گیا تھا۔ لان میں ایک کرسی پر جگتار سنگھ بیٹھا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اٹھ گیا۔

"بیٹھو، بیٹھو یار، کھڑے کیوں ہو گئے ہو؟" جسپال نے اسے یوں تعظیم میں کھڑے دیکھ کر جلدی سے کہا تو وہ دونوں ہاتھ باندھ کر بولے۔

"مان گئے بائی جی، سردار سرجیت سنگھ بندیال جی نے آپ پر جو اعتماد کیا ہے، وہ ٹھیک کیا ہے۔ اتنی تیزی اور اتنی شدت۔"

"میں سمجھا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟" جسپال سنگھ نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

"سردار سرجیت سنگھ بندیال جی نے ہی مجھے آپ کی طرف یہ پیغام دے کر بھیجا ہے۔ چینل سب کچھ نہیں بتائیں گے، لیکن جن تک بات پہنچنی تھی پہنچ گئی ہے۔" اس نے جوش بھرے لہجے میں بتایا

"دیکھ جگتار سنگھ۔! ابھی تو یہ کچھ بھی نہیں ہوا، تم ایک سیاست دان اور لیڈر ہو، کچھ بھی ہو جائے، تُو اور میں ایک ساتھ نظر نہیں آنے چاہئیں۔ یہ تیری غلطی ہے کہ تو اس وقت یہاں میرے گھر میں ہے۔ کیونکہ مجھے اپنا کام کرنا ہے اور تجھے اپنا کام، ہمارا ایک دوسرے سے کوئی لینا دینا نہیں۔ کوئی ایسا کام نہیں ہونا چاہئے، جس سے یہ لوگ تجھ پر انگلی اُٹھا سکیں، کیا تجھے یہ پتہ ہے کہ خفیہ والے تیرے پیچھے بھی ہو سکتے ہیں اس وقت؟"

"کسی کو نہیں پتہ کہ......" اس نے کہنا چاہا تو جسپال نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔

"کچھ بھی ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے بائی جی۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور اٹھنے لگا تو جسپال نے تحمل سے کہا۔

"ابھی بیٹھ، کچھ کھا پی لے، پھر جانا، میں نے تم سے ایک بات بھی کرنی ہے۔"

یہ سنتے ہی جگتار سنگھ بیٹھ گیا۔ اتنے میں اندر سے کھانے پینے کا سامان گرلین کور لے کر آ گئی۔ وہ ٹرے، میز پر رکھ کر انہی کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ تینوں کھانے پینے لگے۔ ان کے درمیان خاموشی تھی۔ تبھی جسپال نے جگتار کی طرف دیکھ کر کہا۔

"سکھ قوم کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔ تقسیم ہند سے پہلے اور بعد میں جو لوگ پاکستان بن جانے کے بعد یہاں بھارت میں آئے تو اسی وقت سے ہی انہیں "مجرم قبیلہ" کہا جانے لگا۔ یہ سازش اسی وقت سے تھی، پنڈت جواہر لعل نہرو، سردار پٹیل نے اس وقت کے گورنر پنجاب سی ایم تیواڑی سے مل کر کی۔ تب سے لے کر اب تک ان بے غیرت ہندوؤں نے سکھوں کے ساتھ کیا کیا نہیں کیا۔ خیر۔! جو بات میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں وہ غور سے سنو۔"

"جی بولیں بائی جی۔" جگتار نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اقوام متحدہ کے قوانین کے مطابق ایسی کوئی بھی قوم خود ارادیت کا حق رکھتی ہے، جس کی اپنی کوئی تاریخ ہو یا جس کی اپنی کوئی مملکت قائم رہی ہو، اس کی اپنی سرزمین ہو، ان کی اپنی الگ سے ثقافت ہو، جن میں اپنی مملکت چلانے کی صلاحیت ہو۔ خالصتان تحریک چلانے والوں کا یہ دعوی ہے اور ہم اس دعوی میں حق بجانب ہیں کہ ہم دنیا کا پانچواں بڑا مذہب رکھتے ہیں۔ ہم دنیا میں تین کروڑ کے لگ بھگ ہیں۔ بھارتی پنجاب میں ہماری سب سے زیادہ تعداد ہے۔ ان باتوں کو بنیاد بنا کر خالصتان تحریک کا پھر سے مطالعہ کرو اور لفظوں کے ہتھیار لے کر نکل پڑو۔ پوری دنیا کے سکھوں تک یہ پیغام پہنچا دو۔ ہمیں اب خالصتان حاصل کرنا ہے۔"

"بائی جی میں سمجھ گیا، سیاسی اور سفارتی سطح اب میرے ذمے رہی۔ میں آپ کا وژن سمجھ گیا ہوں۔ مجھے راستہ مل گیا۔ اب اجازت دیں بائی جی۔ واہ گرو دا خالصہ، واہ گرو جی کی فتح۔" ہاتھ جوڑ کر یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ پھر اپنی قیمتی گاڑی کی جانب بڑھا اور وہاں سے چلا گیا۔ اس سارے معاملے میں گرلین خاموش رہی تھی۔ اس کے جاتے ہی

"کیا یہ کر لے گا؟"

"ہاں، یہ اسلحہ نہیں اٹھا سکتا لیکن لفظوں کی جنگ خوب لڑ سکتا ہے۔" جسپال نے سوچتے ہوئے کہا پھر چونک کر بولا۔

"اروند کی طرف سے کوئی خبر؟"

"ابھی تک تو نہیں۔ ادھر "را" کی طرف سے بھی گہری خاموشی ہے۔" گرلین نے کہا تو جسپال اٹھتے ہوئے بولا۔

"گہری خاموشی میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ آؤ اندر چلیں، یہ وقت بڑا قیمتی ہے۔"

جسپال اندر چلا گیا اور گرلین برتن سمیٹنے لگی۔

☆......☆......☆

میں حویلی کی چھت پر کھڑا دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کو دیکھ رہا تھا۔ سڑک کے پار نور نگر اب بھی ویسا ہی تھا جیسے میرے بچپن میں ہوا کرتا تھا، کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، لیکن میں بہت حد تک بدل گیا تھا۔ انتقام کی آگ سے میرے سفر کی ابتدا ہوئی تھی جو نجانے کہاں کہاں سے ہو کر یہاں تک آن پہنچا تھا۔ اس دوران مجھے آگہی اور شعور نہ ملتا تو میں کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ میں انہی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا تھا کہ اروند سنگھ کا فون ملا، وہ مجھے نیچے بلا رہا تھا۔ میں چند منٹوں میں اس کے پاس جا پہنچا۔

"اروند۔! خیریت ہے؟" میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کل سے لے کر آج صبح تک جو کچھ بھی ہوا، اس نے ایک بار تو "را" کو ہلا کر رکھ دیا۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ وہ کیا کریں۔ پورا زور لگا کر انہوں نے خبریں روکی ہوئی ہیں۔"

"کیا تم نے ان چینلوں کو خبریں نہیں بھیجی تھیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"قتل ہو جانے کی خبریں تو آ گئی ہیں لیکن یہ قتل کیوں ہوئے، اس بارے میں نہیں بتا رہے ہیں۔ خیر۔! یہ دیکھیں۔" اس نے مجھے اسکرین کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے یہ؟" میں نے پوچھا۔

"یہ اک لمبی ای میل ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ یعنی "را" والے "ویرتا" والوں سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہم ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" اس نے بتایا تو میں نے کہا۔

"تو کر لو بات، کہہ دینا کہ ابھی اک لمبی فہرست ہے، انہیں ختم کر لیں تو مطالبات بھی بتا دیں گے۔"

"مطلب ابھی انہیں کوئی واضح بات نہیں بتانی؟" اس نے میری بات سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل، ابھی ویرتا کی دہشت بن جانے دو۔ یہ دیکھو، وہ ویرتا کو تلاش کرنے کے لیے کس حد تک جاتے ہیں، پھر بات بھی ہو جائے گی۔" میرے کہنے پر وہ سمجھ گیا اور کمپیوٹر پر مصروف ہو گیا۔ میں اس کے پاس سے اٹھ کر چل دیا۔

☆......☆......☆

میں حویلی کے لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا، جہاں اماں اور سوہنی پہلے ہی سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں ابھی ان سے کوئی بات بھی نہیں کر پایا تھا کہ چوہدری اشفاق آ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

"وہ یار، کچھ بندے ملنے آئے ہیں تمہیں، افضل رندھاوا بھی ان کے ساتھ ہے۔"

"خیر تو ہے نا، کس لیے آئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے پوچھا تھا، وہ کوئی سیاسی لوگ ہیں۔" اس نے بتایا تو میں اٹھ گیا۔

باہر لان میں تین بندوں کے ساتھ رندھاوا بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے۔ تب اچانک مجھے وہ دور یاد آ گیا، جب میں گھسیٹ کر تھانے لے جایا گیا تھا۔ میں ان سے ملا اور ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ چوہدری اشفاق نے ان کی خاطر تواضع کے لیے چائے کے ساتھ لوازمات بھجوا دیئے تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ وہ حکومتی پارٹی کے لوگ ہیں اور آئندہ آنے والے الیکشن کے بارے میں بات کرنے آئے تھے۔ ان میں ایک بزرگ نما بندہ ظہور مرزا تھا، جس نے ساری بات کی تھی۔

"آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے ہم آپ کی سپورٹ ہی چاہیں گے۔ اس وقت اس علاقے میں آپ ہی کا اثر ورسوخ ہے۔ ہم اپنے امیدوار کے لیے ووٹ چاہیں گے۔" اس نے ملائمت سے کہا، تب میں نے چوہدری اشفاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں تو اسے ایم این اے کا الیکشن لڑانا چاہتا ہوں۔ ہم امیدوار ہیں۔"

اس پر ظہور مرزا کچھ کہنے لگا تو افضل رندھاوا نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں جمال۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں اس پر نظرثانی کرنا ہو گی۔ پس پردہ کھیل کچھ دوسرا ہے، سامنے کچھ اور ہے۔ میرے خیال میں تم اسے الیکشن ہی سے باہر کر دو یا پھر کم از کم ایم پی اے تک محدود کر دو۔"

"میں سمجھا نہیں؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اتنا سمجھ لو کہ اس بار یہ پارلیمانی آداب سیکھ جائے، اگلی بار جیسے آپ چاہو۔"

"کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہ ہونے کی ضمانت دیتے ہو؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ہر طرح کی ضمانت ہے۔" اس نے اعتماد سے کہا۔

"ٹھیک ہے، جیسے تم چاہو۔" میں نے کہا تو انہوں نے خوشگوار حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا، جیسے اتنی جلدی فیصلہ دینے کے بارے میں انہوں نے سوچا بھی نہ ہو۔ کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلے گئے۔ جاتے ہوئے افضل رندھاوا نے دوبارہ آنے کا کہا اور وہ لوگ چلے گئے۔

میں واپس اندر گیا تو اماں اور سوہنی وہیں لاؤنج ہی میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میرے پیچھے ہی چوہدری اشفاق آ گیا۔ میں نے اسے اپنے پاس صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں سمجھ آئی ہے یہ لوگ یہاں کیوں آئے تھے، اس قسم کی بات کرنے؟"

"رندھاوا تو مجھے کئی دنوں سے کہہ رہا تھا، لیکن میں نے اسے ایک ہی بات کہی کہ وہ تم سے بات کر لے، میں اپنے طور پر کوئی بات نہیں کروں گا، میں نے الیکشن لڑنا ہے، نہیں لڑنا ہے اس کا فیصلہ جمال ہی نے کرنا ہے۔" چوہدری اشفاق نے بڑے سکون سے کہا۔

"کون لڑ رہا ہے الیکشن؟" اچانک اماں نے ہماری طرف دیکھ کر پوچھا تو میں نے باہر لوگوں کے آنے کے بارے میں میں اختصار سے بتا دیا۔ وہ چند لمحے سوچتی رہیں، پھر بولیں۔

"یہ اشفاق نے کوئی الیکشن نہیں لڑنا، انہیں کہو، وہ

جسے چاہیں اپنا امیدوار بنالیں۔"
"اماں یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ، یہ باہر کے معاملات ہیں، ان کے بارے میں آپ کو کیا پتہ؟" میں نے کافی حیرت سے پوچھا کیونکہ اماں نے پہلے کبھی باہر کے معاملات میں مداخلت نہیں کی تھی، ایسا پہلی بار ہو رہا تھا۔
"یہ اشفاق یہاں ہوگا تو الیکشن لڑے گا۔ میں اسے لندن بھیج رہی ہوں تانی کے پاس۔" اماں نے پرسکون لہجے میں کہا۔
"کیا، یہ فیصلہ کب ہوا؟ مجھے بتایا ہی نہیں۔" میں پھر پوچھا تو اماں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔
"کیا تجھے ہر بات بتانا ضروری ہے؟"
"نہیں مگر، یہ بات......" میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے سوہنی سے بولیں۔
"سوہنی پتر، بتادے اسے۔"
یہ کہہ کر وہ باہر کی جانب چلی گئیں۔ اس کے پیچھے ہی چوہدری اشفاق اٹھ کر تیزی سے باہر چلا گیا۔ تب سوہنی میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے اپنی نشیلی آنکھوں سے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔
"تمہیں نہیں پتہ، یہ اشفاق بہت پہلے سے تانی کے ساتھ عشق کی حد تک پیار کرتا ہے۔"
"کیا......؟" میں نے خوشگوار حیرت سے کہا۔
"جی ہاں، یہ اپنے دل ہی دل میں اس سے پیار کرتا رہا، لیکن اظہار اس لیے نہیں کیا کہ شاید تم اس سے بہت محبت کرتے ہو اور ممکن ہے اس سے شادی بھی کرلو۔ اسی لیے اپنی خواہش زبان پر نہیں لایا، یہاں تک کہ وہ لندن چلی گئی۔ اب جبکہ تمہاری اور میری شادی ہوگئی ہے تو ایک دن ایسے ہی اس نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ اس کے خیال میں یہی ہے کہ اب تانی واپس کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔ اس پر اماں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ چوہدری اشفاق اور تانی کی شادی کردیں۔"
"کیا تانی اس پر راضی ہے؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں، وہ راضی ہے، اماں نے اس سے تفصیلی بات کرلی ہے، وہ ایک دو دن میں یہاں آرہی ہے۔ اس کی شادی یہیں ہوگی اور آگے کا سارا جو پراسس ہے وہ تم دیکھ لینا یا پھر تانی خود دیکھ لے گی۔" سوہنی نے مجھے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔
"چلو، یہ تو خوشی کی بات ہے، اس کی زندگی میں بھی بہار آجائے گی، سوہنی شاید تم نہیں جانتی ہو، وہ ایک سپاٹ اور تنہا زندگی گذار رہی ہے، جس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے، کوئی بھی تو نہیں۔" میں کافی حد تک جذباتی ہوگیا تھا۔
"ایک بات کہوں؟" سوہنی نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
"بولو۔" میں نے یونہی کہا۔
"اگر تم تانی سے شادی کرلیتے نا، تو مجھے ذرا بھی حیرت نہ ہوتی، میں مانتی ہوں، وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ وہ تم سے عشق کرتی تھی، میں جانتی ہوں کہ عشق کرنے والے ہی جان دیا کرتے ہیں، اس نے تم پر اپنی جان واردی تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اماں اسی لیے اسے اپنے خاندان کا حصہ بنالینا چاہتی ہے۔" وہ انتہائی جذباتی انداز میں اعتراف کرگئی تو میں نے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی لٹ کو درست کیا اور بولا۔
"تم، تم ہو سوہنی۔"
میرے یوں کہنے پر وہ ایک دم سے مسکرادی پھر اٹھ کر تیزی سے باہر چلی گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ سیدھی اماں کے پاس ہی جاکر رکے گی۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چوہدری اشفاق کو تانی سے محبت ہو جائے گی۔ ایسا نہیں ہے کہ اس میں جذبات نہیں تھے۔ سوچ اس لیے سکتا تھا کہ کبھی بھی اس نے اشارے کنائے سے بھی اپنی چاہت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ تانی کی خوبصورتی پر کوئی بھی فدا ہو سکتا ہے۔ پہلی نگاہ میں کوئی یہ کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ اندر سے اتنی سخت ہے، جتنی وہ نازک دکھائی دیتی تھی۔ اب جبکہ میں نے اسے کافی حد تک دیکھ لیا تھا، اس کے ساتھ نے تانی کے بارے میں بہت کچھ سمجھا دیا تھا، کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ وہ جو قلوپطرہ کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ جس طرح قلوپطرہ کے چھوٹے چھوٹے بال، لمبی ناک، گول چہرہ کھا جانے والی پر کشش آنکھیں، اس کا تراشیدہ بدن، دیکھنے میں ایک حسین ترین عورت لیکن اندر سے وحشی، درندہ صفت، ویسے ہی تانی دیکھنے میں قلوپطرہ جیسی، فرق رنگ کا تھا، تانی بہت سفید تھی۔ گلابی سیندوری رنگت والی اور دوسری بات اسے خود پر مکمل قابو تھا، میں نے اسے کبھی بھٹکتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اماں کی بات نہیں ٹال سکتی تھی۔ لیکن اصل سوال یہ تھا کہ کیا وہ بھی چوہدری اشفاق کو قبول کر سکتی ہے دل سے؟ یہی ایک ایسی بات تھی، جو میں ہی ٹٹول سکتا تھا، ورنہ کوئی دوسرا اس کے دل کی بات نہیں جان سکتا تھا۔

میں وہیں بیٹھا رہا۔ تانی کے بارے میں مزید سوچ میرے ذہن میں نہ آئی تو میرا ذہن ”ویرتا“ کی طرف چلا گیا۔ میں اس کا انجام سوچنے لگا، یہ بالکل پانی کے بلبلے کی مانند بات تھی۔ اگر بات جم جاتی تو پھر ایسی جمنے والی تھی کہ اس کا اثر تادیر رہنے والا تھا اور اگر سامنے والے اس کھیل کو سمجھ گئے تو محض ایک پھونک ہی کافی تھی۔ مجھے اروند سنگھ کی ذہانت پر شک نہیں تھا لیکن اس کی پے در پے کامیابیوں کے پیچھے صرف ایک بات تھی۔ اس نے بھارتی اداروں سے سیکھا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ کیسے کام کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات اس کے خلاف بھی جا سکتی تھی لیکن اس نے وہ طریقہ کار بدل لیا، اور ہیکنگ کی دنیا میں اپنا گروپ بنا کر تہلکہ مچائے ہوئے تھا۔ وہ دوسروں کے لیے کام کرتا تھا اور ان سے کام بھی لیتا تھا۔ وہ میرے ساتھ صرف ایک مقصد کے لیے وفادار تھا کہ میں نے اسے تحفظ دیا ہوا تھا اور سکھی کے لیے اس نے اپنا آپ وقف کر دیا ہوا تھا۔ اب تک ایک بھی ایسا عمل سامنے سے نہیں گذرا تھا جس سے کوئی شک بھی پیدا ہوتا۔ اس نے ویرتا بنا کر ایک بڑا کام کر دیا تھا، جس کے پیچھے بہت کچھ چھپ سکتا تھا۔

جس دن سردار سرجیت سنگھ بندیال نے جسپال سنگھ کو اپنے ہاں بلا کر اسے خالصہ کی ذمہ داری سونپ دی تھی، اسی دن سے میرے ذہن میں بھی وہ خیال واضح ہو گیا، جو نجانے کب سے میرے ذہن میں تھا۔ میں چاہتا تو کرنل سرفراز اور روہی والوں کے ساتھ مل کر ایسا ہی کوئی گروپ بنا سکتا تھا، لیکن اُن کے پاس تو اپنا سارا سیٹ اپ تھا۔ پھر میں نے کیا کیا؟ میں اس معاملے میں اروند اور فہیم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ لیکن میں سوچ رہا تھا کہ ویرتا کا حالیہ معاملہ ختم ہو جائے تو پھر ان سے بات کروں۔ میں یہ باتیں سوچ رہا تھا کہ میرا اسیل فون بج اٹھا۔ میں نے اسکرین پر دیکھا، کوئی اجنبی نمبر ہی تھا۔ میں کال رسیو کی تو دوسری جانب سے جو بولا میں اسے پہچان گیا۔

”تم نے ہمارے پرندے آزاد نہیں کیے، اس لیے اب ہماری دشمنی تو بن گئی نا۔“ اس نے دھمکی آمیز طنز سے کہا۔ تو میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”دشمنی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم اپنی کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“

"تو پھر سنو۔! تمہارے پاس چوبیس گھنٹے ہیں، ہمارے پرندے آزاد کردو۔ ورنہ میں اتنے ہی دھماکے کروں گا، جتنے میرے پرندے ہیں۔ پھر مجھ سے شکوہ نہیں کرنا کہ یہ میں نے کیا کردیا ہے۔" اس بار اس کے لہجے میں غصہ آ گیا تھا۔

"یار مجھے ایک بات بتاؤ، تم تو کہتے ہو کہ تمہاری پہنچ بہت دور تک ہے، تم اپنے پرندے آزاد کرالو۔" میں نے بھی اس پر طنز کیا

"وہ اگر قید میں مر بھی جائیں تو مجھے کچھ نہیں ہوگا، کوئی فرق نہیں پڑے گا، لیکن میں صرف تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تو کیا کرتا ہے۔" اس نے کہا۔

"مجھے دیکھنے کا مطلب ہے تمہاری موت، اپنی دنیا تک محدود رہو یہی اچھی بات ہے۔" میں نے اسے کہا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ میں اپنی موت کا سامنا کروں، میں موت کا سامنا کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے دبے دبے جوش سے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ میرا آمنا سامنا چاہتا ہے۔ میں نے فون بند کردیا۔ میں اس کی آواز ریکارڈ کر چکا تھا۔ میں اٹھا اور اروند کے پاس چلا گیا۔

وہ بھی اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ وہاں مکمل خاموشی تھی۔ میں ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گیا تو اروند نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

"را کے بڑوں کا اجلاس ہو چکا ہے۔ ایک طرف وہ ویریتا کے مطالبات ماننے کو تیار ہیں اور دوسری طرف اپنے ہیکرز لگا کر ویریتا کو تلاش کر رہے ہیں۔ میں نے بھی یہی بہانہ بنا کر انہیں جواب نہیں دیا۔"

"بالکل ٹھیک کیا، اگر ہو سکے تو جب تک انہیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے، کرو۔ جسپال سے کہو، تھوڑا مزید دباؤ ڈالے، پھر دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے۔" میں نے کہا تو اس نے سر ہلا دیا۔ پھر چند لمحوں بعد بولا۔

"میں میل کر دی ہے۔ رونیت اسے بتا دے گی۔"

"اوکے، اب یہ ایک آواز ہے، اسے دیکھو، یہ بندہ چند دنوں سے دھمکیاں دے رہا ہے۔ ابھی اپنا کام کرو۔ جس وقت فری ہونا تو اسے تلاش کر لینا۔" میں نے اسے اپنا سیل فون دیتے ہوئے کہا۔ اس نے وہ آواز اپنے کمپیوٹر میں ڈال لی تو اپنی کرسی گھما کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں، اس پر ذرا غور بھی کریں اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا، یہ بھی سوچنا ہے۔"

"بولو، کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس وقت آگرہ بھارت کے ایک اسپتال سے فارغ ہونے والے دو بھائی شمش الدین اور قمر الدین انتہائی کسمپرسی کی حالت میں پڑے ہیں۔ ان کے ارد گرد سخت پہرا ہے۔ میرا خیال ہے انہیں مار دیا جائے گا، یا پھر انہیں کسی غلط مقصد کے لیے استعمال کیا جائے گا۔"

"یہ یہاں کیوں اور یہ سب......" میں نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"میں بتا رہا ہوں نا۔" اس نے تیزی سے کہا اور ایک لمحہ سانس لے کر کہتا ہی چلا گیا۔ "دراصل یہ دونوں بھارتی مسلمان ہیں اور آگرہ ہی کے رہنے والے ہیں۔ تقریباً دس برس پہلے یہ پڑھنے کے لیے امریکہ کے شہر ہوسٹن چلے گئے تھے۔ کمپیوٹر کی تعلیم کے ساتھ ساتھ یہ بہت بڑے ہیکرز بھی بن گئے۔ یہ اس قدر شارپ مائنڈ تھے کہ پچھلے تین برس سے انہیں پکڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی، لیکن یہ ہاتھ نہیں آ رہے تھے۔ ان کا اصل خواب تھا کہ یہ چین چلے جائیں، جس کے لیے یہ بھرپور کوششیں بھی کر

رہے تھے۔ انہوں نے بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ لیکن صرف دولت کے لیے، اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ میں نے ایک دو کام ان سے لیے ہیں اور یہ جو آواز والا سافٹ ویئر بنایا ہے، یہ انہی کی مدد سے بنایا تھا۔ ابتدائی کام انہی سے شیئر کیا تھا۔ تقریباً ایک ماہ پہلے انہیں یقین ہو گیا کہ یہ پکڑے جا سکتے ہیں۔ انہیں پکڑوانے میں ایک بھارتی لڑکی کا ہاتھ تھا، جو خود بھی ہیکر تھی اور نئی نئی ''را'' کے لیے کام کرنے لگی تھی۔ امریکن کو ان پر پہلے ہی شک تھا، انہوں نے ان دونوں کو گھیر لیا۔ دو ہفتے تک یہ امریکن تشدد کا شکار رہے۔ یہاں تک کہ یہ دونوں مرنے والے ہو گئے ہیں۔ ان دونوں نے تشدد تو برداشت کر لیا لیکن منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔''

''بڑی بات ہے جو انہوں نے منہ سے کچھ نہیں نکالا؟'' فہیم نے حیرت سے تبصرہ کیا۔

''الزام کیا لگایا تھا ان پر؟'' میں نے پوچھا۔

''الزام ان پر یہ لگایا گیا تھا کہ یہ دونوں چونکہ مسلمان ہیں اور دہشت گردوں کی مدد کر رہے ہیں اور انہوں نے یہ تفتیش کی۔ چونکہ انہوں نے کبھی بھی ایسا نہیں کیا تھا، کسی دہشت گرد کی کبھی مدد نہیں کی تھی، سو ان پر یہ الزام ثابت نہیں ہو سکا تو انہیں چھوڑ دیا گیا اور پھر الزام ایک بھارتی لڑکی نے لگایا تھا جو خود سامنے نہیں تھی۔'' پھر فہیم کی طرف دیکھ کر بولا۔

''وہ بولے اس لیے نہیں کہ انہوں نے سوچ لیا تھا اگر انہوں نے جھوٹ میں اقرار کر لیا کہ ان کا دہشت گردوں سے تعلق ہے تو پھر ساری زندگی یہاں سے نہیں نکل سکتے۔ انہیں مرنا ہی پڑے گا، ان دونوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر زندگی چاہئے تو منہ بند رکھنا ہوگا۔''

''یار ان کا تشدد، بڑی بات ہے۔'' فہیم نے انسپائر ہوتے ہوئے کہا۔

''اور بات بتاؤں کہ انہیں الگ الگ رکھ کر بھی تفتیش کی گئی تھی۔'' اروند سنگھ نے بتایا

''واہ۔! تو پھر وہ بھارت کیسے واپس آ گئے؟ وہاں کسی اسپتال میں انہیں کیوں نہیں رکھا گیا؟'' پاس بیٹھے ہوئے فہیم نے تیزی سے پوچھا۔

''ایک تو وہاں پر ان دونوں بھائیوں کے دوستوں نے انسانی حقوق کی تنظیموں سے رابطہ کیا۔ ان سے مدد لی، دوسرا وہیں پر موجود بھارتی لابی نے ان کے لیے کوششیں کیں۔ الزام ثابت نہیں تھا، سو امریکن نے تو چھوڑ دیا لیکن بھارتی ''را'' نے ان دونوں کا اپنے استعمال کے لیے منتخب کر لیا۔ وہ دونوں بھائی انتہائی خستہ حالت میں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر مریں بھی تو کم از کم اپنوں کے درمیان مریں، سو انہوں نے واپس بھارت آنا ہی پسند کیا۔ جس پر ''را'' نے پوری دلچسپی لی اور انہیں آگرہ لے آئے۔ اب وہ وہاں کے ایک بڑے نجی اسپتال سے کل ہی فارغ ہوئے ہیں، ان پر سارا خرچ بھی وہ ''را'' کے ایجنٹ کر رہے تھے، جو بظاہر اس کے ہمدرد ہیں۔''

''یہ جو تم نے پوری کہانی سنائی اس کا مقصد کیا ہے؟'' اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھی مہوش نے پوچھا۔

''کسی بھی طرح ان دونوں کو بھارت سے نکال کر یہاں لایا جائے۔ یا ایسی کسی بھی جگہ پر جہاں وہ محفوظ ہو جائیں۔ اگر وہ ہمارے لیے کام نہ بھی کریں تو کم از کم ''را'' کے لیے نہ کریں۔ وہ بڑے بڑے کام کر سکتے ہیں، اگر ان سے کام لیا جائے تو۔ لیکن اس سے بھی ہٹ کر وہ میرے دوست ہیں۔ میں ان کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔'' یہ لفظ کہتے

ہوئے اروند سنگھ بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ تبھی میں نے کہا۔

''کیا تمہارا رابطہ ہے ان کے ساتھ۔'' فہیم نے پوچھا تو وہ بولا۔

''یار رابطہ ہے نا تو مجھے پتہ ہے نا، وہ خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ وہ وہاں سے نکل آئیں۔''

''او کے، تم ایک کام کرو۔ ان کے بارے میں بتاؤ، وہ کہاں ہیں، کوئی کوڈ ان کے ساتھ طے کرو۔ انہیں بتاؤ کہ ہم ان کے لیے کچھ کرتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں ان کے پاس سے اٹھ کر آ گیا۔

☆......☆......☆

رونیت کور اور جسپال سنگھ آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اروند سنگھ کا پیغام دے چکی تھی۔ دونوں کے درمیان خاموشی تھی اور وہ دونوں ہی اس پر سوچ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بانیتا کور بھی ان کے پاس آ گئی تو رونیت نے اسے بھی بتا دیا تو وہ تبصرہ کرتے ہوئے بولی۔

''دیکھو! اگر ہم یہ سمجھیں کہ ہم ''را'' کو ختم کر دیں گے تو یہ ابھی ناممکن ہے۔ اس وقت ہمارا ان سے مقابلہ ہے۔ اس کے پیچھے ایک حکومت ہے۔ اب اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ان سے ڈر جائیں، بلکہ ہم نے اسے ڈرانا ہے، فی الحال ہمیں انہیں یہی تاثر دینا ہے کہ وہ ہم تک نہیں پہنچ سکتے ہیں اور ہم جو چاہئیں کر سکتے ہیں۔''

''اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ انہیں یہ تاثر بالکل بھی نہیں ملنا چاہئے کہ یہ خالصتانی لوگ ہیں۔ پھر وہ اپنی توجہ اسی پر مرکوز کر لیں گے۔'' رونیت کور نے اپنا خیال دیا تو جسپال سنگھ مسکراتے ہوئے بولا۔

''یہ جو کچھ بھی ہونا ہے، کچھ کریں گے تو یہی ہو گا۔''

''ہونا تو کرنے سے ہی ہے، میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ جس قدر محتاط ہوا جا سکتا ہے، اتنا محتاط رہیں تا کہ ہم نے ٹارگٹ لینا ہے، اسے پورا کر سکیں۔'' بانیتا کور نے اپنی رائے دی

''اصل مسئلہ تو یہی ہے نا کہ ہمارا ٹارگٹ کیا ہے؟ فی الحال تو اتنا ہی ہے نا کہ ''را'' کو ڈرایا جائے، انہیں یہ احساس دلایا جائے کہ ہم ان کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں۔'' رونیت کور نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''تو پھر سیدھی سی بات ہے، ''را'' کے لوگوں کو نشانہ بنایا جائے، وہ پنجاب میں جہاں بھی ہوں۔ ایک دم سے انہیں طاقت کا احساس دلایا جائے، تو میرا خیال ہے ہم انہیں اپنی ہر بات منوانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' بانیتا کور نے پر جوش لہجے میں کہا۔

''ایسا ہی کرنا ہے اور یہ کوئی ایک دن کی بات تو نہیں ہے، اس میں وقت لگنا ہے۔'' جسپال نے کہا تو اسی وقت نوتن کور ان کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''سنو۔! جمال نے ایک کام کرنے کا کہا، جو فوری ہو جانا چاہئے۔''

''کیسا کام؟'' جسپال نے پوچھا۔

''دو لڑکوں کو کسی محفوظ مقام پر رکھنا ہے، پھر انہیں جمال کے پاس پہنچانا ہے۔'' نوتن نے تفصیل بتائی

''وہ بندے رکھیں گے کہاں، پنجاب میں ہوتے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔'' جسپال نے کہا تو بانیتا کور نے کہا۔

''ہو جائے گا۔ تم پلان کرو، کرنا کیا ہے۔''

''پھر تم ہی کر لو پلان۔'' جسپال نے کہا۔

''او کے میں دیکھتی ہوں، تم اپنا کام دیکھو۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ اس نے اپنے ساتھ نوتن کو بھی اٹھا لیا تھا۔

☆.........☆.........☆

شام ڈھل رہی تھی۔ سورج کی سرخی مغربی افق پر چھائی ہوئی تھی۔ ایسے وقت میں آگرہ شہر کی سڑک گلاب نگر روڈ پر بے تحاشا رش تھا۔ اسی رش میں ایک سیاہ جدید ماڈل کی فوروہیل بھی پھنسی ہوئی تھی۔ اس میں دو سکھ نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پاؤں میں جدید پسٹل پڑے تھے۔ ایک ڈرائیونگ کر رہا تھا اور دوسرا سامنے دیکھ رہا تھا۔ وہ سامنے دائیں جانب مہاتما گاندھی لنک روڈ دیکھ رہے تھے۔ جہاں سے مڑنے کے بعد انہیں آگرہ کے مشہور جی کے اسپتال جانے کے لیے ایک چھوٹی سڑک پر مڑنا تھا۔ ان کا رابطہ شمش الدین اور قمر الدین سے ہو چکا تھا۔ درمیان میں صرف پانچ منٹ کا وقفہ تھا۔

شمش الدین اور قمر الدین نے چیک اپ کے لیے اسپتال آنا تھا۔ ابھی ان کا چیک اپ ہوا نہیں تھا۔ ان کے ساتھ بھارتی انسانی حقوق کی تنظیم کے دو لوگ تھے، جو اصل میں ”را“ کے ایجنٹ تھے۔ ممکن ہے ان کے ارد گرد بھی لوگ ہوں۔ یہ ساری صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے پلان بنایا تھا۔

جیسے ہی ان کا چیک اپ کے لیے انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا تو ان کے ساتھ وہ لوگ نہیں تھے۔ ڈاکٹر نے انہیں دیکھا اور تسلی بخش قرار دے دیا۔ تاہم انہوں نے ایک ڈاکٹر سے درخواست کی ٹیسٹ لکھ دیں تاکہ کوئی شک نہ رہے۔ ڈاکٹر نے وہ ٹیسٹ لکھ دیا۔ ان دونوں بھائیوں کو پتہ تھا کہ لیبارٹری کس طرف ہے، انہیں وہاں تک جانا تھا۔ ظاہر ہے ان کے ساتھ لوگ بھی تھے۔ اس لیبارٹری سے ذرا فاصلے پر ایک چھوٹا گیٹ تھا جو مہاتما گاندھی لنک روڈ پر کھلتا تھا۔ یہی وہ نزدیک ترین جگہ تھی جہاں سے وہ انتہائی کم وقت میں باہر نکل سکتے تھے۔ اگر انہیں ایک سے دو منٹ مل جاتے تو وہ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ یہ سب کچھ کمپیوٹر پر طے ہوا تھا۔ ان کے پاس سیل فون نہیں تھے، جن سے وہ باہر کسی سے رابطہ کر سکتے۔ ان کے ساتھ والے اس لیے اتنے محتاط نہیں تھے۔

وہ دونوں بھائی لیبارٹری کے پاس پہنچ گئے تھے۔ بلاشبہ ٹیسٹ کے لیے انہیں ہی اندر جانا تھا اور اس کے بعد رپورٹ کا انتظار بھی کرنا تھا۔ وہ دونوں اندر چلے گئے۔ انہوں نے ٹیسٹ کرنے والے شخص کو بتایا ہی نہیں کہ وہ وہاں پر کیوں ہیں۔ اگر کوئی پوچھتا کہ وہ کیوں کھڑے ہیں تو وہ بتا دیتے۔ قمر الدین باہر دیکھنے لگا۔ ان کے ساتھ آئے دونوں بندے باہر ہی کھڑے تھے۔ کچھ دیر گزری تو وہ ساتھ میں پڑے ہوئے بینچ پر بیٹھ گئے۔ اسی دوران انہوں نے دروازے کی اوٹ سے باہر دیکھا، پھر کاریڈور میں آ گئے۔ وہاں سے انہیں دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلے اور گیٹ تک جا پہنچے۔ سامنے ہی ایک سیاہ فوروہیل کھڑی تھی۔ انہوں نے نشانی یہ طے کی ہوئی تھی کہ ڈرائیور سائیڈ کے شیشے کے ساتھ سبز رنگ کی دھجی بندھی ہوئی ہوگی۔ وہ کوئی بھی گاڑی ہو اس میں بیٹھ جائیں۔ وہ دونوں تیزی سے اس فوروہیل کی جانب بڑھے۔ ان دونوں بھائیوں کی تصویریں، ان سکھ نوجوانوں نے دیکھ رکھی تھیں۔ انہوں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ ان کے بیٹھتے ہی فوروہیل چل دی۔ انہوں نے تو نہیں دیکھا، لیکن ڈرائیور نے یہ دیکھ لیا کہ دو بندے ہونقوں کی طرح تیزی سے باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ انہیں یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ دونوں بھائی بھاگ چکے ہیں۔

”ہمیں شہر سے باہر جانا ہے یا یہیں شہر میں رہنا

ہے؟'' شمش الدین نے پوچھا۔

''دیکھو۔! ہمیں انہوں نے دیکھا تو نہیں لیکن انہیں پتہ چل گیا ہے کہ تم لوگ فرار ہو چکے ہو۔'' سکھ ڈرائیور نے بتایا تو شمش الدین فوراً بولا۔

''اب کیا ہوگا؟''

''میرے ذہن میں دو طرح کے پلان تھے، تم دونوں فکر نہ کرو، اب تم اپنے آپ کو محفوظ سمجھو۔'' ڈرائیور نے کہا اور پوری توجہ سامنے دیکھ کر ڈرائیونگ پر لگا دی۔ وہ مہاتما گاندھی روڈ پر آ گیا تھا اور یہی سڑک انہیں آگرہ شہر سے انتہائی تیزی کے ساتھ شہر سے باہر لے جانے والی تھی۔ لیکن اسی سڑک پر اتنا ہی خطرہ تھا۔ یہاں ان کے پکڑے جانے کے زیادہ امکانات تھے۔ وہ تھوڑا سا آگے جا کر سڑک کے بائیں جانب اُتر گیا۔ اگرچہ شہر کی بھول بھلیوں والی گلیوں اور سڑکوں سے نکلنا مشکل اور وقت طلب تھا، مگر محفوظ تھا۔ رات کے پہلے پہر وہ شہر سے باہر نکل چکے تھے۔ انہیں ایک چھوٹے سے گاؤں میں ٹھہرنا تھا، جہاں اپنا گٹ اپ تبدیل کر کے وہ پنجاب کا رُخ کر سکتے تھے۔ اگرچہ یہ تقریباً سات گھنٹے کا راستہ تھا تاہم وہ محفوظ جگہ پہنچ جانے والے تھے۔

☆......☆......☆

اس وقت میں ناشتہ کر چکا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ حویلی سے نکلوں اور مسافر شاہ کے تھڑے تک جاؤں۔ درویش کی باتیں سنوں، فرید سے گپ شپ کروں اور کھلی فضا میں وقت گذاروں۔ میں باہر نکلنے کے لیے پر تول رہا تھا کہ اروند سنگھ نے فون کر کے میرے بارے میں پوچھا، پھر خود ہی آنے کا کہہ دیا۔ میں لاؤنج میں ہی بیٹھ گیا۔ چند منٹ بعد وہ بھی میرے سامنے آ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''آپ نے رات مجھے جو نمبر دیا تھا، اس کے بارے میں پتہ چل گیا ہے۔''

''کہاں ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''تقریباً بارہ بجے تک تو وہ سیالکوٹ سے کچھ فاصلے پر تھا شمال کی جانب، میں اس کے بعد سو گیا تھا۔ اب بیدار ہو کر میں نے دیکھا تو وہ لاہور کے مضافات میں ہے۔''

''گویا کہ وہ وہاں سے لاہور آ گیا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے تم اس کی حرکت پر نگاہ رکھو، اسے بھی دیکھتے ہیں۔'' میں نے کہا تو اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''لاہور نہیں جائیں گے آپ؟''

''مطلب؟ میں لاہور کیوں؟'' میں نے اس سے پوچھا تو وہ بولا۔

''کل صبح تانی کی فلائیٹ ہے، وہ آ رہی ہے یہاں۔ آپ کو نہیں بتایا؟''

''ارے یار جب اس کے چاہنے والا اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے تو ہمیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''بات تو ٹھیک ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا تو مجھے اچانک یاد آیا تو پوچھا۔

''ارے ہاں سنا، وہ تیرے دوست شمش الدین اور قمر الدین خیریت سے پہنچ گئے کسی محفوظ ٹھکانے پر یا کہ ابھی نہیں؟''

''پہنچ گئے ہیں جالندھر فارم ہاؤس پر۔ سارا انتظام بانیتا کور نے کیا ہے۔ امید ہے وہ اب یہاں تک پہنچ ہی جائیں گے۔'' اروند سنگھ نے سکون سے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ابھی انہیں یہاں لانے کی جلدی نہ کی جائے۔ حالات سازگار ہونے کا انتظار کیا جائے۔ جہاں تک کام کا معاملہ ہے وہ لوگ وہاں

بیٹھ کر بھی کر سکتے ہیں۔'' میں نے اسے صلاح دی۔

''میں نے انہیں کہہ دیا ہے اور میرے ساتھ ہی رابطے میں ہیں۔ انہیں وہاں سب سہولت دے دی جائے گی، جیسے ہی حالات بنے وہ وہاں سے نکل آئیں گے۔'' اروند نے بتایا۔ ہم ابھی باتیں کر رہی رہے تھے کہ رندھاوا کے آجانے کی اطلاع ملی۔ میں نے اروند سنگھ کو اندر بھیج دیا اور خود باہر اس سے ملنے چلا گیا۔ وہ لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ ملنے ملانے کے بعد بیٹھتے ہی اس نے کہا۔

''جمال۔! کل تم نے بہت اچھا کیا کہ کسی بحث وغیرہ کے بغیر انہیں ایم این اے کی سیٹ دے دی۔''

''میں یہ نہیں سمجھا کہ تم ان کے ساتھ کیوں آئے تھے اور تمہارا کیا فائدہ ہے اس میں؟'' میں نے اسے ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھو جمال۔! جہاں تم رہتے ہو، میں رہتا ہوں یہ اپنا علاقہ ہے، ہمارا مقصد سیاست ہر گز نہیں ہے، جب ہم نے سیاست کرنی ہی نہیں ہے تو پھر خواہ مخواہ دشمن پالنے کا فائدہ۔ گھر کا دشمن زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ اب تمہارے دشمن نہیں، دوست ہیں۔ اگر وہ تمہارا فائدہ نہ کر سکے تو نقصان بھی نہیں کریں گے۔ تم جو ہو، انہیں یہ احساس ہی نہیں کہ تمہاری طاقت کیا ہے اور جہاں تک میرے فائدے کی بات ہے۔ میں نے یہ پورا علاقہ چلانا ہے۔ تم جانتے ہو میں یہاں پر ایک انسپکٹر کے طور پر تعینات تھا، آج ڈی ایس پی ہوں۔ میں مانتا ہوں، تمہاری وجہ سے یہ سب ہوا۔ اب مجھے اگر رہنا ہے تو اس علاقے میں امن رہنا چاہئے۔'' اس نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

''رندھاوا۔! اگر ہم سیاست کریں ہی نہ، الیکشن ہی نہ لڑیں تو؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر اس سے زیادہ اچھی بات اور کیا ہوگی؟ دونوں متحارب گروپ آپس میں لڑتے رہیں گے اور تمہیں دوست بنا کر رکھنا ان کی مجبوری ہوگا۔ یہ زیادہ بہتر ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو پھر کہہ دینا ان سے کہ اشفاق چوہدری الیکشن نہیں لڑ رہا ہے۔ کسی بھی سیٹ پر نہیں۔'' میں نے کہا تو رندھاوا ہولے سے مسکرا دیا پھر بولا۔

''میں جانتا تھا کہ تم یہی کرو گے۔ خیر، میں ضمانت دیتا ہوں کہ اس علاقے میں تیرا کوئی دشمن نہیں ہوگا۔''

''میں کسی کو بھی دشمن نہیں رکھتا، یہاں تک کہ وہ خود میرا دشمن نہ بن جائے۔'' میں نے کہا۔

''میں نے تو سمجھا تھا کہ تم کوئی اپنی شرائط رکھو گے، لیکن یہاں معاملہ ہی دوسرا ہے۔ میرا خیال ہے اب مزید کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''ہاں، ایسا ہی ہے۔'' میں نے کہا اور پھر کافی دیر تک ادھر اُدھر کی علاقے کے بارے میں باتیں کرنے کے بعد اُٹھ گئے۔

☆......☆......☆

چندی گڑھ میں شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ وہ گھر میں پڑا اکتا گیا تھا۔ یہی حال رونیت کا تھا۔ وہ اپنی اکتاہٹ کا اظہار کر چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے انہوں نے باہر گھوم پھر کر آنے کا پروگرام بنایا۔ ان کے پاس نئے ماڈل کی کار تھی۔ انہوں نے دوسروں کو بھی آفر کی لیکن کوئی بھی باہر جانے کو نہیں مانا، سو وہ دونوں باہر جانے کے لیے نکل پڑے۔ وہ گلیوں سے نکل کر مین روڈ پر آئے تو جسپال نے رونیت کور سے پوچھا۔

''بولو، کہاں چلیں؟''

''کہیں بھی کھلی فضا میں، کسی باغ میں چلو، جہاں تھوڑی دیر بیٹھیں۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے تو آئیڈیا نہیں ہے یہاں کسی باغ کا، تم بتاؤ۔" جسپال نے کہا۔

"ارے یہیں نزدیک ہی تو ہے سیکٹر سولہ میں روز گارڈن، وہیں چلتے ہیں۔" رونیت کور نے کہا اور اسے راستہ سمجھانے لگی۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ باغ میں پہنچ گئے۔ کار پارکنگ میں لگانے کے بعد وہ چہل قدمی کرنے لگے۔ تھوڑی دیر خاموشی سے چلتے رہنے کے بعد رونیت ہی بولی۔

"جسپال۔! ہم پر جو اکتاہٹ طاری ہوئی ہے، تم اس کی وجہ جانتے ہو؟"

"مجھے تو سمجھ میں نہیں آرہا، اگر تم بتا سکو؟" اس نے عام سے انداز میں پوچھا تو چند لمحے خاموشی سے چلتی رہی، پھر بڑے گہرے لہجے میں بولی۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم اپنے دھرم کے لیے لڑ رہے ہیں۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ دھرم ہی کے نام پر ہو رہا ہے، کبھی کبھی میں سوچتی ہوں، کہیں ہم استعمال تو نہیں ہو رہے، ہم ٹشو پیپر کی طرح ہیں۔"

"یہ ٹشو پیپر والی سوچ تمہارے دماغ میں کیوں آئی؟" جسپال نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

"دیکھو، ہم اندھیری رات کے مسافر ہیں۔ ہم نے جو کچھ بھی کیا، اس کا کوئی کریڈٹ نہیں، لینا بھی چاہیں تو نہیں لے سکتے۔ ہم کبھی سامنے نہیں آسکتے۔ اس راہ میں مر گئے تو کسی کو کوئی پتہ نہیں کہ ہم نے سکھی کے لیے کچھ کیا۔ اس کا بھی کوئی کریڈٹ نہیں۔" وہ یوں بولی جیسے اس کی لہجے میں کہیں احتجاج ہو۔

"مطلب تم اس کا کریڈٹ چاہتی ہو؟" جسپال نے اس کی بات سن کر سکون سے پوچھا۔

"اب تم اس پر یہ کہہ دو گے کہ گرو مہاراج تو جانتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ اور پھر سکھی میں بابا لہنا سے لے کر بھنڈرانوالا تک کی مثالیں دو گے کہ انہوں نے پران دے دیئے لیکن سیس نہیں نیوایا۔" رونیت کور پھر اسی احتجاجی لہجے میں بولی۔

"میں بحث نہیں کروں گا رونیت، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہی ہو؟" جسپال نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"میں یہ سوچ رہی ہوں کہ ہم اس تحریک سے چاہیں بھی تو فرار نہیں لے سکتے۔ اپنے مار دیں گے یا ہمارے دشمن، کوئی اعتبار کرنے والا نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں خالصتان تحریک کی زبردست حامی ہوں، مگر یار اتنی جدوجہد کے بعد بھی کوئی آؤٹ پٹ نہیں، کہیں سے تو کوئی ایسا اشارہ ملے کامیابی کا، ہمیں بھی حوصلہ ہو، میں بھی یہ سمجھ سکوں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ ٹھیک ہے، غلط نہیں۔ دولت بہت کما لی، کسی بھی ملک میں خوبصورت ولا لے کر باقی زندگی آرام سے گذار سکتی ہوں۔ دراصل میں تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ جب میں کینیڈا میں تھی تو کم از کم وہاں پر خوف نہیں تھا۔"

"میں سمجھا نہیں، خوف کیسا؟" جسپال نے پوچھا۔

"تم اور میں یہاں ہیں نا، لیکن ہمارے ساتھ ایک انجانا خوف بھی ہے کہ کسی وقت کوئی ہمیں پکڑ سکتا ہے، کہیں سے کوئی گولی ہمیں چھید سکتی ہے، ہماری نگرانی ہو رہی ہوگی، ایسا ہی بہت کچھ۔ لیکن یہ خوف کینیڈا میں نہیں تھا۔ وہاں صرف کام تھا، دن رات کام، لیکن خوف نہیں تھا جو یہاں ہے۔" رونیت نے صاف لفظوں میں کہا تو جسپال نے پوچھا۔

"رونیت، تم کینیڈا جانا چاہتی ہو یا اس کام سے بالکل اکتا گئی ہو۔ سکون سے کہیں زندگی گذارنا چاہتی ہو؟"

"میری زندگی میں شاید ہی خالصتان بنے۔ میں نے اپنے حصے کا بہت کام کر لیا۔ مجھے اب آزادی چاہئے، چاہے تم مجھے گولی مار دو۔ یا پھر مجھے اپنی مرضی کی زندگی جینے کا حق دیا جانا چاہئے۔" اس باراس کے لہجے میں احتجاج کی جگہ اکتاہٹ تھی۔

"اور اگر میں تمہیں یہ یقین دلا دوں کہ خالصتان کا کام بہت ہی منظم انداز میں شروع ہونے جا رہا ہے تو؟" جسپال نے نرم لہجے میں کہا۔

"جسپال میں تم سے زیادہ معلومات رکھتی ہوں۔ اس وقت سکھ دنیا میں تین طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو تلوار کے زور پر خالصتان بنانا چاہتے ہیں، دوسرے وہ جو بات چیت اور دلائل کیساتھ اپنی آواز اٹھانا چاہتے ہیں اور تیسرے وہ جو اس تحریک کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے ہیں، انہیں صرف اپنے مفاد سے غرض ہے۔ میں ان لوگوں کا ذکر نہیں کر رہی ہوں جو خالصتان تحریک کے حامی بھی نہیں ہیں۔"

"مایوس ہو گئی ہو رونیت، کوئی بات نہیں۔ تم جو چاہو، وہی ہوگا اور دوسری بات یہ ذہن میں رکھو کہ ہم کوئی جرائم پیشہ افراد کا گینگ نہیں ہیں جہاں آنے کا راستہ تو ہے لیکن واپس جانے کا نہیں۔ تم جب چاہو، جہاں چاہو اور جس وقت چاہو جا سکتی ہو۔ کینیڈا جانا چاہتی ہو تو وہاں چلی جاؤ۔ میں تمہارے وہاں جانے کا انتظام کر دوں گا۔" جسپال نے بڑے نرم لہجے میں اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"کیا کروں گی وہاں جا کر؟" اس نے اچانک کہا۔

"اب یہ ایک نیا موضوع؟ میں تمہاری ذہنی حالت سمجھ رہا ہوں رونیت، میں جانتا ہوں اس وقت تمہیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ ایسی حالت میں کیا گیا کوئی بھی فیصلہ درست نہیں ہوتا۔ میں تمہارے بارے میں سمجھ گیا ہوں۔ سب کچھ ذہن سے نکال دو۔ ان لمحات کو پوری طرح انجوائے کرو۔ وہ دیکھو سامنے کتنے گلاب کے پھول کھلے ہیں، ان کے پاس چلتے ہیں۔" جسپال نے اسے یوں کہا جیسے کسی بچے کو پچکارتے ہیں۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی ذہنی حالت کیا ہو گئی ہے۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ دونوں باغ سے نکل کر ایک شاپنگ سینٹر میں آ گئے۔ وہاں کافی دیر تک شاپنگ کرتے رہے۔ انہوں نے سب کے لیے کپڑے اور دیگر چیزیں خریدیں۔ جسپال کو اس وقت حیرت ہوئی جب رونیت کور نے اعلیٰ شراب کی دو بوتلیں رکھ لیں۔ جسپال نے دیکھا، مگر خاموش رہا۔ وہ پلٹ کر گھر واپس آ گئے۔ جسپال سوچ رہا تھا کہ اب رونیت کور اگر اُن کے لیے نقصان دہ نہ بھی ہوئی تو فائدہ مند نہیں ہوگی۔ اس کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ یہ پتہ کرنا بہت ضروری تھا۔

جسپال اپنے کمرے میں تھا کہ بانیتا کور اس کے پاس آ گئی۔ اس کا چہرہ کافی حد تک سرخ تھا۔ وہ اس کے پاس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"یہ شراب تم نے رونیت کو خرید کر دی ہے؟"

"نہیں اس نے خود خریدی ہے، کیوں کیا ہوا؟" اس نے پوچھا تو بانیتا کور اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"میں اسے کھانے کا کہنے گئی تو وہ بیٹھی پی رہی تھی۔ یہ حرکت اس نے پہلی بار کی ہے، کیا ہوا ہے اسے؟"

"یہ تجھے پتہ ہونا چاہے تھا، اس کے اندر کی تبدیلی کا تمہیں احساس کرنا چاہے تھا۔" جسپال نے کہا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔

"میں گرلین کور سے پوچھتی ہوں، اسے ہوا کیا ہے، اسے شاید پتہ ہو۔"

"ہاں اس سے پوچھو۔" جسپال نے کہا تو وہ فکر مندی میں ہی اٹھ کر چلی گئی۔

آدھی رات سے زیادہ کا وقت ہو گیا ہوگا۔ جسپال مختلف لوگوں کو فون کر کے حال احوال پوچھ رہا تھا۔ ایسے میں بانیتا کور نے اسے چھت پر بلایا۔ وہ پر سکون سے انداز میں اٹھ کر چھت پر جا پہنچا۔ وہاں دھیمی دھیمی روشنی تھی تو اسٹریٹ لائٹ سے آ رہی تھی۔ ٹیرس کے پاس گرلین کور کے ساتھ بانیتا کور کھڑی تھیں۔ وہ ان کے پاس چلا گیا۔ اسے دیکھتے ہی بانیتا کور نے کہا۔

"جسپال، ہم ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس جانے والے ہیں۔"

"رب خیر کرے، ایسی کیا بات ہوگئی۔" جسپال نے کافی حد تک سکون سے کہا تو وہ بولی۔

"اپنی رونیت کور کا پرانا عشق جاگ گیا ہے۔"

"اس میں برائی کیا ہے اور اس کا ہماری مصیبت سے کیا تعلق؟" جسپال نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ اسے سمجھانے والے لہجے میں بولی۔

"برائی عشق کرنے میں نہیں، لیکن جس سے وہ عشق کر رہی ہے، وہ مصیبت ہے۔"

"مجھے صاف بتاؤ، بات کیا ہے۔" اس نے پوچھا تو گرلین کور نے ایک طویل سانس لیا پھر بولی۔

"رونیت کور کے ساتھ ایک لڑکا پڑھتا تھا، امیت سنگھ۔ اچھا تھا جیسے عام سے لڑکے ہوتے ہیں۔ وہ کچھ عرصہ پروفیسر کے ساتھ رہا، پھر چھوڑ گیا۔ انہی دونوں رونیت اور اُمیت کا عشق زوروں پر تھا۔ اُمیت کے چلے جانے کے بعد تھوڑا عرصہ رونیت نے اسے یاد رکھا۔ پھر پہ در پہ مصیبتیں پڑنے لگیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے اس کا دوبارہ اُمیت سے رابطہ ہوا۔ چند دن پہلے پتہ چلا کہ وہ ایک آرمی آفیسر ہے۔"

"اوہ۔! تو اس کا آرمی آفیسر ہونا ہی سب سے غلط بات ہے۔ رونیت تو ہمارے بارے میں سب جانتی ہے۔ اگر انہیں بھنک بھی مل گئی تو ہمارا سب کچھ ختم ہو کر رہ جائے گا۔" جسپال نے تشویش سے کہا۔

"جسپال، یہ بھی ممکن ہے کہ اُمیت "را" کا ایجنٹ ہو اور اُسے رونیت کے پیچھے لگایا گیا ہو۔ کیونکہ اُمیت یہ جانتا ہے کہ رونیت کیا چیز ہے۔ ایسے ہی کسی شک کی بنا پر وہ اسے ٹٹول لینا چاہتا ہو؟" بانیتا نے کہا۔

"یہ تو بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔ رونیت تو سب کچھ جانتی ہے۔ اسے منع نہیں کر سکتے، اُمیت کو ختم کرتے ہیں تو بھی معاملہ خراب ہو جائے گا۔ اس کا کیا حل ہوگا؟" جسپال ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ پھر گرلین کور کی طرف دیکھ کر بولا۔

"کیا تمہیں شک ہے کہ اُمیت کوئی ایسا ویسا بندہ ہو سکتا ہے؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ یہ تو اس کے بارے میں جانکاری حاصل کی جائے تو پتہ چلے۔"

"اس کے بارے میں تم سے بات تو کرتی ہوگی؟" جسپال نے پوچھا۔

"نہیں، چند دن پہلے مجھے تھوڑا بہت بتایا تھا، وہی جو میں نے تم سب کو بتا دیا، اس کے علاوہ نہ اس نے بات کی اور نہ ہی میں پوچھا۔" گرلین نے جواب دیا۔

"دیکھو۔! رونیت ہماری بہترین ساتھی ہے، ہم اسے ضائع نہیں کر سکتے اور نہ ہی اتنے ظالم ہیں کہ اسے ختم کرنے کا سوچیں۔ اس مسئلے کو بہت سکون سے حل کرنا ہوگا۔ اب کہاں ہے وہ؟"

"وہ آدھی سے زیادہ بوتل پی کر بالکل بے ہوش پڑی ہے۔ اسے پتہ ہی نہیں وہ کہاں ہے۔" گرلین

نے بتایا تو جسپال نے سمجھایا۔

"دیکھو، ہماری بقا اسی میں ہے کہ وہ اب اُمیت سے رابطہ نہ کرے۔ اسے صبح ہوش میں آنے دو، میں اس سے بات کروں گا، تب تک فون، کمپیوٹر یا کوئی بھی رابطہ کرنے والی شے اس کے پاس نہ ہو، گرلین تم نے اس کا خاص خیال رکھنا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں اس کے پاس ہی ہوں۔" اس نے بات سمجھتے ہوئے کہا۔ پھر اسی موضوع پر وہ باتیں کرتے چلے گئے۔

☆......☆......☆

صبح کی تازہ کرنیں لاہور پر پھیل چکی تھیں۔ روشن لاہور میں زندگی رواں دواں تھی۔ ایسے میں لاہور ائر پورٹ پر کافی گہما گہمی تھی۔ چوہدری اشفاق نے بھی سیاہ فورہیل ایئر پورٹ کے سامنے لگا دی۔ اس کے ساتھ جنید تھا۔ چوہدری اشفاق رات ہی لاہور پہنچ گیا تھا۔ اب وہ دونوں تانی کو لینے وہاں پر تھے۔ فلائیٹ آ چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایئر پورٹ کے مراحل کے بعد باہر نکلنے والی تھی۔ وہ مسافروں کے باہر آنے والے راستے پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ تانی باہر آ گئی۔ اس نے اپنا وہی مخصوص عبایہ پہنا ہوا تھا۔ وہ جنید سے ملی، پھر چوہدری اشفاق سے ملتے ہوئے ذرا سا جھجکی، جنید اس سے باتیں کرنے لگا، جبکہ چوہدری اشفاق نے اس کا مختصر سا سامان لیا اور وہ ایئر پورٹ سے باہر آ گئے۔ پھر اگلے چند منٹ میں وہ چل دیئے۔

ایئر پورٹ کی حدود سے باہر آ کر وہ بائی پاس پر تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اگرچہ فون پر روزانہ ہی رابطہ رہتا تھا لیکن تانی پھر بھی نور نگر میں موجود ہر ایک کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور چوہدری اشفاق بتاتا چلا جا رہا تھا۔ انہیں لاہور میں رکنا نہیں تھا، سیدھے نور نگر ہی آنا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ لاہور کے مضافات میں آ گئے۔

ایسے میں اچانک ان کے ساتھ ایک فور وہیل جیپ چڑھی، اور آگے نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک دوسری جیپ ان کے برابر چڑھ گئی۔ جنید ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ فوراً سمجھ گیا۔ اسے اپنے گرد خطرے کا احساس ہو گیا۔ تانی اور چوہدری اشفاق بھی تاڑ گئے کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ تبھی تانی نے پوچھا۔

"جنید! کوئی ہتھیار ہے۔"

"تمہاری سیٹ کے نیچے پسٹل اور میگزین پڑے ہیں، چوہدری اشفاق کو بھی دے دو۔"

"میرے پاس ہے۔" اس نے جواب دیا پھر باہر کی جانب دیکھتا ہوا بولا۔

"کون ہو سکتے ہیں؟"

"کوئی بھی ہوں، اگر ہمیں کچھ کہا تو معاف نہیں کرنا۔" جنید نے کہا اور توجہ ڈرائیونگ پر لگا دی۔ اس کے پیچھے بھی ویسی ہی ایک سیاہ فور وہیل جیپ آ گئی تو صورت حال خاصی خطرناک ہو گئی تھی۔ انہیں یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ان تین گاڑیوں میں لوگ کتنے ہو سکتے ہیں۔ تانی نے پسٹل اپنے ہاتھ میں کر لیا اور میگزین سنبھال لیے۔ ایسے ہی وقت میں جنید کا فون مجھے ملا۔ اس نے صورت حال بتائی تو میں نے اس سے کہا۔

"فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ان کا بندوبست کیا ہوا ہے۔ مجھے احساس تھا کہ ایسا کچھ ہو سکتا ہے۔ تم نے ان سے الجھنا نہیں۔"

"یہ کیسے ہوگا، ان کی ایک گاڑی میرے آگے ہے، ایک پیچھے اور ایک بالکل برابر چڑھی ہوئی ہے۔" جنید نے مزید وضاحت کی

"پھر تم ایسے کرو، راستے میں ڈھابے ہوٹل، یا

فلنگ اسٹیشن، جو بھی ہو اس پر رک جاؤ، ایک دم سے نکلوان کے درمیان سے۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"میں سمجھ گیا۔" اس نے کہا۔

اس نے فون آن ہی رکھا لیکن اس کے ساتھ ہی اچانک اس نے کٹ مارا اور ایک ڈھابے ہوٹل کی جانب مڑ گیا۔ پچھلی جیپ کے ٹائر چرچرائے، اگلی کافی آگے نکل گئی، برابر والی ایک دم سے ڈول گئی۔ ڈھابے ہوٹل پر رکتے ہی جنید نے اپنا پسٹل نکال لیا، تانی نے بھی سیفٹی کیچ ہٹادیا۔ وہ تینوں الرٹ ہو گئے۔

چند لمحے ہی گذرے تھے کہ وہ تینوں فور وہیل ان کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ اب ایک طرح سے اعصاب کی جنگ شروع ہو گئی تھی۔ کون کیا کرتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے وہ رکے ہوئے تھے۔ تین سے چار منٹ تک وہ یونہی آمنے سامنے ڈٹے رہے۔ تبھی ان تینوں فور وہیل سے دو دو بندے نکلے۔ ان سب نے جینز اور شرٹ پہنی ہوئی تھیں۔ سبھی پچیس سے تیس برس کے درمیان کے تھے۔ وہ شکل ہی سے جرائم پیشہ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر پھیل گئے اور ان کی طرف بڑھے۔ ان میں سے دو بالکل سامنے آ گئے۔ وہ جنید کی فور وہیل سے چند قدم کے فاصلے پر تھے۔ ان میں سے ایک نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے جنید کو پسٹل کی نال کے اشارے سے نیچے اترنے کو کہا۔ یہ بات مجھے جنید نے بتادی۔

"اترنا نہیں، وہ تمہارے قریب آئے گا۔" میں نے اسے سمجھایا

وہ چھ لوگ تھے اور آہستہ آہستہ گھیرا تنگ کرتے چلے جارہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک ایک بندہ مزید اتر آیا۔ بلاشبہ وہ تینوں ان کے کور پر تھے۔ انہی لمحات میں اچانک ہی وہاں پر ایسی ہی چھ فور وہیل ایک دم سے آن رکیں۔ جیسے ان گاڑیوں کے بریک لگے، ان میں سے کئی لوگ مختلف ہتھیار لے کر باہر نکلتے چلے۔ یہ ان لوگوں کے لیے اچانک افتاد تھی۔ وہ سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے کہ یہ کون لوگ ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ سمجھتے، انہوں نے لمحوں میں ان سب کو گھیر لیا۔ انہی میں سے ایک نے ان سے کہا۔

"اوئے، تم جو کوئی بھی ہو، اپنے ہاتھ سر پر رکھ کر زمین پر لیٹ جاؤ۔"

"کون ہو تم لوگ اور یوں......" ان میں سے ایک نے کہنا چاہا تو کہنے والے نے پسٹل سیدھا کیا اور فائر اس کے گھٹنے پر دے مارا۔ دلدوز چیخ کی آواز فضا میں بکھری تو اس کے ساتھ ہی باقیوں نے بھی یہی کیا۔ وہ لوگ جنہوں نے جنید کو گھیرا ہوا تھا بھی فوراً زمین پر لیٹ گئے۔ انہیں یہ اندازہ ہو گیا تھا وہ مارنا نہیں چاہتے لیکن اگر ان کی بات نہ مانی گئی تو یہ مارنے سے دریغ بھی نہیں کریں گے۔ اگلے چند لمحوں میں وہ ان تک جا پہنچے۔ تین سے چار منٹ انہیں باندھنے میں لگے۔ وہ سارے باندھ لیے گئے تو جنید گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ اترتے ہوئے اس نے مجھ سے سوال کیا

"کون لوگ ہیں یہ اور......"

"ان میں سے دو طارق نذیر کے ڈیپارٹمنٹ کے لوگ ہیں اور باقی اپنے قبیلے کے لوگ ہیں۔ اب پتہ کرو، حملہ آور کون ہیں۔"

"کرتا ہوں پتہ؟" یہ کہتا ہوا وہ اس تک جا پہنچا، جس نے جنید کو گاڑی سے اترنے کے لیے پسٹل کا اشارہ کیا تھا۔ وہ اس کے سر پر جا کھڑا ہوا اور اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر غصے میں پوچھا۔

"کون ہو تم لوگ، اور کس بے غیرت نے بھیجا ہے؟"

"ہمیں شک پڑا تھا کہ تم لوگ کوئی غیر قانونی

کام کر رہے ہو، اس لیے بس چیک کرنا تھا۔" اس نے کہا۔

"کیا تم پولیس والے ہو؟" جنید نے پوچھا۔

"میرا تعلق خفیہ سے ہے۔" اس نے اعتماد سے کہا۔

"اور یہ جو تمہارے مارے آئے ہیں، یہ خفیہ والے ہیں، جلدی بکو، ورنہ تیری لاش بھی بولے گی۔" جنید نے اسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہا تھا۔ تو کئی ساری ٹھوکریں اسے پڑ گئیں۔ طارق نذیر کے اہلکار نے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر مار کر کہا۔

"اگلے چند سیکنڈ میں نہیں بولا نا تو مجھے تیری گاڑی کے پیچھے باندھ کر واپس لاہور لے جاؤں گا۔"

"مم...... ملک حیات ...... ملک حیات نے ...... بھیجا ہے ہمیں۔ انہیں ان تک لے جانا تھا۔" وہ تیزی سے بولا۔

"ملک حیات، ٹرانسپورٹر، ؟" اہلکار نے پوچھا۔

"جی وہی۔" اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

"او کے۔" اس نے کہا اور طارق نذیر کو رپورٹ کرنے لگا۔ پھر جنید سے بولا۔

"کچھ لوگ آپ کے ساتھ جائیں گے نور نگر تک، باقیوں کے ساتھ مجھے واپس لاہور جانا ہوگا، ان میں کافی زخمی ہیں، انہیں یہیں اسپتال میں......"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر جنید واپس اپنی گاڑی میں چلا گیا۔ اس نے اسٹارٹ کھڑی گاڑی کو گیئر لگایا اور چل دیا۔ اس کے ساتھ دو گاڑیاں چل پڑیں۔ کافی آگے آ کر اس نے مجھ سے کہا۔

"تانی سے بات کرو وہ بات کرنا چاہتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے فون تانی کو دے دیا۔

"کیا مسئلہ تھا یہ؟" اس نے پوچھا۔

"وہی لندن والے معاملے کی ایکسٹینشن ہے۔" میں نے کہا۔

"کیسے، یہ تھا کیا؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے ایویں شک تھا۔ کیونکہ اس نے چوبیس گھنٹے کی وارننگ دی تھی۔ ان چوبیس گھنٹوں میں صرف تم نے آنا تھا۔ اس دوران یہ بھی کل سے یہاں لاہور میں تھا۔"

"تمہیں اس کی موونگ کے بارے میں پتہ ہے۔" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"ہاں، پتہ ہے۔ اب تصدیق ہوگئی ہے۔ خیر یہاں آ ؤ گی تو تمہیں مزید پتہ چل جائے گا۔"

"او کے، وہیں بات ہوگی۔" یہ کہہ کر اس نے فون جنید کو واپس کر دیا۔ میں نے جنید کو سمجھا کر اس سے رابطہ ختم کیا ہی تھا کہ اسی اجنبی کا فون آ گیا۔

"مان گئے، ایویں ہی تمہارا نام ایوانوں اور جرم کی دنیا میں نہیں گونج رہا ہے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"اب جان گئے تو دوبارہ میرے بارے میں سوچنا بھی مت، ورنہ تمہاری سوچیں ہی تمہیں مار دیں گی۔" میں نے سکون سے کہا۔

"نہیں، میں نے تجھے نہیں چھوڑنا، تجھے تو ختم کرنا ہے، یہی میرا ٹاسک ہے۔ بہت عرصے بعد کوئی ایسا دشمن ملا ہے، جس سے لڑنے کا مزہ آئے گا۔ اب تک تو میں صرف تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ تم کیا کچھ کر سکتے ہو۔"

"جب میری سمجھ آ جائے تو بتا دینا۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ اب مجھے اس وقت تک الرٹ رہنا تھا، جب تک وہ تینوں نور نگر تک نہ پہنچ جاتے۔

☆......☆......☆

جسپال کی ساری رات آنکھ نہیں لگی تھی۔ کچھ دیر پہلے جب نوتن اسے بلانے آئی تو وہ اونگھ رہا تھا۔ ان

تینوں نے ناشتہ کرلیا تھا۔ جبکہ رونیت ابھی تک سو رہی تھی۔ تقریباً گیارہ بجے جسپال کی آنکھ کھلی تب تک رونیت بھی جاگ گئی تھی۔ ان دونوں نے مل کر ناشتہ کیا۔ نوتن برتن سمیٹ گئی تو جسپال نے اس کی اجڑی اجڑی حالت کو دیکھا اور کہا۔

''رونیت ایک بات کہوں۔''

''بولو۔'' اس نے سر جھکائے ہنکارے کے سے انداز میں کہا تو وہ بولا۔

''تم ایسا کرو، نہا کر خوب فریش ہو جاؤ۔ جو کل تم نے ڈریس خریدا تھا، وہ پہنو، پھر میں تمہیں بتاتا ہوں۔''

''کیا یہ ضروری ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں بہت ضروری۔'' اس نے کہا تو وہ مزید کوئی بات کیے بغیر اٹھ گئی۔

اس وقت جسپال اپنے کمرے میں تھا جب وہ تیار ہو کر اس کے پاس آگئی۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ جسپال بھی تیار تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ راک گارڈن جا پہنچے۔ دن کے وقت اتنے زیادہ لوگ نہیں تھے۔ بہت کم خال خال لوگ تھے جو پھر رہے تھے یا پھر جوڑے پرسکون گوشوں میں راز و نیاز میں مشغول تھے۔ کچھ دیر سیر کے بعد رونیت نے کہا۔

''جسپال۔! آؤ بیٹھیں، تم نے جو مجھ سے بات کرنی ہے وہ کہو۔''

یہ کہہ کر وہ پتھروں سے بنی ایک کوٹھڑی کے دالان میں ستون کے ساتھ بیٹھ گئی۔ جسپال بھی اس کے قریب بیٹھ گیا پھر چند لمحے بعد پوچھا۔

''تمہیں پتہ ہے کہ میں تمہیں کس مقصد کے لیے یہاں لے کر آیا ہوں۔''

''میں نے کل شراب بھی اسی لیے خریدی اور پھر پی بھی کہ تم لوگ مجھ سے بات تو کرو، میں تم لوگوں کو احساس تو دلاؤں کہ ہم کہاں بھاگے جا رہے ہیں، ایک چھت کے نیچے ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے احساس سے عاری ہیں۔'' وہ دردمند لہجے میں بولی۔

''رونیت، تم کھل کر کہو، کیا کہنا چاہتی ہو، تم مجھے اپنا بہترین دوست پاؤ گی۔'' جسپال نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''مجھے یہاں سے جانے دیا جائے۔'' اس نے دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کہاں؟'' جسپال نے پوچھا۔

''کہیں بھی، جہاں کوئی مجھے تلاش نہ کر سکے اور یہی بات میں نے کل تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی، تم نہیں سمجھے، پھر میرے ذہن میں یہی بات آئی میں کچھ ایسا کروں جس سے کم از کم تم لوگ مجھے توجہ تو دو، میں نے شراب لی اور......''

''ایسا کیا ہو گیا ہے رونیت؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ میری غلطی تھی کہ میں نے اُمیت کو ریسپانس کیا۔ تم شاید اُمیت کو نہیں جانتے ہو۔ وہ میرا کلاس فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ میرا بہترین دوست بھی تھا۔ میں اس سے محبت کرنے لگی۔ ہمارے درمیان شادی کے وعدے بھی ہوئے لیکن وہ اچانک غائب ہو گیا۔ مجھے بڑا دکھ ہوا میں ایک کرب کے دور سے گزری۔ ایک عرصے بعد جب میں یہاں آئی ہوں تو مجھے پتہ چلا کہ وہ مجھے تلاش کرتا پھر رہا ہے۔''

''یہ تمہیں کیسے پتہ چلا؟'' جسپال نے پوچھا۔

''میں نے ایک دو لوگوں سے رابطے کیے، جو یہاں میرے دوست ہیں۔ ان سے پتہ چلا اور میں اُمیت سے ملی۔'' رونیت نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''تو پھر؟'' اس نے سکون سے پوچھا، جبکہ اس کے اندر بہت سارے سوال ابل پڑے تھے۔
''اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ فوج میں چلا گیا ہے۔ خصوصی اسکواڈ میں ہے۔ وہ ایک شاندار زندگی گذار رہا ہے اور مجھے وہ اب بھی چاہتا ہے۔ اسی لیے اب تک اس نے شادی نہیں کی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ سسک پڑی، پھر خود پر قابو پا کر بولی۔
''میں اس سے دوبار مل چکی، وہ مجھے اپنانا چاہتا ہے۔''
''پھر تمہارا کیا فیصلہ ہے؟'' جسپال نے تحمل سے پوچھا۔
''تم بتاؤ جسپال کیا میں اس سے شادی کر سکتی ہوں؟'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔
''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، یہ تو تمہارا اور اس کا فیصلہ ہے، جس سے میں ابھی تک ملا نہیں اسے دیکھا تک نہیں، میں اس کے بارے میں اپنی رائے کیا دے سکتا ہوں۔'' جسپال نے کہا تو وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔
''ذرا سوچ کے بتاؤ۔''
اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا۔ اس کے سیل فون پر ایک پیغام آ گیا۔ اس نے پڑھا تو ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ وہ بے چین ہوتا ہوا بولا۔
''ٹھیک ہے سوچتے ہیں۔ آؤ، پہلے تھوڑا کچھ کھا پی لیں۔'' جسپال نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی اٹھ گئی وہ دونوں چلنے لگے۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک ہٹ سی بنی ہوئی تھی، جسپال اور رونیت وہاں جا پہنچے۔
''کیا پسند کرو گے؟'' رونیت نے پوچھا۔
''جو تمہارا دل چاہے۔'' جسپال نے کہا اور چہل قدمی کے سے انداز میں ذرا فاصلے پر جا کر بانیتا کور کو فون ملانے لگا، جلد ہی اس نے کال پک کر لی۔
''ہاں بولو جسپال۔''
''ایک لمحہ ضائع کیے بغیر یہاں سے سب کو لے کر نکل جاؤ۔ خاص طور پر لیپ ٹاپ اور اس سے متعلق کوئی شے بھی نہیں چھوڑنا۔ رونیت کا فون کہاں ہے؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔
''اسی کے پاس ہے؟'' بانیتا نے کہا۔
''فوراً نکلو۔'' جسپال نے کہا۔
''اوکے۔'' اس نے کوئی تفصیل پوچھے بنا کہا اور فون بند کر دیا۔ رونیت کور تب تک آ چکی تھی۔
''کچھ سوچا تم نے جسپال؟'' وہ اسے کولڈ ڈرنک دیتے ہوئے بولی۔
''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔''
''آنا بھی نہیں ہے۔ کیونکہ میرے ذہن میں بھی اب تک کچھ نہیں آیا ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی تو جسپال نے اس سے دو ٹوک بات کرنے کی ٹھان لی
''رونیت۔! تم انجانے میں ایک زہریلے ناگ کو اپنے ہاتھ میں لے بیٹھی ہو۔ وہ تم سے کبھی بھی شادی نہیں کرے گا، بلکہ وہ تمہیں اپنا سورس بنا کر تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کے خلاف جانے والا ہے۔ وہ ''را'' کا ایجنٹ ہے۔'' جسپال نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔
''مجھے بھی پتہ ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ بچے نہیں ہیں ابھی۔ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔'' وہ اطمینان سے بولی۔
''کیا؟'' اس نے چونکتے ہوئے کہا۔
''ہاں، مجھے پتہ چل گیا تھا۔ دکھ اس بات کا ہوا کہ میرا ہی محبوب مجھے ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے میں یہاں سے چلے جانا چاہتی ہوں۔ دور ایسی جگہ جہاں مجھے کوئی بھی تلاش نہ کر سکے۔''
''تم جذباتی طور پر اس قدر کمزور ہو سکتی ہو،

میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ تمہیں پتہ ہے وہ کتنا نقصان کر سکتے ہیں ہمارا۔ ہم سب کو مار سکتے ہیں۔ وہ بھی سسکا سسکا کر، تم جانتی ہو کہ تم نے کیا کیا؟''

''تم نہیں سمجھ سکو گے جسپال۔'' اس نے دور خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب اور کیا سمجھنا ہے رونیت؟'' وہ تلخ لہجے میں بولا۔

''چلو چلیں۔'' اس نے ایک دم سے کہا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے مشروب کی آدھی سے زیادہ بوتل ڈسٹ بن میں پھینک دی۔

انہیں لمحوں میں جسپال نے فیصلہ کر لیا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ جس وقت وہ پارکنگ سے نکل رہے تھے۔ تب اچانک رونیت کو رنے کہا۔

''جسپال، گاڑی روکو، اور میرا انتظار کرو، اگر مر گئی تو میری لاش اٹھانے کی کوشش بھی نہ کرنا اور اگر نکل سکی تو یہیں ملتے ہیں۔'' رونیت نے کہا اور سنی ان سنی کرتے ہوئے فوراً نیچے اتر گئی۔ جسپال چاہتا تو اسی وقت اسے گولی مار سکتا تھا۔ لیکن اس کی ہمت ہی نہیں پڑی کہ اپنی ایک ساتھی کو یونہی مار دے۔ عقل اسے کہہ رہی تھی کہ مار دے، ختم کر دے۔ لیکن دل کہہ رہا تھا کہ نہیں ابھی نہیں، مزید دیکھ لے۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ رونیت تیزی سے چلتی چلی جا رہی ہے۔ وہ سو میٹر سے بھی زیادہ سفر کر گئی۔ تبھی اس نے ایک نوجوان کے کاندھے پر جا کر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نوجوان نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر اُسے گلے لگا لیا۔ وہ دونوں ذرا سی دیر وہیں کھڑے باتیں کرتے رہے، پھر ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ایک بینچ پر آن بیٹھے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب جسپال نے اپنے فیصلے پر عمل کرنے کا سوچ لیا۔ وہ آگے بڑھا اور ایسی جگہ تاکنے لگا، جہاں سے وہ ان دونوں کے سر کا نشانہ لے سکے۔ وہ انہیں باتیں کرنے کا کم سے کم وقت دے سکے۔

اس وقت جسپال نے اپنے اردگرد دیکھا۔ وہاں سے بھاگنے کا راستہ منتخب کیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کتنے وقت میں اپنی گاڑی تک پہنچ سکتا ہے۔ اس اطمینان کے بعد اس نے پسٹل نکالا ہی تھا کہ سامنے کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ رونیت نے اپنا پسٹل نکال کے اس کے سر پر رکھا ہوا تھا اور اگلے ہی لمحے اس نے ٹرائیگر دبا دیا۔ ایک دھماکا ہوا۔ رونیت نے ادھر ادھر دیکھا اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ انہیں لمحات میں دو بندے رونیت کی طرف لپکے۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اُمیت کے ساتھ تھے۔ جسپال نے ان کا نشانہ لیا اور یکے بعد دیگرے فائر کر دیا۔ رونیت گاڑی کی طرف جا رہی تھی۔ جسپال بھی سرعت کے ساتھ وہاں تک پہنچا۔ اگلے دو منٹ میں وہ وہاں سے بھاگ چکے تھے۔ رونیت نے اپنا سیل فون وہیں پھینک دیا تھا۔

جسپال نے کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی کوئی بات کرنے کا وقت تھا۔ وہ وہاں سے کافی آگے نکل آئے تو ایک جگہ گاڑی کھڑی کی اور پیدل چل پڑے۔ ذرا سا آگے جا کر انہوں نے آٹو رکشہ لیا اور اسے اسٹیشن کی طرف جانے کا کہہ دیا۔ اسٹیشن کے قریب جا کر وہ رکشے سے اُتر گئے۔ وہاں پہنچ کر جسپال نے بانیتا کو فون کیا۔

''کہاں ہو؟''

''پتہ نہیں یہ کون سی جگہ ہے، ہم کار میں ہیں اور بس چلتے چلے جا رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''وہاں سے......'' اس نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

''پتہ نہیں وہاں کیا ہوا ہوگا، ہم تو نکل آئے

ہیں۔‘‘

’’او کے ملتے ہیں۔‘‘ جسپال نے کہا اور جگتار سنگھ کو فون ملانے لگا۔ جسپال اپنے ساتھیوں کے بارے میں بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ صرف ایک رونیت کور کے رویے نے پورے نیٹ ورک کو داؤ پر لگا دیا تھا۔

☆......☆......☆

سہ پہر ڈھل رہی تھی جب تانی، جنید اور چوہدری اشفاق نور نگر پہنچ گئے۔ جیسے ہی وہ لوگ نور نگر کے علاقے میں پہنچے، ان کے ساتھ سیکورٹی کے طور پر آنے والے لوگ وہیں سے واپس پلٹ گئے۔ انہیں بہت کہا گیا کہ وہ نور نگر تک آئیں لیکن انہوں نے آنے سے انکار کر دیا کہ ہمیں حکم ہی یہی ہے۔ تانی کے آنے سے یوں لگا جیسے حویلی میں رونق آگئی ہے۔ وہ جتنے بھی اس کے شاگرد تھے، سبھی وہاں موجود تھے۔ ان میں بیشتر لڑکیاں تھیں۔ میں ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ اماں نے ان سب کو کھانے تک وہیں روکے رکھا اور جب شام ڈھلی تو وہ تب گئے۔

رات کے کھانے پر سب اکٹھے تھے۔ میں سب کو کھانے کی میز پر دیکھ رہا تھا تو میرے جذبات بڑے عجیب سے ہو رہے تھے۔ ایک وقت تھا، جب میں اور میری ماں تھے۔ ہمیں نور پور سے آگے کوئی نہیں جانتا تھا۔ ایک غریب ماں کے بیٹے کو اس کی وہی حیثیت دی جاتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میری نشانہ بازی کی شہرت کے ساتھ لوگ مجھے پوچھنے لگے تھے۔ سوال یہ ہے کہ میری نہیں میری نشانہ بازی کی اہمیت تھی۔ آج یہ بھرا ہوا میز، جس پر اتنے لوگ تھے۔ بلاشبہ یہ سب لوگ مجھ پر جان وار دینے والے تھے، یہ سب کیسے ہوا؟

’’ارے بھائی کہاں کھوئے ہوئے ہو؟‘‘ اروند سنگھ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

’’کہیں نہیں، بس یونہی۔‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

’’میں سمجھا شاید آپ بھی عشق نادان کی کرشمہ سازی پر سوچ بچار کر رہے ہیں۔‘‘

’’اوئے اروند۔! لگتا ہے تو یہاں نور نگر آ کر کچھ زیادہ ہی شرارتی ہو گیا ہے۔ اصل بات بول کیا کہہ رہا ہے۔‘‘ جنید نے خوشگوار لہجے میں کہا تو اس نے رونیت کی ساری بات بتا دی۔ اگرچہ اس نے یہ سب مذاق میں کہا تھا لیکن میں چونک گیا۔ اتنا بڑا نیٹ ورک رونیت کور کے پاگل پن کی بھینٹ چڑھنے والا تھا۔ اب اسے سنجیدگی سے دیکھنا اور اسے سنبھالنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔

’’اب کہاں ہیں وہ؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’چندی گڑھ ہی میں کہیں ہیں۔ ابھی ان سے رابطہ نہیں ہو پا رہا ہے۔ انہوں نے اپنے فون بھی ضائع کر دیئے ہیں۔‘‘ اروند نے اس بار سنجیدگی سے بتایا۔

’’یار، اس کا کوئی حل کرنا پڑے گا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’کرنا تو پڑے گا اور وہ دونوں شمش الدین اور قمر الدین بھی پھنسے ہوئے ہیں۔ انہیں بھی یہاں لانا ہے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ وہ قانونی طور پر کہیں جائیں گے تو یہ ناممکن ہے۔‘‘ اس نے اپنا خوف کہہ دیا۔ تبھی اماں نے کہا۔

’’اس وقت صرف کھانا کھاؤ، بعد میں باتیں کرتے رہنا، رزق تم لوگوں کے سامنے ہے۔‘‘

باتیں وہیں ٹھپ ہو گئیں اور ہم سب کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے بعد سبھی لاؤنج میں آ بیٹھے۔ مہوش اماں کے قریب ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

’’اماں جی۔! شادی آپ جب بھی رکھیں۔ ڈھولک

آج ہی سے بجے گی۔ ڈھولک کا انتظام کیا جائے۔"

"یہ نہ ہو کہ اماں تجھے ہی بجانا شروع کر دیں، تمہاری تو سادہ آواز ہی ڈھول کی طرح لگتی ہے، روتے ہوئے تو مزید بری لگے گی۔" فہیم نے ہنستے ہوئے کہا تو ایک دم سے قہقہہ لگ گیا، تب اماں نے فہیم کو گھورتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"نہ پتر۔! یہ بھی میری بیٹی ہے۔ ایسا نہیں کہتے۔"

"اس کا مطلب ہے آپ ہمیں اپنا بیٹا نہیں مانتی۔" فہیم نے مصنوعی بے چارگی سے کہا۔

"اب تیرے ایک دو لگ گئی نا تو پھر خود ہی کہے گا کہ ہاں اماں میں تیرا بیٹا ہی ہوں۔" اماں نے کہا تو مہوش تیزی سے بولی۔

"اماں۔! خدا کی قسم اس کے دو تین لگا دے، بہت ستاتا ہے۔"

"مجھے پتہ ہے تم دونوں کا ہی بندوبست کرنا پڑے گا۔" اماں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا تو اروند ایک دم سے بول اٹھا

"یہ کی ہے نا اماں جی حق کی بات، میں تو کہتا ہوں، تانی کے ساتھ اس کا گھونٹ بھر دیں۔"

"لگتا تو ایسے ہی ہے۔" اماں نے کہا تو فہیم جلدی سے مہوش کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اب بجاؤ ڈھولک۔"

اس پر مہوش شرما کر رہ گئی۔ ایک لفظ بھی نہیں بولی تو میں نے ماحول بدلنے کے لیے کہا۔

"اماں جو کرنا ہے، وہ بتاؤ۔ میں تو کہتا ہوں کل ہی یہ سب ہو جائے۔"

"نا، ایسے نہیں۔ مجھے سکون سے ان کی شادیاں کرنے دو۔"

"کیسے اور کب کرنا ہے وہ تو بتا دو؟" میں نے پوچھا۔

میں دو دن بعد بتاؤں گی۔" اماں نے کہا اور اٹھ گئی۔ ہم کافی دیر تک بیٹھے یونہی باتیں کرتے رہے۔ اس دوران سوہنی ہمارے لیے دو بار چائے بنا کر لے آئی تھی۔

اس رات کا دوسرا پہر ختم ہو گیا تھا۔ میں، جنید، اروند اور فہیم ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے شمش اور قمر کی باتیں کرتے رہے تھے۔ کافی دیر بحث کے بعد یہی نتیجہ نکلا کہ انہیں سرحد ہی پار کرانا پڑے گی۔ ورنہ وہ جس طرح بھی نکلے پکڑے جانے کا زیادہ امکان ہے۔

"تو پھر کہاں سے لائیں؟" میں نے کہا۔

"ہم یہاں بیٹھے جتنا مرضی سوچ لیں، کچھ نہیں ہوگا۔ ہمیں سرحد پار لوگوں پر ہی انحصار کرنا پڑے گا۔" جنید نے بہت سوچنے کے بعد ایک دم سے کہا۔

"یہ مجھ پر چھوڑ دیں۔" اروند نے کہا۔

"مان لیا کہ ہم تم پر چھوڑ دیں تو پھر کرو گے کیا؟" جنید نے پوچھا۔

"یار یہ جو جسپال نے نیٹ ورک بنا لیا ہے، یہ کام دے گا۔ انہیں دن تو لگ جائیں گے یہاں آتے ہوئے لیکن وہ پہنچ جائیں گے، فکر نہ کریں۔"

اس نے تسلی دی تو سب ہی اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لیے چل دیئے۔

☆......☆......☆

چندی گڑھ کے سیکٹر اٹھائیس میں ایک بڑا بنگلہ خالی تھا۔ جگتار سنگھ نے اپنے کاموں کے لیے ایسے کئی ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ اس وقت جسپال سنگھ ایک ہال میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ نوتن کور، بانیتا کور، رونیت کور، سندیپ کور اور گرلین کور بیٹھی ہوئی تھیں۔ رونیت کور پوری تفصیل سے انہیں اپنی روداد سنا چکی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اُمیت سنگھ اس کی پہلی محبت تھا لیکن جب یہ دوبارہ ملا اور اس نے کئی پیغامات چھوڑے تو اسے تجسس ہوا کہ وہ کیوں اس سے ملنا چاہتا ہے۔ فون کالز، کمپیوٹر چاٹ اور دونوں ملاقاتوں میں اس کا یہی رویہ تھا کہ ان دنوں وہ کیا کر رہی ہے۔ اسے جب یقین ہو گیا کہ وہ اس کی کھوج میں ہے تو رونیت نے اسے قتل کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ وہ سب کو بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن پھر یہاں رہنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ نگاہوں میں آچکی ہے اس لیے دوستوں سے الگ ہو جانے میں ہی اس کے دوستوں کی سلامتی ہے۔ روز گارڈن میں بھی وہ اُمیت ہی سے ملنے گئی تھی جو اسے نہیں ملا۔ اس دن وہ اسے اس کے قتل کے ہی ارادے سے گئی تھی۔ وہ کینیڈا چلے جانا چاہتی تھی۔ اسی لیے وہ جسپال کو ذہنی طور پر تیار کر رہی تھی کہ وہ اسے جس طرح بھی چاہئے کینیڈا بھیج دے۔ اچانک حالات بدل گئے اور راک گارڈن میں اُمیت کو قتل کرنا پڑا۔ جسپال کا یہ شک غلط نکلا کہ وہ ان کے ٹھکانے تک پہنچ سکتے ہیں۔ ایسا نہیں تھا۔ رونیت کوئی پاگل یا لا ابالی لڑکی نہیں تھی کہ اپنے بارے میں بتا دیتی۔ مگر کہا کچھ بھی نہیں جا سکتا تھا۔ چونکہ وہ اس کی کھوج میں تھے، ممکن ہے وہ ان کی لاعلمی میں ان کے ٹھکانے تک پہنچ جاتے۔ اگرچہ ایسا کچھ نہ ہوا لیکن یہ واقعہ جو بھی تھا اور جیسے بھی پیش آیا، وہ اپنے ساتھ کئی سوال چھوڑ گیا تھا۔

جسپال سنگھ ساری رات سوچتا رہا۔ اس وقت وہ ایک مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ پورے پنجاب میں اس کا نیٹ ورک تھا۔ اس کے تحت انہوں نے کارروائیاں بھی کر لی تھیں۔ جس کے ردعمل کے طور "را" میں تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اتنا بڑا نیٹ

استاد کی تعظیم

۞ جن اقوام میں استاد کو احترام کا درجہ دیا جاتا ہے وہ اقوام عالم کی راہبری کرتی ہیں۔

۞ یہ مت دیکھو کہ کس استاد کے پاس شاگردوں کی بھیڑ زیادہ ہے بلکہ یہ پرکھو اس کے کامیاب طالب علم کتنے ہیں۔

۞ استاد کی تعظیم معاشرتی ترقی کا زیور ہے۔

۞ اچھا استاد نعمت خداوندی ہے۔

۞ وہی استاد معتبر ہے جو اپنے طالب علموں سے تحمل مزاج رہے۔

۞ اچھا شاگرد اپنے استاد کی لازوال تصنیف ہوتا ہے۔

ارشد اظہر...... پشاور

ورک، جسے بنانے میں برسوں لگے تھے، ایک ہی دن میں ختم ہو کر رہ جاتا۔ جسپال نے سوچ لیا تھا کہ وہ رونیت کور کو اب کینیڈا بھجوا دے گا، وہ کیسے جا پائے گی، یہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ بھارت میں محدود ہو گئی تھی۔

وہ اپنی سوچ سے چونکا اس وقت جب دروازے پر ہلکی سے دستک ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی رونیت کور اندر آگئی اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی ٹرے تھی، جس میں چائے کے دو مگ رکھے ہوئے تھے اور دائیں بغل میں کچھ کاغذ دبے ہوئے تھے۔ اس نے آکر ٹرے بیڈ پر رکھی، خود بیٹھ کر بغل میں دبے کاغذ نکال کر ایک طرف رکھے، پھر جسپال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"تم رات سے میرے بارے میں بہت کچھ سوچ رہے ہو گے؟"

"ہاں، تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" اس نے کسی تردد کے بغیر کہہ دیا۔

''میں جانتی ہوں، تم نے کیا کچھ نہیں سوچ لیا ہوگا، یہاں تک کہ مجھے ختم کر دینے کا بھی خیال آیا ہوگا اور میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ کیا سوچا جا سکتا ہے۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے یوں کہا جیسے وہ سب جانتی ہو، جسپال کی سوچوں تک سے واقف ہو۔

''ہاں، میں نے یہ بھی سوچا۔'' جسپال سنگھ نے اعتراف کیا۔

''لیکن تم مجھے قتل نہیں کر پا رہے ہو، میں یہ بھی جانتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش رہی پھر بولی۔

''جانتے ہو ہماری پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟''

''ہاں، یاد ہے۔ وہ میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ سکھنا جھیل کے پاس موجود گردوارہ ساگر صاحب میں، ایک سیوک سنگھ نامی لڑکے نے ملوایا تھا۔'' جسپال نے انتہائی سنجیدگی سے کہا، وہ چاہتا تھا کہ رونیت کو روہ کچھ کہے جو وہ کہنا چاہتی ہے۔

''بالکل، تم ٹھیک کہتے ہو۔ تب سے لے کے اب تک، میں نے سکھی کی کتنی سیوا کی ہے۔ یہ تم جانتے ہو۔ ہم سب اپنی جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اپنے، پتا سمان گرو، پروفیسر دیویندر سنگھ کو بھول جاؤں گی، ایک ایسے لڑکے کے لیے، جس نے پروفیسر دیویندر سنگھ کو قتل کیا تھا۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟'' جسپال نے حیرت سے کہا۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ پچھلے دو سال سے میں اس قاتل کو تلاش کر رہی تھی، جس نے میرے پتا سمان گرو کو قتل کیا۔ یہ اُمیت سنگھ، اس وقت بھی آرمی میں تھا۔ اس نے پیار کا ناٹک مجھ سے کیا اور پھر موقع ملتے ہی اس نے پروفیسر کو مار دیا۔ ان دو برسوں میں مجھے یہی پتہ چلا۔ میں اس انتظار میں تھی کہ کب چنڈی گڑھ جانا ہوتا ہے۔ رب نے مجھے موقع دیا اور میں یہاں آ گئی اور میں نے اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔''

''ہمیں کیوں نہیں بتایا؟'' جسپال نے کہا۔

''معاف کرنا جسپال، یہ فقط میرا انتقام تھا۔ میں تم لوگوں کو اس میں شامل کر کے تم لوگوں کو سامنے نہیں لانا چاہتی تھی۔ جسپال جتنی بھاری ذمہ داری اس وقت تم پر ہے، شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ میں تم لوگوں کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ جب میں دوبارہ اُمیت سے ملی ہوں تو مجھ پر ایک بڑا انکشاف ہوا ہے۔'' رونیت نے بتایا۔

''کیسا انکشاف؟'' جسپال نے پوچھا۔

''اُمیت 'را' کے اس شعبے میں آ گیا تھا، جہاں ایک ایسی فورس ترتیب دی جا رہی تھی، جو کمانڈوز سے بھی آگے کی تربیت ہے۔ اسے انہوں نے ''سویٹ'' کا نام دیا ہے۔ اسپیشل ویپن اینڈ ٹیکنکس کے نام سے۔ یہ ان میں سے ایک تھا۔ صرف میرا اُمیت کے سامنے آنے کا مطلب تھا کہ میں ہی ہوں، اکیلی۔ میرے ساتھ کوئی نہیں۔ وہ مجھے اپنی فورس کے لیے تیار کرنے لگا اور میں تیار ہو گئی۔ میرے جیسے ہیکرز کی انہیں بہت ضرورت ہے۔ میں نے اس کے کمپیوٹر سے جو ڈیٹا لیا، اس سے مجھے کافی معلومات ملی ہیں۔ جس سے میں نے بہت کچھ تلاش کیا۔'' یہ کہہ کر اس نے کاغذ اٹھا کر جسپال کے سامنے رکھ دیئے۔ ''یہ دیکھو! یہ فورس اور اس کے بارے میں معلومات صرف پہلے صفحے پر ہیں، باقی جو صفحات ہیں، وہ آئندہ کیا کرنے والے ہیں۔''

جسپال نے وہ کاغذ پکڑ لیے۔ اس نے مگ اٹھایا اور چائے پینے لگا۔ وہ پڑھتا جا رہا تھا، اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں کھلتی گئیں۔ سارے

صفحات پڑھ کر بولا۔
''یار یہ تو ان کے وہ پلان ہیں، جس میں اس فورس نے را کی مدد کرنی ہے۔ یہ پلان تو بہت خطرناک ہیں؟ اس سے ہمارا سارا نیٹ ورک برباد ہو جائے گا۔''
''یہ مت سوچو، کہ تمہارا نیٹ ورک ان کی نگاہوں میں آنے والا نہیں ہے۔ انہیں بس یہ پتہ نہیں چل رہا کہ یہ 'ویرتا' ہے کون؟ اس لیے بہت محتاط ہونا ہوگا، یا پھر ایسا کچھ کرنا ہوگا کہ ایک دم سے وہ یہ سب بھول جائیں۔'' رونیت کور نے کہا۔
''کیا یہ جو سب تمہیں تھما دیا گیا ہے، کہیں یہ ہم لوگوں کو گمراہ کرنے ہی کے لیے نہ ہو؟ یہ درست ہے، اس کی کیا تصدیق ہے۔'' جسپال نے کہا۔
''شک اس رپورٹ میں نہیں ہے جسپال، شک میری ذات میں ہے اور یہ شک میں بہت جلد دور کر دینے والی ہوں۔'' اس نے گہرے لہجے میں کہا۔
''کیسے؟'' جسپال نے تیزی سے پوچھا۔
''یہ وقت آنے پر بتا دوں گی۔'' اس نے کہا اور اٹھ گئی۔ جسپال اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بانیتا کور سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے رونیت پر شک پڑ گیا تھا کہ وہ کسی بھی وقت ان کے خلاف جا سکتی ہے۔

☆......☆......☆

حویلی میں پہلے دن سے ہی تائی اور چوہدری اشفاق کی شادی کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ ہر فرد اس شادی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد ہی اسی موضوع پر باتیں کرنے لگے تھے۔ صرف ایک اروند سنگھ تھا، جو بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے ہی سے نہیں نکلا تھا۔ میں نے اس کی کمی محسوس کی تو اس کے پاس چلا گیا۔ وہ لیپ ٹاپ کی اسکرین میں جیسے کھویا ہوا تھا۔ میری آمد پر چونکا۔ اس کے چہرے پر بہت حد تک پریشانی تھی۔
''کیا بات اروند، پریشان لگ رہے ہو؟'' میں نے اس کے پاس ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
''وہی رونیت کا رونا ہے، چندی گڑھ سے کوئی اچھی خبر نہیں آ رہی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے جسپال اور رونیت کے بارے میں ساری بات بتا دی۔ جس پر میں چند لمحے سوچتا رہا، پھر کہا۔
''اروند۔! میرا دل نہیں مانتا کہ رونیت کسی طرح بھی ہمارے خلاف جا سکتی ہے۔''
''دل تو نہیں مانتا لیکن وہ اس معاملے میں بہت آگے تک جا چکی ہے۔ وہ ایسے ایسے انکشاف کر رہی ہے جو عام ہیکر کی بھی رسائی میں نہیں ہیں۔''
''مثلاً، کچھ مجھے بھی بتاؤ۔'' میں نے کہا۔
''اس وقت چندی گڑھ میں فقط چھ 'سویٹ' ہیں۔ ان کے بارے میں ساری معلومات اس کے پاس ہے۔ چلو یہ تو مان لیا، لیکن ان کے پاس جو پلان ہیں، وہ اس قدر تفصیل سے ہیں کہ خفیہ ادارے بھی ایسی معلومات نہیں رکھتے ہیں۔ یہ بہت ہائی پروفائل میں ہوتے ہیں۔ انہیں میں جسپال کے نیٹ ورک کے بارے میں صرف اتنا ہے کہ کوئی ویرتا کے نام سے تنظیم بنا چکا ہے، کون ہے، یہ کیسے لوگ ہیں، اس بارے میں ابھی کچھ نہیں پتہ، ایک بات تو یہ ہے، دوسری ایک اہم بات یہ ہے کہ چند بڑے جرائم پیشہ بھی انہیں تلاش کر رہے ہیں تاکہ وہ ان کے ساتھ کوئی ڈیل کر سکیں۔ رونیت کا اس حد تک رسائی حاصل کر جانا غیر معمولی بات ہے۔ جسپال کو لگتا ہے کہ یہ ساری معلومات جعلی ہیں اور وہ ان سب کو پھنسانے کے لیے کر رہی ہے۔'' اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، اروند نے جلدی سے اسکرین پر دیکھا، پھر تیزی سے بولا۔

''رونیت آن لائن ہے۔''

''اروند کیسے ہو؟'' رونیت نے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں، یہ تمہارے بارے میں......''
اس نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

''وقت نہیں ہے فضول بات کے لیے، میں تمہیں لنک دے رہی ہوں، فوری طور پر وہاں سے جتنا ڈیٹا ہے نکال لو، میں اب شاید آن لائن نہ ہو سکوں۔ لیکن دھیان رکھنا۔ اس ڈیٹا سے سب سمجھ جاؤ گے۔'' یہ کہہ کر وہ آف لائن ہو گئی۔ اگلے آدھے منٹ میں اس نے لنک دے دیا۔ اروند بری طرح مصروف ہو گیا، تقریباً دس منٹ بعد اروند کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی۔ وہ زور سے بولا۔

''اوہ واہ اوئے رونیت واہ۔'' پھر میری جانب دیکھ کر بولا۔

''بہت بڑا کام ڈال دیا اس نے، وہ چھ کے چھ سویٹ تین مختلف جگہوں پر پہنچا دیئے ہیں، اور ان کے پیچھے جرائم پیشہ لگ گئے ہیں اور ان کا تعاقب شہر میں موجود مختلف فورسز کر رہی ہیں۔''

''یہ کیا کھیل ہے، مجھے سمجھ میں نہیں آیا۔'' میں نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ سارا کھیل غلط انفارمیشن کا ہے۔ اس نے پہلے سویٹ کو یہ پیغام دیا کہ تین مختلف جگہیں ہیں جن میں سے صرف ایک جگہ ایسی ہے جہاں اسلحہ کی ڈیل ہونے والی ہے۔ وہاں صرف خطرناک ہتھیار دکھایا جائے گا اور ڈن ہوگا۔ جرائم پیشہ کو ان سویٹ کے پیچھے لگا دیا اور ان کے پلان کے بارے میں فورسز کو آگاہ کر دیا۔ اب دیکھیں وہ سب سمجھتے ہیں یا اس کھیل میں استعمال ہو جاتے ہیں۔'' اس نے اسکرین پر دیکھتے ہوئے تیزی سے کہا۔

''تمہیں کیسے پتہ چلے گا یہ نتیجہ کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

''فورسز کی ہر ٹیم کو یہ ہدایت ہے کہ جیسے ہی مجرموں کو پکڑ لیا جائے فوراً رپورٹ کریں اور یہ سب مجھ تک اور رونیت تک آ رہا ہوگا، اب جو بھی ہدایت دینی ہے، ہم نے ہی دینی ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے شروع ہو جاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے میں اس کے ساتھ بیڈ پر آ گیا۔ اروند نے رونیت کو بتا دیا کہ میں بھی ان کے ساتھ ہوں۔ تب اس نے پیغام دیا کہ جسپال کو فون کر کے کہہ دیں کہ دو گھنٹے تک مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔''

میں نے جسپال کو کال ملا دی۔

''وہ اپنے کمرے میں بند ہے نجانے کیا کر رہی ہے، ہمیں اس کے بارے میں بہت پریشانی ہے۔'' جسپال نے فوری طور پر کہا۔

''فی الحال تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں دیکھ رہا ہوں، دو گھنٹے تک اسے ڈسٹرب نہیں کرنا، بعد میں بات کرتے ہیں۔'' میں نے اسے کہا تو اس نے تفصیل جاننا چاہی۔ میں نے اسے مطمئن کر کے فون بند کر دیا۔

ہم کچھ دیر انتظار کرتے رہے۔ کوئی پون گھنٹے بعد ایک طرف سے اطلاع آ گئی۔ سیکٹر چھتیس کے ایک ریستوران میں دو سویٹ موجود تھے۔ وہاں آنا تو کسی نے نہیں تھا۔ ان کے بیٹھتے ہی ان کی قریبی میز سے دو جرائم پیشہ اٹھے اور انہوں نے دونوں سویٹ پر فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ سویٹ کوئی تفریح کے لیے وہاں نہیں آئے تھے، انہوں نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ وہ تربیت یافتہ تھے اور انہوں نے بلٹ پروف جیکٹ پہنی ہوئی تھی، اس لیے ان میں اعتماد تھا۔ لمحوں میں انہوں نے ان دونوں کو ختم کر دیا۔ پھر انہیں خبر نہ ہوئی کہ کس کس

عبرت ناک

نانی جان اور امی جان کی وفات کے بعد ہمارے ماموں نے ابو کو میری والدہ کے حق اور جائیداد سے فارغ کر دیا اور ماموں نے میری ماں کا شرعی حق جو حق وراثت کہلاتا ہے وہ غبن کر لیا اگر زمین کو لیا جائے تو اس وقت لاہور جیسے شہر میں ہمارے ننھیال کی زمین کی قیمت بھی تمیں سے پینتیس کروڑ کی جائیداد تھی جس میں ہمارا حق بھی بنتا تھا صرف لڑائی جھگڑے سے بچنے کی خاطر ابو نے چپ سادھ لی۔

میرے والد اور والدہ دونوں ہی نوکری تھے۔ والد صاحب واپڈا میں ملازم تھے اور امی مڈل اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں لاہور میں رہنا ہوتا تھا کیونکہ ہمارا ننھیال اور باقی پورا خاندان یہیں رہتا تھا۔ والد صاحب کی ٹرانسفر لیہ ہوگئی اور ہم لوگ لاہور سے لیہ شفٹ ہوگئے۔ دو تین سال کے بعد والد صاحب کی ٹرانسفر پھر تونسہ بیراج ہوگئی اب ہماری نانی اکثر بیمار رہنے لگیں اور 1995ء میں ان کا انتقال ہوگیا ہماری نانی بڑی مذہبی اور نیک خاتون تھیں نانا کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا ہمارے ننھیال والے خاصے صاحب جائیداد تھے اور ہر لحاظ سے اللہ کا فضل و کرم تھا مگر وراثت کے حقوق کو نظر انداز کر جانے لگے تھے۔

اب ماموں نے اس کروڑوں کی جائیداد ہتھیانے کے لیے والد صاحب سے زبردستی دستخط کرا لیے تو پھر اچانک ان کے ہاں زوال کا خوفناک جانور آ گھسا جس دن ماموں نے ابو سے زبردستی دستخط کرائے تھے اطلاع ملی ان کو کہ ان کی ایک بیٹی گھر آ بیٹھی ہے اور اسے طلاق ہوگئی ہے۔ ممانی صاحبہ کو چھاتی کا کینسر ہوگیا تھا آپریشن کے لیے تگ و دو کر رہے تھے ماموں صاحب کو بواسیر کا مرض لاحق ہوگیا اور آپریشن بھی کرالیا۔ مگر آپریشن ٹھیک طرح سے نہ کیا گیا تھا زخم زبردست پک گیا آخر چند روز سخت بخار میں مبتلا رہ کر وفات پا گئے۔ اس کے بعد ماموں کے نزدیک کے دوست جو تھے انہوں نے پٹواری اور بڑے سرکاری لوگوں سے مل کر کئی کروڑ کی جائیداد اپنے نام کرالی اور ان پر کوئی دعویٰ کرنے والا نہ تھا۔ اب ممانی صاحبہ بھی بیمار رہنا شروع ہوگئیں اور بستر سے جالگیں بہت تکلیف میں کئی ماہ گزار کر آخر کار اللہ کو پیاری ہوگئیں۔

ان لوگوں کے فوت ہونے پر باہر ہمارے دو ماموں رہتے ہیں دونوں ہی تعزیت کے لیے آئے مگر انہوں نے بھی وراثت کا حق دینے کا ایک لفظ بھی نہ کہا اور پھر آج تک دونوں نے فون پر ہی کبھی بھی ہمارا حال تک نہ پوچھا آخر میں یہی کہوں گا کہ اللہ سب پر رحم کرے بیماریوں، تکلیفوں اور رنج سے دور رکھے اور ان بڑوں کو عقل سلیم عطا فرمائے۔ آمین۔ کیونکہ میں نے اچھے خاصے پڑھے لکھے ہوں یا نیک لوگ ہوں، عبادت گزار ہوں، ان کو بھی جائیداد کا حصہ دینا لڑکیاں کو خاص طور پر وراثت سے حصہ دینا کبھی نہ دیکھا تھا اور اب بھی ہم عذاب الٰہی کو نہیں سمجھ پار رہے ہیں۔

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے ماموں نے اپنی بہن کا حق زبردستی چھینا تھا جس کی وجہ سے وہ خود بھی اور پورا گھرانہ اجڑ گیا مگر نصیحت کون پکڑے؟

جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی

طرف سے گولیاں برسنے لگی ہیں، اگلے دو منٹ میں ان کا منہ ہی اُڑ گیا۔ یہ فائرنگ ابھی ہو رہی تھی کہ پولیس کا خصوصی اسکواڈ وہاں آن پہنچا۔ اس میں زخمی تو کئی ہوئے لیکن بھگدڑ میں دو بندے مارے گئے۔

بالکل اسی وقت میں چندی گڑھ سے باہر جانے والی سڑک پر سیکٹر انچاس میں انڈسٹریل ایریا کے قریب دائیں جانب ایک فلنگ اسٹیشن تھا۔ دونوں سویٹ سڑک کے بائیں جانب کار میں انتظار کر رہے تھے۔ انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ ایک ماروتی آئے گی۔ اس میں سے ایک ادھیڑ عمر بندہ نکلے گا۔ جیسے ہی وہ کار کھڑی کر کے ٹک شاپ کی جانب جائے تو سمجھ لیں کہ اسی بندے سے ملنے وہاں پر اسلحہ ڈیلر آنے والے ہیں۔ یہی نشانی بتائی گئی تھی۔ وہ اسی انتظار میں تھے کہ کوئی ادھیڑ عمر ماروتی کار میں آئے گا۔ اچانک اس کے ساتھ دو بھاری گاڑیاں آ کر رکی۔ اس سے پہلے کہ وہ انہیں کچھ سمجھتے، وہاں سے فائرنگ ہونے لگی۔ اچانک حملہ آوروں کی طرف سے دو ہینڈ گرنیڈ اچھالے گئے اور بھاری گاڑیاں چل دیں، وہ چند گز ہی بڑھی ہونگی کہ دو دھماکے ہوئے اور ماروتی اُڑ گئی۔ اچانک ان بھاری گاڑیوں کو پولیس اسکواڈ نے گھیر لیا۔ سڑک پر فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ گاڑی میں موجود چار لوگ مارے گئے تھے اور سویٹ ختم ہو گئے۔

ایسے ہی وقت میں چندی گڑھ کے سیکٹر ایک سو تیرہ ختم ہوتے ہی تحصیل رزون سے شمال کی جانب ذرا آگے دو سڑکوں کے درمیان کافی ساری جگہ تھی۔ وہیں ایک بڑا موڑ تھا، جس کے ساتھ کافی ساری کھلی جگہ تھی۔ وہاں ایک کونے میں چھوٹا سا چائے خانہ تھا۔ جس کے آگے اس پوری کھلی جگہ پر لوگ مختلف بینچوں پر جا بیٹھتے اور گپ شپ کے ساتھ چائے پیتے تھے۔ اسے ویرانہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن وہ تھی ویرانے جیسی جگہ۔ لوگ اردگرد کی بھاگتی گاڑیوں سے بے نیاز وہاں بیٹھے رہتے تھے۔ وہ دونوں سویٹ بھی اسی جگہ پر موجود چائے خانے سے دور ایک بینچ پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ جیسے ہی ایک اکیلے آدمی کے پاس کوئی بریف کیس لے کر آئے، دراصل وہی مجرم ہیں، انہیں زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کی جائے۔ انہیں انتظار کرتے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ تبھی ایک نوجوان وہاں آیا اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ وہ دونوں سویٹ الرٹ ہو گئے۔ انہیں پتہ تھا کہ فورسز ان کے اردگرد ہیں۔ وہ بڑے اطمینان سے آگے بڑھے اور ان میں ایک نے بریف کیس پر ہاتھ ڈال دیا، جبکہ دوسرے نے وہاں بیٹھے ہوئے شخص کی کنپٹی پر پسٹل کی نال رکھ دی۔ اسی لمحے نجانے زمین میں سے لوگ اُگ آئے تھے۔ انہوں نے سویٹ پر بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی۔ ان کے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ سویٹ کے لیے راہ فرار نہیں تھی۔ وہ اتنے لوگوں کا مقابلہ نہیں کر پائے تھے، اگلے دو منٹ میں وہ وہیں ڈھیر ہو چکے تھے۔ حملہ آوروں کو جیسے ہی یقین ہوا کہ وہ مر گئے ہیں، وہ سب نکل پڑے۔ فورسز نے انہیں گھیر لیا، کچھ مر گئے، کچھ زخمی ہوئے اور باقی فرار ہو گئے۔

وہاں کی ساری رپورٹ اور تصویریں آنے لگیں۔ اروند انہیں محفوظ کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ لنک غائب ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ رونیت نے جو کام لینا تھا وہ لے لیا تھا۔

"یار یہ رونیت نے تو کمال کر دیا، اس کا دماغ ......" وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔

"اس نے جو کہا تھا کہ میں یہ ثابت کردوں گی تو اس نے کردیا۔" میں نے کہا۔

"بالکل، اس نے ثابت کیا۔" یہ لفظ ابھی اروند کے منہ ہی میں تھے کہ اس کے ساتھ ہی رونیت آن لائن ہوگئی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ میں اس کے سامنے تھا۔ اس لیے مجھے ہی مخاطب کر کے بولی۔

"آپ نے ساری کارروائی سمجھ لی، جو بھی ہوا، اب اسے میں کیسے سمجھاتی ان سب کو۔ یہ سارا رسک پر تھا۔ ناکامی کی صورت میں تو یہ مجھے قتل کرنے کے درپے تھے۔"

"نہیں کوئی تمہیں قتل نہیں کرسکتا۔ صرف غلط فہمی ......" میں نے اسے کہا۔

"ہماری دنیا میں غلط فہمی ہی تو مار جاتی ہے۔ خیر میں اسی لیے یہاں سے کینیڈا جانا چاہتی تھی، وہیں پر رہ کر میں یہ سب کرنا چاہتی تھی۔ میرے یہاں ہونے اور میرے ہاتھوں امیت کا قتل، مجھے یہاں بھارت میں محدود کر چکا ہے، اب میں نکل نہیں سکتی۔"

"تمہیں کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں، میرے خیال میں ابھی بہت سارا کام پڑا ہے؟" میں نے کہا۔

"کیسا کام؟" اس نے پوچھا۔

"یہ جو جرائم پیشہ تم نے استعمال کیے ہیں، یہ بہت بڑا کام کیا ہے۔ فورسز کی ساری توجہ اب انہی کی طرف ہوگی، انہیں کس طرح قابو میں کیا تو نے؟"

"دولت سے۔ شہر میں تین بڑے ہیں جو خود کو ڈان سمجھتے ہیں۔ میں نے کسی کے پیسے اٹھا کے ان کے اکاونٹ میں ڈال دیئے اور انہیں ایک کہانی سنا دی کہ

کُند ذہن لڑکے کا قصہ

ایک وزیر کا لڑکا نہایت کُند ذہن اور احمق تھا، اس کو ایک عالم کی خدمت میں بھیجا اور یہ کہا: اس کی تعلیم و تربیت کیجیے شاید عقل مند ہوجائے۔ اس عالم نے بہت دنوں تک اس کو تعلیم دی پڑھانے میں سر کھپایا کچھ اثر نہ ہوا، آخر کار اس کو اس کے باپ کے پاس واپس بھیج دیا کہ یہ عقل مند نہیں ہوسکتا اس نے تو مجھ کو پاگل بنادیا۔

فائدہ: خراب قسم کے لوہے کو کوئی شخص اچھی طرح جلا کر چمک دار نہیں بنا سکتا۔ کتے کو سات سمندر میں دھو کر پاک کرنا بے کار، جتنا زیادہ تر ہوگا اتنا ہی زیادہ ناپاک ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گدھے کو اگر مکہ شریف لے جائیں، جب وہاں سے واپس آئے گا تو وہ گدھا ہی رہے گا۔ (گلستان ص ۱۸۳)

نعمان علی...... راول پنڈی

یہ ایک کام کرو، اس کے بعد نئی ڈیل کریں گے۔"

"بس یہی، اسی بات کو آگے بڑھانا ہے اور ان سے کام لینا ہے۔ بہت کام لینا ہے۔"

"وہ تو اب جیسا کہیں گے کردوں گی۔ لیکن یہ لوگ مجھ پر وشواس نہیں کریں گے۔"

"تم سنو۔ میں دیکھتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے جسپال کو فون ملایا۔ جلد ہی اس نے کال پک کر لی، "رونیت کے بارے میں کوئی منفی نہیں سوچے گا، وہ ہماری وفادار ساتھی ہے، اور اب تو بہت زیادہ محترم بھی ہوگئی ہے۔ اس لیے کوئی شک نہیں کرنا ہے۔"

"کیا تم نے......" اس نے کہنا چاہا تو میں بولا۔

"اس پر ایک لفظ کہنے کی ضرورت نہیں، اس نے جو کردکھایا ہے، اس کے بڑے دوررس اثرات ہیں۔

میں تمہیں سمجھاؤں گا کہ اس کا کتنا فائدہ لینا ہے۔''

''اوکے۔'' جسپال نے کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔ رونیت نے میری بات سن لی تھی۔ وہ خوش ہوگئی۔ اگلے لمحے وہ آف لائن ہوگئی۔

☆......☆☆......☆

میں کافی حد تک پرسکون ہو گیا تھا۔ رونیت کے بارے میں جان کر میرے اعصاب پر ایک بڑا بوجھ تھا جو ایک دم ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے اروند سنگھ سے کہا۔

''چل آ ذرا باہر گھوم پھر آئیں، مسافر شاہ کے تھڑے پر چلتے ہیں، ذرا درویش کی باتیں سن آئیں تھوڑا تازہ ہوا کھا آئیں۔''

میرے کہنے پر وہ فوراً تیار تو ہو گیا تاہم معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔

''مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں، یہ سب سمیٹ لوں، پھر چلتے ہیں، میرا بھی دل چاہ رہا ہے۔''

''اوکے، میں نیچے ہوں، بالکل فراغت سے آ جانا۔'' میں نے کہا اور وہاں سے نیچے آ گیا۔

لاؤنج میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں ایک صوفے پر آ کر بیٹھا تو سوہنی آ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے انتظار میں تھی۔ وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے جو سوچا تھا وہی کہہ دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''یہ تو ٹھیک ہے کہ میں آپ کے انتظار میں تھی، میں نے آپ سے ایک بات کرنا تھی۔''

''ہاں بولو۔'' میں کہا۔

''آپ، اس شادی میں دلچسپی ذرا کم نہیں لے رہے ہیں؟''

''نہیں تو، ایسی تو کوئی بات نہیں، پر میں چاہتا ہوں کہ یہ شادی جتنی جلدی ہو جائے اتنا زیادہ اچھا ہے، اس شادی کو اتنی دھوم دھام سے نہیں ہونا چا ہیے۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اس کی کوئی خاص وجہ؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا تو میں نے کہا۔

''حالات، اس وقت حالات ایسے ہیں۔ ایک تو اماں نے مجھے بتائے بنا تائی کو یہاں بلا لیا، دوسرا اگر شادی پر لمبا چوڑا اہتمام کیا گیا تو ممکن ہے کوئی ہنگامہ ہو جائے، جیسے کہ ہماری شادی سے پہلے ہو گیا تھا، یہ تم جانتی ہو اور اماں کو بھی پتہ ہے۔''

''تو آپ نے اماں سے بات کیوں نہیں کی۔'' سوہنی نے پوچھا۔

''یار وہ ماں ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا، میں ان کے اشفاق کے بارے میں جذبات کو سمجھتا ہوں۔ میں انہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اب جو ان کی مرضی۔'' میں نے کہا تو وہ تشویش سے بولی۔

''میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ حالات کیا ہیں، لیکن اگر آپ کہیں تو میں اماں سے بات کر لیتی ہوں۔ میرا نہیں خیال کہ وہ اس پر ضد کریں گے۔''

''اچھا تم بات کر کے دیکھ لو۔ اگر وہ مان جائیں تو ہم ان کی شادی کر دیتے ہیں۔ تائی دو مہینے ابھی ادھر ہی ہے نا، پھر بعد میں جو دل چاہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے میں کرتی ہوں بات۔'' سوہنی نے سوچتے ہوئے کہا۔ اتنے میں اروند سنگھ آ گیا۔ میں اسے دیکھتے ہی اٹھ گیا۔

ہم پورچ میں آئے وہاں سے کار نکالی اور مسافر شاہ کی جانب چل پڑے۔

موسم ابر آلود تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، بڑا پرسکون ماحول تھا۔ ہم دونوں رونیت ہی کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے مسافر شاہ کے تھڑے پر پہنچ گئے۔ ابھی میں نے وہاں جا کر کار ہی روکی تھی کہ میرا سیل فون بج

اٹھا۔ میں اسکرین پر دیکھا، وہ افضل رندھاوا کا نمبر تھا۔ میں نے اس کی کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

"خیر تو ہے نا رندھاوا صاحب؟"

"بس خیر ہو ہی گئی ہے۔ تم یہاں آسکتے ہو تھوڑی دیر کے لیے؟"

"بات کیا ہے؟" میں تشویش سے پوچھا۔

"یہاں سے دو لوگ پکڑے ہیں۔ پکڑے کیا، پکڑوائے ہیں۔ وہی جو میرے ساتھ آیا تھا نا ظہور مرزا، اس نے۔ میں نے کہا تھا نا الیکشن نہ لڑنے سے تمہارا کوئی دشمن نہیں رہے گا۔" وہ کہتا چلا جا رہا تھا مگر مجھے الجھن ہونے لگی تھی۔

"یار، یہ کہانی مجھے بعد میں سنانا، ان پکڑے ہوئے لوگوں سے میرا کیا تعلق؟"

"وہ تمہیں قتل کرنے آئے ہیں۔" اس نے تیزی سے کہا تو میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے قتل کرنے آئے ہیں؟ کون ہیں وہ؟"

"کوئی ملک حیات ہے، اس کا نام لے رہے ہیں، میں تمہیں اس لیے بلا رہا ہوں کہ کوئی بات سامنے آ جائے، مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ انہوں نے بڑے آرام سے اقرار کرلیا۔"

"چلو میں آ جاتا ہوں، لیکن ظہور مرزا کو کیسے پتہ چلا کہ وہ مجھے مارنے کے لیے آئے اور اس نے پکڑوا دیا ان کو؟" میں نے پوچھا۔

"سچ پوچھو تو یہ لڑکے ان کے مخالف امیدوار کے پاس آکر ٹھہرے تھے۔ وہاں سے مخبری ہوئی تھی کہ وہ کون ہیں اور کس مقصد کے لیے یہاں تک آئے ہیں، ہیں تو دونوں ہی جرائم پیشہ، اگر تم ان کے مخالف امیدوار ہوتے تو ظہور مرزا خاموش رہ جاتا، اب اسے موقعہ ملا تمہارے ساتھ دوستی کا تو احسان کرنے کے چکر میں ہے۔" اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

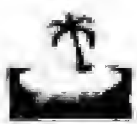
"رندھاوا! میں آنے کو ابھی آ جاتا ہوں، لیکن میرے آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم ایسے کرو، ان سے ذرا مزید بات کرو، دیکھو کیا کہتے ہیں، پھر کوئی کام کی بات ملی تو میں آ جاؤں گا۔" میں نے بڑے سکون سے کہا اور چند مزید باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔

میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ وہ اجنبی یونہی فون نہیں کرتا رہا تھا اور پھر جنید اور تانی پر حملہ کے بعد اس کا کارندہ ملک حیات یونہی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے اسی لیے فیصلہ کیا کہ پہلے میں اسی ملک حیات کو دیکھ لوں، اب اس اجنبی فون کرنے والے کو زیادہ وقت نہیں دینا۔ وہ میرے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے نظرانداز اس لیے کیا تھا کہ یہ تانی والا معاملہ بخیر و خوبی ہو جائے تو پھر اسے پوری توجہ سے دیکھو، لیکن لگتا یہی تھا کہ اب مجھے اس کا کچھ نہ کچھ ضرور کرنا تھا۔ میں نے سیل فون پر طارق نذیر کا نمبر ملایا۔ دو چار بیل جانے کے بعد دوسری طرف سے طارق نذیر کی بجائے کوئی بھاری آواز میں بولا۔

"ہاں بھئی جمال۔! میں ملک حیات بات کر رہا ہوں، طارق کی بجائے تو مجھ سے بات کر سکتا ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر میں چونک گیا۔ میرے اندر سنسنی پھیل گئی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)



زندگی

شاہد جمیل احمد

شاہد جمیل احمد صرف ادیب ہی نہیں اسکالر بھی ہیں۔ انہوں نے ادب اور سائنس پر درجنوں کتابیں تحریر کی ہیں اور ایوارڈ بھی حاصل کرچکے ہیں۔
ہم فخر کے ساتھ ان کی ایک مختصر کہانی کسی تبصرہ کے بغیر نذر قارئین کر رہے ہیں۔

گوڑے کے ڈھیر پر بائیں کروٹ کے بل دائیں بازو اور ٹانگ کو ایل کی شکل میں پھیلا کر بوڑھا ڈیوڈ اس طرح لیٹا تھا جیسے اُس کے پہلو میں جُوس کے خالی ڈبے، بوتلیں، سڑا، ٹن اور پھلوں کے چھلکے نہیں بلکہ گورے پاؤں والی خود لیٹی ہو۔ پاؤں کے دُودھیا پنجے سے پھوٹتی ہلکی روشنی کے انعکاس و انعطاف کے بیچ نینو سیکنڈ کے کئی لاکھویں حصے میں جب وقت اِنفنِٹ ہو کر تازہ چرم کی طرح بان کی چارپائی پر پڑا سُوکھتا تھا، اُس خفیف وقفے کے بیچ جو برقی پردوں کے باہم متصل ہونے کے درمیان بھی ضرور ہوا کرتا ہے، اُس کی نظر یکسر دُنیا و مافیہا کے معدوم و معلوم پر جا پڑی تھی۔

وہ دِن اور آج کا دِن، آدھے لوگ اُسے زندہ اور آدھے لوگ مُردہ تصور کرتے تھے۔ جب وہ گوڑے کرکٹ اور کباڑ خانوں میں سویا ہوتا تو مکھیاں اُس کے مُنہ پر کالے رنگ کا بیضوی ڈھکنا بنا دیتیں جسے دیکھ کر آدھے لوگ اُسے مُردہ تصور کرنے میں حق بجانب تھے جبکہ آدھے لوگ جنہوں نے اُسے لنگڑی لات کے ساتھ کبھی منٹوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرتے دیکھا تھا وہ بہر حال اُسے زندہ تصور کرنے پر مجبور تھے۔ اُس نے اپنے ساتھ ہونے والے واقعہ کے بعد ہمیشہ کے لیے اسکول کی نوکری، گھربار اور دوستوں کو تج دیا تھا اور اب دُودھیا روشنی کی تلاش میں شہروں شہروں مارا مارا پھرتا تھا۔ شیر دلت بھی اُس کی تلاش کے کبھی نہ ختم ہونے والے سفر کا ایک پڑاؤ ہی تھی۔ وہ جس شخص کا پیچھا کرنا شروع کرتا، پہلے تو وہ شخص اُسے اپنی شش جہات میں موجود پا کر پریشان ہوتا مگر پھر بار بار اُس کی مسکین اور روہانسی شکل دیکھ کر اُس کا ہمدرد بن جاتا۔ بے ضرر ایسا کہ اُس نے آج تک کسی عورت کی آنکھوں کو تو کیا اُس کے جسم کے اُوپری اور درمیانی حصوں تک کو نہیں دیکھا تھا اگر اُس کی آنکھیں کبھی بغاوت پر آمادہ ہو بھی گئیں تو وہ زیادہ سے زیادہ کسی خوبصورت پاؤں پر جا کر رُک جاتیں، پُورا پاؤں بھی نہیں بلکہ اِس کے چوتھائی حصے یعنی پنجہ یا پب تک یا پھر اس سے بھی کم کسی پیر کے حلقۂ زنجیر سے مشابہہ انگوٹھے تک۔ معدوم نے اپنی لاج چھپانے کے لیے اسے نجوم و شہاب کے اتنے سکے دیئے کہ جنہیں وہ جہاں چاہتا رکھ کر بھول جاتا۔

لوگ اُسے سیف زبان اور سیف نظر کہنے پر تُلے ہوئے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ اُس نے اپنے آپ کو لوگوں سے الگ تھلگ کر لیا تھا۔ آج وہ شیر دلت کا پیچھا کر رہا تھا۔ شیر دلت عام شکل وصورت کی لڑکی تھی مگر اُس کے لیے شکل وصورت کی اہمیت ہی نہیں تھی، کسی خوبصورت پاؤں سے دُودھیا روشنی کے پھوٹنے کے امکان کی بات تھی، ایک ایسا امکان جو برق رفتاری سے سمٹتے پردوں کے بیچ وقفے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اِسی موجود مگر ناپید کے تعاقب میں وہ ستاروں اور سیاروں



کی ریزگاری نچھاور کرتا ایک سمت کو گھسٹتا اور گرتا پڑتا چلا جا رہا تھا۔

لیبارٹری کے مین گیٹ پر پہنچ کر اُس نے اپنے بلیک اینڈ وائٹ چیک والے پھٹے پرانے چیکٹ کوٹ کی اندرونی جیب سے محدب عدسہ نکالا۔ یہ وہی عدسہ تھا جسے اُس نے خانۂ عدم کی نامعلوم سمت والی دیوار سے اُچک لیا تھا اور جس سے مشرقی وجنوبی ڈیوون (Devon) کے لوگ چالیس سے سو میل تک کے رقبے پر پھیلے شیطانی پاؤں کے نشانات پہچاننے پر مصر تھے۔ شیر دلٹ کے پاؤں کے ابھی نہ پڑنے والے نشان بتا رہے تھے کہ وہ لیبارٹری ہی میں آئے گی' اُسے اب یہ مسئلہ درپیش تھا کہ وہ اندر کیسے جائے کیونکہ سکیورٹی گارڈ نے اُسے جب زمین پر بیٹھ کر عدسے سے کچھ دیکھتے پایا تو اُسے دیوانہ جان کر ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگا۔ ایک دم اُسے عدم کے فرش پر ڈھیر ہوا سیاہ مادہ یاد آ گیا۔ یہ ڈارک میٹر سیکورٹی گارڈ کی کائنات کا ستر سے اسّی فیصد تھا مگر سیکورٹی گارڈ اس کو دیکھنے سے قاصر تھا، سیکورٹی گارڈ کی بے بسی کا سوچ کر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ عود کر آئی اور اُس نے ہاتھ لمبا کر کے مادہ سیاہ کی ایک چٹکی بھری اور اپنے اُوپر چھڑک لی۔ اب وہ لٹک لٹک کر چلتا ہوا سیکورٹی گارڈ کے عقب سے لیبارٹری میں داخل ہو رہا تھا مگر سیکورٹی گارڈ کو اُس کی کانوں کان خبر نہ تھی۔ وہ اِسی حالت میں ڈاکٹر واٹسن کو گھورتا ہوا تھوڑی دور پڑے لیدر کے صوفے میں دھنس گیا۔

......☆☆☆......

نیویارک، اکتوبر ۲۰۰۷، پہلا ہفتہ، درجہ حرارت ۷ ڈگری سینٹی گریڈ، آب وہوا وہی بوجھل اور نم جو ساحلی اور جنگلاتی علاقوں کی ہوا کرتی ہے۔ وہ یعنی جیمز ڈیوی واٹسن نیویارک کے ایک گاؤں لورل ہالو کی کولڈ سپرنگ ہاربر لیبارٹری کے ایک وسیع کمرے میں اپنے سامنے بچھی لکڑی کی میز پر پڑے عمدہ پلاسٹک اور ایلومینیم تار سے بنے اُس ماڈل کو اُوپری اور ظاہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جسے وہ ہمیشہ دل کی نگاہوں سے دیکھتا آیا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی اور اس کی وجہ شیر ولٹ کا صبح سویرے موصول ہونے والا فون تھا۔ شیر ولٹ ہنٹ گروبے! دی ٹائمنز میگزین کی رپورٹر۔ اخبار جوائن کرنے سے پہلے وہ مذکورہ بالا تعلیمی و تحقیقی ادارے کے کسی شعبے میں طالب علم رہ چکی تھی اور شاید اس انٹرویو کے لیے اُس کا انتخاب ہی اِس بنیاد پر ہوا تھا اور اخبار کے مدیر اور بورڈ کے دیگر تین ممبران نے اُس کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ دھوئیں کے مرغولوں کی طرح نیچے سے اُوپر اُٹھتی ہوئی دوہری کمانی (The Double Helix) کی اِس ساخت میں اُس کی جان تھی پھر اُسے روزی یاد آئی یعنی روز النڈ فرنکلن جسے وہ بے تکلفی میں روزی کہا کرتا تھا اور پھر اُس کا وہ خط جو پیارے واٹسن سے شروع ہوا تھا اور بہترین خواہشات کی متمنی پر ختم ہوا۔ یہ صرف خط نہیں تھا بلکہ ایک ایکسرے محسوس ہوتا تھا جس میں روزی اپنی آنکھوں سے مُسکرا رہی تھی جبکہ وہ یعنی ڈاکٹر واٹسن اپنے لمبے قد کے نصف تک شرمندگی سے جُھکا ہوا تھا پھر ایک دم ایکسرے شیٹ میں ارتعاش پیدا ہوا اور جیسے ہی یہ کڑکڑاتی شیٹ سیدھی ہوئی ریمونڈ گوسلنگ بھی منظر میں داخل ہو گیا شاید وہ روزی کی وجہ سے یہاں آیا تھا۔

روزی جدھر بھی جاتی اُس کے قدم خود بخود اُس جانب اُٹھنا شروع ہو جاتے۔ وہ اُس کا پی ایچ ڈی اسٹوڈنٹ بھی تھا اور اُس کی عقیدت بھری محبت کا شکار بھی۔ اس نے محبت کی اِس راہ میں فقط سوچنا اور اپنے ریسرچ ورک میں مصروف رہنا سیکھا تھا۔ وہ خود بھی بہت حیران تھا کہ اُن کی عمروں میں زیادہ فرق نہ ہونے کے باوجود اُس نے کبھی روزی کے بارے میں عورت کے نقطہ نظر سے نہیں سوچا۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ تھی کہ جب انسان کے پاس سوچنے کے لیے بڑے خیال اور کرنے کے لیے بڑے کام موجود ہوں تو اُس کا میلان ہیچ اور اوسط کاموں کی طرف راغب نہیں ہوتا اور دوسری وجہ اُستاد اور طالب علم کا وہ فطری رشتہ کہ احترام جس کا جزو لاینفک ہے اور پھر وہ چالاک، اپنی خفت ملی عیار ہنسی کو اپنے ہونٹوں میں بھینچتا ہوا مورس ولکنز اگرچہ اُس کی وفاداری کے سبب واٹسن اور کرک نے اُسے نوبل لوریٹس میں شامل تو کروا دیا تھا مگر وہ اس ایکسرے شیٹ میں داخل ہونے سے قاصر تھا۔ یہ چھوٹی سی شیٹ اُس کے لیے اجنبی باگھ کی راجدھانی سے کم نہ تھی۔ اُسے یوں لگتا تھا کہ اگر اُس نے اِس راجدھانی میں قدم رنجا ہونے کی کوشش کی تو اجنبیت کی مہک کے بھبھوکے اُسے اُڑا کر دور پھینک دیں گے۔ وہ اپنے تئیں کنارے ہی کنارے پشیمان کھڑا اُن لمحات کو کوس رہا تھا جب اُس نے روزی کے گھر میں اُس کی دراز سے انکسارِ امواج کے ایکسرے حقائق برائے ڈی این اے (X-Ry Diffraction data of DNA) چُرا کر جُوں کے توں واٹسن اور کرک کی خدمت میں پیش کر دیئے تھے۔ کتنی تکلیف ہوئی ہوگی بیچاری روزی کو کہ ایک جانب اووری میں چھپی بیٹھی کینسر جیسی مُوذی بیماری کی صعوبت اور دوسری جانب خام آلات کے ذریعے مہینوں اور سالوں کی محنت سے حاصل کیے گئے حقائق (Data) کا زیاں۔ اب تو شاید ولکنز کے عرق انفعال کے قطروں کی مہک واٹسن تک بھی پہنچ چکی تھی کہ اُس نے بھی ایکسرے شیٹ کے منظر سے باہر نکلنے میں ہی عافیت محسوس کی۔

والس کا خیال ایک بار پھر شیر دلت کے صبح سویرے موصول ہونے والے فون کی طرف لوٹ گیا۔ دوپہر ہونے کو آئی تھی اور اب وہ کسی بھی وقت اُس سے انٹرویو لینے پہنچ سکتی تھی پھر اچانک اُس کے دل میں فکر مند کر دینے والا یہ خیال پیدا ہوا کہ جانے وہ اُس سے کس طرح کے سوالات پوچھے مگر جلد ہی اُس نے یہ بھی دریافت کرلیا کہ وہ دراصل اُس کی طرف سے پوچھے جانے والے سوالات کی وجہ سے پریشان نہیں تھا بلکہ وہ تو اُس جواب کی وجہ سے پریشان تھا جو وہ اپنی سٹیٹ منٹ کے طور پر اُس کو ریکارڈ کروانے والا تھا۔ اب اُس کی یاد میں اُس کے ذہن کے سوفٹ بورڈ پر تھمب وپن سے لگی سابقہ اسٹیٹ منٹس گھوم گئیں جن کی بنا پر اُسے پہلے ہی بین الاقوامی طور پر کافی مخالفت کا سامنا تھا۔ اُس کے ذہن کے سوفٹ بورڈ کے دائیں اُوپری کونے میں تھمب وپن سے جو سٹیٹ منٹ اٹکی ہوئی تھی وہ اُسے غور سے پڑھنے لگا۔ وہ کئی بار اپنے لیکچروں میں جینیاتی انتخاب (Genetic Screening) اور جینیاتی انجینئرنگ (Genetic Engineering) بارے دلائل دے چکا تھا اور اُس کی دانست میں گھامڑ پن (Stupidity) ایک بیماری تھی اور دس فیصد گھامڑ ترین لوگوں کا علاج (Cure) ضروری تھا۔ اُس کا یہ بھی خیال تھا کہ خوبصورتی کو جینیاتی انجینئرنگ کے ذریعے پیدا کیا جاسکتا ہے جبکہ عُرف عام کا یہ کہنا تھا کہ اگر دنیا میں تمام لڑکیاں ہی خوبصورت ہوگئیں تو یہ دنیا اور فطرت کے لیے تباہ کن ہوگا جبکہ اُس کے خیال میں ایسا ہونا دنیا اور فطرت کے لیے بہت اچھا تھا۔ اُس کا یہ بیان جلی حروف میں شائع ہوا تھا کہ اگر ہم اُس جین کا پتہ لگالیں جو جنسیات سے متعلق ہے تو پھر ایک خاتون کو ہم جنس میلان والے بچے کی طرح موافق جنس میلان والے بچے کو بھی پیدا کرنے کا اختیار ہونا چاہیے۔

انمول موتی

☆ تمہاری وہ خاموشی جس سے تم میں بات کرنے کی خواہش پیدا ہو جائے تمہارے اس کلام سے بہتر ہے جس کے بعد تمہیں خاموش کر دیا جائے۔

☆ اللہ کے نزدیک سب سے برا انسان وہ ہے جس کی بدزبانی کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا چھوڑ دیں۔

☆ دنیا کا امیر ترین شخص وہ ہے جو تمام رشتوں کے باوجود تنہا رہ جائے۔

☆ کم بولنے کی عادت اپناؤ اور فضول گوئی سے پرہیز کرو۔ انسان پر اکثر مصیبتیں زبان کی وجہ سے ہی آتی ہیں۔

☆ اچھا بولنے میں مہارت حاصل کرو لیکن ایک اچھا سامع ہونا بھی ضروری ہے دوسروں کو سننے کا حوصلہ بھی خود میں پیدا کرو۔

☆ اگر تم دوسروں کی کوتاہیاں معاف نہیں کر سکتے تو دوسروں سے بھی یہ امید مت رکھو تمہاری زیادتیوں سے درگزر کیا جائے گا۔

☆ غصے کو پی جایا کرو ورنہ ایک دن ایسا آئے گا کہ تمہارے بات بات پر غصہ کرنے کی عادت دوستوں کو تم سے دور کر دے گی اور تم اکیلے رہ جاؤ گے۔ تحمل اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا کرو۔

اقرا امانو بلی، ماریہ نور..... شاہ کوٹ

اخبار والوں نے تو خیر حسب توفیق و عادت اُس کے اِس بیان کو توڑ مروڑ کر پیش کیا تھا جس کی بنا پر علم الحیات کے ماہر رچرڈ ڈاؤ کنز کو اس کی تشریح بھی کرنی پڑی تھی تاہم اس کا لب لباب یہی تھا۔ موٹاپے کے مسئلے پر اُس کا داغا گیا بیان بھی تو یہیں کہیں اُس کے ذہن کے سوفٹ بورڈ پر تھمب پن سے جھول رہا تھا جس میں اُس نے کہا تھا کہ آپ جب کبھی بھی موٹے لوگوں کا انٹرویو کرتے ہیں تو اچھا محسوس نہیں کرتے کیونکہ آپ یہ جانتے ہوتے ہیں کہ آپ اُنہیں محنتانے پر رکھنے والے نہیں۔ بورڈ پر انتہائی بائیں جانب ۲۰۰۰ء کی اُس کانفرنس کی رپورٹ بھی لگی ہوئی تھی جس میں اُس نے جلد کی رنگت اور جنسیات کے باہمی تعلق کو بیان کرتے ہوئے اپنے اِس مفروضے کا اظہار کیا کہ گہری رنگت کے لوگوں میں جنسی شہوت زیادہ ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ نے لاطینی عاشق تو سُنے ہوں گے مگر انگریز عاشق نہیں۔ بوڑھا ڈیوڈ اپنی ٹیڑھی میڑھی ٹانگیں صوفے پر سمیٹے واٹسن کے ذہنی و فکری تذبذب سے محظوظ ہو رہا تھا اور دفعتاً اُس کا خیال عدم کی بے چھت سے بغیر زنجیر جھولتے اُن جوابات کی طرف لوٹ گیا جو انسانی ذہن سے متعلق اُن سوالات پر مبنی تھے ہنوز جن کا جواب مٹی گارے سے بنی دنیا کے تیز ترین دماغوں سے اوجھل تھے۔ جوابات تو عجیب تھے ہی، سوالات بھی بظاہر کم عجیب نہ تھے۔ مثلاً یہ کہ دماغی عمل میں معلومات کی کوڈنگ کیسے ہوتی ہے، یادداشتیں کیسے محفوظ اور پنہاں ہوتی ہیں، انسان کی حالت آرام میں دماغ کیا اور کیسے عمل کرتا ہے، دماغ مستقبل کے بارے میں کیسے سوچتا ہے، جذبات کیا ہیں، ذہانت کیا ہے، دماغ میں وقت کا اظہار کیسے ہوتا ہے، دماغ کیوں سوتا اور خواب دیکھتا ہے، دماغ کے مختلف نظام ہائے کار آپس میں کس طرح منسلک ہوتے ہیں اور یہ کہ شعوریت ہے کیا؟ جوابات والے چمچماتے مخطوطے پڑھتے پڑھتے اُس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور اُس نے اپنے آپ کو بجلی سے زیادہ رفتار کے ساتھ کائنات کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتے محسوس کیا، وہ شاید گرتا ہی چلا جاتا یا پھر برمودہ مثلث میں گر کر ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتا اگر اُس کا ہاتھ سات سو پاؤنڈ کے رُکے ہوئے سیلنگ اسٹون (Sailing Stone) میں نہ پڑ جاتا۔

واٹسن ابھی اپنے بیانات کی اُدھیڑ بُن میں اُلجھا تھا کہ اُسے دور سے لیبارٹری اٹنڈنٹ کی کسی خاتون سے

محبت و عشق

کائنات کی ہر ایک چیز محبت کی وجہ سے قائم ہے' اگر زمانے میں محبت نہ ہوتی تو شاید آج کوئی چیز اس قابل نہ ہوتی کہ ہم ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے بولتے ایک دوسرے کی خوشیوں اور چاہتوں میں شریک ہوتے۔ اس دنیا میں اس کائنات میں نجانے محبت و عشق کی کتنی لازوال داستانیں ہیں جو آج بھی ادھوری ہیں۔ جو بھی کسی مجبوری یا غربت مفلسی کی وجہ سے کہیں گم نامی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ کوئی ایسی داستانوں پر یقین نہیں کرتا۔ کوئی کرے بھی تو کیسے؟ کیونکہ کوئی بھی تو محبت نہیں سمجھتا سب ہوس اور لالچ کے مارے لوگ ایک دوسرے سے محبت کا ڈراما کرتے ہیں۔ کبھی کسی لڑکی کے سر بے وفائی تو کبھی کسی لڑکے کے ماتھے پر بے وفائی کا نشان آخر کیوں؟ ہمارے اس معاشرے سے محبت' چاہت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ کیوں محبت پر سے لوگوں کا یقین اُٹھ گیا ہے؟ کبھی ہم نے سوچا کہ کس وجہ سے محبت و عشق کو ختم کیا جا رہا ہے۔ کیوں محبت ہم سے روٹھتی جا رہی ہے۔ ہم سب محبت کرنے والے محبت محبت کا راگ الاپتے ہیں مگر کبھی عملی طور پر اس کی تکمیل کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا۔ محبت و عشق کی دنیا الگ ہے۔ محبت و عشق کے جذبات الگ ہیں۔ محبت و عشق کا مذہب الگ ہے۔ احساسات منفرد ہیں۔ محبت کے ناکام ہونے پر دل برداشتہ نہیں ہوتے حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیتے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات نہیں سجاتے بلکہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ محبت جو ہم سے روٹھ کر کہیں بہت دور جا رہی ہے اسے کو دور نہ جانے دیں اس کا راستا روک لیں اس کے آگے دیوار بن جائیں۔ اگر ہم اپنی سچی محبت کو بچانا چاہتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ محبت ہمیشہ ہمارے آس پاس رہے ہمارے دلوں میں بسی رہے تو ہمیں ان لوگوں کے نقشِ قدم پر چلنا ہوگا جنہوں نے محبت و عشق کے لیے سب کچھ قربان کر دیا۔ اپنی زندگی کو محبت و عشق کی نذر کر دیا کبھی آپ نے سوچا وہ لوگ کون تھے؟ وہ لوگ ہمارے جیسے ہم میں سے تھے ہماری طرح کھاتے پیتے تھے ہماری طرح چلتے پھرتے تھے مگر ان کے دلوں میں محبت و عشق کا سمندر موجزن تھا۔ اس لیے آج بھی کائنات میں محبت و عشق کی نجانے کتنی داستانیں موجود ہیں اور موجود رہیں گی۔

کتنے عشق و محبت کرنے والے آئے اور آ کر چلے گئے اور ان کی قبروں کے نشانات بھی مٹ گئے مگر ان کی محبت و عشق کی داستانیں آج بھی لوگوں کے دلوں میں ذہنوں میں اور تاریخ کے اوراق میں زندہ ہیں اور ستاروں کی طرح چمکتی ہیں۔

......☆☆☆......

شکیل اختر...... سنجر پور

خفیف سی گفتگو سنائی دی اور ساتھ ہی ہیل کی ٹِک ٹِک، اُس نے سوچا وہ آگئی اور ساتھ ہی نکٹائی درست کرتے ہوئے میز کی دوسری جانب کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

شیرولٹ کے ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ اور اُس کی آنکھوں کی چمک اِس بات کی غماز تھی کہ وہ واقعی بہت خوش تھی۔ دنیا کی عظیم شخصیات کے انٹرویو کرنا اخبارات والوں کے لیے ہمیشہ سے کریز کا باعث رہے ہیں اور آج اُس کا یہ کریز پورا ہونے جا رہا تھا۔ اگرچہ اُس نے اِس انٹرویو کے لیے بہت تیاری کی تھی اور جینیاتی سائنس، مالیکیولر بیالوجی، زوالوجی، مقیاس الذہانت اور نسل اور ذہانت کے باہمی تعلق بارے حتی الوسع مطالعہ بھی کیا تھا۔ اِس کے ساتھ ساتھ اُس نے سوالات کی ایک لمبی مگر محتاط لسٹ بھی تیار کی تھی اور سائنسی الفاظ و تراکیب کی شارٹ ہینڈ رائٹنگ کی پریکٹس بھی کی تھی۔ اُس کی تمام تیاری مگر اُس وقت دھری کی دھری رہ گئی جب واٹسن نے اُسے کہا۔

"وہ آج کے انٹرویو میں سوالات کے جوابات دینے کی بجائے اپنی Perception سے متعلق گفتگو کرے گا اور گفتگو کے آخر میں Concluding statement ریکارڈ کروائے گا۔"

شیرولٹ کے لیے انٹرویو کا یہ انداز قدرے سہل تھا اور وہ گفتگو کو ٹیپ ریکارڈر میں ریکارڈ کرنے کے ساتھ شارٹ ہینڈ میں آسانی سے لکھ سکتی تھی۔ اِس سے پہلے کہ واٹسن اپنی گفتگو کا آغاز کرتا، ڈیوڈ کی نظر گھومتی گھماتی شیرولٹ کے پیروں پر جا پڑی، جھنجھلاہٹ میں وہ زیرلب بڑبڑایا۔

"دھت تیرے کی۔" شیرولٹ نے نہ صرف یہ کہ بند جوتے پہنے ہوئے تھے بلکہ اُس کے ٹخنوں پر اسکن کلر کے موزے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ڈیوڈ کی سعی سفر آغاز سے قبل ہی انجام تک پہنچ گئی تھی۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا، اُس نے اِسی میں عافیت محسوس کی کہ وہ اپنے کانوں پر بڑی ساعتی ریڈیو دور بین (Big Ear Radio Telescope) چڑھا لے جس پر جیری آراہمن نے بُرج قوس کے قریبی ستاروں سے WOW کا سگنل سُنا تھا۔ اُسے TAOS HUM میں دلچسپی نہ رہی تھی جب سے وہ اِن کے زمینی Lwo Pitch شور کی بجائے عدم کے لامحدود صحرا میں ان کی High Pitch دھڑ دھڑ سُن چکا تھا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے اور صوفے پر کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ اب واٹسن گویا ہوا۔

"میرا فوکس آج نسل اور ذہانت کے موضوع پر ہوگا۔ ڈی این اے کے دوہری کمانی والے اسٹرکچر کو وضع کرنے کے دوران مذکورہ موضوع میرے زیرِ مطالعہ رہا۔ اپنے اصل بیان تک پہنچنے کے لیے مجھے اِس موضوع کے پس منظر، اِس کی تاریخ اور متعلقات پر تفصیلی بات کرنا پڑے گی اور ڈیئر شیرولٹ آپ کو اِن تمام تر تفصیلات کو سننے کی زحمت گوارا کرنا پڑے گی، اِس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔"

"آئی ایم سوری۔" شیرولٹ نے کہا۔ "نو سر! Its OK، آپ اپنی بات جاری رکھیں، میں آپ کی ساری باتیں سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ویل! تو میں اپنی بات شروع کرتا ہوں نسل اور ذہانت کے باہمی تعلق پر مباحث کا آغاز آج سے ٹھیک ایک سو سال پہلے اُس وقت ہوا جب مقیاس الذہانت (Intelligence Quotient) عمل میں آیا۔ امریکا میں مقیاس الذہانت کے لیے کیے گئے ٹیسٹوں سے یہ بات سامنے آئی کہ افریقی نسب کے لوگوں کا اوسط اسکور یورپ نسب کے لوگوں سے بہت کم ہے۔ اِسی طرح یہ کہ مشرقی ایشیاء کے لوگوں کی ذہانت کا لیول یورپ کے لوگوں سے بہت زیادہ ہے۔ نسلی ذہانت کا یہ فرق پوری طرح اپنے وثیقہ کے ساتھ محفوظ ہے مگر یہ بات الگ ہے کہ ریسرچرز اِس کی وجوہات بارے متفق نہیں ہو سکے۔

اِس ضمن میں یعنی اِن وجوہات سے متعلق اب تک چار قسم کے جائزے دنیا میں موجود ہیں۔ پہلا یہ کہ لوگوں کی ذہانت کے مابین فرق حقیقی ہے اور اِس کی وجوہات ماحولیاتی اور وراثتی فرق کی پیدا کردہ ہیں۔ دوسرا یہ کہ قوموں اور نسلوں میں اُن کی ذہانت اور قابلیت کے حوالے سے واضح فرق موجود ہے تاہم اِس کی وجوہات معاشرتی اور ماحولیاتی عناصر کی مرہون منت ہیں۔ تیسرا خیال یہ ہے کہ کسی نسل اور ذہانت کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے اور ذہانت معلوم کرنے کے لیے جو طریقہ ہائے کار وضع کیے گئے ہیں وہ از خود ناقص ہیں۔ چوتھا خیال یہ ہے کہ نسل اور عام ذہانت کے تصورات بذاتِ خود ناقص ہیں اس لیے نسلی یا گروہی تقابل بذاتِ خود بے معنی ہے۔"

واٹسن اپنے دونوں ہاتھوں کی پوروں کو آپس میں ملاتے ہوئے بظاہر تو شیرولٹ کی طرف دیکھ رہا تھا مگر اُس کا دماغ کسی گہری سوچ میں پڑا ہوا تھا کہ لیب اسٹنڈنٹ نے اُن کے سامنے بلیک کافی کے دو مگ اور کچھ سینڈوچ لا کر رکھ دیے۔ کافی کا مگ دیکھتے ہی شیرولٹ نے کاپی پنسل ایک طرف رکھ دی اور ٹیپ ریکارڈر کا بٹن آف کر دیا۔ وقفے کے دوران اُن کے درمیان ہلکی پھلکی غیر رسمی گفتگو جاری رہی۔ شیرولٹ نے ڈاکٹر سے ان کی بیوی الزبتھ اور بیٹوں رُوفس اور ڈنکن بارے معلوم کیا جبکہ ڈاکٹر نے اُس سے اُس کی صحافتی مصروفیات کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ڈاکٹر نے ہاتھ کے اشارے سے اپنی گفتگو دوبارہ شروع کرنے کا عندیہ دیا اور بولا۔

"امریکی ماہرین نفسیات کی تنظیم کا یہ کہنا ہے کہ اگرچہ مختلف نسلی گروہوں کے درمیان اُن کی ذہانت کے حوالے سے واضح فرق موجود ہے لیکن اِس کی وجوہات سے متعلق نہ تو کوئی ماحولیاتی توضیح موجود ہے اور نہ ہی کوئی ایسا تجرباتی و مشاہداتی مواد موجود ہے جس کی بنیاد پر اسے جینیاتی توضیح سے منسوب کیا

دینِ اسلام

ایک دفعہ حضرت محمد ﷺ اپنے صحابہ کرامؓ سے فرما رہے تھے کہ ہر چیز کو کھانے سے پہلے دیکھنا چاہیے اور یہ بات ایک یہودی سن رہا تھا رات کو جب وہ پانی پینے لگا تو اس نے بیوی کو چراغ لانے کے لیے کہا تو وہ چراغ لے کر آئی اور یہودی نے چراغ کی روشنی میں پانی دیکھا۔ برتن میں ایک بچھو بیٹھا ہوا تھا۔ یہودی فوراً بول اٹھا جس نبی ﷺ کی ایک بات پر عمل کرنے سے انسان کی جان بچ جائے واللہ اس کا دین کتنا پیارا ہوگا پھر وہ یہودی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔ (سبحان اللہ)

گلناز مان گل...... مان

داستانِ عبرت

اے انسان تو سمجھتا ہے کہ ہمیشہ زندہ رہے گا ایسا کبھی نہیں ہو سکتا بلکہ دنیا میں جو آیا اسے بالآخر جانا پڑتا ہے اور ایسے ہی دنیا جلد ہی تمہارا نام بھی زندوں کی فہرست سے نکال کر مردوں کی فہرست میں درج کردے گی۔ والدین تمہاری جدائی میں بہت روئیں گے بالآخر مایوس ہو کر بیٹھ جائیں گے احباب، عزیز و اقارب تمہیں کچھ عرصہ یاد کر کے ہمیشہ کے لیے طاق نسیاں میں رکھ دیں گے تم پر مرمٹنے والی بیوی کچھ عرصہ یقیناً غمگین اور سوگوار رہے گی مگر چند روز کے بعد حالات کی سنگینی اور ماحول کی تبدیلیاں اسے روزمرہ کے مسائل میں الجھا دیں گی بچے جن پر تم واری صدقے ہوتے تھے اور وہ بھی آپ سے بہت محبت کرتے تھے مگر آہستہ آہستہ ان کے ذہن سے بھی تمہارے نقش و نگار محو ہو جائیں گے۔ طوفان باد و باراں تمہاری قبر کی بلندی کو ہموار کر کے تمہارا نشان بھی صفحہ ہستی سے مٹا دیں گے اور تم چند سال کے بعد ایک بھولے ہوئے خواب کی مانند ہو جاؤ گے۔

چند سال گزرنے کے بعد اس بات کا یقین کرنا مشکل اور ناممکن ہوگا کہ تم کبھی دنیا میں آئے تھے اس لیے فکرِ دنیا چھوڑ کر آخرت کی تیاری کر جہاں ہمیشہ کی زندگی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

شمشاد احمد ...... میرپور آزاد کشمیر

جا سکے۔ یہاں مجھے اختلاف ہے کہ کیا اب جینیاتی توضیحات نفسیات دان کیا کریں گے۔ امریکی علم الانسان (Anthropology) کے ماہرین کی تنظیم کا بھی یہ کہنا ہے کہ جانداروں کے علم حیاتیات کے مطابق واضح گروہوں میں مروجہ تقسیم کے مطابق اُن کی ذہانت کے فرق کو صراحت کے ساتھ بیان نہیں کیا جاسکتا......''

شیر دلت نے نہایت ادب سے ڈاکٹر کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یوں لگتا ہے جیسے آپ کی بات کا مرکز و محور مقیاس الذہانت ہے۔ اِس ضمن میں' میں آپ کی توجہ مقیاس الذہانت کے مُوجد الفریڈ بائنٹ کے اُس بیان کی طرف مبذول کروانا چاہوں گی جس میں انہوں نے اپنے مقیاس کے استعمال سے متعلق یہ بھی واضح کیا کہ اِن ٹیسٹوں کو مادرزاد (Innate) ذہانت معلوم کرنے کے لیے استعمال نہ کیا جائے اور نہ ہی لوگوں کو لیبل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔'' ڈاکٹر اُس کی بات سُن کر سٹپٹا گیا۔ اُسے شاید اندازہ نہیں تھا کہ وہ اُس کے انٹرویو کے لیے اِس قدر تیاری کر کے آئی ہوگی۔ اُس نے اُس کی سنجیدہ بات کو ہنسی میں ٹالنا چاہا کہنے لگا۔

''ہاں بھئی! وہ بھی تو ایک اِنسان ہی تھے اور اِنسانوں کی بے شمار ادیانی، اخلاقی، نفسیاتی اور معاشرتی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اِنسانوں کی ذہنی صلاحیتوں کے فرق کو سامراجی نظاموں، لوگوں کو غلام بنائے رکھنے اور سوشل ڈارونزم کے لیے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا پھر جنگ عظیم اول میں مشرقی و جنوبی یورپ کے لوگوں کی انگریزی زبان سے متعلق مشکلات و مسائل کو مدنظر رکھے بغیر اُنہیں امریکا کے جنمی (Native) لوگوں سے ہیچ قرار دے دیا گیا' مگر میرا مطلب اور مقصد یہ نہیں ہے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جینیاتی طور پر یہ فرق موجود ہے اور جینیاتی طور پر اِسے Cure کیا جا سکتا ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۳۰ء کے عرصے میں مفکرین اور سائنسدانوں نے عمدہ نسلِ انسانی پیدا کرنے کے علم (Eugenic) کو نسل اور جینیات سے منسوب کرنے کو یکسر مُسترد کر دیا اور بعد ازاں انہیں بنیادوں پر امریکی سپریم کورٹ نے متفرق پبلک اسکولوں کے نظام کو ختم کر کے غریب افریقی طالب علموں کے لیے ترجیحی تعلیمی پروگرام وضع کرنے کا کہا، یہ غالباً ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔ سب کچھ دُرست جا رہا تھا، پھر بھائی آرتھر جینسن نے اپنے مضمون میں پھر اس بحث کو اُجاگر کر دیا اور افریقی امریکن بچوں کی تعلیم سے متعلق اُس نے کہا کہ اُن کی بری پرفارمنس اُن کے جین کی وجہ سے ہے نہ کہ اُن کے گھریلو کم تعلیمی ماحول کی وجہ سے۔ اُس کے اِس بیان نے درسگاہی نظام میں پھر سے نئے تضاد کو جنم دیا پھر اس کے بعد تو یہ سلسلہ چل نکلا۔ آپ کو مارک اسنڈر مین اور سٹینلے رُتھمین کی کتاب The IQ Controversy تو یاد ہی ہوگی، زیادہ دُور کی بات نہیں، ۱۹۸۸ء کی کتاب ہے۔ جس میں چھ سو نفسیات دانوں، معاشرتی علوم کے ماہرین اور ماہرین تعلیم سے سروے کیا گیا اور ان میں سے پینتالیس فی صد نے اِس رائے کا اظہار کیا کہ کالے گورے کی ذہنی صلاحیت کے فرق میں جینیاتی اور ماحولیاتی دونوں عناصر کارفرما ہیں۔ اِسی طرح The g Factor, The Bell curve جیسی کتابوں نے بھی موروثیت کے نقطہ نظر کو پروموٹ کیا.....'' اب ڈاکٹر نے ایک لمبی سانس لی، یُوں لگتا تھا جیسے مسلسل بولنے کی وجہ سے اُس کی سانس پھُول گئی ہو۔ اُس نے کچھ دیر کرسی پر بیٹھے بیٹھے ستانے کے انداز میں اپنے بازوؤں اور گردن کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور جلد ہی شیر دلت کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''ہاں تو اس ساری گفتگو کے بعد میں اس بابت اپنا

Point of view آپ کے سامنے رکھتا ہوں، آپ اِس کو میرا بیان بھی کہہ سکتی ہیں۔ میں اندرونی طور پر افریقی امکان پر بہت رنجیدہ ہوں کیونکہ ہماری تمام معاشرتی پالیسیاں اِس بات پر بنیاد کرتی ہیں کہ ہم سب کی ذہانت ایک جیسی ہے جبکہ تمام مقیاس (Testing) کہتی ہے کہ نہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اِس Hot Potato کا حل انتہائی دشوار ہے۔ میری یہ امید اور خواہش ہے کہ ہر کوئی برابر ہے مگر یہ مشاہدہ اور تجربہ بھی کہ جو لوگ کالے ملازمین کے ساتھ ڈیل کرتے ہیں اُن کے لیے یہ دُرست نہیں۔"

ڈاکٹر نے اپنا بیان ریکارڈ کروا دیا تھا اور اب وہ قدرے مخمصے کے انداز میں اپنی کُرسی پر اِدھر اُدھر پہلو بدل رہا تھا۔ ڈیوڈ بھی صوفے پر ایک دم جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور واٹسن کی طرف دیکھتے ہوئے گنگنانے کے انداز میں بول۔

"ماں پر پُوت پتا پر گھوڑا، بُہتا نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ اُس کے دماغ میں پھر سوالات کی ایک چین چل پڑی، کیا تھیوری آف ایوری تھنگ کا وجود ممکن ہے، سیاہ مادہ (Dark Matter) کیا ہے، کششِ ثقل کی مزید بہتر تھیوری کیا ہو سکتی ہے، بڑھتی ہوئی توانائی کی ضروریات کے تناظر میں کولڈ فیوژن کی کامیابی کے امکانات کیا ہیں۔ اُس نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا اور ٹھنڈی آہ بھرتا اپنی نامعلوم منزل کے سفر پر روانہ ہوا۔ شیر ولٹ ایک بار پھر پنسل کاپی ایک طرف رکھتے ہوئے اور ٹیپ ریکارڈر کا بٹن بند کرتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی کہ ڈاکٹر اگر اپنے مشاہدے و تجربے کو معاشرتی ارتقاء کے تناظر میں بیان کرتا تو کتنا ہی اچھا ہوتا مگر شاید وہ یہ سہرا ڈارون کے سر نہیں باندھنا چاہتا تھا۔ یُوں بھی ڈاکٹر کو ہر اِنسان کی طرح اپنے سر پر نئے نئے سہرے سجانے کا بہت شوق تھا۔ اِنسانی چہروں پر بندھے کئی سہروں کی سُنہری اور سیمیں لڑیوں سے منعکس ہوتی روشنی نے ایک لمحے کو شیر ولٹ کی آنکھیں چندھیا دیں اور وہ واپس جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

شیر ولٹ ہنٹ گروبے۔ دی ٹائمز میگزین کی رپورٹر جو خاص طور پر سائنس سے متعلق تحاریر اور سائنسدانوں کے انٹرویو پیش کرنے کے لیے معروف ہیں۔

جیمز ڈیوی واٹسن، معروف امریکی ماہرِ جینیات، حیاتیات جس نے فرانسس کرِک کے ساتھ مل کر ڈی این اے کی مالیکیولر ساخت بذریعہ واٹسن اینڈ کرِک ماڈل، دوہری کمانی (The Double Helix) وضع کی اور انہیں 1962 میں نوبل انعام ملا۔ (An article published by Francis Crick and James D. Watson in the scientific journal Nature April1953) It was the first in its 171st volume on pages 737-738 (dated 25 publication which described the discovery of the double helixstructure of DNA

مورس فریڈرک ہیوولکنز۔ نیوزی لینڈ نژاد انگلش ماہرِ طبیعات و حیاتیات جس نے واٹسن اور کرِک کو ان کے ماڈل وضع کرنے میں مدد کی اور ان کے ساتھ نوبل پرائز میں شامل ہوا۔

روزالنڈ فرینکلن۔ انگریز ماہرِ کیمیا و ایکسرے قلمیات جس نے ڈی این اے، آر این اے کی مالیکیولر ساختیات دریافت کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مورس وِلکنز نے روزالنڈ کی ایکسرے تصاویر اس کی میز کی دراز سے چرا کر واٹسن اور کرِک کو مہیا کیں جن کی بنیاد پر دوہری کمانی والا ڈی این اے سٹرکچر وضع کیا گیا۔

ریمونڈ گوسلنگ۔ روزی یعنی روزالنڈ فرینکلن کا شاگرد، ساتھی سائنسدان جس نے اس کے ساتھ کنگز کالج لندن میں ڈی این اے پر کام کیا۔

بوڑھا ڈیوڈ۔ افسانے کا مین کردار جو جدید علوم ہائے سائنس کا دلدادہ ہے اور عام لوگوں میں رہتے ہوئے غیر محسوس طریق سے کائنات کے بڑے بڑے موضوعات پر غور و فکر کرتا رہتا ہے۔

سیاہ مادہ (ڈارک میٹر) مادے کی مفروضہ قسم جسے دوربین سے نہیں دیکھا جا سکتا اور جسے علمِ تکوینیات (کاسمولوجی) اور علمِ فلکیات (ایسٹرانومی) میں اس کے کششِ ثقل کے اثرات کی بنا پر بیان کیا جاتا ہے۔

تیسرا راستہ

ریاض بٹ

محترم ریاض بٹ کا شمار نئے افق کے دیرینہ لکھاریوں اور پڑھنے والوں میں ہوتا ہے۔ آپ نے لکھنے کے لیے جو موضوع چنا اور جیسا انداز تحریر اپنا ہے وہ سب سے جداگانہ ہے' ان کے انداز تحریر میں دیہات کی سادگی ندرت اور قدرت کے سارے رنگ یکجا ہوجاتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و تندرستی دے اور وہ اپنے چاہنے والوں کے لیے یوں لکھتے اور دل بہلاتے رہیں۔

کہتے ہیں جوڑے آسمان پر بنتے ہیں' میری سروس میں ایسے بے شمار کیس تھے جن سے یہ بات ثابت ہوئی ہے۔ آج میں ایک ایسے ہی کیس کی روداد سنانے لگا ہوں۔ وہ موسم بہار کی آخری شاموں میں سے ایک شام تھی میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے اطلاع دی گئی۔

''سر! ایک جوڑا آپ سے ملنا چاہتا ہے' ہم نے لاکھ کریدا لیکن وہ اس بات پر بضد ہیں کہ بات صرف تھانیدار صاحب کو بتائیں گے۔'' یہ اطلاع کانسٹیبل وزیر لے کر آیا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت کردوں کہ میں نے اپنے عملے کو حکم دیا ہوا تھا کہ جو بھی سائل مجھ سے ملنے کا آرزو مند ہو اسے میرے پاس لانے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ برتی جائے۔ بہرحال کچھ لمحوں کے بعد جو جوڑا میرے سامنے لایا گیا ان کا میں نے بغور جائزہ لیا۔

مرد کی عمر لگ بھگ پچاس سال تھی' رنگ گورا' ماتھا تنگ اور چہرہ گول تھا۔ اس عمر میں بھی وہ جاذب نظر لگتا تھا اس نے سفید رنگ کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ عورت کی عمر کا اندازہ میں نے چھیالیس کے اریب قریب لگایا جو بعد ازاں درست ثابت ہوا۔

اس کا رنگ بھی گورا تھا میں نے انہیں اپنے سامنے بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ چہرے سے پریشان لگتے تھے' وہ بیٹھ تو گئے لیکن یوں لگتا تھا جیسے ابھی اٹھ کر بھاگ جائیں گے۔ میں نے ان کے دل سے تھانے کا خوف دور کرنے کی غرض سے ازراہ مذاق پوچھا۔

''کیوں بھئی لگتا ہے کوئی جرم کر کے سیدھے تھانے میں آگئے ہو۔''

''جرم......'' مرد نے زیر لب دہرایا پھر بولا۔ ''جناب! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہمارا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ ہم نے اپنا مسئلہ آپ کے اہلکاروں کو نہیں بتایا' سیدھے آپ کے پاس آگئے ہیں۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا ''کوئی بات نہیں' یہ جرم قابل دست اندازی پولیس نہیں ہے آپ اپنا مسئلہ بیان کریں۔''

''تھانیدار صاحب ہماری جواں سال بیٹی دلربا گم ہوگئی ہے' اس لیے ہم یہ بات صرف آپ کو بتانا چاہتے تھے۔'' عورت نے لب کشائی کرتے ہوئے کہا۔

''گم ہوگئی ہے۔'' میں نے مرد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔



"جی ہاں اور ہم اس کی گمشدگی کی رپورٹ بھی درج نہیں کروانا چاہتے۔" عورت نے اپنے سر پر چادر کو صحیح کرتے ہوئے کہا۔ "آپ ہماری مجبوری سمجھیں۔"

"دیکھو بی بی! تھانے میں بغیر رپورٹ کے کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"تھانیدار صاحب اس طرح تو ہماری بہت زیادہ بدنامی ہوگی۔" عورت نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"عزت اور ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے، میں آپ لوگوں کو قانونی مجبوریاں بتارہا ہوں پھر......" میں نے ایک لمحے کو توقف کیا اور دوبارہ گویا ہوا۔

"آپ دنیا کو کیا بتائیں گے کہ آپ کی بیٹی کہاں چلی گئی؟"

آخر کافی مغز کھپائی کے بعد بات ان کے پلے پڑھی اور وہ رپورٹ درج کروانے پر راضی ہوئے۔ میں نے ان کے گھر کا محل وقوع اور پتہ پوچھ کر محرر کے پاس بھیج دیا۔ مانا کہ بیٹیوں کا معاملہ حساس ہوتا ہے لیکن رپورٹ درج کرنے سے پہلے ہم کوئی کارروائی نہیں کرسکتے۔

دلربا کو غائب ہوئے تقریباً چوبیس گھنٹے ہوچکے تھے۔ بات وہیں آجاتی ہے کہ اولاد خاص طور پر بیٹی کی گمشدگی کی صورت میں والدین کافی وقت ضائع کردیتے تھے (شاید آج کل بھی یہی بات ہو) اس کو ڈھونڈنے اور تلاش کرنے کی ہر کوشش میں ناکامی کے بعد تھانے میں آتے تھے۔ اس کو ان کی مجبوری

سمجھ لیں یا کوئی اور نام دے لیں مگر ہمارے لیے مسائل بڑھ جاتے تھے۔

بہرحال اس رات گھر جانے سے پہلے میں نے سپاہی انور کو ساتھ لیا اور گمشدہ لڑکی کے گھر پہنچ گیا۔ وہ ایک دو منزلہ گھر تھا' اوپر بیٹا اور اس کی بیوی رہتے تھے جبکہ نچلی منزل میں یہ میاں بیوی رہتے تھے ان کے دو ہی بچے تھے' ان کی بہو کا نام زلیخا تھا یہ باتیں' ہمیں سوال جواب کے بعد معلوم ہوئی تھیں۔

دلربا گزشتہ شام گھر میں سہیلی کا بتا کر گئی تھی پھر واپس نہیں آئی تھی۔ اگر میں یہاں سارے سوال جواب لکھنے بیٹھ جاؤں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ یہاں جو کچھ دلربا کی ماں نے بتایا تھا وہ لکھ رہا ہوں۔

''بی بی آپ کے خیال میں آپ کی بیٹی کہاں جاسکتی ہے؟''

''تھانیدار صاحب! اس بابت میں کیا بتا سکتی ہوں؟''

''ٹھیک ہے یہ بات آپ نہیں بتا سکتیں لیکن اتنا تو بتا سکتی ہیں کہ آخر ایسی کون سی وجہ ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے آپ کی بیٹی نے گھر چھوڑا۔'' میں نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وجہ.....'' اس نے خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھا اور گویا ہوئی۔ ''تھانیدار صاحب! ہمارے پاس اللہ کا دیا ہوا بہت کچھ ہے' آسودہ حالی ہے۔ ہمارا بیٹا اور بہو اپنا خرچہ خود کرتے ہیں' ہم دو میاں بیوی ہیں اور.....'' وہ خاموش ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ آگے کیا کہنا چاہتی تھی میں نے اگلا سوال داغ دیا۔ شاید عشق معشوق کا کوئی چکر ہو؟

''تھانیدار صاحب! اس معاملے میں آپ پورے محلے سے پوچھ لیں' ہماری بیٹی ایسی نہیں تھی۔''

''ہر ماں باپ ایسے ہی کہتے ہیں بعض تو قسمیں بھی کھاتے ہیں لیکن بعد میں زیادہ تر معاملہ عشق معشوق والا ہی نکل آتا ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ اپنی تفتیش کے گھوڑے کو کسی اور سمت میں ڈال لیں تو بہتر ہے۔''

''مثلاً کس سمت میں.....'' میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

''میری تو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ میں کیا کہوں؟'' اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

بہرحال اس سے مجھے اس کیس کے سلسلے میں کوئی رہنمائی اس کے علاوہ نہیں ملی کہ دلربا شادی سے پہلے محبت کو اچھا نہیں سمجھتی تھی پھر میں نے جب اس کا کمرہ دیکھا تو مجھے وقتی طور پر اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ لڑکی اور ہی دنیا میں مگن تھی اس کے کمرے سے جو کتابیں ملیں وہ سب اسلامی تھیں۔

ہم تھانے کی طرف واپس جاتے ہوئے یہی سوچ رہے تھے کہ ایسی پاکیزہ خیالات رکھنے والی لڑکی کہاں جاسکتی ہے؟ عجیب کیس تھا۔

ماں نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ صرف تن پر موجود کپڑوں میں گئی ہے البتہ پیسے ضرور لے کر گئی تھی تقریباً ایک ہزار روپیہ ہوگا صرف ایک بات مجھے کھٹک رہی تھی کہ بیٹا اور بہو نیچے نہیں آئے تھے۔ میں نے بھی فی الحال انہیں چھیڑنا مناسب نہیں جانا تھا۔ بیٹے کا نام عمران معلوم ہوا۔

تھانے میں واپس آکر تھانے کا انتظام و انصرام میں نے شبینہ ڈیوٹی والے سینئر اہلکار (جو ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا) کے سپرد کیا اور اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

گمشدہ لڑکی کے بھائی اور بھاوج کے متعلق مخبروں سے رپورٹیں لینی تھیں' وہ میں نے سوچا ہوا تھا۔

یہ جس دور کی بات ہے اس وقت ایک ہزار کی

بڑی وقعت تھی جیسا کہ ذکر آچکا ہے یہ گھرانہ خوشحال تھا' روپے کی ریل پیل تھی ایک ہزار روپے لڑکی کے پاس ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ اصل بات یہ تھی جو مجھے الجھا رہی تھی کہ دینی کتب پڑھنے والی لڑکی کہاں جاسکتی تھی؟ اس بات کا مجھے یقین تھا کہ وہ گئی خود تھی کہاں گئی تھی اور کیوں گئی تھی؟ اس کا مجھے کھوج لگانا تھا۔

اگلی صبح میں تیار ہو کر تھانے میں پہنچا تو اے ایس آئی شاہد میرا منتظر تھا' کل وہ چھٹی پر تھا۔

''سر! سنا ہے کسی لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ ہے۔'' اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''تم نے ٹھیک سنا ہے لیکن اس بات کو دوسرے کان سے نکال نہیں دینا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے سر! میں آپ کو ہمیشہ فرنٹ لائن پر نظر آؤں گا۔''

''یہ بات تو ہے۔'' میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا تھا کہ میں نے گمشدہ لڑکی کی ایک تصویر اس کے والدین سے حاصل کرلی تھی۔ وہ تصویر میں نے منیر کی دراز سے نکالی اور اے ایس آئی شاہد کے ہاتھ میں تھمادی۔ چند لمحے وہ تصویر کا بغور جائزہ لیتا رہا پھر اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے بولا۔

''سر! لڑکی تو خوب صورت ہے کہیں......'' میں نے اس کا فقرہ درمیان سے اچکتے ہوئے کہا۔

''جو بات تم سوچ رہے ہو بات وہ نہیں ہے۔'' پھر میں نے اسے لڑکی کے متعلق بتایا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے چپ سا ہوگیا پھر بولا۔

''سر! ایسا کیس شاید پہلی بار ہمارے پاس آیا ہے مجھے لگ یہی رہا ہے کہ یہ کیس آگے چل کر ہمارے لیے کافی مشکلات لائے گا۔'' پھر وہ چلا گیا۔

اے ایس آئی شاہد ایک ذہین بندہ تھا' اسے پتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ مجھے اسے انگلی پکڑ کر چلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب میری ضرورت یہ تھی کہ میں کسی طرح دلربا (گمشدہ لڑکی) کی اس سہیلی سے دو دو باتیں کرلیتا جس کے گھر کا بتا کر دلربا گئی تھی۔

ویسے میرے سوال کے جواب میں دلربا کی ماں نے کہا تھا کہ سہیلی نے کہا تھا دلربا اس کے پاس آئی تھی صرف دس منٹ رکی تھی اور واپس چلی گئی تھی لیکن گھر نہیں پہنچی تھی۔

شام سے ذرا پہلے میں نے سپاہی انور کو ساتھ لیا اور سہیلی (فرحت) کے پاس پہنچ گیا۔

فرحت ایک دھان پان سی لڑکی تھی عمر بیس سال کے اریب قریب ہوگی۔ میں نے اس کے ماں باپ سے کہا تھا کہ میں علیحدگی میں فرحت سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں انہوں نے مجھے بیٹھک میں بٹھایا تھا اور فرحت کو بھیج دیا تھا۔ سپاہی انور باہر ہی رہ گیا تھا۔

''بی بی! تمہاری سہیلی کہاں جاسکتی ہے؟''

''تھانیدار صاحب! میں تو خود حیران ہوں کہ وہ کہاں چلی گئی۔'' فرحت نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو مروڑتے ہوئے کہا۔

''تم نے اس کے اندر یعنی چہرے پر کوئی خاص بات نوٹ کی تھی؟''

''بالکل نہیں' وہ بس نارمل تھی۔''

''وہ کردار کی کیسی تھی؟'' میں نے ایک اور زاویے سے سوال کیا۔

''کردار کی......؟'' میں نے دیکھا کہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آگئی ہے۔

''تھانیدار صاحب! وہ بس پند و نصیحت کا پٹارہ تھی'

کہتی تھی لڑکی کو اپنے ماں باپ کی عزت کا خیال رکھنا چاہیے۔ شادی سے پہلے کسی نامحرم سے بات بھی نہیں کرنی چاہیے بغیر پردے کے باہر نہیں نکلنا چاہیے وغیرہ وغیرہ......"

"تمہیں اس کی باتیں کیسی لگتی تھیں؟"

"تھانیدار صاحب! وہ دل کی بہت اچھی تھی، غریبوں کی مدد کرتی تھی۔"

"فرحت ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آئی' ایک طرف وہ یہ خیالات رکھتی تھی کہ ماں باپ کی عزت کا خیال رکھنا چاہیے اور دوسری طرف وہ اچانک غائب ہوگئی۔ اس کے ماں باپ کی عزت تو خاک میں مل گئی۔"

"تھانیدار صاحب! اس کے متعلق میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

اب ہمارا وہاں کوئی کام نہیں تھا' ہم واپس تھانے میں آگئے۔ واقعی یہ بات سوچنے والی تھی لیکن میں صرف اس بات پر ہی نہیں سوچنا چاہتا تھا بلکہ نئی راہیں ڈھونڈنا چاہتا تھا جن پر چل کر منزل پر پہنچ جاتا۔

اے ایس آئی شاہد اپنے کام میں لگا ہوا تھا شاید یہ بات میں نے کسی تفتیشی کہانی میں آپ کو نہیں بتائی کہ اے ایس آئی اکیلا تفتیش کے لیے نہیں جاتا تھا بلکہ ایک سپاہی (کم از کم) اس کے ساتھ جاتا تھا۔ آج سپاہی نواز اس کے ساتھ گیا ہوا تھا۔

میں اپنے آفس میں بیٹھا ضروری کاغذات نمٹا رہا تھا کہ سپاہی نواز نے آکر مجھے سلیوٹ کیا تھا اور بولا۔

"سر! شاہد صاحب لاری اڈے پر ہیں۔" میں سمجھ گیا کہ اسے کوئی سراغ مل گیا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ میں بھی وہاں پہنچ جاؤں۔

بہر حال آدھے گھنٹے بعد میں بھی ضروری تیاری کے بعد اڈے پر پہنچ گیا' سپاہی انور کو ساتھ لے لیا تھا۔

وہ ایک بڑا اڈہ تھا شہر کا نام میں نہیں بتاؤں گا' اتنا بتا دیتا ہوں کہ یہاں سے لاہور' فیصل آباد' پشاور وغیرہ کے لیے بسیں جاتی تھیں اور ان میں ایک کمپنی کی بسیں نمایا تھیں۔ اسی کمپنی کے دفتر میں اے ایس آئی بیٹھا ہوا تھا وہاں کچھ ڈرائیور اور کنڈیکٹر بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ سب کھڑے ہوگئے اور مجھے احترام کے ساتھ بٹھایا میں نے ان رسمی چیزوں کی کبھی پروا نہیں کی تھی۔ میں اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ تھا۔ بہر حال جس کام کے لیے میں آیا تھا اس کو کرنا تھا۔ سب سے پہلے اے ایس آئی شاہد بولا۔

"سر! دلاور اور فیصل لڑکی کے متعلق کچھ بتانا چاہتے ہیں۔" اور ساتھ ہی ایک فربہ اندام اور دھان پان سے بندے کی طرف اشارہ کر دیا۔ یہ شکل اور حرکات وسکنات سے ڈرائیور اور کنڈیکٹر لگتے تھے۔

"کیا انہوں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟" میں نے معنی خیز نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"سر! بتایا تو ہے لیکن......" اے ایس آئی نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں سمجھ گیا کہ اسے ان کی باتوں پر یقین نہیں آیا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ میں ان سے سوال و جواب کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ کروں۔ آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات بتا دوں کہ ڈرائیور اور کنڈیکٹر کے چہروں کا میں جائزہ لیتا رہا تھا وہاں مجھے گھبراہٹ تو نظر آرہی تھی لیکن ایسی کوئی بات نظر نہیں آرہی تھی جو مجھے کسی نتیجے پر پہنچنے میں مدد دیتی۔ بہر حال میں نے سب سے پہلے دلاور (ڈرائیور) کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"دلاور صاحب! جو کچھ آپ کے علم میں ہے وہ سچ سچ بتا دیں۔"

"تھانیدار صاحب! یہ منگل کی بات ہے (یہ وہ

دن تھا جس دن دلربا گم ہوئی تھی) شام ہونے والی تھی۔ میں نے اور فیصل نے ایک لڑکی کو مستانے اور دیوانے کے ساتھ بازار میں دیکھا تھا۔"

"یہ کیا نام ہوئے؟" میں نے دلاور کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تھانیدار صاحب! وہ اڈے پر اسی نام سے مشہور ہیں ان کے اصل نام کسی کو بھی نہیں معلوم۔"

"ہوں......" میں نے ہنکارا بھرا۔ "اب لگے ہاتھوں یہ بھی بتادیں کہ آپ کے یہ مستانے اور دیوانے کہاں ملیں گے، لیکن ٹھہریں پہلے یہ بتائیں کہ وہ کام کیا کرتے ہیں؟"

"تھانیدار صاحب!" دلاور نے چند لمحے فیصل کی طرف دیکھا اور پھر گویا ہوا۔ "یہ دونوں اڈے سے تھوڑی دور جو آڑھت کی منڈی ہے وہاں مزدوری کرتے ہیں۔ اس وقت وہ آپ کو وہیں ملیں گے۔"

"فیصل میاں! تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟" میں نے اچانک کنڈیکٹر کی طرف رخ پھیرتے ہوئے کہا۔

"جناب! جو استاد ہوراں نے بتایا ہے بالکل یہی بات ہے۔" اس دوران اے ایس آئی شاہد خاموش بیٹھا رہا تھا، سپاہی دفتر کے باہر الرٹ کھڑا تھا۔ میں نے اے ایس آئی شاہد کو ایک مخصوص اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم ذرا باہر دیکھو، سپاہی انور کہیں آگے پیچھے تو نہیں ہوگیا۔" وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ میں دراصل اکیلے میں دونوں سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا پھر میں نے باقی لوگوں کو بھی باہر نکال دیا تھا۔

اے ایس آئی نے یہ بھی کرنا تھا کہ کوئی دوبارہ اندر نہ آئے، سپاہی انور اس کی مدد کے لیے موجود

سکھ

ایک سکھ رات کے وقت موٹر سائیکل پر جارہا تھا۔ اچانک سامنے سے ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ تو اس نے رک کر اپنا کوٹ الٹا پہن لیا اور بٹن پیچھے کی طرف کرلیے اور موٹر سائیکل پر سوار ہوگیا۔ اور سردی سے بچنے پر اس ترکیب پر وہ اتنا خوش ہوا کہ ڈھلان پر موٹر سائیکل پھسل گئی اور وہ دھڑام سے گر گیا۔ کچھ دیر بعد بہت سے لوگ جمع ہوگئے۔ دیکھا سردار جی مرے پڑے ہیں۔ اور ایک سکھ اس کے پاس کھڑا ہے۔ لوگوں نے پوچھا۔ کیا ہوا ہے۔ وہ بولا۔ جب میں یہاں پہنچا سردار جی کراہ رہے تھے۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ تو پتہ چلا کہ گردن مڑ گئی ہے۔ میں نے زور لگا کر گردن سیدھی کی تب سے نہیں بولے۔

عبدالرحمن...... کراچی

تھا۔ میں نے دیکھا کہ دلاور اور فیصل کے چہروں پر بارہ بج چکے ہیں۔

"ہاں تو دلاور اور فیصل صاحب! اب یہاں کوئی نہیں ہے اس لیے آپ لوگ مجھے جو بھی بتائیں گے وہ میرے تک رہے گا۔" میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تھانیدار صاحب! ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے؟" دلاور نے کہا۔

"پولیس سے جھوٹ بولنا سب سے بڑا جرم ہے۔ تم لوگ مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔" اچانک میں نے گرم ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک لڑکی کا معاملہ ہے۔" میں نے دیکھا کہ دونوں کے چہرے فق ہوچکے ہیں۔ چند لمحے میں نے انتظار کیا پھر تپتے ہوئے ہی لہجے میں ان کو گھورتے ہوئے کہا۔

"باہر سپاہی اور اے ایس آئی موجود ہیں، میں تم

دونوں کو ہتھکڑیاں لگا کر یہاں سے لے جاؤں گا اور تھانے جا کر تمہیں ٹرائل روم کی سیر کرواؤں گا تو تمہیں چھٹی چھوڑ ساتویں کا بھی دودھ یاد آ جائے گا۔"

"تھانیدار صاحب! آپ تو ویسے ہی ناراض ہو رہے ہیں، ہم نے تو......" وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کی دلیری اور مزاحمت دم توڑ چکی ہے۔

لوہا گرم ہو چکا تھا آخری چوٹ لگانے کی دیر تھی پھر میں نے دیر نہیں کی اور سوالات کا آخری پتہ پھینکتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اے ایس آئی نے لڑکی کی تصویر دکھائی ہو گی اور تم نے فوراً کہہ دیا ہو گا کہ اس لڑکی کو تم لوگوں نے مستانے اور دیوانے کے ساتھ بازار میں دیکھا تھا۔"

"جی جی ہاں...... یعنی......" وہ ہکلانے لگا۔

"لیکن تم نے مجھے شروع میں بتایا تھا کہ ایک لڑکی کو تم نے دیوانے اور مستانے کے ساتھ بازار میں دیکھا تھا۔ تم نے میرے سامنے تصویر کا ذکر نہیں کیا۔"

اس نے سر جھکا لیا اور پھر پوری کہانی سنا دی۔ آخر میں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"تھانیدار صاحب! اب ہماری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔"

"دیکھو بھئی تم نے سچ سچ بتا دیا ہے اب میں کوشش کروں گا کہ...... خیر جانے دو، یہ سب بعد کی باتیں ہیں لیکن جب تک میں نہیں کہوں گا تم لوگوں نے تھانے میں بتائے بغیر کہیں نہیں جانا ہے۔"

"تھانیدار صاحب! لیکن بس کا کیا ہو گا؟"

"یہ تم لوگوں کا معاملہ ہے، میری دردسری نہیں ہے۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ "تم دونوں نے کہیں نہیں جانا ہے۔" پھر میں اٹھ کر باہر آ گیا اے ایس آئی اور سپاہی کو ساتھ لیا اور ہم تھانے میں واپس آ گئے۔ راستے میں اے ایس آئی نے کہا۔

"سر! دیوانے اور مستانے کو ٹٹولنے کی ضرورت ہے؟" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اسے ساری بات بتائی تھی وہ حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

قارئین آپ بھی ذرا صبر کے دامن کو تھامے رکھیں کیونکہ ابھی میں آپ کو وہ کہانی نہیں سنا سکتا جو دلاور کی زبانی مجھ تک پہنچی تھی۔

اسی دن دلربا کا باپ میرے پاس آیا اور اپنا رونا رونے لگ گیا۔

"تھانیدار صاحب! میری بیٹی کا کچھ پتا چلا؟"

"دیکھو بھائی! ہم کوشش کر رہے ہیں، اگر آپ نہ آتے تو میں آپ کے گھر آنے والا تھا۔"

"خیر ہے تھانیدار صاحب! میں خود آ گیا ہوں جو کچھ پوچھنا ہے میں حاضر ہوں۔"

"آپ کا لاہور میں کون رہتا ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی نہیں۔" اس نے کہنے کو کہہ تو دیا لیکن میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا ہے۔

"ٹھیک ہے پھر آپ گھر جائیں اور کسی معجزے کا انتظار کریں۔"

"کیا مطلب؟" اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"جب آپ گھر والے ہی باتیں چھپائیں گے تو میں کوئی شرلاک ہومز تو ہوں نہیں کہ چٹکی بجاتے ہی آپ کی لڑکی کو برآمد کر لوں گا۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"لیکن تھانیدار صاحب ہم سب کچھ چھوڑ کر

آ گئے ہیں پھر میری بیٹی کی گمشدگی کا لاہور سے کیا تعلق؟''

''تعلق ہے یا نہیں اس پر غور کرنا آپ کا نہیں میرا کام ہے۔آپ میرے سوال کا ٹھیک جواب دیں۔'' پھر اس نے جو کہانی سنائی وہ اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا ہوں۔

''یہاں آنے سے پہلے یہ گھرانہ لاہور میں رہتا تھا دو بھائی ایک حویلی نما مکان میں رہتے تھے۔ دونوں بھائی مجید اور وحید محنت مزدوری کرتے تھے' یہ حویلی کرائے پر لی گئی تھی۔

والدین فوت ہو چکے تھے' دونوں بال بچے دار تھے۔اچانک مجید کے دن پھر گئے اس کا انعامی بانڈ نکل آیا اس وقت رقم مجھے یاد نہیں آ رہی بہر حال اس زمانے کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی' پہلا انعام نکلا تھا۔

کہتے ہیں جب انسان کے پاس پیسہ آ جاتا ہے تو اس کی آنکھوں پر خود غرضی کی پٹی بندھ جاتی ہے۔ میں سب انسانوں کی بات نہیں کر رہا لیکن زیادہ تر بدل جاتے ہیں اور خون کے رشتے بھی بھول جاتے ہیں۔یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا مجید کی بیوی شازیہ کینہ پرور اور لڑاکا تھی۔

بہر حال مختصراً یہ کہ مجید بیوی کے مجبور کرنے پر بھائی سے جدا ہونے پر تیار ہو گیا۔اس شہر میں مجید کا ایک دوست رہتا تھا مجید نے اسے خط لکھ کر سارے حالات سے آگاہ کر دیا۔دوست کا نام وسیم فاروقی تھا یہ کافی عرصے سے کسی ایسے پارٹنر کی تلاش میں تھا جو پیسہ لگاتا اور دونوں مل کر آڑھت کا کاروبار کرتے۔ چاول اور دالوں کا کاروبار وسیم فاروقی کے ذہن میں تھا۔اس کے شہر میں دو مکان ہیں ان دنوں اس نے ایک مکان کرائے پر دیا ہوا تھا۔

روشن ستارے

استاد کی نظر معاملے کے اس پہلو پر ہوتی ہے جہاں شاگرد کی نگاہ پہنچنے میں ابھی دیر ہوتی ہے۔

+ آپ اپنا کام کرتے جائیں وقت آپ کے لیے دوستیاں اور محبتیں خود پیدا کرے گا۔

+ اگر آپ کسی کو سزا دینا چاہتے ہیں تو اس سے سچ بولتے جائیں۔

+ عورت کڑھتی زیادہ ہے اور مرد چڑتا زیادہ ہے۔

+ ہر انسان کا روپ آپ سے چھپا ہوا ضرور ہوتا ہے ورنہ آپ کسی کے خاص رویے پر چونکتے نہیں۔

عثمان عبداللہ......ملتان

قصہ مختصر یہ کہ مجید کا خط پڑھ کر اس کے لیے گویا اندھے کے ہاتھ بٹیر آنے والی بات ہو گئی۔اس نے مجید کو لکھا کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ یہاں آ جائے وہ اسے اپنا مکان خالی کروا کے دے دے گا' اِدھر دونوں مل کر کاروبار کر لیں گے اُدھر مجید بھی کوئی مضبوط سہارا ڈھونڈ رہا تھا۔اس نے دیر نہ کی اور اپنی فیملی کو لے کر یہاں آ گیا اس دوران فاروقی نے مکان خالی کروا لیا تھا۔آج کل دونوں آڑھت کا کاروبار کر رہے تھے کاروبار خوب چل رہا تھا۔

''ہوں......'' میں نے اس کی کہانی سننے کے بعد ہنکارا ابھرا' چند لمحے اس کے چہرے کو بغور دیکھتا رہا پھر گویا ہوا۔''اب آپ جائیں۔'' اور اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تھانیدار صاحب! لگتا ہے آپ کو کوئی سراغ مل گیا ہے اور ابھی آپ مجھے بتانا نہیں چاہتے۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔میں مصلحتاً خاموش ہو گیا' وہ چلا گیا۔

ابھی میں واقعی اس کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا ایک تو میں خود کنفرم نہیں تھا دوسرے میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی خون خرابہ ہو۔ میں نے اس سے لاہور کا پتا بھی نہیں

پوچھا تھا۔ شام کو میں نے مجید کے بیٹے کو تھانے میں بلالیا جب وہ میرے سامنے آیا تو میں نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ پچیس چھبیس سال کا ایک گھبرو جوان تھا۔ ہلکی ہلکی مونچھیں اس کی مردانہ وجاہت میں اضافہ کررہی تھیں۔ رنگ اس کا بھی باپ کی طرح گورا تھا' قد درمیانہ تھا۔

''عمران! تمہیں پتا ہے کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''شاید ہمارے گھر کے حالات معلوم کرنے کے لیے اور دلربا کے متعلق کچھ پوچھنے کے لیے۔'' جوان ذہین اور دلیر لگتا تھا۔

''بالکل عمران! اور مجھے یقین ہے کہ تم جو کڑی رہ گئی ہے وہ پوری کردو گے۔''

''کیا مطلب تھانیدار صاحب! آپ کی یہ بات میں بالکل نہیں سمجھا۔'' اس نے حیران نگاہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں خوانخواہ ہنس پڑا تاکہ وہ مجھ سے بے تکلف ہوجائے پھر میں نے اسے وہ ساری باتیں بتائی تھیں جو اس کا باپ بتا گیا تھا۔ تمام کہانی سننے کے بعد وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

''تھانیدار صاحب! واقعی کئی اہم باتیں ابا جی آپ کو بتا کر نہیں گئے۔'' پھر اس نے وہ باتیں بتائی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں بالکل منزل کے قریب پہنچ چکا ہوں۔

اب میں دیر نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اگر واقعی یہی بات تھی جس کا اندازہ میں نے لگایا تھا تو...... ویسے میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر مجید سے کہہ دیا تھا کہ اس نے اب آرام سے بیٹھ جانا ہے۔

اگلے دن تھانے میں آکر میں نے اے ایس آئی شاہد اور کانسٹیبل وزیر کو ''مہم'' پر روانہ کردیا۔ پہلے انہیں متعلقہ تھانے میں جانا تھا پھر...... بہرحال ہمیں کامیابی ہوئی اور اے ایس آئی شاہد اور کانسٹیبل وزیر گمشدہ لڑکی (دلربا) کو لے کر آگئے' ساتھ ہی ایک مرد اور عورت بھی تھے۔

میں نے غور سے لڑکی کو دیکھا وہ ایک خوب صورت دوشیزہ تھی' اس کے حسن میں ایک پاکیزگی تھی۔ اس نے کالا فیشنی برقعہ پہنا ہوا تھا اور اس وقت اس نے نقاب اٹھایا ہوا تھا۔

اب پہلے میں آپ کو وہ باتیں بتادوں جو دلاور (ڈرائیور) نے مجھے دوران جرح بتائی تھیں یہ اس کی زبانی سنیے۔

''تھانیدار صاحب! میں آپ کو بتاؤں کہ میں بہت گناہ گار آدمی ہوں' اس شام میں اور فیصل بازار میں گھوم رہے تھے کہ ہماری نظر ایک برقع پوش عورت پر پڑی (ہم پہلے اسے عورت ہی سمجھے تھے) وہ تیز تیز قدموں سے اڈے کی طرف جارہی تھی۔ میری تجربہ کار نظروں نے بھانپ لیا کہ یہ گھر سے بھاگی ہوئی ہے۔ فیصل نے اس کے قریب جاکر پوچھا

''بہن کدھر جانا ہے؟'' اس دوران میں بھی اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

''بھائی! میں نے لاہور جانا ہے۔''

جب وہ بولی تو ہمیں اندازہ ہوگیا کہ یہ کوئی دوشیزہ ہے اور بہت خوب صورت ہے۔

''تھانیدار صاحب! ہمارے اوپر شیطان حاوی ہوچکا تھا اس دن فیصل کا گھر خالی تھا۔ میں نے کہا دیکھو بہن! میں ڈرائیور ہوں اور یہ کنڈیکٹر ہے ہماری بس صبح صبح جائے گی۔ رات تم کہاں خوار ہوتی پھرو گی اکیلی لڑکی ہو' ہم صبح تمہیں حفاظت سے لے جائیں گے۔''

''رات میں کہاں گزاروں گی؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''دیکھو تم ہم پر اعتبار کرو۔''

بہر حال وہ شاید جذباتی لمحے کے حصار میں آ کر گھر سے نکل آئی تھی یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ سر کے اوپر رات آنے والی ہے اور وہ اکیلی لڑکی ہے۔ مختصراً یہ کہ ہم اسے مکان میں لے گئے۔ اسے کھانا کھلایا اور اپنی ایک واقف کار عورت کو اس کے پاس چھوڑ کر باہر نکل گئے' ہم نے اس کی سورت دیکھ لی تھی۔ رات تقریباً گیارہ بجے ہم گھر میں دوبارہ داخل ہو گئے وہ مجھے دیکھ کر چپکے سے کھسک گئی اور دوسرے کمرے میں فیصل کے پاس چلی گئی۔ اچانک لڑکی جاگ اٹھی اور مجھے اپنے قریب دیکھ کر بولی۔

''بھائی جان! آپ اس وقت اس کمرے میں...... آنٹی کہاں ہے؟'' میں نے مکارانہ مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔

''اس تنہائی کے کچھ لمحے مجھے دے دو۔'' وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر ہاتھ جوڑ کر بولی۔

''دیکھو مجھے خراب نہ کرو' تم نے مجھے بہن کہا ہے۔''

''کون بہن اور کیسا بھائی...... سیدھی طرح میری بات مان لو۔'' اس وقت میں مکمل شیطان بن چکا تھا۔

بہر حال اچانک اس نے دوپٹہ صحیح طرح اپنے سر پر رکھا اور کچھ پڑھنے لگی۔ میں نے غور کیا وہ قرآن پاک کی کوئی صورت پڑھ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی آواز بلند ہونے لگی اور اس کے چہرے پر پاکیزگی گہری ہوئی تھی۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور جیسے میں کسی اور جہان میں پہنچ گیا۔ وہ مجھے ایک پاکیزہ روح کی طرح نظر آنے لگی' میری نگاہیں خود بخود جھکتی چلی گئیں۔

کامیابی کا راز

+ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ پریشانیوں میں گھرا ہونے کے باوجود ہمت اور حوصلے سے آگے بڑھا جائے۔

+ مصیبت میں گھبرانا خود بڑی مصیبت ہے۔

+ خوف اور وہم آگے بڑھنے کا راستہ روک دیتے ہیں' کامیابی صرف انہیں ملتی ہے جو مستقل مزاجی سے محنت کرتے ہیں اور مایوسی کو قریب نہیں آنے دیتے۔

اور جو لوگ صبح کو فیصلہ کرتے ہیں اور شام کو بدل دیتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

+ بے شک دیر تک سوچو مگر سوچنے کے بعد جو فیصلہ کرو وہ اٹل ہو۔

+ بغیر کوشش کے کامیابی حاصل کرنا ایسا ہے جیسے بغیر پروں کے اڑنے کی کوشش کرنا۔

ندیم احمد ...... لاہور

پھر اچانک میں اس کے قدموں میں گر گیا' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے یہ شاید ندامت کے آنسو تھے۔ پچھتاوے کا پانی آنکھوں کے رستے نکل رہا تھا' میں اندر سے پگھل رہا تھا۔ تھانیدار صاحب! میں نے اس کے قدموں پر سر رگڑتے ہوئے کہا۔

بہن! مجھے معاف کر دو' تم میری بہن ہو اس ذلیل انسان کو معاف کر دو یا پھر......'' میں نے اپنا گلہ اس کے سامنے کر دیا ''میرا گلہ گھونٹ دو۔'' اس نے میرے ہاتھوں کو پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا لیا اور بولی۔

''میں نے آپ کو معاف کیا' اللہ آپ کو معاف کرے۔'' یہاں پہنچ کر دلاور رونے لگ گیا' چند لمحوں کے بعد وہ سنبھلا اور بولا۔

''تھانیدار صاحب! اس لڑکی نے ہمیں بدل دیا' ہم سب نے آئندہ بُرے کاموں سے توبہ کر لی ہے اب ہماری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

''دلاور خدا تمہیں معاف کرے یہ بتاؤ کہ اب لڑکی کہاں ہے؟''

''تھانیدار صاحب! اس کے بعد میں دوسرے کمرے میں فیصل کے پاس چلا گیا اور عورت کو لڑکی کے پاس بھیج دیا تھا یقین کریں تھانیدار صاحب! وہ عورت بھی بدل گئی ہے اس نے بھی بُرے کاموں سے توبہ کرلی ہے اور......''میں نے اسے ٹوکا۔

''دلاور میں لڑکی کے متعلق پوچھ رہا ہوں۔''

''اوہ تھانیدار صاحب! سوری، صبح ہم نے لڑکی کو ناشتا کروایا تھا اور عورت کے ساتھ اڈے پر بھیج دیا تھا اس نے آ کر ہمیں بتایا تھا کہ اس نے لڑکی کو لاہور جانے والی بس میں بٹھا دیا ہے۔'' میں نے آخری سوال کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''تم نے لڑکی سے پوچھا ہوگا وہ لاہور کیوں جا رہی ہے اور وہ بھی اکیلی؟''

''تھانیدار صاحب! یہ سب کچھ ہونے کے بعد ہمیں اس لڑکی سے کچھ پوچھنے کا خیال ہی نہیں رہا۔'' میں اس کی دلی کیفیت سمجھ رہا تھا اور یہ بھی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔

اب دلربا کے بھائی عمران کی وہ باتیں بھی سن لیں جو وہ مجھ سے کر گیا تھا اور جس کے بعد میں نے اے ایس آئی شاہد اور کانسٹیبل وزیر کو لاہور اس پتے پر روانہ کر دیا تھا جو عمران نے بتایا تھا اور میں آپ کو یہاں یہ بھی بتا دوں کہ یہ پتا دلربا کے چچا وحید کا تھا اور اس وقت دلربا کے ساتھ وحید اور اس کی بیوی بھی تھانے میں موجود تھے، عمران نے کہا تھا۔

''تھانیدار صاحب! ابا جی آپ کو جو باتیں نہیں بتا کر گئے وہ میں بتا دیتا ہوں۔

''جب ہم لاہور میں رہتے تھے تو ابا نے دلربا کا رشتہ وحید چچا کے بیٹے دلدار سے طے کر دیا تھا باقاعدہ منگنی ہوئی تھی۔ امی نیم دلی سے راضی ہوئی تھیں، وہ اپنی بہن ذکیہ کے بیٹے فرحان سے دلربا کا رشتہ کرنا چاہتی تھیں پھر جب ابا کے پاس پیسے آ گئے تو انہوں نے یہاں آنے سے پہلے منگنی توڑ دی۔ میں بھی اس کے حق میں نہیں تھا لیکن نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے بہر حال یہاں آ کر جب ابا اور ان کے دوست فاروقی صاحب کا کاروبار خوب چمک گیا تو ایک اور ہی ڈرامہ شروع ہوگیا۔

اب امی نے دوبارہ اپنی بہن ذکیہ کے بیٹے کے لیے زور دینا شروع کر دیا لیکن اب ابا جی کچھ اور ہی سوچ رہے تھے وہ فاروقی انکل کے بیٹے جمیل کے ساتھ دلربا کا رشتہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایک آزاد خیال باپ کا آزاد خیال بیٹا ہے اور ہمارے گھر آتا رہتا ہے۔ یہ بات تو شاید آپ کے علم میں بھی آ چکی ہوگی کہ دلربا کس ذہن کی لڑکی ہے۔ بہر حال گھر میں ٹینشن بن گئی تھی۔ آخر نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ ابا جی اور امی میں باقاعدہ ٹھن گئی تھی۔ امی ہماری ضدی اور جھگڑالو ہیں انہوں نے کہہ دیا تھا کہ اگر دلربا کا رشتہ ان کے بھانجے فرحان کو نہ دیا گیا تو وہ طلاق لے لیں گی۔

''تھانیدار صاحب! اور امی کی ضد کی وجہ سے میں اور میری بیوی بھی اوپر والے حصے تک محدود ہو گئے ہیں۔ ہماری بول چال بند ہوگئی ہے ان حالات میں دلربا کہاں جا سکتی ہے؟ آپ خود سمجھدار ہیں۔''

قارئین! میں یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ میں نے وہ باتیں عمران کو نہیں بتائی تھیں جو دلاور بتا گیا تھا اب کچھ باتیں دلربا کی زبانی بھی سنیے۔

''تھانیدار صاحب! گھر میں اتنی ٹینشن بن گئی تھی۔'' (پھر اس نے وہی باتیں بتائی تھیں جو اس کا بھائی اور باپ مجھے بتا گئے تھے) میں نے سوچا مجھے تیسرا راستہ اختیار کرنا چاہیے مجھے کچھ دنوں کے لیے

منظر سے غائب ہوجانا چاہیے تاکہ ابا جی اور امی اپنی لڑائی بھول جائیں اور کوئی تیح فیصلہ کرسکیں۔ میرے ذہن میں یہی خیال بار بار آتا تھا کہ مجھے لاہور اپنے چچا اور چچی کے پاس کچھ دنوں کے لیے چلے جانا چاہیے۔ میں شادی سے پہلے شیریں' سسی یا ہیر بننے کے سخت خلاف ہوں لیکن میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ چچی اور چچا کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔

''تھانیدار صاحب! پیسہ تو ہاتھوں کی میل ہوتا ہے اس کے لیے خون کے رشتوں کو تو پامال نہیں کرنا چاہیے۔'' وہ خاموش ہوئی تو میرے ذہن میں جو سوال آرہا تھا وہ میں نے کردیا۔

''لیکن دلربا! تمہارے اتنے اچھے خیالات ہیں پھر تم نے یہ تیسرا راستہ کیوں اختیار کیا؟ کیا تمہارے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ اس طرح گھر چھوڑ کر چلے جانے سے تمہارے ماں باپ کی بدنامی ہوگی' ان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔'' اس نے ایسا جواب دیا کہ میں اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ہوسکتا ہے یہ جواب آپ کو عجیب لگے' اس نے کہا۔

''تھانیدار صاحب! ایسے والدین کو کچھ تو سزا ملنی چاہیے۔'' بہرحال میں اس کی بات سے متفق نہیں تھا خیر جو ہونا تھا وہ ہوچکا تھا وہ پل صراط سے گزر کر آئی تھی' چچا اور چچی نے کہا۔

''تھانیدار صاحب! ہمارا کوئی قصور نہیں ہے' یہ ہمارے پاس آئی تو سب سے پہلے ہم نے یہی کہا تم نے بہت بُرا کیا تمہارے والدین سب رشتے ناتے توڑ کر چلے گئے تھے بہرطور ہم نے یہ سوچ لیا تھا کہ چند دن بعد اسے کسی طرح راضی کرکے واپس چھوڑ آئیں گے۔''

اس کے بعد میں نے دلربا کے ماں باپ کو تھانے میں بلالیا تھا اور ساری صورت حال ان کے سامنے رکھ دی تھی اور ان سے پوچھا تھا کہ وہ اب کیا چاہتے ہیں؟ دلاور کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا' دلربا کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس نے کسی سے ان باتوں کا ذکر نہیں کیا تھا اور وہ شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ میں بھی ان باتوں سے لاعلم ہوں' یقیناً اس نے دلاور کو معاف کردیا تھا۔

میری باتیں سن کر دونوں میاں بیوی چند لمحوں کے لیے سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں چلے گئے پھر اچانک وہ ہوگیا جس کی توقع کی بھی جاسکتی تھی اور نہیں بھی۔ مجید نے بیٹی کو سینے سے لگالیا تھا پھر ماں بھی آگے بڑھی تھی اور بیٹی کو گلے لگا کر رونے لگ گئی تھی اور ان آنسوؤں میں شاید سب کچھ بہہ گیا تھا۔ سارے گلے شکوے دور ہوگئے تھے' ساری کدورتیں دھل گئی تھیں کیونکہ پھر مجید نے اپنے بھائی کو گلے لگایا تھا اور شازیہ اپنی دیورانی سے گلے ملی تھی۔ یہ سب کچھ ہنسی خوشی تھانے میں ہوا تھا کسی کو کسی سے گلہ نہیں رہا تھا۔ میں نے راضی نامے کے پیپر تیار کروائے تھے اور سب نے بغیر کسی حیل و حجت کے ان پر سائن (دستخط) کردیئے تھے۔

کچھ عرصے بعد مجھے ایک عورت نامہ ملا جس پر لکھا تھا دختر نیک اختر دلربا کی شادی برخوردار دلاور سے فلاں تاریخ کو طے ہوگئی ہے۔ آپ کی شرکت ہمارے لیے باعث صد افتخار ہوگی۔

قارئین واقعی جوڑے آسمان پر بنتے ہیں۔

پھاگنی

مہر افروز

ماضی اور حال کا تنازعہ' وقت کی بوالعجمیوں کا احوال' ایک معصوم محبت' دل کی اتھاہ گہرائیوں میں دیکھنے والی پیار کی کلی کا فسانہ۔

اچھی کہانیاں پڑھنے والوں کے لیے بطور خاص کنٹری ادیب موہن ناگ سوز کا فسانہ۔

اپنے بابا کا ہاتھ پکڑے وہ بڑے خراماں خراماں انداز میں چل رہی تھی۔ زمیندار کی بیٹی، شاہی چال اس کا شیوہ اور غرور اس کا حق تھا۔ تھی تو سات سال ہی کی مگر چہرے پر وقار، متانت اور سنجیدگی بڑوں کی سی تھی اور اُٹھان بھی غضب کی۔ ابھی سے لگ رہا تھا بارہ تیرہ کی ہے۔ زمیندار بھی متانت والے انسان تھے۔ مگر زمینداری کا رعب اور دبدبہ ہمیشہ چہرے پر قائم رہتا اور صبح سویرے جب وہ مندر کو نکلتے تو ہر کوئی اپنی راہ لے لیتا۔ یا ادباً ان کو دیکھ کر راستے سے ہٹ جاتا۔ جب ان کی سواری گذرتی یا وہ پیدل نکلے ہوں تو پھر راستے پر لوگ دکھائی نہ دیتے۔ یہ روز کا معمول تھا۔ عموماً مندر وہ پیدل ہی جاتے، جب دیر ہوتی تو گھوڑا گاڑی پہ دکھائی دیتے۔ دیر ہو یا سویر پیدل ہو یا گھوڑا گاڑی پھاگنی ہمیشہ ساتھ ہوتی۔

پھاگنی کو تکنا اس کا روز کا معمول تھا۔ وہ روزانہ اپنے باپ کے ساتھ راستہ صاف کرنے نکلتا۔ پنچایت کی طرف سے ہمیشہ اس کے باپ کی باری مندر کا راستہ صاف کرنے کی ہوتی۔ زمیندار کے نکلنے سے پہلے وہ دونوں باپ بیٹا راستہ صاف کرنے نکل پڑتے۔ جب زمیندار کا گزر ہوتا تو راستہ چھوڑ کر، ادب سے جھک کر کھڑے ہو جاتے۔ زمیندار کا موڈ اچھا ہوتا تو کبھی کوئی نوٹ ہوا میں لہراتا اور ان کی طرف پھینک جاتا۔ جیسے وہ بھگوان کا پرساد سمجھ کر سمیٹ لیتے اور ان کی گردنیں اس احسان تلے جھک جاتیں۔ وہ سوریہ تھا۔ باپ نے بڑے ارمانوں سے اس کا نام سوریہ رکھا تھا مگر مقدر بھی سورج کا ہی تھا۔ صبح سویرے اُٹھنا اور کام کرنا، جیسا کہ سورج سب سے پہلے اُٹھ کر لگ جاتا ہے۔ چھوٹا تھا تو بڑے لاڈ و پیار تھے۔ پانچ سال کا ہونے کو آیا تو سرکاری اسکول میں بھیج دیا گیا۔ مگر اُسے شوق تھا کہ وہ باپ کے ساتھ راستہ صاف کرے۔ کیونکہ جب بھی وہ جاتا تو زمیندار پیسے ضرور دیتا۔ اب اس کا یہ شوق لت بن گیا کہ زمیندار اسے سکہ ضرور دے جو اس کے اپنے ہوتے' نوٹ تو باپ لیتا، روپیہ دو روپیہ اس کا اپنا ہوتا۔ روزانہ کا مشغلہ سالوں پر محیط ہو گیا۔ باپ کی کمر غریبی اور مزدوری نے جھکا دی۔ اور اس کا سینہ بغاوت نے تن دیا۔ اب روپیہ دو روپیہ شوق تھا نہ لت، بلکہ کام مجبوری تھی۔ سردی کی صبح باپ کھانستے کھانستے اُٹھتا، جھاڑو اُٹھاتا، تو وہ کہتا۔ ''بابا! رہنے دو میں کر لوں گا۔'' شوق بدل گیا تھا۔ پھاگنی کو دیکھنا، اُسے محسوس کرنا، اس کی لت بن گئی۔ زاویۂ نگاہ بدل گیا۔ شوق بدل گیا کام وہی تھا۔ پھاگنی وقت



کے ساتھ نکھر گئی تھی۔ وہ سرکاری اسکول سے گورنمنٹ کالج میں داخل ہوگیا۔ علی الصبح اُٹھنا اور مندر کا راستہ صاف کرنا۔ پھالگنی کو دیکھ کر اپنی صبح خوشگوار بنانا پھر کالج کو دوڑنا اس کا معمول تھا۔

وہ بلا کا ذہین تھا۔ نچلی ذات کا تھا تو کیا ہوا؟ پڑھائی میں ہمیشہ اول رہتا۔ پچھلے سال شہر سے اس کے ماما آئے، اُنھوں نے جب سنا کہ وہ اسکول بھر میں اول آیا ہے تو ماما نے اصرار کیا کہ اُن کے ساتھ شہر چلے مگر اُس نے منع کردیا۔ وہ پھالگنی کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ سورج کو دیکھ کر سب کی صبح ہوتی مگر اس کی صبح پھالگنی سے ہوتی۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ پھالگنی بڑی ہونے کے بعد روزانہ آتی کبھی کبھی نہ آتی مگر شام میں سہیلیوں کے ساتھ ندی کے کنارے ٹہلنے ضرور نظر آجاتی' دونوں کے درمیان جانے کون سی ڈور تھی۔ صبح نہ نظر آتی، دن بڑا بیزار کن ہوتا۔ شام میں نظر آتی، رات سہانی ہوجاتی۔ بس ایک احساس، ایک سرور، ایک روحانی خوشی تھی جو اُسے ملتی ورنہ اس کا اور پھالگنی کا کیا میل کہاں وہ سندرسی البیلی، نرم و نازک دوشیزہ، زمیندار کی نازوں میں پلی بیٹی کہاں وہ کالا، کلوٹا، راستہ جھاڑنے والا مزدور کا بیٹا سوریہ، سورج کی طرح جلنا اس کا مقدر تھا۔

مگر ان جذبوں کا' احساسات کا، خیالات کا' سوچوں کا کیا کریں۔ کالے کلوٹے مزدور کے احساسات تو دوسرے نہیں ہوتے۔ بس وہ تھا اور اس کے خوابوں کی اچھوتی دنیا جہاں پھالگنی کے مختلف عکس اور رنگ ہوتے اور اس کے خوابوں کی اچھوتی دنیا جہاں پھالگنی کے مختلف عکس اور رنگ ہوتے اور وہ بس اُسے نہارتا رہا۔ گویا نہارنا ہی اس کی عبادت اور ریاضت تھی۔ بس کچھ اور نہیں

کل اماں کو کچھ کہتے اُس نے سنا' وہ اس کے بابا سے مخاطب تھی۔

''سوریہ کے باپو سنا تم نے' پھالگنی کا رشتہ آیا ہے۔ پڑوس کے گاؤں کے زمیندار کا بیٹا وشنو اُس سے بات پکی ہوگئی ہے۔ شاید کل پرسوں شگن آجائے''۔

کھن سے کچھ ٹوٹا۔ بہت زور سے کچھ گرا۔ پل بھر میں وہ زمین پر آگیا۔ اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ رات بڑی بے چینی سے کٹی۔ صبح اندھیر منہ وہ مندر کی اور نکل پڑا۔ مندر کی سیڑھیوں پر جھاڑو لگاتے ہوئے اُسے بھگوان سے پہلی بار شکایت ہوئی۔ ''برسوں تیرا، راستہ اور تیری

سیڑھیاں جھاڑنے کا یہی صلہ ہے۔ ''جس بھگوان سے اُس نے کبھی کچھ نہیں مانگا، اُس سے شکایت تھی۔ سوریہ کو سورج کا انتظار تھا۔ ''ارے آج یہ صبح کیوں نہیں ہو رہی۔''

پھاگنی کو دیکھنے کی آس!
بس ایک نگاہ کی آس!
آج آجائے!
کل بھی نہیں آئی تھی!
جانے کہاں ہے!

کیا اُسے بھی یہی احساس ہے؟ احساس ہوتا تو شام میں ندی کنارے ٹہلنے نہیں آتی؟

یہ میں ہی کیوں ایسا ہوں! یہ دل! اس میں یہ آگ کیوں ہے!۔ آنکھوں کا کھارا پانی اس کے چہرے کی دھول دھو رہا تھا۔

مندر کی گھنٹی بجی! وہ چونکا۔

''سوریہ ایسے کیوں مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہے اُٹھ۔''

زمیندار کی آواز گرجی۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے''! کیا ہوا؟'' پوچھو کہاں ہے تمہارا بابا؟

کئی دن سے دکھا نہیں؟''

''وہ بیمار ہے، آج میں جلدی آ گیا تھا......'' وہ ہکلایا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے یہ لو۔''

پہلی مرتبہ زمیندار کے ہاتھ میں اُس نے پچاس کا نوٹ دیکھا۔

''شام تک حویلی کا آنگن صاف ہو جانا چاہئے اور سامنے کا راستہ بھی کل پھاگنی کا شگن آ رہا ہے۔ خبردار کہیں کوئی پتھر کا نٹا باقی نہ رہے۔''

''جی صاحب!'' بس وہ اتنا ہی کہہ پایا۔

''حویلی جاؤں! آنگن اور راستہ جھاڑوں''! بغاوت نے سر اُبھارا۔ یہ اس کی تعلیم اور جوانی بول رہی تھی۔

''شاید پھاگنی کی ایک جھلک دکھ جائے۔'' دل نے سرگوشی کی اس کے چہرے پر مسکان کھلی۔ دل نے عقل پر فتح پائی اور وہ گھر کو بھاگا۔ بابا کو سنانے۔

''زمیندار نے ہمیں جھاڑو لگانے کو کہا ہے؟'' اس کے باپ کو یقین نہیں تھا۔

''بابا! یہ دیکھو پچاس روپئے بھی دیے ہیں۔'' نوٹ لہرایا۔

کھانستا، بسورتا بابا اُٹھ کھڑا ہوا۔ نوٹ کی گرمی نے جان بھر دی۔

''چل چل، جلدی چل صاحب ناراض نہ ہو جائے''۔

دونوں سارا دن کوڑا کرکٹ صاف کرتے رہے۔ دوپہر میں کھانا آیا ملازمہ لے آئی۔ اس کی ٹٹولتی نظریں حویلی کے کھلے دروازے کو تکتی رہیں۔ شاید پھاگنی نظر آ جائے مگر پھاگنی کو نہ آنا تھا نہ آئی۔

صبح کی طرح شام بھی اندھیری ہی رہی۔ تھکن سے چور! جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ شاید پھاگنی کی ایک جھلک اُسے سکون دے جاتی۔ نیند نہ آنی تھی نہ آئی۔ بابا خراٹے لے رہا تھا۔ اماں کی کھانسی بھی خاموشی توڑ دیتی۔

وہ دھیرے سے اُٹھا دروازے کی کنڈی کھولی۔

''کون ہے؟'' اماں کی آواز آئی۔

''میں ہوں اماں۔'' اس نے تسلی دی۔

''کہاں جا رہا ہے' نیند نہیں آ رہی کیا؟''

''بس اماں' باہر ہو کر آیا۔'' وہ تیر کی طرح نکلا۔

''جلدی آئیو۔ کنڈی لگا کر جائیو! دھیان سے۔'' اماں کی آواز دھیمی ہوتی گئی۔

حویلی کے سناٹوں میں ایک کھڑی مردانی آواز اُبھری۔

''پھاگنی! پھاگنی! کہاں ہو؟''

وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ سوریہ کیا یہ وہی ہے۔ کیا اُس نے میرے دل کی آواز سن لی۔ کہیں میرے کانوں کا دھوکہ تو نہیں! کیا میں حواس میں ہوں؟'' اُس نے اپنی چیونٹی کاٹی۔ ''سی'' درد تو ہو رہا ہے۔

وہ تیزی سے آواز کی طرف لپکی۔ اندھیرے میں اس کے سفید موتی ایسے دانت ہی نظر آرہے تھے۔ ''سوریہ کیا تم ہو؟'' اُس نے خود کو یقین دلانے کے لیے پوچھا۔

''ہاں پھاگنی میں ہی ہوں۔'' وہ رونے کو تھا۔

''تم صبح مندر کیوں نہیں آئیں؟'' بس آوازیں ایک دوسرے کو محسوس کر رہی تھیں۔ ہلدی۔ ابٹن اور مہندی کی خوشبو نے اس کے پورے حواس جگادیے۔ وہ کھڑکی کے اُس پار کھڑی تھی۔

''کل میرا شگن آئے گا۔ باہر کیسے آتی'' وہ مشکل سے بول پائی۔ کبھی کوئی وعدہ نہیں کیا نہ عہدو پیمان باندھے نہ اقرار کیا پھر یہ آواز میں لڑکھڑاہٹ کیوں تھی!

''تم بیاہ کرو گی؟'' اس کی آواز میں کئی سوال تھے!

''اور کیا کروں؟'' کئی سسکیاں ایک ساتھ اُبھریں۔

''تم چلی جاؤ گی۔'' پھر میں کیسے دیکھوں گا؟'' تم مت جاؤ پھاگنی!'' وہ رونے کو تھا۔

''تم جاؤ کسی نے دیکھ لیا تو مشکل ہو جائے گی۔'' شاید وہ ہوش میں آئی۔

''اوپر کون ہے؟'' نیچے سے کرخت آواز گونجی۔

''سوریہ! بھاگ جاؤ۔'' وہ دبی دبی آواز میں

چند باتیں اپنانے کی

آپ دنیا پر نظر ڈالیں، دنیا کے غموں کا سرسری جائزہ لیں آپ کو اپنے غم بہت چھوٹے لگیں گے اور تب آپ کو خداوند کریم کا شکر ادا کرنے کا موقع ملے گا جسے آپ دیانت داری کے ساتھ ادا کریں گے۔ دکھ جتنے بھی بڑے، گہرے کیوں نہ ہوں اگر آپ ثابت قدمی کے ساتھ صبر سے کام لیں گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کے یہاں انعام ہے۔ کچھ لوگ اپنے اطراف میں بسنے والوں پر ہمیشہ طنز کے تیر چلاتے رہتے ہیں ان کے پاس بیٹھ کر اکثر سامنے والوں کو پچھتاوہ ہوتا ہے لیکن سوچیں اگر آپ ان کو بہتر کمپنی نہیں دیں گے تو ان کی یہ عادت جڑ پکڑ جائے گی اور ممکن ہے کسی دن شرمندگی بھی اٹھانی پڑے تو بہتر ہے ابھی ان لوگوں کو صحیح سمت کی پہچان کرائیں۔ وقت آپ کو کئی سبق دے رہا ہے، مشاہدوں سے سبق سیکھ کر خود کو آنے والے وقت کے لیے پہلے تیار کرلیں گے تو زندگی آسان ہو جائے گی۔

وقت

وقت ایک ایسا بادشاہ ہے جو نہ کسی وزیر کی سنتا ہے اور نہ کسی مشیر کی یہ تو صرف بھاگتا چلا جاتا ہے، وقت ہاتھ میں سے ریت کی طرح پھسلتا جاتا ہے ہمیں احساس تب ہوتا ہے جب ہم خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں تب ہمارے پاس پچھتاوؤں کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور ہم خود کو بے بس جان کر اندھیروں کے سپرد کردیتے ہیں۔ وقت ایک ایسا آسیب ہے اگر ہم اسے سینت سینت کر رکھیں گے تو موتی عطا کرے گا ورنہ ہمیشہ خالی ہاتھ رہیں گے۔ وقت کی قدر کرنے والے اپنی منزل پالیتے ہیں جبکہ وقت کی قدر نہ کرنے والوں کے مقدر میں ہمیشہ کے لیے اندھیرے لکھ دیئے جاتے ہیں۔ وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا وقت کو ضائع مت کیجیے ورنہ وقت آپ کو ضائع کرے گا۔

سید اعجاز علی......ساہیوال

چیخی۔

"چور...... چور۔" حویلی سے شور اُٹھا۔وہ دھڑام سے گرا۔

"ارے یہ تو سوریہ ہے' حرام خور کیا کر رہا تھا یہاں؟"

زمیندار نے اُسے جوتوں کی نوک پر رکھ لیا۔

"اتنا مارو کہ مرجائے گندی نالی کا کیڑا۔اس کی یہ ہمت۔" زمیندار کا غصہ آپے سے باہر تھا۔ سوریہ کا روزانہ تکنا اُسے اب سمجھ میں آگیا۔

لوگوں نے سمجھا وہ مرگیا۔ ندی کے کنارے پھینک آئے۔

زمیندار نے اعلان کیا۔ پھالگنی کا بیاہ آج ہی ہوگا۔ وہ نہیں چاہتے تھے اس واقعہ کی خبر پھیلے اور پھالگنی کا بیاہ ٹوٹ جائے اور ان کی پگڑی اُچھالی جائے۔عنقریب پنچایت کے الیکشن ہونے والے تھے۔

مندر میں پھیرے لیتی پھالگنی نے ایک ہی دعا مانگی۔

"بھگوان' میری ساری عمر' میری ساری خوشیاں اور میرے سارے سپنے سوریہ کو دے دینا' مجھے کچھ بھی نہ دینا۔اس کے سارے غم مجھے دے دینا۔ بھگوان!" وہ سسک سسک کر پیا گھر چلی گئی۔

باپ کی عزت اور پگڑی جذبات سے بڑی ہوتی ہے۔ایک اور بیٹی بلی چڑھ گئی۔

......☆☆☆......

وقت نے کروٹ بدلی۔

زمینداری نہ رہی' شاید بھگوان نے اس کی سن لی تھی۔اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا' نہ وشنو تھا' نہ زمیندار سسر، نہ باپ، نہ حویلی بس دو ایکڑ کی زمین رہ گئی تھی' جس پر پنچایت کا صدر دانت گاڑے بیٹھا تھا۔سب کچھ تو چھن چکا تھا۔بس یہ دو ایکڑ زمین رہ گئی تھی۔

جو باپ نے مرتے وقت اُس کے نام کی تھی۔ کاغذات تھے۔وہ ضلع کلکٹر کے دفتر کے سامنے کھڑی تھی۔سوتی ساڑی میں ملبوس، بالوں کا جوڑا باندھے۔ویران آنکھیں اور سونی مانگ لیے۔ اُسے پنچایت کے صدر کے خلاف شکایت کرنی تھی۔وہ اس کے ماتحت سے بحث کررہی تھی۔اور وہ اُسے جھڑک رہا تھا۔ D.C. سوریہ وشنی کی کار رکی۔کار کے شیشے میں ایک شبیہ اُبھری۔

"کیا یہ وہی ہے' یہ میری آنکھوں کا دھوکہ تو نہیں؟"

"کیا یہی پھالگنی ہے' کیا یہ میری پھالگنی ہے؟" اس کے کئی رنگین عکس مختلف زاویوں سے ذہن میں اُبھرے۔

"گاڑی آفس کے پچھلے دروازے کی طرف لو۔" اس کی بھرائی آواز اُبھری۔

وہ بڑی تیزی سے اندر داخل ہوا۔دھم سے کرسی پر گرا۔اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔"یہ پھالگنی تو نہیں ہو سکتی۔" وہ ریشم اور کم خواب پہننے والی پھالگنی اس طرح! اُسے کسی طرح یقین نہیں آرہا تھا۔

اُس نے بیل بجائی۔ملازم نمودار ہوا۔

"A.C. شندے کو بھیجو۔" اُس نے اپنی آواز پر مشکل سے قابو پاتے ہوئے کہا۔

"یس سر۔" شندے سامنے کھڑا تھا۔

"باہر کھڑی عورت کون ہے کیا چاہتی ہے؟"

"صاحب! وہ پھالگنی کلکرنی ہے۔کبھی اس کا باپ گاؤں کا زمیندار ہوا کرتا تھا۔وہاں کی پنچایت کے صدر نے ساری زمین خریدلی ہے۔دو ایکڑ

زمین رہ گئی ہے اور اُس پر بھی وہ قبضہ مار چکا ہے۔ یہ ہے کہ دینے کو تیار نہیں۔ اچھے خاصے پیسے بھی دے رہا ہے۔'' وہ کاروباری زبان بول رہا تھا۔ گویا قصور پھالگنی کا تھا۔

''کیوں دے اس کی زمین ہے۔ کسی کے باپ کا راج ہے کیا؟'' وہ چیخ رہا تھا۔

''صاحب! آپ کیوں غصہ ہو رہے ہیں؟'' شندے حیرت میں تھا۔ اتنے ٹھنڈے مزاج کے صاحب آج اچانک غصہ' سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''تم ایک کام کرو۔ فون کر کے اُس پنچایت کے صدر کو بلالو۔'' اُس نے حکم دیا۔

''جی صاحب!'' ایک نمک خوار کی نمک حلالی خطرے میں پڑ رہی تھی۔ اُس عورت پر شندے کو شدت سے غصہ آیا۔ ''اچھی خاصی سیٹنگ تھی۔ جانے یہ کہاں سے منہ اٹھائے چلی آئی۔ دو کوڑی کی عورت۔'' وہ بڑبڑاتا باہر نکل گیا۔

وہی صبح تھی' وہی انتظار' وہی مندر وہی ندی کا پاٹ۔

مگر وقت بدل گیا تھا۔

کردار وہی تھے۔ حالات بدل گئے تھے علی الصبح وہ بغیر ڈرائیور کے خود اپنی کار چلاتے ہوئے نکل چکا تھا۔ دل بے قابو دھڑک رہا تھا۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ اُسے بس دیکھنا مقصود تھا۔ تیس سال کے بعد وہ اپنے گاؤں واپس آ رہا تھا۔ وہ اپنے کھیتوں میں کام کر رہی تھی۔ دو لڑکیاں اس کے ساتھ تھیں۔ ایک شاید پندرہ کے آس پاس تھی۔ ایک بارہ کے آس پاس بڑی لڑکی ہو بہو پھالگنی تھی' جو ساتھ کھڑی تھی۔ دوسری کا رنگ ذرا دب رہا تھا۔ پہلی نظر میں وہ چکرا گیا۔ کیا یہ پھالگنی ہے۔ میری پھالگنی۔ جانے نہ جذبے کیسے ہیں۔ کوئی اپنا مانے نہ مانے' کوئی بندھن ہو نہ ہو۔ دل جسے اپنا لگے وہ بس اپنا ہی لگتا ہے۔ بھلے کسی کی قید میں کیوں نہ ہو۔

مگر پھالگنی! اس کی دمکتی مانگ سونی کیوں تھی۔ وہ ایسے کپڑوں میں کیوں تھی۔ اس کے ڈھیر سارے زیورات، اس کے کپڑے۔ اس کی بکھی! ڈھیر سارے سوالات۔

کار رکی۔ وہ بڑی بے تابی سے اترا اور کھیتوں میں دوڑ لگائی۔ ایک لمحے کے لیے وہ بھول گیا کہ وہ D.C سوریہ ونشی ہے۔

وہ وہی سوریہ تھا۔ کالا کلوٹا۔ بس سلیقے کے سوٹ میں تھا اور اس کا عہدہ جھاڑو والے سے D.C. میں تبدیل ہو چکا تھا مگر کمبخت دل وہی تھا جذبے وہی تھے، کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔

''پھالگنی!'' اس نے بڑی بے تابی سے پکارا۔

لمحے کے ہزارویں سیکنڈ سے پہلے وہ پلٹی۔ پورے حواس کان بن گئے۔ کیا یہ وہی آواز ہے سالوں پہلے جو اُس نے صرف ایک مرتبہ سنی تھی۔

ہاں وہ وہی تھا۔ کسرتی بدن، چوڑا سینہ۔ سلونی رنگت، سلیقے سے سنوارے بال۔ قیمتی سوٹ۔ اتنی لمبی سی گاڑی۔ بڑے سلیقے سے پر وقار انداز میں چلتا وہ اس کی طرف آ رہا تھا۔

کمر میں اُڑسی ساڑی کے پلو کو اُس نے سلیقے سے سر پر اوڑھا اور ہاتھ میکانکی انداز میں جڑ گئے۔

''نمستے صاحب!'' گاڑی کا بورڈ اُس نے پڑھ لیا تھا۔

''آپ یہاں .D.C صاحب؟'' لہجہ اجنبی ہو گیا۔ وہ اس کی پہچان ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''میں سوریہ ہوں پھالگنی۔'' وہ دانت چبا کر دھیرے سے بولا اس کے اجنبی لہجہ پر اُسے جھلاہٹ

ہو رہی تھی۔

"صاحب! مجھے معلوم ہے! آپ سوریہ ونشی ہو۔"

یہ دونوں میری بیٹیاں ہیں صاحب ان کا باپ مرگیا ہے۔ یہ تھوڑی سی زمین رہ گئی ہے جو ہمارا آخری سہارا ہے۔ پنچایت کا ادھیکش اسے بھی ہتھانا چاہتا ہے۔ میں اسی کی شکایت لے کر آپ کے دفتر گئی تھی۔ صاحب' وہ آپ کا افسر میری نہیں مان رہا۔ میں خود آج آنے والی تھی۔" وہ بڑے انکسار اور بڑی تفصیل سے بولی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، دھول اُڑاتی گاڑیاں اور لوگوں کی ایک بھیڑ اکٹھا ہو چکی تھی۔ شاید گاؤں میں ڈی سی کی آمد سے ہنگامہ مچ گیا تھا۔ پنچایت کا صدر ہانپتا ہانپتا قریب آیا۔

"صاحب! میں آج آنے ہی والا تھا آپ نے کیوں کشٹ کیا۔"

"دو حکم دیں صاحب!" وہ ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

"میں نے سنا ہے تم اس کی زمین ہڑپ رہے ہو' شرم نہیں آتی؟ بے بس عورتوں پر ظلم کرتے ہو۔"

"صاحب میں قیمت دینے کو تیار ہوں!"

"کاہے کی قیمت' اس کی زمین کی قیمت تم دو گے؟ تم دو کوڑی کے آدمی! جانتے بھی ہو یہ کون ہے؟" اس کی آواز میں غصے کی شدت تھی۔

صاحب! یہ تیس سال پہلے زمیندار کی بیٹی تھی۔ اب تو یہ اکیلی ہے' صاحب میں اسے پیسے دینے کو تیار ہوں' یہ راجی (راضی) ہی نہیں ہوتی۔"

"وہ نہیں بیچنا چاہتی تو تمہاری زبردستی ہے' خبردار اس سے دور رہو۔ ورنہ منہ کی کھاؤ گے۔"

"جی جو حکم صاحب!" پنچایت صدر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"تم لوگ چلو سب میں آفس آتا ہوں' دیکھیں تم نے پنچایت میں کیا راج مچا رکھا ہے۔" وہ غرایا۔

"جی صاحب!" سب پیچھے ہٹ گئے۔

"اور تم پھالگنی کلکرنی' کل میرے دفتر آ جانا۔" اُس نے تاکید میں اُنگلی اُٹھائی اور بھاری قدم اُٹھاتا چل دیا۔

"تم نے مجھ سے ملنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟" وہ مجسم سوال تھا۔

"جی صاحب! مجھے نہیں پتہ تھا' آپ کہاں ہو؟" وہ دبے لہجے میں بول رہی تھی۔

"وشنو کو کیا ہوا تھا؟"

"شراب اُسے پی گئی صاحب' خون تھوکتا مرگیا۔ شراب میں ساری زمین بھی بیچ دی۔"

"اور بابا؟" اس کا سوال باقی تھا۔

"بابا الیکشن ہار گئے۔ الیکشن میں زمینیں بک گئیں اور بابا ہار برداشت نہیں سکے۔ زمینوں سے زیادہ ان کو اپنی ہار کا بہت دکھ تھا پھر وہ بھی چلے گئے۔ پیچھے اماں بھی سدھار گئیں۔ جب تک بابا تھے سب دبے رہتے پھر ایک ایک چیز بک گئی اور اب یہ زمین بھی......" اس کی آواز بھر آ گئی۔

"زمین کو کچھ نہیں ہوگا۔ تم بیٹھتی کیوں نہیں' کب تک کھڑی رہو گی؟" وہ جھلایا آج بھی اُس کے سامنے وہ خود کو کمزور محسوس کر رہا تھا۔

"نہیں صاحب! رہنے دو۔ گاؤں میں لڑکیاں اکیلی ہیں مجھے جانا ہے۔"

"میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ تم چاہو تو ......" وہ آگے بول نہ سکا۔

"نہیں صاحب! ہمارے جذبے سچے تھے' خواب کچے تھے حقیقت بن نہ سکے۔ کل میرا رُتبہ بڑا تھا۔ آج آپ کا رُتبہ بڑا ہے۔ یہ دیوار نہ آپ توڑ

یمن کے بادشاہ کی حاتم طائی سے دشمنی

مجھے یہ یاد نہیں یہ حکایت مجھ سے کس نے کہی۔ یمن میں ایک دولت مند بادشاہ تھا اس کو بخشش کا بادل کہا جاتا تھا اس لیے کہ اس کے ہاتھ درہم کی بارش برساتے تھے۔ کوئی آدمی اس کے سامنے حاتم کا نام لیتا تو بہت غصہ ہو جاتا کہ اس کی باتیں کیا حقیقت رکھتی ہیں جس کے پاس نہ ملک ہے نہ حکم ہے اور نہ خزانہ ہے۔ ایک مرتبہ بھری محفل میں اس نے لوگوں سے حاتم کی تعریف سنی تو حسد نے دشمنی پر آمادہ کر دیا۔ ایک شخص کو حاتم کے قتل پر مقرر کیا کہ جب تک یہ میرے زمانہ میں ہے میرا نیک نام مشہور نہیں ہوگا۔ اس بدبخت نے اس مشہور سخی کو قتل کے ارادہ سے بنی طے کا راستہ لیا۔ راستہ میں ایک نوجوان نے اس کا استقبال کیا جس سے اس کو محبت کی بو آئی خوب صورت عقل مند شیریں زبان۔ وہ اس رات اس کو اپنے گھر مہمان بنا کر لے گیا۔ مہمان کے ساتھ شرافت برتی، غم خواری کی اور خدمت میں کوتاہی کی معافی چاہی نیکی سے اس دشمن کا دل جیت لیا۔ صبح کو اس کے ہاتھ پیر پر بوسے دیئے اور کہا: ہمارے پاس چند روز اور ٹھہر جاؤ۔ یمن والے نے کہا: میں اب رک نہیں سکتا اس لیے کہ مجھے ایک بڑا کام کرنا ہے۔ میزبان نے کہا: اگر آپ بتائیں تو میں ایک دوست کی طرح پوری کوشش کروں گا۔ اس نے کہا: اے بہادر! دھیان سے سن اس لیے کہ بہادر پردہ پوش ہوتے ہیں۔ اس علاقہ میں شاید آپ حاتم کو جانتے ہوں گے جو مبارک نام نیک سیرت ہے اس کا سر یمن کے بادشاہ نے مانگا ہے مجھے معلوم نہیں کہ ان کی کیا دشمنی ہے۔ آپ کی مہربانی سے مجھ کو یہ امید ہے کہ اس کی جگہ جہاں وہ رہتا ہے مجھے بتا دیں۔

نوجوان میزبان ہنسا کہ حاتم تو میں ہی ہوں سر حاضر ہے تلوار اٹھا اور تن سے جدا کر لے۔ ابھی رات کا وقت ہے اپنا کام پورا کر لے ورنہ پھر صبح ہونے کے بعد تجھے کوئی نقصان پہنچے یا تو نا امید ہو۔ جب حاتم نے دل کھول کر اپنا سر پیش کر دیا تو وہ شخص چیخ پڑا زمین پر گر گیا اور اٹھا کبھی زمین چومی کبھی حاتم کے ہاتھ پیر چومے تلوار پھینک دی اور ترکش رکھ دی پھر غلاموں کی طرح باادب سامنے بیٹھ گیا اور کہا: اگر میں تیرے جسم پر ایک پھول بھی ماروں تو میں مرد نہیں ہوں بلکہ مردوں کی اصطلاح میں عورت ہوں اس کی دونوں آنکھیں چومیں اور بغلگیر ہوا اور وہاں سے یمن کی طرف روانہ ہو گیا۔

بادشاہ اس کی پیشانی سے سمجھ گیا کہ اس نے کام نہیں کیا ہے پوچھا کیا خبر ہے؟ شکار دان میں سر کیوں نہیں باندھا شاید حاتم نے تجھ پر حملہ کر دیا اور تو مقابلہ نہیں کر سکا چالاک بہادر نے زمین کو بوسہ دیا بادشاہ کی تعریف کی اور آداب بجا لایا پھر کہا: اے بخشش اور ہوش والے بادشاہ! حاتم کے بارے میں یہ خبر سن میں نے اس کو ہنر مند بہادر اور خوش اخلاق دیکھا اس کی مہربانی نے میری کمر توڑ دی احسان اور بڑائی کی تلوار سے اس نے مجھے مار ڈالا اس نے اس کے جو اخلاق دیکھے تھے بتائے بادشاہ نے قبیلہ طے والوں کی تعریف کی قاصد کو انعام دیا کہ سخاوت حاتم کے نام پر ختم ہو گئی اس کی حقیقت اور شہرت ساتھ ساتھ ہیں اگر لوگ اس کی تعریف کریں تو وہ اس کا بالکل حق دار ہے۔

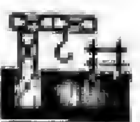
محمد حذیفہ پیرزادہ ...... ناظم آباد کراچی

سکتے ہیں نہ میں۔'' اُس کے لہجے میں ٹھہراؤ اور سختی تھی۔

''آج کے بعد آپ مجھے کبھی نہیں دیکھیں گے۔ اپنی زندگی میں آگے بڑھ جائیں ماضی میں لوٹنے کی کوشش نہ کریں۔'' وہ بڑے تاکیدی اور حتمی انداز میں بولی۔

وہ تیزی سے مُڑی متانت سے چلتی ہوئی اُس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور وہ اس کے پیچھے بند دروازے کو تکتا رہ گیا۔

وہ جو اُس کی زندگی کی بہار تھی جا چکی تھی۔ ساری بہاریں ہمیشہ کے لیے اُسے سونپ کر۔



یمن کے بادشاہ کی حاتم طائی سے دشمنی

مجھے یہ یاد نہیں یہ حکایت مجھ سے کس نے کہی یمن میں ایک دولت مند بادشاہ تھا' اس کو بخشش کا بادل کہا جاتا تھا اس لیے کہ اس کے ہاتھ درہم کی بارش برساتے تھے۔ کوئی آدمی اس کے سامنے حاتم کا نام لیتا تو بہت غصہ ہو جاتا کہ اس کی باتیں کیا حقیقت رکھتی ہیں' جس کے پاس نہ ملک ہے نہ حکم ہے اور نہ خزانہ ہے۔ ایک مرتبہ بھری محفل میں اس نے لوگوں سے حاتم کی تعریف سنی تو حسد نے دشمنی پر آمادہ کر دیا۔ ایک شخص کو حاتم کے قتل پر مقرر کیا کہ جب تک یہ میرے زمانہ میں ہے میرا نیک نام مشہور نہیں ہو گا۔ اس بدبخت نے اس مشہور سخی کو قتل کے ارادہ سے بنی طے کا راستہ لیا۔ راستہ میں ایک نوجوان نے اس کا استقبال کیا جس سے اس کو محبت کی بو آئی' خوب صورت عقل مند شیریں زبان۔ وہ اس رات اس کو اپنے گھر مہمان بنا کر لے گیا۔ مہمان کے ساتھ شرافت برتی' غم خواری کی اور خدمت میں کوتاہی کی معافی چاہی' نیکی سے اس دشمن کا دل جیت لیا۔ صبح کو اس کے ہاتھ پیر پر بوسے دیئے اور کہا: ہمارے پاس چند روز اور ٹھہر جاؤ۔ یمن والے نے کہا: میں اب رک نہیں سکتا اس لیے کہ مجھے ایک بڑا کام کرنا ہے۔ میزبان نے کہا: اگر آپ بتائیں تو میں ایک دوست کی طرح پوری کوشش کروں گا۔ اس نے کہا: اے بہادر! دھیان سے سن اس لیے کہ بہادر پردہ پوش ہوتے ہیں۔ اس علاقہ میں شاید آپ حاتم کو جانتے ہوں گے جو مبارک نام نیک سیرت ہے' اس کا سر یمن کے بادشاہ نے مانگا ہے' مجھے معلوم نہیں کہ ان کی کیا دشمنی ہے۔ آپ کی مہربانی سے مجھ کو یہ امید ہے کہ اس کی جگہ جہاں وہ رہتا ہے مجھے بتا دیں۔

نوجوان میزبان ہنسا کہ حاتم تو میں ہی ہوں' سر حاضر ہے' تلوار اٹھا اور تن سے جدا کر لے۔ ابھی رات کا وقت ہے اپنا کام پورا کر لے ورنہ پھر صبح ہونے کے بعد تجھے کوئی نقصان پہنچے یا تو ناامید ہو۔ جب حاتم نے دل کھول کر اپنا سر پیش کر دیا تو وہ شخص چیخ پڑا' زمین پر گر گیا اور اٹھا' کبھی زمین چومی' کبھی حاتم کے ہاتھ پیر چومے' تلوار پھینک دی اور ترکش رکھ دی پھر غلاموں کی طرح باادب سامنے بیٹھ گیا اور کہا: اگر میں تیرے جسم پر ایک پھول بھی ماروں تو میں مرد نہیں ہوں بلکہ مردوں کی اصطلاح میں عورت ہوں' اس کی دونوں آنکھیں چومیں اور بغل گیر ہوا اور وہاں سے یمن کی طرف روانہ ہو گیا۔

بادشاہ اس کی پیشانی سے سمجھ گیا کہ اس نے کام نہیں کیا ہے پوچھا کیا خبر ہے؟ شکار دان میں سر کیوں نہیں باندھا شاید حاتم نے تجھ پر حملہ کر دیا اور تو مقابلہ نہیں کر سکا' چالاک بہادر نے زمین کو بوسہ دیا بادشاہ کی تعریف کی اور آداب بجا لایا پھر کہا: اے بخشش اور ہوش والے بادشاہ! حاتم کے بارے میں یہ خبر سن' میں نے اس کو ہنر مند بہادر اور خوش اخلاق دیکھا اس کی مہربانی نے میری کمر توڑ دی' احسان اور بڑائی کی تلوار سے اس نے مجھے مار ڈالا' اس نے اس کے جو اخلاق دیکھے تھے بتائے' بادشاہ نے قبیلہ طے والوں کی تعریف کی' قاصد کو انعام دیا کہ سخاوت حاتم کے نام پر ختم ہو گئی' اس کی حقیقت اور شہرت ساتھ ساتھ ہیں اگر لوگ اس کی تعریف کریں تو وہ اس کا بالکل حق دار ہے۔

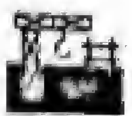
محمد حذیفہ پیرزادہ......ناظم آباد' کراچی

سکتے ہیں نہ میں۔" اُس کے لہجے میں ٹھہراؤ اور سختی تھی۔

"آج کے بعد آپ مجھے کبھی نہیں دیکھیں گے۔ اپنی زندگی میں آگے بڑھ جائیں ماضی میں لوٹنے کی کوشش نہ کریں۔" وہ بڑے تاکیدی اور حتمی انداز میں بولی۔

وہ تیزی سے مُڑی متانت سے چلتی ہوئی اُس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور وہ اس کے پیچھے بند دروازے کو تکتا رہ گیا۔

وہ جو اُس کی زندگی کی بہار تھی جا چکی تھی۔ ساری بہاریں ہمیشہ کے لیے اُسے سونپ کر۔



قسط نمبر 2

روپ بہروپ

محمد سلیم اختر

اس دنیا میں لوگوں کے کئی روپ ہوتے ہیں' ہر روپ دوسرے سے جدا اور نرالا ہوتا ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے دنیا کو جان لیا ہے' سمجھ لیا ہے' جو بھی دنیا کے روپ کو سمجھنے کا دعویٰ کرتا ہے اس کے سامنے ایک نیا بہروپ سامنے آجاتا ہے۔

اس رنگ بدلتی دنیا کا احوال' نئے افق کے کنہ مشق لکھاری محمد سلیم اختر کے قلم سے ایک طویل ناول۔



اس لڑکی کی آبرو بچا کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ بے شک تقدیر نے مجھے غلط راستوں پر ڈال دیا تھا لیکن شاید میری رگوں میں کوئی شریف خون تھا کہ میں کسی کی عزت کو داغ دار نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' میں نے سوال کیا۔

''رام وتی۔'' وہ بولی۔

''کہاں رہتی ہو؟''

''لکھن پور' ہمارے گاؤں کا نام لکھن پور ہے۔''

مجھے لکھن پور کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا لیکن میں خاموش ہو گیا' راستہ طے کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ فی الحال اسے چاچی کے پاس ہی لے جایا جاسکتا ہے۔ چاچی خود حیران رہ جائے گی کہ میں اتنی جلدی واپس کیسے آ گیا' ایک اور بات سوچی تھی میں نے' وہ یہ کہ بھیروں نے مجھے دو قوتیں دی تھیں اور چھ وچن دیئے تھے جن میں سے دو تو میری نا تجربے کاری کی بناء پر فوراً ہی پورے ہو گئے تھے۔ پہلے تو مجھے کوئی یقین نہیں تھا کہ ایسا کوئی عمل ہو سکتا ہے لیکن جو کیفیت میں نے دیکھی تھی اس سے پتہ چل گیا تھا کہ بات سچ ہے۔ چاچی' سیوک رام اور اس بابا کی عقیدت مند تھی لیکن یہ اندازہ مجھے بھی ہو چکا تھا کہ وہ کوئی اچھی عورت نہیں ہے' خیر مجھے اس سے کوئی غرض نہیں اس لڑکی کے بارے میں مجھے سوچنا تھا کہ اس کے لیے کیا کیا جائے' پتہ نہیں کیا حالات تھے' بات وہی ہے میں تو ایک بے مقصد زندگی گزار رہا تھا جس کا کوئی مقصد نہیں تھا' اب اگر یہ چھوٹے موٹے کام کر لیتا ہوں تو یہ تو میرے لیے خوش بختی کی بات ہے چنانچہ فاصلے طے ہو گئے اور میں چاچی کے گھر پہنچ گیا' چاچی گھر میں ہی تھی' مجھے دیکھ کر دنگ رہ گئی' پہلے تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا' پھر بولی۔

''ارے تو...... تو واپس آ گیا۔''

''کیوں چچی جان' کیا تمہیں یقین نہیں تھا کہ میں زندہ واپس آؤں گا۔''

چچی ایک دم گھبرا گئی' کہنے لگی۔ ''ارے نہیں جہانو مجھے پتہ تھا پر یہ بتا کہ وہاں پیر دولہا میاں نے تیرے لیے کیا کیا؟''

''جو کچھ بھی کیا چاچی ٹھیک نہیں تھا' لیکن کبھی کبھی بہت سی باتیں خود بخود ٹھیک ہو جاتی ہیں۔''

''یہ کون ہے' کیا تو نے شادی کر لی؟''

''ارے نہیں چاچی اس لڑکی نے مجھے بھائی کہا ہے اور میں نے اپنی بہن' بہن بھائی' بہن بھائی ہی ہوتے ہیں۔''

''کہاں سے لے آیا ہے اسے؟''

''بس مل گئی راستے میں' لکھن پور کی رہنے والی ہے' اسے آرام کرنے کی جگہ دو چاچی' بعد میں سوچیں گے اس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔''

''آرام ہی آرام ہے یہاں' یہاں کونسے پہاڑ کھودنے پڑیں گے۔'' چاچی نے کسی قدر بُرے لہجے میں کہا مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی' غرضیکہ رام وتی کو رہنے کی جگہ دے دی گئی' کھانے پینے کے لیے اس سے پوچھا گیا کہ کیا وہ مسلمان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھائے گی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' کہنے لگی۔

''بھیا بنے ہو نا میرے' مسلمان ہو کہ ہندو اب یہ بھلا کیا سوچوں گی بھوکی ہوں' پتہ نہیں کب سے پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھایا' جو کچھ دو گے کھا لوں گی' اگر ہو سکے تو ماس مت دینا۔''

''کیا پکا ہے چاچی؟'' میں نے سوال کیا۔

''سبزی ہے' روٹیاں پکانی پڑیں گی۔''

''تو پھر پکاؤ نا۔ کیا چاہیے تمہیں؟''

''ارے ہمیں کوئی کیا دے گا' زندگی بھوکے مرنے کے لیے ہے' وہ مسٹنڈا جب تک خصم رہا کچھ

نہ کر کے دیا اب چلا گیا ہے دنیا سے تو بس ٹھوکریں ہی ٹھوکریں ہیں۔''

میں مسکرا دیا میں نے کہا: ''نہیں چاچی فکر مت کرو میں جو ہوں، میں تمہیں بھلا ٹھوکریں کھانے دوں گا۔'' میں نے کہا اور چاچی منہ ٹیڑھا کر کے چلی گئی جیسے اسے ذرا بھی یقین نہ ہو کہ میں اسے کچھ دوں گا' البتہ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے پوچھنا چاہتی ہے کہ میں نے کچھ سیکھا یا نہیں' مگر یہ اسے بتانے کی بات نہیں تھی۔ ایک بات میں دل سے مانتا تھا کہ مجھ پر یہاں احسان کیا گیا تھا اور اس احسان کا بدلہ دیئے بغیر میں نہیں رہ سکتا تھا۔

خیر چاچی نے رام وتی کو کھانے کے لیے کیا دیا اور کیسے دیا؟ میرے لیے بھی روٹیاں اور سبزی آ گئی تھی میں نے رام وتی سے کچھ نہ پوچھا۔ البتہ دل میں یہ سوچا کہ رام وتی کو لکھن پور پہنچا دیا جائے اس کے بعد دیکھوں گا کہ خود مجھے کہاں جانا ہے' چنانچہ میں کھانے پینے کے بعد آرام سے سو گیا اور دوسری صبح اس وقت جاگا جب رام وتی میری پائنتی بیٹھی میرے پاؤں ہلا رہی تھی۔

''بھیا جی' سورج چڑھ چکا ہے اُٹھو گے نہیں کیا؟''

پتہ نہیں کیوں مجھے اس کا اس طرح اٹھانا اچھا لگا تھا۔

''بھیا' چاچی بڑی دیالو ہے' اس نے بڑا اچھا سلوک کیا ہے میرے ساتھ۔ چائے اور روٹی لے کر آئی میرے لیے تو میں نے کہا کہ پہلے میرے بھیا کھالیں پھر میں کھاؤں گی۔''

میں پھیکے سے انداز میں ہنس دیا تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی پھر بولی ''ہنسے کیوں بھیا جی؟''

''نہیں کوئی بات نہیں' میں ذرا منہ ہاتھ دھولوں۔''

''ایسے نہیں جانے دوں گی پہلے بتاؤ ہنسے کیوں تھے' میں نے کوئی ایسی بات کہہ دی۔''

''ہاں تو نے ایسی ہی بات کہہ دی۔''

''کیا؟'' اس کا چہرہ اتر گیا۔

''کتنے دن میرے ساتھ رہے گی اور رام وتی' لکھن پور چلی جائے گی اپنے ماتا پتا کے پاس اور اس کے بعد میں کہیں اور چلا جاؤں گا کیا سمجھی' کیسا بھیا اور کیسی بہن؟''

رام وتی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھے اور پھر واپسی کے لیے مڑ گئی' مجھے یوں لگا جیسے میری باتوں نے اسے دکھ دیا ہو لیکن کیا کرتا میری تو ساری زندگی زخم کی طرح گزری تھی' میرے دل پر جتنے زخم تھے اتنے کسی اور انسان کے دل پر نہیں ہوں گے' چاچی نے ناشتہ تیار کر دیا تھا لیکن اس کا منہ پھولا ہوا ہی تھا جیسے اسے میری یہاں موجودگی پسند نہ ہو۔ البتہ ناشتے وغیرہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ایک سنسان سی جگہ جا کر میں نے بھیروں کو آواز دی تو ایک لمحے کے اندر وہ حاضر ہو گیا۔

''یار بھیروں مجھے بتا تا رہ کہ میرے کتنے وچن ختم ہو گئے؟''

بھیروں نے سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بولا' ''مجھے کیوں بلایا ہے؟''

''تو نے کہا تھا نا کہ جس کے ہاتھ میں یہ کڑا ہو گا وہ میرا غلام ہو گا؟''

''تو ہوں تو سہی غلام اور کونسی غلامی کرنی ہے مجھے بتا دو۔''

''یار مجھے کچھ رقم چاہیے' اچھی خاصی رقم ہو' بڑی ضرورت ہے اس کی۔''

''لاتا ہوں۔'' بھیروں نے کہا اور نگاہوں سے غائب ہو گیا' تھوڑی دیر کے بعد میرے سامنے نوٹوں

کے انبار لگ گئے اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگا۔ پتہ نہیں میرے وجود میں کیسی سنسناہٹ ہو رہی تھی' اگر میرے ایک بار کہنے سے اتنی بڑی رقم مجھے حاصل ہوسکتی ہے تو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ میں بھیروں کے ذریعے دنیا کا امیر کبیر آدمی بن سکتا ہوں۔ ایک لمحے کے اندر بہت سے منصوبے میرے دل میں آئے لیکن میں نے سوچا کہ پہلے ایک کام کر دوں اس کے بعد اس کے بارے میں سوچوں گا۔

بھیروں غائب ہوگیا تھا' میں نے نوٹ سنبھال کر ایک کپڑے میں باندھے' تھوڑے سے نوٹ اپنے لباس میں بھی ٹھونس لیے تھے کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ اب ان کی ضرورت پیش آئے گی۔ اب بار بار بھیروں سے پیسے منگوانا بہت عجیب لگتا تھا' میں نے کافی رقم اپنی جیبوں میں ٹھونس لی لیکن اس کے باوجود وہ اتنی بچی تھی کہ چاچی کیا اس کی نسلیں زندگی بھر عیش سے رہ سکتی تھیں' اس رقم کو کپڑے میں باندھنے کے بعد میں نے ایک طرف رکھ دیا' چاچی تھوڑی دیر کے بعد آئی اور بولی۔

''دیکھو جہانو! ایک بات کہوں تم سے' برا تو نہیں مانو گے؟''

''نہیں۔''

''جہانو' تجھے معلوم ہے کہ تیرا چاچا کچھ نہیں چھوڑ کر گیا تھا' روکھی سوکھی کھا کر زندگی گزارتی رہی ہوں اور آگے بھی مشکل ہی سے گزرے گی' جہانو! مجبوراً کہہ رہی ہوں تجھ سے' اب تُو چلا جا یہاں سے' اسے جہاں بھی لے جانا چاہے لے جا' میں زیادہ بوجھ برداشت نہیں کرسکتی۔''

''ارے دوپہر کا کھانا تو کھلا دے نا چاچی' اب صبح تو ناشتہ کیا ہے تھوڑا سا۔ لکھن پور پتہ نہیں کتنی دور ہے ہمیں وہاں جانا پڑے گا۔''

''کئی گھنٹے کا سفر ہے' میں جا چکی ہوں ایک بار' میری ایک سکھی تھی جس کی شادی لکھن پور میں ہوئی ہے' بس بہت پیچھے پڑی تھی کہ ایک مرتبہ وہاں چلی گئی۔ یہاں سے کئی گھنٹے کا سفر ہے لاری میں جانا پڑتا ہے۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں چاچی کچھ کھلا پلا کر بھیج' راستے بھر تجھے دعائیں دیں گے۔''

''کچھ ہو تو کھلاؤں جا کے دیکھ لے' کچھ بھی نہیں ہے۔''

''آ تو سکتا ہے' اتنا بڑا بازار بکھرا ہوا ہے۔''

''آنے کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''تو تجھے رقم میں دے دیتا ہوں۔''

''تُو...... تیرے پاس کیا ہے' نکھٹو کہیں کے چلا آیا منہ اٹھا کر اگر کچھ وقت رہ جاتا پیر دولہا میاں کے پاس تو انسان کا بچہ بن جاتا۔''

''اچھا...... وہاں انسان کے بچے بنائے جاتے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''مجھ سے بکواس مت کر۔''

''اچھا چاچی لو یہ پیسے اور سامان منگوا لو دوپہر کے کھانے کا۔'' میں نے کہا اور ہزار ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر چاچی کے سامنے رکھ دی' چاچی نے نوٹوں کو دیکھا اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر انہوں نے اس گڈی میں سے ایک نوٹ نکالا اور اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتی رہی اور پھر آہستہ سے بولی۔

''اصلی ہے۔''

''ہاں چاچی' بازار جا کر دیکھ لو۔''

''مروا مت دینا مجھے۔''

''تمہیں مروا کر مجھے کیا ملے گا چاچی؟''

''سچ مچ اصلی ہے۔''

''ہاں ہاں ہاں۔''

''پولیس تو نہیں پکڑے گی مجھے؟''

''پکڑ لے تو کوئی بات نہیں کم از کم جیل میں تمہیں کھانا تو ملے گا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تیرے منہ میں خاک' سچی بتادے' تجھے اپنے ماں باپ کی قسم۔''

اچانک ہی میری ساری خوش مزاجی رخصت ہوگئی' چاچی نے میری دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا' ماں باپ کا کوئی وجود اس دنیا میں نہیں تھا' مجھے کسی بھی طرح کی گالی دے دی جاتی لیکن کبھی میرے سامنے میرے ماں باپ کا نام نہ لیا جاتا' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''اگر تو نہیں جاننا چاہتی چاچی تو ہم لوگ چلتے ہیں۔''

''نہ نہ رے نہ مگر اتنی بڑی رقم۔''

''اور بھی ہے یہ دیکھ۔'' میں نے رومال چاچی کے سامنے کردیا' چاچی نے اسے دیکھا اور دھڑ سے نیچے گر پڑی وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی' میں نے اسے بمشکل تمام اٹھا کر پانی پلایا اور کہا۔

''کیوں؟''

''یہ...... یہ...... تو نے کہیں ڈاکہ ڈالا ہے سچی سچی بتادے' ارے باپ رے' اگر پولیس ادھر آگئی تو کیا ہوگا؟'' چاچی نے لرزتے ہوئے کہا۔

''چاچی' اب میں تجھ سے کیا کہوں' میں چلتا ہوں بھاڑ میں جا میری طرف سے اور اگر نہیں جانے دینا چاہتی تو جا یہ نوٹ لے کر بازار میں جا اور کھانے پینے کا سامان لے آ۔''

بڑی مشکل سے چاچی جانے پر راضی ہوئی تھی اور اس کے بعد وہ لدی پھندی واپس آئی۔ چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا' اس نے جلدی جلدی کھانا پکانا شروع کر دیا' لیکن بار بار مجھے دیکھ لیتی تھی' ایک دفعہ باورچی خانے سے نکل کر باہر آئی اور بولی۔

''یہ سب تو مجھے دے دے گا نا۔''

''ہاں چاچی تُو رکھ لے میں کب مانگ رہا ہوں تجھ سے۔''

''ارے مگر میں انہیں سنبھالوں گی کیسے؟ اگر ڈاکوؤں کو پتہ چل گیا تو۔''

''چاچی یہ تیرا کام ہے کہ تُو کیا چیز کیسے سنبھالے گی میری بات سن' ایسا کر کسی بکسے میں ڈال اور زمین میں گڑھا کھود کر دبا دے' تھوڑے تھوڑے کر کے نکالتی رہنا' تیرے کام آ جائیں گے۔''

''ارے اتنی بڑی رقم سے تو میں ایک پورا گھر بنوا سکتی ہوں۔''

''جو تیرا دل چاہے کرنا' میں نے کہا تھا نا کہ اب تیری زندگی بڑے سکون سے گزرے گی۔''

''اے اللہ...... میں کون سی دُعا دوں تمہیں۔''

خیر چاچی دُعائیں بھی دیتی رہی اور کھانا بھی پکاتی رہی' دوپہر کا کھانا بھی کھلایا اس کے بعد میں رام وتی کو لے کر لکھن پور جانے کے لیے لاری اڈے کی جانب چل پڑا۔

☆☆☆

رام وتی خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ نجانے کیا کیا سوچیں اس کے دل میں تھیں۔ سوچ میں بھی رہا تھا لیکن یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے رام وتی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم' لکھن پور کے راستے کے بارے میں بھی کچھ نہیں پتا تھا۔ لیکن لاری اڈے کی جانب جا رہا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد میں رام وتی کے ساتھ لاری اڈے پر پہنچ گیا۔ یہاں لکھن پور جانے والی لاری کی تلاش میں کوئی دقت نہیں ہوئی اور میں رام وتی کے ساتھ لاری میں جا بیٹھا۔ لاری ابھی بھری نہیں تھی اور مسافر آ جا رہے تھے' میں نے رام وتی سے پوچھا۔

''رام وتی مجھے تمہارے بارے میں کچھ نہیں معلوم

مگر اتنا ضرور بتا دو کہ یہاں سے تم لکھن پور کا راستہ جانتی ہو۔"

رام وتی نے نمناک آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولی۔

"میں اپنے گاؤں سے باہر کبھی نہیں نکلی' لیکن لاری ہمیں گاؤں میں ہی اتارے گی' وہاں سے مجھے اپنے گھر کا راستہ معلوم ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ اچھا یہ بتاؤ تمہارے ماتا پتا موجود ہیں؟"

"ہاں' میں آپ کو اپنے بارے میں بتانا چاہتی ہوں' آپ اتنے اچھے ہیں کہ میں بتا نہیں سکتی۔ آپ نے ابھی تک میرے بارے میں مجھ سے کچھ نہیں پوچھا اور میں بھی آپ کا نام تک نہیں جانتی۔"

"جہانو ہے میرا نام۔ بس اس کے علاوہ کچھ نہیں۔"

"اپنا نام تو میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ میرا نام رام وتی ہے۔ میرے پتا کا نام دھرم داس ہے اور ہم تھوڑی سی زمینوں کے مالک ہیں۔ پتا جی نے ان زمینوں کو بہت کچھ بنا دیا ہے اور ہماری زمینوں پر جو فصلیں اُگتی ہیں وہ لکھن پور کی سب سے شاندار فصلیں ہوتی ہیں۔ بہت سے لوگ ہم سے جلتے ہیں میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی بھیا جی۔ ہمارے گاؤں کے مکھیا اور سب سے بڑے زمیندار بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ گاؤں کے مالک چوہدری منگل سنگھ ہیں۔ منگل سنگھ بہت سخت مزاج اور جھگڑالو سے آدمی ہیں' ان کا بیٹا ہے پورن سنگھ' میں آپ سے جو کچھ کہوں گی بالکل سچ کہوں گی بھیا جی میں نے کوئی ایسی کوشش نہیں کی تھی لیکن ایک دن پورن سنگھ جی مجھے کھیتوں پر ملے' بچپن سے لے کر جوانی تک بہت بار ہمارا آمنا سامنا ہوا تھا لیکن وہ ہم سے بہت بڑے تھے' بہت دولت مند تھے' ہمارے بیچ کوئی ایسی بات نہیں ہو سکی لیکن ایک دن جب میں

کھیتوں سے واپس آ رہی تھی تیز بارش شروع ہو گئی اور میں بارش میں بھیگتی دوڑنے لگی۔ مگر ایک جگہ میرا پاؤں پھسلا اور میں اوندھے منہ گر پڑی' میری ناک سے خون نکلنے لگا' پورن سنگھ مہاراج کہیں سے آ رہے تھے انہوں نے مجھے دیکھا تو آگے بڑھ کر ہمدردی سے مجھے اٹھایا اور ایک ایسی جگہ لے جا کر بیٹھ گئے جہاں بارش سے تھوڑی سی بچت ہو سکتی تھی۔

انہوں نے اس دن مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا کہ رام وتی تو اتنی بڑی ہو گئی ہم نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ بس میرے من میں بھی ان کے لیے جگہ پیدا ہو گئی اور اس کے بعد ہم دونوں ملنے لگے۔ کبھی کھیتوں میں کبھی کھلیانوں میں لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ کوئی بات چھپی نہیں رہتی' سو ایک دن کسی نے ہمیں اس طرح ملتے ہوئے دیکھ لیا اور بات منگل سنگھ مہاراج کے کانوں تک پہنچ گئی جیسا کہ میں نے کہا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگ سکتا۔ وہ آگ بگولہ ہو گئے جس آدمی نے انہیں ہمارے بارے میں بتایا تھا وہ ہماری تاک میں لگ گیا پھر ایک دن جب باغ میں چاندنی رات میں ہم دونوں پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ منگل سنگھ جی آ گئے اور میرا تو دم ہی خشک ہو گیا لیکن پورن سنگھ' منگل سنگھ مہاراج کو دیکھنے لگے۔ منگل سنگھ نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"تو یہ گل کھلائے جا رہے ہیں؟"

"نہیں پتا جی ہم نے کوئی گل نہیں کھلایا۔ پر یوں سمجھ لیجئے آپ کہ ہم ایک دوسرے کے من میں رہتے ہیں' ہمیں ایک کر دیجئے' میرا بیاہ کر دیجئے رام وتی سے۔" پورن سنگھ نے کہا۔

"پورن کیا اس سے پہلے تو اتنا کھل کر ہم سے بات کر لیتا تھا۔ عورت ایسی ہی چیز ہوتی ہے تمام رشتے ناتے مٹا دیتی ہے' سارا احترام ختم کر دیتی ہے۔"

''ایسا نہیں ہے مہاراج...... ایسا بالکل نہیں ہے آپ میرے پتاجی ہیں' من کی بات آپ سے نہ کہتا تو اور کسے کہتا؟''

''تو جانتا ہے' یہ کون ہے۔ بھلا دھرم داس کی کوئی اوقات ہے ہمارے سامنے......''

''پریم کی کوئی اوقات نہیں ہوتی اور پریم نہ بھی ہو تو منش تو سارے منش ہی ہوتے ہیں۔''

''تو بہت زبان چلاتا ہے پورن......''

''نہیں زبان نہیں چلا رہا پتاجی۔ آپ سے درخواست کر رہا ہوں' رام وتی میرا جیون ہے' اسے میرے جیون میں شامل کر دیجیے' آپ کا احسان مانوں گا۔''

''جا لڑکی تُو اپنے گھر جا اور سُن! اس کے بعد اگر پورن سنگھ کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو میں تیرے دونوں پاؤں کٹوا دوں گا۔''

انہوں نے مجھے دوبارہ دھمکی دی تو میں پورن سنگھ کی طرف دیکھنے لگی' میں نے اس سے کہا۔

''میں جاؤں پورن جی!''

اس بات سے منگل سنگھ اور زیادہ بھڑک اٹھے۔ انہوں نے کہا۔

''اور میں جو تجھ سے کہہ رہا ہوں وہ بات تیرے کانوں میں نہیں پہنچ رہی۔''

میں نے کوئی توجہ نہیں دی' لیکن جب پورن سنگھ نے کہا کہ جاؤ رام وتی اور چنتا مت کرو تم میرے جیون میں شامل ہو کر رہو گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ چنانچہ میں وہاں سے چل پڑی' بعد میں مجھے کچھ نہیں پتا چل سکا کہ پورن سنگھ کے ساتھ کیا ہوا لیکن پورن سنگھ جی مجھ سے دوبارہ نہیں ملے وہ آدمی جو ان کا سندیس لے کر آتا تھا کہ پورن جی نے تمہیں وہاں بلایا ہے یا وہاں بلایا ہے وہ بھی غائب ہو گیا تھا۔ کچھ پتا نہیں چل سکا تھا کہ ہوا کیا لیکن پھر ویسی ہی ایک چاندنی رات مجھے وہی آدمی بلانے کے لیے آیا جو پورن سنگھ جی کا سندیس لاتا تھا اور میں خوشی خوشی وہاں پہنچ گئی جہاں مجھے جانا تھا لیکن وہاں میں نے ایک اجنبی شخص کو دیکھا وہ بالکل میرے لیے اجنبی تھا۔ اس نے بڑے پیار سے مجھے پکارا اور میں حیرانی سے اس کی صورت دیکھنے لگی۔ وہ کہنے لگا۔

''رام وتی آج کئی دن کے بعد تم یہاں آئی ہو۔ میرا من چاہتا ہے کہ تمہیں کلیجے میں بھر لوں۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''پاپی تُو ہے کون؟''

مگر اس پاپی نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور مجھے پیار کرنے لگا۔ میں اس سے بچ رہی تھی لیکن وہ بہت طاقتور تھا۔ اس نے مجھے زمین پر گرا لیا اور اسی وقت میں نے پورن سنگھ اور منگل سنگھ کو دیکھا۔ پورن سنگھ غصے سے آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ اس نے غراتے ہوئے کہا۔

''یہ ہے تیرا پریم رام وتی...... یہ ہے تیرا کردار۔ پتاجی ٹھیک کہتے تھے کہ نیچ لوگ ہمیشہ نیچ ہی ہوتے ہیں' نفرت ہے مجھے تجھ سے نفرت ہے تو اسی کے قابل ہے۔ میں اگر تجھ سے پریم نہ کرتا ہوتا تو اسی وقت تیرے بدن میں بہت سی گولیاں اتار دیتا۔'' یہ کہہ کر پورن سنگھ جی واپس چلے گئے تھے۔ میں ہکا بکا رہ گئی تھی۔ مہاراج منگل سنگھ بھی اس کے ساتھ ہی تھے' وہ اپنے بیٹے کو لے کر آئے تھے اور یہ سازش ہوئی تھی میرے خلاف...... پوری سازش ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے بدکردار ثابت کر دیا تھا تاکہ مجھے اپنے بیٹے کے دل سے نکال سکیں' میں روتی پیٹتی واپس چلی آئی۔ وہ شخص بھی نہ جانے کون تھا۔ لازمی طور پر کرائے کا پٹھو ہوگا۔

میں دن رات روتی پیٹتی رہتی تھی۔ پھر ایک دن پتاجی نے مجھ سے کہا کہ انہیں پتا چلا ہے کہ ایک سادھو مہاراج لکھن پور آنے والے ہیں' وہ سنسار کے سارے کام کرادیتے ہیں معلوم نہیں پتاجی کو یہ خبر کس نے دی تھی۔ پتاجی نے کہا تھا کہ وہ مجھے سادھو مہاراج کے پاس لے جائیں گے اور میرے لیے دعا کرائیں گے کہ میرا جیون سپھل ہوجائے۔

پھر ایک دن پتاجی مجھے ساتھ لیے ہوئے چل پڑے اور ہم لوگ ایک ایسے ویران علاقے میں پہنچ گئے جہاں سادھو مہاراج کا استھان تھا۔ پتاجی کو پتا بھی نہ چلا اور اچانک ہی بہت سے آدمی ہم پر ٹوٹ پڑے۔ پتاجی کو بے ہوش کردیا گیا' مجھے بھی بے ہوش کردیا اور اس کے بعد جب ہوش آیا تو میں سیوک رام کی کٹیا میں تھی اور سیوک رام وہی سادھو تھا جس کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ بس اس سمے سے میں سیوک رام کی قید میں ہوں۔ اس پاپی نے میرے پیروں میں زنجیریں ڈال کر رکھی ہوئی تھیں۔ یہ میری آبرو لوٹنا چاہتا تھا مگر بھگوان نے میری مدد کی اور میں اس کے ہاتھ سے بچتی رہی۔ مگر کب تک؟ اس نے کہہ دیا تھا کہ اگر میں اس کی خواہش پوری کردوں تو وہ مجھے پورن سنگھ سے ملادے گا مگر میں نے ایسا نہیں کیا' وہ مجھ سے کہتا رہا کہ اگر وہ چاہے تو میرے ساتھ سختی بھی کرسکتا ہے لیکن اس کی اچھا ہے کہ میں خوشی سے اس کا ساتھ دوں۔ پر بھگوان نے مجھے اس کے ہاتھوں سے بچالیا اور اب میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

میں خاموشی سے یہ کہانی سن رہا تھا۔ بڑی اجنبی سی چیز تھی میرے لیے' بھلا مجھے رام وتی یا پورن سنگھ سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی لیکن ایک اور بات بھی تھی میں کیا کرتا۔ زندگی نے جس طرح میرے ساتھ مذاق کیا تھا اور جس طرح میں دربدر پھر رہا تھا اگر مجھے ایک چھوٹی سی قوت حاصل ہوگئی ہے تو کیوں نا میں اس طرح کے لوگوں کی مدد ہی کروں۔ ایسے اپنی مدد بھی ہوسکتی تھی چنانچہ میں اپنے ذہن میں فیصلے کرتا رہا کہ مجھے آگے کیا کرنا چاہیے۔

لکھن پور تک کا سفر واقعی بہت لمبا تھا' لیکن آخرکار لاری رکتی رکاتی بہت سارا وقت لے کر اس وقت لکھن پور پہنچی جب سورج ڈوب رہا تھا۔ رام وتی کو لاری اڈے سے اپنے گھر تک کا پتہ معلوم تھا۔ وہ مجھ ساتھ لے کر چل پڑی۔ بہت ڈری ہوئی اور سہمی ہوئی سی تھی' میں نے اسے تسلی دی کہ میرے ہوتے ہوئے کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا' وہ اطمینان رکھے' رام وتی نے روتے ہوئے کہا۔

"بھیا جی مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے جیون میں کون سا ایسا نیک کام کیا تھا کہ مجھے آپ جیسا انسان مل گیا جس نے مجھے اس درندے کے چنگل سے بھی آزاد کرایا اور مجھے میرے گھر تک لے آئے۔ اس سے بڑا اپکار اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا میرے لیے۔"

آخرکار وہ اپنے گھر پہنچ گئی' گھر سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ گاؤں اچھا خاصا بڑا تھا' اسے روایتی قسم کا گاؤں نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن گاؤں کی روایتیں یکساں ہوتی ہیں اس وقت مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رام وتی نے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی تو ایک عمر رسیدہ عورت نے دروازہ کھولا حالانکہ ماحول اندھیرے میں ڈوب چکا تھا لیکن رام وتی کو دیکھتے ہی عورت کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔

"رام وتی میری بچی...... میری بچی۔" عورت یہ کہہ کر رام وتی سے لپٹ گئی۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر زاروقطار رونے لگیں۔ میں خاموشی سے ایک طرف جا کھڑا ہوا تھا۔ ظاہر ہے یہ سارا کام تو ہونا ہی تھا۔ رام وتی کو ہوش آیا تو وہ ماں کو لے کر اندر گئی۔

مجھے بھی اندر آنے کا اشارہ کیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا تھا تا کہ کوئی آ نہ جائے۔ دونوں ماں بیٹیاں بہت دیر تک روتی رہیں اس کے بعد رام وتی نے کہا۔

''باپو کہاں ہے؟''

''بیمار ہے اندر پڑا ہوا ہے...... مگر یہ...... یہ...... یہ کون ہے؟''

''بھیا ہے میرا...... میرا بھائی ہے جس نے میری عزت بچائی ہے۔''

''کون ہے ہردیوی......؟''

''اپنی رام وتی واپس آ گئی۔'' ہردیوی جو رام وتی کی ماں تھی خوشی بھرے لہجے میں بولی اور اندر بڑی کھڑ بڑاہٹ سنائی دی۔ پھر کوئی دروازے میں آیا اور نیچے گر پڑا۔ رام وتی جلدی سے آگے بھاگی اور اس نے گرنے والے کو اٹھایا۔

''کہاں چلی گئی تھی بیٹی...... کہاں چلی گئی تھی...... کیا ہوا تھا؟'' یہ دھرم داس تھا جو زاروقطار رو رہا تھا۔ میں کونے میں کھڑا سارے تماشے دیکھ رہا تھا۔ دھرم داس نے کہا۔

''میں جانتا ہوں مجھے سب کچھ پتا چل گیا ہے...... سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ پر ہم بے بس تھے بٹیا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے' یہ سنسار دولتمندوں کے لیے ہے' غریب انسان کے لیے یہاں بے عزتی ہی بے عزتی ہے۔ پر تم نے بھی ایک غلطی کی رام وتی تم یہ بتاؤ کہ کیا تم پورن سنگھ کے قابل تھیں' وہ مہاراجہ اور ہم پرجہ۔ کہیں ایسا ہوا ہے؟''

''مجھ سے غلطی ہو گئی تھی پتا جی...... مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔''

''اسی غلطی کی سزا بھگت رہے ہیں ہم لوگ' تمہیں لازمی طور پر منگل سنگھ نے اغوا کرایا تھا۔ وہ اسی کے آدمی تھے جو تمہیں اٹھا کر لے گئے تھے اور جنہوں نے مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ پر ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ زبان کھولیں گے تو گردنیں کٹوا دی جائیں گی۔ پر بیٹی بہت بُرا ہوا چھوڑ دیں گے ہم یہ گاؤں چھوڑ دیں گے' تجھ پر کیا بیتی میری بچی۔''

جواب میں رام وتی نے پوری کہانی دھرم داس کو سنا دی۔ دھرم داس واقعی پریشان تھا لیکن اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے میرے پیروں کے پاس بیٹھ کر میرے پاؤں پکڑ لیے۔

''بیٹا تم بہت مہان ہو...... بہت مہان ہو تم۔ تم نے جو کچھ کیا ہم تمہیں اس کا کیا صلہ دے سکتے ہیں' دینے والا تو بھگوان ہی ہے پر دعائیں دے سکتے ہیں تمہیں' بھگوان تمہارے من کی ساری اچھائیں پوری کرے۔''

''یہ دُعا کافی ہے میرے لیے دھرم داس مہاراج۔''

''بیٹا ایک بات کہیں تم سے چلے جاؤ اب تم یہاں سے چلے جاؤ گاؤں سے ورنہ ظالم تمہیں بھی نقصان پہنچا دیں گے' ہم تقدیر کا لکھا بھگتیں گے اور اگر بھگوان نے جیون دیا تو یہ گاؤں چھوڑ کر چلے جائیں گے' ہمارے پاس تھوڑی سی زمینوں کے سوا کچھ نہیں ہے' ہم کوشش کریں گے کہ یہ زمینیں بیچ دیں اور کہیں اور جا کر پناہ لیں۔ حالانکہ پُرکھوں کی دین ہے' بزرگوں کا ورثہ ہے یہ سب کچھ پر کیا کریں ایک ہی بیٹی ہے اور ہم دونوں پتی پتنی ہیں جیون تو بچانا ہی ہے۔ نکل جائیں گے یہاں سے۔'' دھرم داس رونے لگا تو میرے دل میں ان کے لیے ایک دُکھ سا پیدا ہو گیا' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''دھرم داس جی آپ بھروسہ رکھیے میرا خدا اور آپ کا بھگوان کبھی کسی کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔ وہ آپ کے لیے کچھ نہ کچھ کرے گا اگر آپ مجھے یہاں رُکنے کی

اجازت دیں تو رُک جاؤں گا نہیں تو مجھے کوئی ایسی جگہ بتادیں جہاں میں قیام کرسکوں۔"

"بیٹا سرآنکھوں پر رُک جاؤ تم نے جو احسان ہمارے اوپر کیا ہے اس کے بعد تو تمہارے جوتے بھی ہمارے لیے قیمتی ہیں' پر بیٹا ساری صورت حال تمہارے علم میں ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں یہاں ٹھہرنے کے لیے کوئی جگہ تو ہوگی۔"

"ہاں بابو کی سرائے ہے' وہاں رہنے کی جگہ مل جاتی ہے۔"

دھرم داس نے مجھے بابو کی سرائے کا پتا بتا دیا۔ میرے لیے یہی مناسب تھا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ رہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی مجھے ان پر نگاہ رکھنی ضروری تھی چنانچہ میں بابو کی سرائے چلا گیا۔ اچھی خاصی جگہ تھی ایک چھوٹا سا کمرہ مجھے رہنے کے لیے مل گیا' میں نے اپنے آپ کو پردیسی ہی بتایا تھا لیکن بہرحال بابو کی سرائے کے بارے میں مجھے جو کچھ معلوم ہوسکا تھا وہ برا نہیں تھا' یہاں مجھے کھانے پینے کو اچھی ہی چیزیں ملیں۔ رات کو کمرے میں لیٹ کر یہ سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اس مسئلے کو یونہی چھوڑ کر نکل جاؤں تو کم از کم دل میں یہ احساس ضرور رہے گا کہ میں نے اچھا نہیں کیا۔ چاچی کے لیے زندگی گزارنے کا سامان کرکے آیا تھا۔ بہت دیر تک سوچتے رہنے کے بعد دل نے ایک بات کہی تھی کہ جہانو تو جہانزیب تو کبھی نہیں بن سکے گا جو تیرا ماضی ہے وہ اب دھندلکوں میں گم ہوگیا ہے۔ حال سے حال بنا' دنیا میں ٹھوکریں کھانے کے لیے نہیں پیدا ہوا تو' جب تجھے اللہ تعالیٰ نے یہ موقع دیا ہے اور خوش نصیبی ہے تیری کہ تیرا ایمان بھی نہیں چھنا تو پھر اس سے فائدہ اٹھا۔ بھیرو' قبضے میں ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر وقت اس سے کام لیا جائے۔ ہاں جب کوئی مجبوری آئے تو دیکھا جائے گا' جب تک وہ کڑا اس کے ہاتھ میں ہے بقول اس کے وہ میری غلامی سے دُور نہیں جاسکتا۔ چنانچہ کیوں نا میں ان تمام چیزوں سے بھرپور فائدہ اٹھاؤں اور آخر کار میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے بعد ہی لکھن پور سے باہر جاؤں گا۔

چنانچہ سب سے پہلے میں نے ایک فیصلہ کیا اور دوسری صبح جو آدمی ناشتہ لے کر میرے پاس آیا' میں نے اس سے اس کے بارے میں پوچھا۔

"صاحب جی کمالو ہے ہمارا نام۔"

"اسی گاؤں کے رہنے والے ہو؟"

"ہاں جی! باپ دادا بھی اسی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے' بچپن سے بابو کی سرائے میں کام کرتے ہیں۔"

"تو پھر یار کمالو! میرے لیے ایک کام کرو۔"

"حکم سرکار حکم۔" وہ بولا اور میں نے اسے تھوڑی سی رقم نکال کر دی۔ کمالو خوش ہوگیا تھا' اس نے کہا۔

"آپ کے لیے جان بھی حاضر ہے صاحب جی! آپ حکم کریں۔"

"کمالو دیکھو دھرم داس کو جانتے ہو؟"

"ہاں جی وہ بیری والے باغ والا۔"

"شاید۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں جانیں گے صاحب جی! ہمارے گاؤں میں سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ زیادہ بڑا گاؤں تو ہے نہیں سب ایک دوسرے کے ملنے والے ہیں مگر آپ نے خاص طور سے دھرم داس کے بارے میں کیوں پوچھا۔"

"ایسے ہی کمالو وہ بے چارہ بڑا مظلوم آدمی ہے۔"

"آپ کو پتا ہے صاحب جی اس کی لونڈیا گھر سے بھاگ گئی تھی۔"

''بھاگ گئی تھی وہ گھر سے؟ صحیح پتا ہے تمہیں۔''
کمالو نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر رازداری سے بولا۔
''نہیں صاحب جی! وہ بالکل نہیں بھاگی تھی اب ہم آپ کو کیا بتائیں، پر ہمیں بتانا پڑے گا کیونکہ آپ تو ہمارے اپنے ہیں ہم...... میرا مطلب ہے، ہم آپ پر بھروسا کرتے ہیں، صاحب جی آپ ہماری بات کو اپنے آپ تک ہی رکھنا۔''
''ہاں...... ہاں کیوں نہیں، کیوں نہیں۔''
''کوئی نہیں بھاگی تھی وہ، اس حرامی منگل نے سارا کھیل کھیلا تھا۔''
''اچھا۔'' میں نے حیرانی سے کہا۔
''ہاں جی ہاں۔ بڑا سازشی ہے، اِدھر کی اُدھر کرتا رہتا ہے وہ تو یوں کہیں آپ کہ جرگے کا چوہدری بہت سخت آدمی ہے، اگر چوہدری ویر سنگھ اسے نہ سنبھالے رکھے تو پتا نہیں کیا کر ڈالے وہ مگر وہ جانتا ہے کہ چوہدری ویر سنگھ کتنا خطرناک ہے اسے صحیح بات پتا چل جائے تو حشر کر کے رکھ دے۔''
''اچھا۔'' میں نے دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ویسے بھی بات واقعی بڑی دلچسپ تھی ایک نیا نام سامنے آیا تھا، جرگے کا سردار چوہدری ویر سنگھ۔
''تو صاحب جی ہم بتا رہے تھے کہ سب منگل سنگھ کی چال تھی، اصل میں وہ جو کہتے ہیں نا جی پتا نہیں کیا کہتے ہیں وہ ظالم آسمان جو کہ ظلم کرتا ہے، مگر آسمان نیچے آ کر تو ظلم نہیں کر سکتا صاحب جی۔ نیچے رہنے والے ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں، بے چارہ پورن سنگھ دھرم داس کی بیٹی رام وتی سے پریم کرتا تھا مگر بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا، چوہدری منگل نے سب سے پہلے رام سنگھ کی بیٹی پر برائی کا الزام لگا کر اسے پورن سنگھ کے سامنے بدنام کیا اور اس کے بعد اس لڑکی کو اغوا کرا دیا۔ سب نے یہی سمجھا کہ وہ گھر سے بھاگ گئی، پر صاحب جی ایسا ہوا نہیں تھا وہ گھر سے نہیں بھاگی تھی بلکہ اس بے چاری کو بس کیا کہیں صاحب جی کیا کہیں آپ سے اور کیا نہ کہیں۔''
''بولو...... بولو کیا ہوا تھا؟''
''صاحب جی بس اغوا کرا دیا تھا اسے اور یہ بات اڑا دی کہ دھرم داس کی بیٹی اپنے آشنا کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے، بے چارہ دھرم داس بیمار پڑ گیا، اپنی اس بے عزتی پر۔''
''گاؤں والوں کو یقین ہے کہ دھرم داس کی بیٹی گھر سے بھاگی نہیں تھی۔''
''یقین ہے جی سب جانتے ہیں ایسا ہی ہوا ہے، پر ظالم کے آگے کون بول سکتا ہے وہ جو من چاہے کرے۔''
''بڑے افسوس کی بات ہے، ویسے میں تمہیں ایک بات بتاؤں کمالو، بھی تم اسے اپنے آپ تک ہی رکھنا۔''
''ہاں...... ہاں جی صاحب جی! ہم تو آپ کے دوست بن گئے ہیں نا اب۔ آپ حکم کرو کیا بات ہے۔''
''تم بالکل ٹھیک کہتے ہو بلکہ گاؤں والے ٹھیک کہتے ہیں، دھرم داس کی بیٹی گھر سے بھاگی نہیں تھی بلکہ اسے ایک کمینے سادھو کے حوالے کر دیا تھا جس کا نام سیوک رام تھا۔ سیوک رام اسے لے گیا تھا اور یہ کام چوہدری منگل سنگھ نے ہی کرایا تھا۔''
''ہم تو سمجھ رہے تھے نا صاحب جی پر آپ کو کیسے معلوم؟''
''مجھے مل گئی تھی اس کی بیٹی سیوک رام کے قبضے سے نکال کر لایا ہوں۔''
''ہیں......'' کمالو کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
''ہاں، فی الحال تم یوں کرو کہ ذرا دھرم داس کا خیال

رکھو۔ یہ بات تو پھیل جائے گی کہ دھرم داس کی بیٹی واپس آ گئی ہے' دیکھنا یہ ہے کہ اس کے بعد چوہدری منگل پر کیا رد عمل ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے صاحب جی آپ چنتا ہی نہ کرو۔'' کمالو نے کہا۔

دو دن گزر گئے اس دوران میں نے دھرم داس سے کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا ادھر کیا ہوا تھا' کمالو کہہ رہا تھا کہ حالات ٹھیک ٹھاک ہیں' لیکن تیسرے دن کمالو ہانپتا کانپتا میرے پاس آ گیا۔

''ہو گئی گڑبڑ صاحب جی ہو گئی۔''

''کیا ہوا...... کیا ہوا؟''

''اُسے پتا چل گیا کہ رام وتی واپس آ گئی ہے۔ وہ رام وتی کو پکڑ کر لے گیا ہے اور اپنی قید میں ڈال دیا ہے۔ دھرم داس بے چارہ غشی کے دورے کھا رہا ہے' لوگ اس سے ہمدردی بھی ظاہر نہیں کر سکتے کیونکہ منگل سنگھ کے ڈر سے سب خوفزدہ ہیں۔''

''کیا منگل سنگھ نے دھرم داس کو بھی اٹھا لیا ہے۔''

''نہیں جی بس اس کی بیٹی کو پکڑوا کر لے گیا ہے اور قید کر لیا ہے۔''

''یہ بات ویر سنگھ کو معلوم ہو چکی؟''

''ہاں! ٹھاکر صاحب کو پتا چل گیا ہے کہ یہ کام بھی دھرم داس نے ہی کرایا ہے۔'' کمالو کی باتوں نے مجھے عجیب سے احساسات کا شکار کر دیا تھا اور میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔

بہرحال معلومات کے لیے باہر نکلنا پڑا تھا' گاؤں کے لوگ ایک دوسرے سے اس بارے میں باتیں کر رہے تھے' میں بے شک ان کے درمیان اجنبی تھا لیکن گاؤں کے لوگ محبت والے تھے' کئی لوگوں سے میری سلام دعا ہوئی میں نے ان سے یہ ہی کہا کہ میں ایسے ہی گھومتا پھرتا ادھر نکل آیا ہوں۔ آوارہ گرد آدمی ہوں' تھوڑے دن رہوں گا اس کے بعد چلا جاؤں گا۔ تو لوگوں نے مجھے بھی اپنے درمیان قبول کر لیا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ تین دن کے بعد پنچایت بلائی جائے گی' پنچایت میں منگل سنگھ رام وتی کو پیش کرے گا۔

''کیا ابھی تک یہ بات پتا نہیں چلی کمالو کہ دھرم داس کی بیٹی لکھن پور واپس کیسے آ ئی۔''

''پتا چل گئی ہے صاحب جی' آج پتا چل گئی ہے۔ میرا خیال ہے کچھ لوگ آپ کو بلانے کے لیے بابو کی سرائے آئیں گے۔'' کمالو نے انکشاف کیا اور اس کا انکشاف بالکل درست تھا۔ چار آدمی آئے تھے' یہ منگل سنگھ کے ہی آدمی تھے۔ انہوں نے بابو سے اس اجنبی کے بارے میں پوچھا تھا جو دھرم داس کی بیٹی رام وتی کو لکھن پور لے کر آیا تھا۔

''میں ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے جوان منگل سنگھ جی نے تجھے بلایا ہے۔''

''چلتا ہوں میں تمہارے ساتھ۔'' میں نے جواب دیا' اب مجھے ان تمام معاملات سے کافی دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔

لکھن پور میں منگل سنگھ کی حویلی سب سے بڑی تھی۔ پرانے طرز کی عظیم الشان عمارت نجانے کیسے کیسے رازوں کی امین تھی۔ مجھے حویلی میں لے جایا گیا اور ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ کمرہ خالی تھا اور یہاں میرے علاوہ اور کوئی موجود نہیں تھا' پھر کوئی ایک گھنٹے وہاں بیٹھے رہنے کے بعد دو آدمی میرے پاس آئے اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا لیکن اس بار وہ مجھے حویلی کے نیچے بنے ہوئے تہہ خانے میں لے گئے' تہہ خانے میں کٹہرے بنے ہوئے تھے جنہیں دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ منگل سنگھ کا عقوبت خانہ ہے' کافی ظالم آدمی معلوم ہوتا ہے۔ ایک بڑا سا کٹہرا کھول کر مجھے اندر داخل کیا گیا اور تالا لگا دیا گیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے تم نے مجھے قیدیوں کی طرح یہاں کیوں بند کیا ہے؟''
''مجبوری ہے مہاراج! منگل سنگھ آپ سے آج ہی ملتے اور بات کرتے لیکن انہیں کوئی ضروری کام پڑ گیا ہے' آپ کو کل دوپہر کو پنچایت کے سامنے پیش کیا جائے گا وہیں پر سب کچھ ہوگا۔''
''ٹھیک۔'' میں نے پُراطمینان لہجے میں کہا۔ میں جانتا تھا کہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے یہ لوگ' مجھے اس مسئلے کو حل کر کے ہی لکھن پور سے جانا تھا۔ بے چارہ دھرم داس اور اس کا چھوٹا سا خاندان بڑی مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ میں اس قید خانے میں بیٹھ کر آنے والے وقت کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس شخص نے میرے ساتھ بھی غلط کیا تھا اور اسے اس غلط کاری کی سزا ملنی چاہیے تھی۔ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ ظالم ہے اور اس ظالم کو سزا دینے کی قوت میرے پاس تھی۔ یہ بات بھی میرے ذہن میں تھی کہ بے چاری رام وتی کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک ہو رہا ہے اور اس کا ایک ہی ذریعہ تھا۔
چنانچہ میں انتظار کرنے لگا' قید خانے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ یہاں آس پاس کوئی موجود نہیں تھا' میں نے بھیروں کو آواز دی اور چند ہی لمحات کے بعد بھیروں میرے سامنے حاضر ہو گیا۔
''یار ایک بات سن' بے شک میرے ہاتھ میں تیرا کڑا جا پڑا ہے لیکن میں نے اس سے تجھے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا' کوئی ایسا کام تیرے سپرد نہیں کیا جسے کرنے میں تجھے دقت ہو۔''
''آپ بتاؤ آپ کو میری کیا ضرورت پیش آ گئی ہے؟'' بھیروں نے کہا۔
''اب تھوڑی سی تکلیف دینی ہے تجھے۔ پہلا کام تو یہ کر ذرا یہ معلوم کر کے آ کہ دھرم داس کی بیٹی رام وتی کو اس نے کہاں قید کیا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر وہاں اسے کوئی نقصان یا تکلیف پہنچائی جا رہی ہے تو تُو ان لوگوں کو سزا دے اور روک دے' جو رام وتی کے ساتھ کوئی برا سلوک کر رہے ہیں' یہ کام تو کر سکتا ہے۔''
''ٹھیک ہے مہاراج میں کر دوں گا۔''
''میں پھر تیری واپسی کا انتظار کر رہا ہوں۔''
بھیروں نے گردن جھکائی اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ دوسرے لمحے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا' مجھے بڑی مسرت ہو رہی تھی۔ ساری باتیں اپنی جگہ لیکن جو کام ہو گیا تھا وہ تو لاجواب تھا۔ پھر میں اس بارے میں سوچتا رہا تھا' رات کو میرے لیے کھانا آیا جسے بھوجن کہہ کر مجھے دیا گیا تھا اور میں نے وہ سبزی پوریاں رغبت سے کھائیں اور اس کے بعد آرام سے لیٹ گیا' کچھ دیر کے بعد بھیروں واپس آیا۔
''وہ خیریت سے ہے اور سب سے بڑی بات جو ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں ایک اور شخص ہے جو لکھن پور کی آبادی میں سب سے زیادہ طاقتور سمجھا جاتا ہے..... حالانکہ وہ نہ یہاں کا سردار ہے نہ کوئی بہت بڑی قوت بس یہاں کی پنچایت کا سربراہ ہے' البتہ اس کے پاس ایسے ذرائع موجود ہیں کہ اگر کوئی اس کے احکامات کے خلاف کوئی عمل کرے تو اسے سزا دی جا سکے تو دھرم داس اس کے پاس پہنچ گیا تھا اور اس نے اس سے فریاد کی تھی اور کہا تھا کہ اس کی بیٹی کو اس وقت تک کوئی سزا نہ دی جائے یا نقصان نہ پہنچایا جائے جب تک اس کا جرم ثابت نہ ہو جائے۔ چنانچہ دیر سنگھ نے منگل سنگھ کو احکامات پہنچا دیے تھے۔ منگل سنگھ ویسے بھی شاید اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کرنا چاہتا تھا' پتا نہیں اس کے ذہن میں کیا ہے۔'' یہ بات تسلی بخش تھی' چنانچہ میں کھا پی کر آرام سے سو گیا۔
☆☆☆

دوسرا دن اطمینان بخش تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میرے لیے کوئی مشکل باقی نہیں رہی تھی۔ گھر بار چھوڑ دیا تھا' اب تو عرصہ ہوا حیدر شاہ صاحب کا گھر بالکل ذہن سے نکل گیا تھا وہاں جو کردار تھے ان سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا کیونکہ زندگی میں مسلسل تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور یہ تبدیلیاں ایک خوشگوار حیثیت کی حامل تھیں بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اب خاص طور سے بھیروں کے قبضے میں آ جانے کے بعد تو میں خود کو ایک بہت بڑی شخصیت سمجھنے لگا تھا' انسان کو جب کوئی طاقت حاصل ہو جاتی ہے' چاہے وہ کسی بھی طرح کی ہو تو اس کی شخصیت میں ایک اعتماد پیدا ہو جاتا ہے اور یہ اعتماد میرے اندر بھی پیدا ہو گیا تھا۔ یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے' کبھی اس کا تجربہ زندگی میں ہو تو دیکھا جائے کہ اعتماد کتنی بڑی چیز ہوتی ہے۔

غرض یہ کہ وقت گزرتا رہا۔ مجھے پنچایت کے سامنے پیش ہونا تھا اور اس کے بعد چھوٹی موٹی ضروری کارروائیاں ہوئیں اور آخر کار مجھے پنچایت میں طلب کر لیا گیا۔ ابھی تک میں منگل سنگھ سے نہیں ملا تھا' یہاں پنچایت میں جب میں پہنچا تو میں نے یہاں کا ماحول دیکھا۔ ایک بڑی سی جگہ شامیانے لگائے گئے تھے' کرسیاں رکھی ہوئی تھیں' ایک طرف تخت بچھا ہوا تھا' بہت بڑا تخت بچھا ہوا تھا جس پر پنچایت کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہی میں ایک نمایاں جگہ میں نے منگل سنگھ اور اس کے بیٹے پورن سنگھ کو دیکھا۔ پورن سنگھ ایک خوبصورت نوجوان تھا' بلاشبہ ایسا جس سے محبت کی جاسکتی تھی' چہرے پر بھی نرمی کے آثار تھے۔ ان دونوں باپ بیٹوں نے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ مجھے ایک مجرم کی طرح ایک الگ حصے میں لے جا کر بٹھا دیا گیا جو اسٹیج کے دائیں جانب تھا۔ پھر کچھ لمحوں کے بعد میں نے ٹھاکر ویر سنگھ کو دیکھا۔ لمبے قد قامت کا' چڑھی ہوئی داڑھی مونچھوں والا ایک پروقار آدمی تھا' جس کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ بڑی شخصیت کا حامل ہے۔ اسے احترام سے خوش آمدید کہا گیا' اس کے ساتھ چھ اور افراد تھے' جو پنچایت کے بڑے شمار ہوتے تھے۔ ہر ایک کو اس کی نشست دے دی گئی اور سب سے آخر میں رام وتی کو لایا گیا' رام وتی کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا' آنکھوں میں خوف کے آثار تھے' ایک طرف اس کا باپ بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

بہر حال مجھے اس کرسی پر بٹھا دیا گیا جو میرے لیے مخصوص تھی اور میرے سامنے رام وتی لائی گئی' پھر ٹھاکر ویر سنگھ نے داہنے ہاتھ سے اشارہ کیا اور پنچایت کی کارروائی کا آغاز ہو گیا۔ ایک عمر رسیدہ شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے پنچایت کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"سجنوں پہلے میں آپ کو آج کی پنچایت کے مقصد کی بات بتا دوں۔ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ دھرم داس کی بیٹی رام وتی اچانک غائب ہو گئی تھی دھرم داس نے اس پنچایت کو بتایا کہ وہ اپنی بیٹی کو جو بیمار تھی دکھانے کے لیے ایک سادھو مہاراج کے پاس لے جا رہا تھا کہ راستے میں کچھ لوگوں نے اسے مار پیٹ کر اس کی بیٹی کو اغوا کر لیا اور اس کے بعد سے رام وتی کا کوئی پتا نہیں تھا۔ سجنوں رام وتی کو ایک بار خود مہاراج منگل سنگھ نے اپنے کسی عاشق کے ساتھ بیٹھے دیکھ لیا تھا اور اس پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ بستی کے ماحول کو خراب کر رہی ہے' وہ لڑکی اچانک غائب ہو گئی اور دھرم داس بیمار پڑ گیا۔ بات ختم ہی ہو گئی تھی کہ اچانک وہ لڑکی اس آدمی کے ساتھ لکھن پور واپس آ گئی۔ یہ آدمی کون ہے کیا ہے' ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ لیکن شاید یہ وہ بھی ہو سکتا ہے' جس کے ساتھ رام وتی کو دیکھا گیا تھا

اور اس پر سختی کی گئی تھی' یہ آدمی غائب ہو گیا تھا اور اب یہ رام وتی کو لے کر لکھن پور آیا ہے' یہ ہے ساری کہانی۔ رام وتی نے لکھن پور کی روایت کو بدنام کیا ہے اور ایک بُری لڑکی کے طور پر سامنے آئی ہے۔ گاؤں کے مکھیا اور بڑے زمیندار ہونے کی حیثیت سے مہاراج منگل سنگھ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ رام وتی کا کردار اچھا نہیں ہے' اسے گاؤں کی عزت کو پامال کرنے پر بدترین سزا دی جائے۔''

ٹھاکر ویر سنگھ خاموشی سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ پھر ٹھاکر نے دھرم داس کی طرف رُخ کر کے کہا۔

''کیا کہتے ہو تم دھرم داس' تمہاری بیٹی نے یہ سب کچھ کیا ہے یا نہیں۔''

''میں نے پہلے بھی کہا تھا مہاراج کہ میری بیٹی ایسی نہیں ہے' اسے اغوا کیا گیا تھا۔''

''ٹھیک اور تم کیا کہتے ہو لڑکے؟ پہلے اپنا نام بتاؤ۔'' ٹھاکر ویر سنگھ نے میری جانب متوجہ ہو کر کہا۔

میں حالات سے بالکل مطمئن تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے پاس ایک ایسی قوت موجود تھی جو ہر طرح سے میرا دفاع کر سکتی ہے' میں نے پُراطمینان لہجے میں کہا۔

''میرا نام جہانزیب شاہ ہے۔''

''کیا؟'' بہت سی آوازیں ابھریں۔ ''مسلمان ہو تم؟''

''ہاں' الحمدللہ......'' میں نے جواب دیا۔ سارے چہرے بگڑ گئے تھے' منگل سنگھ نے کہا۔

''یہ اس کا دوسرا بڑا جرم ہے کہ اس نے ہندو دھرم کی ساری مان مریاداؤں کو پیروں کے نیچے کچل دیا اور ایک ملیچھ سے پریم کا ناتا بڑھایا۔'' کسی نے کہا۔

''خاموش ہو جاؤ' بات کرنے دو۔'' ٹھاکر ویر سنگھ بولا۔ پھر اس نے میری طرف رُخ کر کے کہا۔

''ہاں لڑکے آگے بول' تیرا اس سے کب اور کیسے ٹاکرا ہوا۔''

''وہ تو میں ضرور بولوں گا ٹھاکر صاحب لیکن آپ لوگ ایک بڑی بے وقوفی کی بات یہ کر رہے ہیں کہ آپ نے ایک اہم بات نہیں پوچھی۔''

''کیا؟'' ویر سنگھ نے میری بات کا برا مانے بغیر کہا۔

''آپ یہ بتائیے کہ میں اسے یہاں سے لے کر بھاگا اور اتنے عرصے اسے اپنے ساتھ رکھا پھر میں واپس کیوں آ گیا' کیا اس لیے کہ آپ لوگ مجھے سزا دیں یا اس لڑکی کو میں آپ کے حوالے کر دوں۔ اس بات کا آپ کے پاس کیا جواب ہے۔''

مدھم مدھم آوازیں ابھریں' لوگ ایک دوسرے سے سوال کر رہے تھے کہ واقعی یہ کیسے ممکن ہو گیا۔ ٹھاکر ویر سنگھ نے کہا۔

''تو خود ہی بتا دے۔''

''بتاتا ہوں...... بتاتا ہوں اور پوری تفصیل سے بتاتا ہوں ٹھاکر صاحب۔ ساری کہانی میرے علم میں آ چکی ہے' پہلی بات تو میں آپ کو یہ بتاؤں کہ مسلمان کبھی جھوٹ نہیں بولتا' ہم لوگ گردن کٹوا دیتے ہیں' اصلیت کو کبھی نہیں چھپاتے۔ اگر اس لڑکی سے میرا کوئی ایسا واسطہ ہوتا تو سینہ تان کر جس طرح آپ کے گاؤں آیا ہوں اسی طرح یہ بھی کہتا کہ ہاں میں اس سے پریم کرتا ہوں' لیکن میں آپ کو ایک بات بتاؤں میں اس سے پریم کرتا ہوں اور بہت پریم کرتا ہوں اور اس کا جیون بچانے کے لیے میں اتنا کچھ کر دوں گا کہ آپ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ نہ سمجھیں کہ چار بندے لے کر آئے اور آپ لوگوں نے مجھے گرفتار کر لیا' کان کھول کر سن لیں میں آپ کا قیدی نہیں ہوں' میں اگر چاہوں تو ایک لمحے کے اندر یہاں سے جا سکتا

ہوں لیکن آپ کو ساری تفصیل بتائے بغیر میں کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔"...... میں نے کہا۔

"میں اس سے پریم کرتا ہوں لیکن ایک بھائی کی حیثیت سے یہ میرے لیے سگی بہنوں جیسی ہے اور میں اس کے لیے بھائی ہوں' ہم لوگ بہنوں پر بری گناہ نہیں ڈالتے۔ ہاں اگر لکھن پور میں ایسا کچھ ہوتا ہے تو میں نہیں کہہ سکتا' ہمارے ہاں ماں اور بہنوں اور بیٹیوں کا رشتہ مقدس سمجھا جاتا ہے۔"

میرے ان الفاظ پر ایک بار پھر بھنبھناہٹ شروع ہوگئی' لوگ حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

میں نے پنچائیت میں پوری کہانی سنا دی۔

بہر طور یہ وقت گزر گیا۔ رات گزرنے کے بعد صبح ہی صبح میں نے بھیروں کو طلب کیا اور بھیروں میرے پاس پہنچ گیا۔

"سنو بھیروں آج پنچایت لگے گی' میں تمہاری ایک ذمے داری لگاتا ہوں میرے دوست۔ سیوک رام جہاں بھی ہے اسے اٹھا کر یہاں لے آؤ' اسے پنچایت میں پیش کرنا ہے۔"

"آ جائے گا۔" بھیروں نے بدستور بُرے لہجے میں کہا۔

ٹھاکر ویر سنگھ نے میری خاطر مدارت کا بھرپور بندوبست کیا ہوا تھا۔ اس دوران مجھے سوچنے کے بہت سے مواقع مل رہے تھے۔ زندگی اتنی بری چیز نہیں ہے۔ حیدر شاہ کی کوٹھی میں میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ زندگی بھر نہ بھولنے والی کہانی تھی۔ لیکن اب مجھے صحیح معنوں میں زندگی کا لطف آ رہا تھا اور وہ ہو رہا تھا جو میری دلچسپی کے لیے کافی تھا۔ میں آرام سے وقت گزارتا رہا اور سوچتا رہا کہ میرے آگے کے اقدامات کیا ہونے چاہئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی میرا دھیان اور بھی سوچوں میں ڈوبا رہا تھا۔ میں فیصلے کر رہا تھا کہ مجھے آگے کیا اقدامات کرنے ہوں گے۔ اگر یہ مسئلہ حل ہو بھی گیا تو بات تو اس سے آگے بھی چلے گی اس میں میرا اپنا عمل کیا ہوگا۔

غرض یہ کہ وقت گزرتا رہا اور آخر کار ٹھاکر ویر سنگھ کے آدمی مجھے لینے آ گئے۔

"پنچایت دوبارہ لگ چکی ہے مہاراج اور وہاں آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔" میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ پہلے ہی کے انداز میں پنچایت لگی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی جگہ سنبھال لی اور ٹھاکر ویر سنگھ نے مجھ سے کہا۔

"ہاں تو جوان تم یہ بتاؤ کہ تم رام وتی تک کیسے پہنچے؟"

"ہاں میں بتاتا ہوں' بالکل اتفاقیہ طور پر میرا گزر ایک جگہ سے ہوا اور وہاں مجھے کسی لڑکی کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں تم لوگ جانتے ہو کہ ایک مسلمان کبھی کسی مظلوم کی آواز سن کر سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔ میرے ضمیر نے گوارہ نہیں کیا اور میں وہاں پہنچ گیا جہاں سے چیخیں ابھر رہی تھیں یہ معصوم لڑکی وہاں موجود تھی اور ایک وحشی قسم کا سادھو اس پر دست درازی کرنے کی کوشش کر رہا تھا یہ اپنے آپ کو بچا رہی تھی۔ میں نے اس سادھو کو روکا میری اس سے جھڑپ ہوئی اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں اپنی اس بہن کی عزت و آبرو بچانے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ وہی سادھو سیوک رام تھا جس کا منگل سنگھ سے کوئی واسطہ ہے اور منگل سنگھ کے ہی اشارے پر سیوک رام نے رام وتی کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ منگل سنگھ نے ہی اسے اغوا کرا کے اس کے پاس پہنچایا تھا۔"

"جھوٹ...... جھوٹ...... جھوٹ' بالکل جھوٹ ہے......" منگل سنگھ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

''جھوٹ نہیں ہے منگل سنگھ سچ ابھی سامنے آجاتا ہے۔ وہ دیکھو سچ آرہا ہے۔'' میں نے دیکھا کہ دو آدمی سیوک رام کو پکڑے لیے آرہے ہیں۔ بھیروں نے یقیناً اس کا بندوبست کیا ہوگا۔ سب کی نگاہیں سیوک رام کی جانب اٹھ گئیں۔ سیوک رام گھسٹتا ہوا آرہا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ پنچایت میں پہنچ گیا۔

''یہ ہے وہ سادھو سیوک رام جس نے رام وتی کو اپنے قبضے میں کیا ہوا تھا۔ سیوک رام تم اگر سچ نہیں بولو گے تو میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ تم جانتے ہو میں ایسا کر سکتا ہوں۔ اس لڑکی کے بارے میں بالکل سچ بولو! کسی کے دباؤ میں آنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر تم سچ نہ بولے تو پھر تمہارا حشر دیکھنے کے قابل ہوگا۔''

سیوک رام کانپنے لگا' اس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ امداد طلب نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی مدھم آواز ابھری۔

''میں سچ بولوں گا مہاراج...... میں سچ بولوں گا۔''

''سیوک رام تم سادھو ہو؟''

''ہاں مہاراج! میں کالا علم جانتا ہوں۔''

''اچھا...... کالے علم کا ماہر ہونے کے باوجود اس شخص نے تمہیں اس طرح پکڑوا لیا۔''

''میں نہیں جانتا مہاراج کہ اس کے پاس کون سی شکتی ہے۔''

''یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ تم یہ بتاؤ کیا تم منگل سنگھ کو جانتے ہو۔''

میری نگاہیں منگل سنگھ کے چہرے کی جانب اٹھیں۔ اس کی شکل دھواں دھواں ہو رہی تھی' میں نے سیوک رام سے کہا۔

''سیوک رام جواب دو۔ کیا تم منگل سنگھ کو جانتے ہو۔'' سیوک رام نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور بولا۔

''ہاں مہاراج جانتا ہوں۔''

''کیسے؟''

''منگل سنگھ مجھ سے ملتا رہتا ہے' اس نے مجھ سے کئی کام کرائے ہیں۔''

''بکواس...... بکواس کرتا ہے یہ...... یہ جھوٹ بولتا ہے۔'' منگل سنگھ غصے سے غرایا۔

''کیوں...... سیوک رام کیا تم جھوٹ بول رہے ہو؟''

''نہیں مہاراج۔''

''منگل سنگھ اگر یہ سچ بول رہا ہے تو اس بات کو تسلیم کرو۔ خیر سیوک رام تم بتاؤ کیا ہوا تھا۔''

''بات وہی سچ ہے جو کہی گئی ہے۔ منگل سنگھ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بیٹے پورن کی شادی دھرم داس کی بیٹی سے ہو۔ اس نے یہ ساری چالیں اسی لیے چلیں اور مجھ سے کہا کہ وہ لڑکی کو میرے پاس بھیج رہا ہے اسے احتیاط سے رکھا جائے' پر مہاراج میں احتیاط نہیں کر سکا۔''

''کیوں منگل سنگھ اب تم کیا کہتے ہو؟'' ویر سنگھ نے منگل سنگھ کو گھورتے ہوئے کہا۔

''یہ سب سچ ہے۔ ایسی ہی بات تھی۔'' منگل سنگھ نے الف سے لے کر یے تک ساری داستان سنا دی اور سارا گاؤں اس پر لعنت بھیجنے لگا۔ ہر ایک نے اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہا۔ بے چارہ دھرم داس سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا اور رام وتی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ تبھی پورن سنگھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کہا۔

''بستی والو! میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں تم اس کی تائید کرو۔ پتا جی نے رام وتی اور دھرم داس چاچا کے ساتھ جو کچھ کیا ہے میں نہیں جانتا کہ

اس کی معافی کیسے مانگی جاسکتی ہے۔ میرے اپنے حساب سے اس برائی کی معافی نہیں ہے۔ پتاجی کا رویہ اور سوچ کچھ بھی ہو بستی والے یا پنچایت ان کے اس جرم کے نتیجے میں ان سے کچھ بھی کہے لیکن میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں صرف اور صرف رام وتی سے پھیرے لوں گا اور اس کے سوا کسی اور کے ساتھ شادی نہیں کروں گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے جسے پتاجی مانیں یا نہ مانیں میں سب کچھ چھوڑنے کے لیے تیار ہوں' دھن' دولت' جائیداد' زمینیں' مجھے ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر پتاجی چاہیں تو ان تمام چیزوں سے مجھے بے دخل کر سکتے ہیں۔ مجھے اعتراض نہیں ہوگا لیکن پتاجی کو اسی وقت اپنا فیصلہ سنانا ہوگا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔"

لوگوں نے تالیاں بجائیں اور ویر سنگھ نے منگل سنگھ سے کہا۔

"ہاں منگل کیا کہتے ہو؟"

"مجھے اپنے کیے کا بڑا دکھ ہے' اب ساری باتیں سامنے آ ہی چکی ہیں۔ میں ان سے کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ ہاں اگر مجھے شادی جائے تو معافی مانگتے ہوئے میں اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ میں پورن سنگھ کی شادی رام وتی سے کرنے کے لیے تیار ہوں۔ دھرم داس اب میرا اپنا بھائی جیسا ہے اگر مجھے معاف کر دیا جائے تو اچھا ہے ورنہ پنچایت میرے لیے جو سزا تجویز کرے گی مجھے منظور ہوگی۔ ان کی شادی کے بعد مجھے سزا دے دی جائے۔ میں گاؤں بھی چھوڑ دوں گا۔"

"فیصلہ پنچایت کے ہاتھ ہے اور وہ جو کہا جاتا ہے کہ صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے اور جہاں تک اس مسلمان لڑکے کا تعلق ہے تو اس نے بستی والوں کی آنکھیں کھول دی ہیں اور ایک ہندو لڑکی کی بہن کہہ کر سہاتا کی ہے۔ ہم اسے بہت بڑا مان دیتے ہیں یہ چاہے تو ہمیشہ کے لیے لکھن پور میں رہ سکتا ہے ہم اسے ہر طرح کی سہولت مہیا کریں گے۔ لکھن پور میں بے شمار مسلمان گھرانے موجود ہیں' اگر یہ چاہے تو یہاں بھی کسی جگہ شادی کر کے رہ سکتا ہے۔"

پنچایت ان تمام فیصلوں کے بعد منتشر ہوگئی۔ منگل سنگھ نے آگے بڑھ کر رام وتی کے سر پر ہاتھ رکھا اور دھرم داس کے سینے سے لگا۔ اس نے دھرم داس سے بہت معافیاں مانگی تھیں' دھرم داس اس کے پیروں میں گر گیا۔

"آپ کے چرنوں کی دھول ہوں مہاراج' آپ بھگوان کے لیے مجھے اتنا شرمندہ نہ کریں' ہمیشہ آپ کا تابعدار رہوں گا۔"

میں سرائے واپس آ گیا۔ ایک کام کر چکا تھا اور اس سلسلے میں دل کو بڑا عجیب سا احساس ہوا تھا' اب اگر اس گاؤں میں رہتا تو لوگ میری خدمت کرتے' پتا نہیں کون کون اپنے کیا کیا مسائل لے کر میرے پاس آ جاتا۔ چنانچہ یہاں سے خاموشی سے نکل جانا ہی بہتر تھا اور اس کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ جانتا تھا کہ رام وتی کی شادی اب پورن سنگھ سے ہو جائے گی' مجھے بلاوجہ اہمیت دی جاتی' ان تمام چیزوں سے ہٹ کر مجھے کچھ اور کام کرنا تھا۔ میں نے دل میں یہی فیصلہ کیا تھا کہ اپنا ایک مقام بناؤں گا۔ حیدر شاہ صاحب نے جس طرح اپنا رکھ رکھاؤ رکھا ہے اور جس طرح انہوں نے اپنی آن بان شان بنا رکھی ہے میری آن بان بھی ایسی ہی ہونی چاہیے۔ بلکہ اس سلسلے میں مجھے بہت سے مشورے بھی کرنا تھے اپنے ذہن اور اپنے دماغ سے فی الحال لکھن پور سے نکل جانا زیادہ مناسب تھا۔ چنانچہ رات کی تاریکی میں ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ خاصی رات ہوگئی تھی۔ ریلوے اسٹیشن تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ چنانچہ میں ایک گوشے میں

جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک بیٹھا رہا پھر میں نے اکاؤ کا گنے والوں سے معلوم کیا کہ اب یہاں سے ٹرین کس وقت گزرے گی۔ پتا چلا کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد ٹرین یہاں سے چلنے والی ہے۔ چنانچہ میں تیار ہو گیا۔

پھر تھوڑی دیر کے بعد ٹرین کی روشنی نظر آئی اور اس کے ساتھ ہی وسل کی آوازیں...... میں تیار ہو گیا۔ ٹرین کو یہاں صرف پانچ یا چھ منٹ رُکنا تھا چنانچہ ڈبوں کی کوئی تخصیص نہیں تھی' میں ٹرین کے رُکنے کے بعد ایک ڈبے کی جانب بڑھ گیا اور اس میں داخل ہو گیا۔ ٹکٹ وغیرہ کے لیے میں نے طے کر لیا تھا کہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے' راستے میں لے لوں گا۔

انسان اپنے بارے میں کچھ بھی سوچ لے اس کی حیثیت بس ایک کھلونے جیسی ہے' یہ کھلونا چابی سے چلتا ہے اور یہ چابی کس کے ہاتھ میں ہے' خود انسان حتمی طور پر کیا کہے' شاید تقدیر شاید وقت یا پھر بس میرے چھوٹے سے ذہن میں ان باتوں کے سوا اور کوئی نہیں آ سکتا تھا' ٹرین کے سفر میں اگر آپ تنہا ہوں اور آپ کے پاس کوئی ایسا ماضی ہو جس کے بہت سے پہلو تشنہ ہوں تو اس سے اچھا وقت اور کوئی نہیں گزرتا کہ ماضی میں گم ہو جایئے' نجانے کن کن سوچوں میں گم رہا اور ٹرین کی مدھر آواز کانوں میں گونجتی رہی۔

پھر وہ ایک اسٹیشن پر رکی تھی اور یہ اسٹیشن کسی چھوٹے سے شہر کا تھا۔ پلیٹ فارم تقریباً سنسان ہی پڑا تھا' لیکن چند ہی لمحوں کے بعد کچھ افراد آئے ان کے ساتھ ایک پیر صاحب تھے' بزرگ صورت لمبے لمبے بال' چہرہ البتہ کلین شیو تھا' بڑی بڑی آنکھیں ایک پروقار سی دراز قامت شخصیت تھی' غالباً کوئی نام نہاد پیر وغیرہ تھے انہیں اسی ڈبے میں سوار کرایا گیا جس میں میں بیٹھا ہوا تھا۔ ویسے بھی ڈبے میں میرے علاوہ کوئی آٹھ دس افراد اور ہوں گے پیر صاحب کا سامان ڈبے میں چڑھایا گیا۔ پھر ایک شخص نے ان کے ہاتھ چومے اور اسی وقت ٹرین نے وسل دی۔

پھر دوسری وسل کے ساتھ ٹرین آہستہ آہستہ رینگنے لگی' جو لوگ پیر صاحب کو چھوڑنے آئے تھے وہ جلدی جلدی نیچے اتر گئے اور پیر صاحب نے ایک سیٹ پر قبضہ جما لیا۔ میں یہ تمام کارروائی دیکھ رہا تھا اور دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ روحانی شخصیتیں بھی کیسی ہوتی ہیں' لوگ کس طرح ان کے عقیدت مند بن جاتے ہیں لیکن اس دوران اور بھی بہت سے تجربات ہو چکے تھے' یہ پتہ چل چکا تھا کہ یہ پیری مریدی بھی کاروبار بن چکی ہے اور بہت سے لوگ اس کاروبار سے بڑے فائدے اٹھا رہے ہیں۔ پیر صاحب خاموش بیٹھے کچھ بدبداتے رہے' غالباً کچھ پڑھ رہے تھے' میں نے ان کی جانب سے توجہ ہٹالی اور اپنی سوچوں میں ڈوب گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی اپنے بارے میں سوچتا سوچوں کا تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے دماغ کے راستے بند کرنے پڑتے تھے' بالکل اتفاق سے مجھے جو کچھ حاصل ہو گیا تھا وہ میرے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا' رام وتی کے لیے جو کچھ میں نے کیا تھا اس نے مجھے بڑا سکون بخشا تھا اور زندگی پر ایک اعتماد بھی قائم کیا تھا' گویا اب میں بھی کسی حیثیت کا مالک ہوں اور اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ سوچ سکتا ہوں' بہت سے راز خود بخود مجھ پر منکشف ہو رہے تھے۔ زندگی کیا ہے کیسی ہے اس کا اب بھرپور اندازہ ہوتا جا رہا تھا اور میں اس زندگی سے ناخوش نہیں تھا' سوائے اس کے کہ یہ سوچتا کہ میں عام لوگوں سے ذرا مختلف ہوں' عام لوگوں کے گھر اپنے گھر ہوتے ہیں'

رشتے ناتے ہوتے ہیں' حیدر شاہ کی خوبصورت کوٹھی میں میرا کوئی رشتے دار نہیں تھا' بہت سے لوگ تھے لیکن میں ان سب کی نگاہوں میں ایک بے مقصد سی حیثیت رکھتا تھا۔

کبھی کبھی تو دل چاہتا کہ حیدر شاہ کی کوٹھی میں واپس جاؤں اور بھیروں کی مدد سے ان تمام کے دماغ درست کروں جنہوں نے میرے ساتھ بدسلوکی کی تھی لیکن آپ کو اپنے تجربات سے آگاہ کررہا ہوں' جب انسان کو کچھ مل جاتا ہے اور اس پر اسے اعتماد ہوتا ہے تو دو ہی صورتیں نکلتی ہیں اول تو یہ کہ وہ دوسرے انسانوں پر دنیا تنگ کردے اور اگر خون میں کوئی اچھی بات ہے تو پھر اس کا ظرف بلند ہوجائے اور وہ عام لوگوں سے انتقام نہ لے اور شاید میرا خون اچھا تھا کیونکہ میں نے حیدر شاہ کی حویلی میں رہنے والوں کو معاف کردیا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اب صرف اپنے طور پر سوچا جائے اور زندگی سے لطف اندوز ہوا جائے۔

نجانے کب آنکھ لگ گئی اور میں سو گیا' البتہ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ٹرین کسی اسٹیشن پر رکی' آوازیں لگا کر چیزیں بیچنے والوں نے ساری نیند بھگا دی' میرا کچھ کھانے پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا' میرے پاس تو ہر ذریعہ موجود تھا' جو چاہتا کھا سکتا تھا' ٹرین یہاں تھوڑی دیر رکی تو یہاں سے ایک پیر صاحب سوار ہوئے اور اس کے بعد ٹرین چل پڑی' پتہ نہیں اس کا کتنا سفر رہ گیا تھا' ٹکٹ چیکر آیا تو میں نے اسے رقم دے کر ٹکٹ بنوالیا اور سفر جاری رکھا' نجانے کیا وقت ہوا تھا' میری نگاہیں یونہی پیر صاحب کی جانب اٹھ گئیں وہ موبائل فون پر کسی سے بات کررہے تھے اور ان کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے' آوازیں مدھم تھیں' لیکن مجھے سنائی دے رہی تھیں' وہ کہہ رہے تھے۔

''پورے اعتماد سے کہہ رہے ہو' نشاندہی میری ہی ہوئی ہے' دیکھو کچھ کرتا ہوں' یہ تو بڑی خطرناک بات ہے ایسا ہونا نہیں چاہیے' میں جانتا ہوں یہ کس خنزیر نے کیا ہے' خیر تم لوگ اسٹیشن پر الرٹ رہو' میں کوشش کرتا ہوں کہ سب ٹھیک ہوجائے' اوکے اوکے۔''

انہوں نے فون بند کردیا' میں ان کے چہرے پر شدید تشویش محسوس کررہا تھا' دفعتاً ان کی نگاہیں میری جانب اُٹھ گئیں' وہ مجھے دیکھتے رہے پھر انہوں نے اپنے پاس رکھے ہوئے ایک تھرماس سے کافی کے دو کپ بھرے اور میری طرف متوجہ ہوگئے۔

''ہیلو۔'' انہوں نے مجھے مخاطب کیا اور میں چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

''جی فرمایئے۔''

''ادھر آؤ بیٹے' میرے ساتھ ایک پیالی کافی پیئو۔''

میں خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس جا بیٹھا' انہوں نے مجھے کافی دی اور خود بھی چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگے پھر بولے۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''جہانو۔''

''صرف جہانو؟''

''ہاں' نام تو جہانزیب رکھا گیا تھا' لیکن وقت نے جہانو بنادیا۔''

''واہ...... جہانو بیٹے بہت ہی گہرا راز سونپ رہا ہوں تمہیں' کیا تم میرے ساتھ رازداری برت سکتے ہو۔''

''کہیے۔''

''دیکھو...... یہ میرے دو سوٹ کیس ہیں' ان میں سے ایک میں تمہاری تحویل میں دے رہا ہوں' اصل میں کچھ لوگوں نے مجھ پر الزامات لگائے ہیں' میں ان الزامات سے بچنا چاہتا ہوں' بیٹے یہ سوٹ کیس تم اپنے پاس رکھ لو' اسٹیشن پر اسے لے کر نیچے اترنا' تمہاری

طرف کوئی توجہ نہیں دے گا لیکن مجھ پر غور کیا جائے گا' اس سوٹ کیس کو لے کر تمہارا جہاں دل چاہے چلے جانا' میں خود تم سے رابطہ قائم کرلوں گا اور اسے لے لوں گا' بولو یہ کام کر سکتے ہو میں کہنا نہیں چاہتا لیکن میں تمہیں اس کا بہترین معاوضہ دوں گا' براہ کرم مجھ سے سوالات مت کرنا' بس جواب دو کیا ایسا کر سکو گے؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا اور پیر صاحب خوش ہو گئے' پھر بولے "تم کون ہو کیا ہو اس کی تفصیل میں بعد میں تم سے پوچھ لوں گا' میری دعا ہے کہ تمہیں اس میں کامیابی حاصل ہو۔"

بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی' اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑا وقت گزار لیا تھا تنہا رہ کر' بہت کچھ دیکھ لیا تھا لیکن ابھی زندگی کے اتنے شعبے باقی تھے کہ بہت سی چیزوں سے واقفیت نہیں تھی۔ ٹرین کا سفر جاری رہا' میں اپنی جگہ آ بیٹھا تھا' پیر صاحب کی عنایتیں شروع ہو گئیں' ان کے پاس ایک بڑی سی باسکٹ تھی جس میں کھانے پینے کی چیزیں اور پھل وغیرہ رکھے ہوئے تھے' وہ میری تواضع کرتے رہے اور میں مسکرا مسکرا کر اس تواضع کو قبول کرتا رہا' میں پیر صاحب کی ایسی تواضع کر سکتا تھا کہ وہ بھی یاد رکھتے لیکن ہر جگہ اپنے آپ کو اس حیثیت سے نمایاں کرنا مناسب نہیں ہوتا' چنانچہ میں نے اپنے آپ کو محدود رکھا۔ آخر کار یہ سفر ختم ہوا اور ٹرین آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اسٹیشن پر جا رکی' لیکن اس کے ساتھ ہی جو کچھ بھی ہوا وہ بڑا سنسنی خیز تھا' اچانک ہی بے شمار پولیس والوں نے ہمارا یہ ڈبہ گھیر لیا' دو تین بڑے بڑے پولیس افسر بھی تھے جو پھرتی سے ٹرین میں گھس آئے' ان کے ہاتھ میں بھرے ہوئے پستول تھے مجھے ایک دم سے احساس ہوا کہ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے' میں نے خاموشی سے بھیروں کو آواز دی۔

"بھیروں' ظاہر مت ہونا پوشیدہ طور پر میرے پاس آؤ۔"

"میں موجود ہوں۔" بھیروں کی آواز میرے کانوں میں ابھری۔

"یہ سوٹ کیس نگاہوں سے غائب کر دو اور اسے لے کر نیچے اتر جاؤ۔" میں نے سوٹ کیس کی جانب اشارہ کیا' میں نے خاص طور سے محسوس کیا تھا کہ پولیس والے پیر صاحب کی طرف متوجہ ہیں' پیر صاحب حیران نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے' بڑے پولیس افسر نے لوگوں سے کہا۔

"سنیئں آپ لوگ پریشان نہ ہوں' ہمیں ایک بہت بڑے اسمگلر کی تلاش ہے جو آپ لوگوں میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے' براہ کرم اپنا اپنا سامان یہیں چھوڑ دیں اور لائن بنا کر نیچے اتریں' ایک ایک کر کے لائن بنا کر کھڑے ہو جائیں' ہم آپ سے معافی مانگ لیں گے لیکن پولیس کو اپنا کام کرنا ہے۔"

میری نگاہ پیر صاحب کے دیئے ہوئے سوٹ کیس کی جانب اٹھی تو میں نے اسے غائب پایا اور میرے ہونٹوں پر مدہم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ بھیروں نے اپنا کام سرانجام دے دیا تھا' بہر طور پیر صاحب بھی نیچے اتر گئے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ پولیس والوں کی توجہ ان کی طرف ہے۔ پھر کمپارٹمنٹ میں مسافروں کا جو جو سامان تھا وہ احتیاط سے پولیس والے نیچے لانے لگے اور اس کو بھی ایک لائن میں رکھ دیا گیا' پھر بڑے پولیس افسر نے کہا۔

"آپ میں سے جس جس کا جو جو سامان ہے براہ کرم اس کی نشاندہی کر دیجیے۔"

مسافروں نے پریشانی کے عالم میں اپنے اپنے سامان کی طرف اشارہ کر دیا اور اس کے بعد پولیس والے اس سامان کو کھول کھول کر دیکھنے لگے' بہت

سے پولیس والوں نے دوسرے مسافروں کو دور ہٹا دیا تھا اور ایک میگافون پر ان سے کہا گیا تھا کہ کوئی قریب نہ آئے ورنہ نقصان اٹھا سکتا ہے۔ سامان کی تلاشی لی جانے لگی' پیر صاحب خاموش کھڑے ہوئے تھے' مجھ سے میرے سامان کے بارے میں پوچھا گیا تو میں نے کہا کہ اس میں میرا کوئی سامان ہے ہی نہیں' پیر صاحب مجھ سے کافی فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے میری جانب توجہ نہیں دی اور لاتعلق سے کھڑے رہے۔ ان کی تلاشی لی گئی اور پھر وہ اپنے اس سوٹ کیس کے ساتھ آگے بڑھ گئے جو انہوں نے اپنے پاس رہنے دیا تھا۔ انہوں نے میری جانب توجہ بھی نہیں دی تھی' میری بھی تلاشی ہوگئی اور پولیس والوں نے مجھے بھی آگے جانے کی اجازت دے دی۔ میں تھوڑی دور آیا لیکن پیر صاحب کا کہیں پتہ نہیں تھا' میں بھیروں کے اس کارنامے پر بہت خوش تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ کوئی بہت ہی گہرا معاملہ معلوم ہوتا ہے چونکہ پولیس افسر نے کسی اسمگلر کی تلاش کے بارے میں کہا تھا۔

خیر اب اتنی سمجھ تو آ گئی تھی کہ صورت حال کا اندازہ ہو سکے' یقینی طور پر پولیس کو کسی اسمگلر کے بارے میں علم ہوا تھا' لیکن پیر صاحب نے جب فون پر بات کی تھی تو کسی نے انہیں بتا دیا تھا شاید ان کے آدمیوں نے ان کی مخبری ہوگئی ہے' یہ پیر صاحب یقینی طور پر کوئی بڑے اسمگلر ہی تھے میں سوچتا رہا اور مسکراتا رہا اس کے بعد ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔ سامان تو میرے پاس کوئی تھا نہیں' لیکن میں جانتا تھا کہ جب بھی چاہوں بھیروں مجھے وہ سوٹ کیس واپس کردے گا' خیر میں آگے بڑھتا رہا اور سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔''

رقم کا کوئی معاملہ نہیں تھا' ریلوے اسٹیشن سے کچھ تھوڑے فاصلے پر ہی مجھے الائیڈ ہوٹل کا بورڈ نظر آیا' دور سے ہی اچھا خاصا ہوٹل معلوم ہوتا تھا میں اس کی جانب بڑھ گیا اور اس کے بعد ہوٹل میں ایک کمرا حاصل کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں کمرے میں پہنچ گیا' بہت ہی کشادہ اور صاف ستھرا کمرہ تھا' اس کا پیشگی کرایہ میں نے ادا کردیا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر سب سے پہلے میں نے غسل خانے میں جا کر غسل کیا اور اس کے بعد ویٹر کو بلا کر اپنے لیے کھانے پینے کی چیزوں کا آرڈر دے دیا' یہ زندگی بہت دلچسپ اور دلکش تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتہ' کھانا پینا اور عیش کرنا لیکن اس کے بعد مجھے وہ سوٹ کیس بھی یاد آ گیا' دیکھنا تو چاہیے کہ آخر سوٹ کیس میں ہے کیا' میں نے بھیروں کو آواز دی اور بھیروں ایک لمحے میں حاضر ہوگیا۔

''کہاں ہے سوٹ کیس؟'' میں نے کہا اور بھیروں نے ایک طرف اشارہ کردیا' سوٹ کیس ایک طرف رکھا ہوا تھا۔

''دروازہ بند کردے اور بہت بہت شکریہ تیرا۔''

بھیروں چلا گیا' دروازہ خود بخود اندر سے بند ہوگیا تھا۔ میں نے سوٹ کیس کا جائزہ لیا اور اس کے بعد اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا' نمبروں والا تالا لگا ہوا تھا۔ مجھے خاصی پریشانی ہوئی لیکن آخر کار میں سوٹ کیس کا نمبر تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا اور پھر میں نے سوٹ کیس کھول لیا اندر ایک بہت ہی خوبصورت چھوٹا سا بکس رکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی سفید سفید پاؤڈر کی تھیلیاں رکھی ہوئی تھیں' ایک لمحے میں میرے ذہن نے نعرہ لگایا۔ 'ہیروئن' سو فیصدی ہیروئن' اب اتنی ناواقفیت بھی نہیں رہی تھی اسمگلر کی بات میں سن چکا تھا' بکس کو کھول کر دیکھا تو

آ نکھیں چندھیا گئیں' اس میں بہت سے ہیرے رکھے ہوئے تھے۔ میرے اپنے خیال میں یہ کروڑوں کی مالیت کا سامان تھا' ساتھ ہی کچھ اور کاغذات وغیرہ بھی رکھے ہوئے تھے میں نے ان کاغذات کو نکال کر دیکھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا' کچھ حساب کتاب لکھا ہوا تھا ان پر' میں دیر تک ہیروں کو دیکھتا رہا۔ ایک بات میں آپ سے عرض کروں تو شاید آپ کو حیرانی ہو وہ یہ کہ میرے دل میں دولت کا کوئی لالچ نہیں تھا' پتہ نہیں کیوں ایک فراخدلی سی پیدا ہوگئی تھی' میرے پاس ابھی وہ قوت موجود تھی جس کی بناء پر میں اپنی کئی خواہشیں پوری کراسکتا تھا اس قوت سے کام لے کر میں جو چاہتا حاصل کر لیتا' جبکہ میں نے چاچی کو بھی اسی قوت سے کام لے کر بہت کچھ دیا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے اور پھر اچانک ہی ایک خیال نے میرے ذہن میں گھر کر لیا پیر صاحب بہت بڑے اسمگلر ہیں' میں اگر ان سے رابطہ قائم رکھوں تو کیسا رہے گا مزہ آئے گا' لیکن ایک اور خیال بھی میرے دل میں تھا وہ یہ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی خطرے میں پڑ جاؤں' بہت سوچنے کے بعد آخر کار میں نے ایک فیصلہ کیا اور ایک بار پھر بھیروں کو تکلیف دی۔

''بھیروں کہاں ہو تم؟''

''موجود ہوں۔'' بھیروں کی ناخوشگوار آواز سنائی دی' ظاہر ہے وہ زبردستی کا غلام تھا اپنی خوشی سے میرے پاس نہیں آیا تھا بلکہ میری چالاکی نے اسے میرا غلام بنا دیا تھا۔

''یار یہ سوٹ کیس کچھ وقت کے لیے غائب کر دو اور سنو میں تمہیں تکلیف دیتا رہوں گا۔''

بھیروں نے برا سا منہ بنایا اور آگے بڑھ کر سوٹ کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا پھر وہ سوٹ کیس سمیت نگاہوں سے گم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

دنیا سے اب ناواقفیت ختم ہوگئی تھی۔ عمر کے بارے میں میں نے کبھی نہیں سوچا تھا' کتنی ہوگئی ہے' کتنی باقی ہے' مسائل ہی دوسرے تھے لیکن انہیں مسائل کہنا مناسب نہیں تھا' تقدیر نے اور وقت نے اس قدر آسانیاں اور آسائشیں بخش دی تھیں وہ بھی قسمت اور قدرت تھی' طبیعت میں لالچ بالکل نہیں تھا' بلکہ بچپن ہی سے نہیں تھا' وہاں کوٹھی میں مجھ پر جو گزرتی تھی اسے اپنی ذات تک ہی محدود رکھتا تھا۔ ہاں طبیعت میں ایک انتقامی کیفیت ضرور تھی اور کسی سے مار نہیں کھاتا تھا' البتہ راستے ذرا مشکل تھے' لیکن اب قدرت نے وہ راستے آسان کر دیئے تھے۔

فطرت کی تشکیل کبھی کبھی خود ہی ہو جاتی ہے' جس کا مظاہرہ میں اس لڑکی کی مدد کر کے کر چکا تھا' اپنا تجزیہ کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ عمل کر کے ایک سکون حاصل ہوا ہے' گویا زندگی میں اگر انسانیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے تو سکون ہمیشہ مناسب ہوتا ہے۔ ہوٹل میں جو وقت گزار رہا تھا وہ بس نارمل ہی سا تھا' دل نہیں لگ رہا تھا' بہت ساری چیزوں سے ابھی ناواقفیت تھی کیونکہ اپنی اوقات کو کبھی نہیں بھولا تھا' غور کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ انسان سب سے مشکل وقت وہ گزارتا ہے جب وہ تنہا ہوتا ہے' پھر یہ تنہائی کیسے دور کی جا سکتی ہے' کوئی دوست' کوئی ایسا بے تکلف دوست جس سے دل کی ہر بات کہی جا سکے' مگر ایسا کون ہو سکتا ہے' کچھ وحشت سی سوار ہونے لگی طبیعت پر۔ وہ پیر صاحب جو ڈنڈا پیر تھے اوپر سے کچھ اندر سے کچھ اپنی ایک سوغات مجھے دے گئے تھے جسے میں نے دیکھ ہی لیا تھا لیکن لعنت بھیجتا تھا' میرے

پاس سب کچھ آچکا تھا' خاص طور سے بھیروں کی شکل میں' اس کا مظاہرہ بھی ہو چکا تھا' چنانچہ مجھے اس چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ غرض یہ کہ تیار ہو کر ہوٹل سے باہر آ گیا۔

طبیعت پر وہی بوجھل پن سوار تھا' سڑک پر کافی دور تک پیدل چلتا رہا۔ ٹریفک رواں دواں تھا' میں نے سوچا کہ کوئی ٹیکسی لوں اور شہر کی سیر کروں' کوئی خاص پروگرام تو ہے نہیں' بس یونہی آوارہ گردی کی جائے' ایک جگہ کھڑے ہو کر ٹیکسی کا انتظار کرنے لگا' ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ ایک ٹیکسی میرے سامنے سے گزری اور مجھ سے کوئی دس بارہ گز کے فاصلے پر جا کر رک گئی' پھر وہ ریورس ہو کر میرے پاس آ کر رکی' ڈرائیور نے گردن جھکا کر میرا جائزہ لیا' ایک لمحے تک دیکھتا رہا' اسی وقت میں آگے بڑھا اور میں نے اس سے کہا۔

''چلو گے۔''

ڈرائیور جیسے کسی سوچ میں گم تھا' بے اختیار بولا۔

''جی جی صاب' چلے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے پچھلے دروازے کا لاک کھول دیا' لیکن میں پیچھے نہیں بیٹھا' بلکہ ڈرائیور کے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور اب بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا کیا بات ہے؟'' میں نے سوال کیا تو وہ جیسے کسی خواب سے جاگ گیا۔

''نہیں صاب کچھ نہیں صاب' کدھر چلے؟'' اس نے سوال کیا لیکن مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی خاص بات ہے وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا ہے' میں نے اس کا جائزہ لیا' نوجوان اور خوش شکل آدمی تھا صورت سے ڈرائیور نہیں لگتا تھا' ویسے بھی مجھے معلوم تھا کہ آج کل بیروزگاری ہے اور اچھے اچھے پڑھے لکھے نوجوان ہر طرح کی مزدوری کر رہے ہیں' اس نے ٹیکسی آگے بڑھا دی تو میں نے اس سے کہا۔

''یار کوئی خاص بات ہے' تم میرے اشارے پر نہیں رُکے تھے بلکہ تم نے خود ٹیکسی روکی تھی اور ریورس کر کے پیچھے آئے تھے' کوئی خاص بات ہے تو مجھے بتاؤ۔''

''نہیں صاب کوئی خاص بات نہیں ہے' میرے کو معافی دو۔''

''ارے ارے بھائی معافی کی اس میں کیا بات ہے' چلو مت بتاؤ میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔''

''کدر چلے صاب۔'' اس نے کہا۔

''یار میں تمہیں ایک بات بتاؤں' میری کوئی منزل نہیں ہے' بس کسی ایسی جگہ لے چلو' جہاں تھوڑا سا دل بہل جائے۔''

میرے ان الفاظ پر ڈرائیور ایک دم چوکس ہو گیا۔ اس کے چہرے پر کسی قدر ناگواری کے آثار نظر آئے' گاڑی کی رفتار اس نے آہستہ کر دی اور پھر آہستہ آہستہ کرتے ہوئے سڑک کے کنارے روک دیا۔

''تمہارے سے معافی چاہتا ہے صاب' آپ نے جو بولا ہم اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا' اگر آپ میرے کو یہ بولتے ہو کہ میں آپ کو کسی دل بہلانے والی جگہ لے جاؤں تو صاب معافی چاہتا ہوں بہت ساری۔ میں اس دھندے کا بندہ نہیں ہوں' آپ ادھر سے دوسرا ٹیکسی کر لو۔''

''کونسا دھندہ؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''صاب دل بہلانے والا دھندہ۔'' میں سوچتا رہا اور پھر صورت حال میری سمجھ میں آ گئی' پھر میں بہت زور سے ہنسا۔

''نام کیا ہے تمہارا یار۔''

''فرید خان۔''

''فرید خان' مسلمان ہو میں بھی مسلمان ہوں' خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری بات کا مطلب یہ نہیں تھا کہ تم مجھے کسی غلط جگہ۔ لے جاؤ' بالکل یہ مطلب نہیں تھا میرا۔ معافی چاہتا ہوں کہ تم غلط سمجھے' اصل میں ایک تنہا آدمی ہوں' کوئی نہیں ہے میرا' ایک ہوٹل میں رہتا ہوں' بس دل بہت اداس تھا' اس بات پر میں نے کہا تھا کہ کسی بھی ایسی جگہ لے جاؤ جہاں دل بہل جائے' کوئی ہنسنے بولنے والی جگہ۔'' میں ایک دم سنجیدہ ہو گیا تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''خدا کا قسم صاب' میں آپ کو ایک بات بولے' آپ چہرے سے بہت اچھا لگتا ہے' میرا آپ سے ایک رشتہ بھی ہے صاب اب میں آپ کو بتائے گا۔ میں یہی سمجھا اور میرے کو بہت دکھ ہوا کہ میرا دوست سلطان پیسہ حاصل کرنے کے بعد اتنا برا ہو گیا۔''

''تمہاری ایک بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''صاب میں ایک بات آپ کو صاف بولوں' آپ نے ٹیکسی نہیں روکا تھا' میں خود رکا تھا آپ کی شکل دیکھ کر' آپ کا صورت میرے دوست سلطان سے ملتا ہے۔ ہم لوگ آٹھویں کلاس تک ایک ساتھ پڑھتا رہا' پھر اس کے بھی حالات خراب ہو گئے' میرے بھی باپ کا انتقال ہو گیا اور صاب ہم دونوں اپنے اپنے گھر کو بچانے کے چکر میں لگ گئے۔ میں نے ڈرائیوری سیکھ لی اور وہ کوشش کر کے ملک سے باہر چلا گیا' شارجہ دبئی یا پتہ نہیں کدھر' پھر اس نے میرے کو یاد نہیں کیا' نہ کبھی کوئی خط لکھا نہ دوبارہ مجھ سے ملا' اس کے گھر والے بھی بس دو بندے تھے' اس کے ماں اور باپ' وہ بھی پتہ نہیں کدھر چلے گئے' آپ کا شکل اس سے اتنا ملتا ہے کہ میں آپ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا' پر آپ کا عادات اس سے نہیں ملتا۔ بس صاب یہ چھوٹا سا کہانی ہے۔''

''ارے یار فرید خان' میں تمہارے دوست کا ہم شکل ہوں نا؟''

''جی صاب یہی بولا ہے۔''

''تو یار مجھے اپنا دوست بنا لو۔'' میں نے کہا اور فرید خان کے چہرے پر عجیب سے آثار نظر آنے لگے' یوں لگا جیسے وہ رو پڑے گا۔

''ساتھ دے گا صاحب' فرید خان دوستوں کے لیے جان دینے والوں میں سے ہے۔''

''ہاں ساتھ دوں گا تیرا فرید خان فکر کیوں کرتا ہے۔'' میں نے کہا تو اس نے گردن جھکا لی۔ میں نے اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے ہوئے دیکھے تھے۔ انسان کتنا ہی معصوم کتنا ہی بے ضرر اور کتنا ہی کمزور ہو' چاہے اپنے آپ کو کچھ بھی سمجھ لے لیکن کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں جب وہ ایک بے بس انسان بن کر رہ جاتا ہے۔ میں نے ایک دوست کی خواہش کی تھی اور قدرت نے میری یہ خواہش بھی پوری کر دی تھی مجھے لگ رہا تھا کہ فرید خان ایک اچھا انسان ہے اور میرا ساتھ دے گا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ دیکھو ایسا ابھی ہوتا ہے' میں تمہارے دوست کا ہمشکل ہوں اور میری تمہاری دوستی ہو گئی ہے۔ میرا نام جہانزیب ہے مگر مجھے جہانو کہا جاتا ہے اور تم تو ہو ہی فرید خان۔''

میں نے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے بھی اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور ہم لوگ ایک دوسرے سے گرم جوشی سے ملے۔ فرید خان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''واہ مالک دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ یار مل گیا مجھے میرا۔'' پر صاحب مجھے حیرت ہے اللہ تعالیٰ سلطان کو زندہ سلامت رکھے اسے ہر خوشی دے اس نے برا کیا۔ پیسہ ملنے کے بعد اس کا ذہن بدل گیا تو

صاب ایسا ہونا نہیں چاہیے۔

''ہاں فرید خان بات تو یہی ہے ایسا ہونا نہیں چاہیے' لیکن کیا کیا جائے اس دولت نے انسان کو انسان سے بہت دور کر دیا ہے۔ بس کیا کہا جائے اور کیا نہ کہا جائے۔''

''آپ بالکل ٹھیک بولتے ہو صاحب۔''

''چلو کہیں بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔'' میں نے تجویز پیش کی تو فرید خان ہچکچائی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر ایک دم سے ہنس پڑا۔

''کدھر کھانا کھاؤ گے صاحب۔''

''کسی بھی ہوٹل میں اور تم مجھے دوست کہتے ہو تو پھر صاحب مت کہو دوستی زخمی ہو جاتی ہے۔'' میں نے یہ بات دل سے کہی تو فرید خان نے بریک دبا دیا۔

''ٹھیک ہے جہانو کہوں گا تمہیں۔'' وہ بے تکلفی سے بولا اور مجھے ایک دم خوشی ہوگئی۔

''ہاں کیا کہہ رہے تھے؟''

''آج گھر کا دال روٹی کھاؤ...... دال روٹی کا مزہ ہی الگ ہوتا ہے' صاحب اگر وہ بہن کے ہاتھ کا پکا ہو۔''

''ارے واہ کہاں ملے گی یہ دال روٹی۔''

''آپ کے دوست کے گھر۔ آپ بولتے تھے نا صاحب کہ کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں دل بہل جائے۔ تو دل بہلانے کی سب سے اچھی جگہ میرا گھر ہے صاحب جدھر میری ماں ہے' میری دو چھوٹی بہنیں ہیں' چھوٹا بھائی ہے ایک۔ آپ دیکھ لینا صاحب سب آپ کو سلطان بھائی سلطان بھائی بولے گا۔ پر میں ان کو بتا دوں گا کہ یہ سلطان نہیں جہانو ہے۔''

''ٹھیک ہے چلو ادھر چلو۔'' میں نے بھی موڈ میں آ کر کہا اور فرید خان نے ٹیکسی ایک طرف موڑ دی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک کچی آبادی میں پہنچ گئے جہاں چھوٹے کچے پکے مکانات بنے ہوئے تھے۔ انہی میں سے ایک مکان کے سامنے فرید خان نے ٹیکسی روک دی۔

''یہ اپنا راج محل ہے صاحب۔'' اس نے ہنستے ہوئے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔

''چلو پھر راج محل میں چلتے ہیں۔'' میں بولا اور تھوڑی دیر کے بعد ہم اس چھوٹے سے گھر میں داخل ہو گئے جس کا صحن کچا تھا اور کچے صحن میں کئی چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ صحن کے بعد ایک دالان تھا جس میں تخت بچھا ہوا تھا۔ دالان کے بعد دو یا تین کمرے جو دروازے سے داخل ہوتے ہی نظر آرہے تھے۔ باورچی خانے میں ایک سولہ سترہ سال کی لڑکی کچھ پکا رہی تھی۔ فرید خان کے ساتھ اس طرح بے دھڑک مجھے داخل ہوتے دیکھ کر اس نے جلدی سے دوپٹہ سر پر کھینچ لیا۔ فرید خان نے آواز دی۔

''اماں او اماں...... باہر آؤ۔ دیکھو کون آیا ہے۔''

ایک بزرگ عورت باہر آگئی اور مجھے دیکھتے ہی زور سے چیخی۔

''ارے سلطان آ گیا تو کمینے؟'' بوڑھی عورت آگے بڑھی اور اس نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ بس انسان جذبات کا پتلا ہے۔ میں بتا نہیں سکتا آپ کو کہ اس کے سینے پر سر رکھ کر مجھے کتنا سکون حاصل ہوا تھا۔ ماں کائنات میں کہیں بھی ہو ماں ہی ہوتی ہے اور اس کے سارے وجود سے ممتا پھوٹتی ہے۔ اگر محسوس کرنے والا ہو تو اسے ہر جگہ محسوس کر لیتا ہے' اندھے کو کیا نظر آئے۔

میرا دل چاہا کہ وہ مجھے بہت دیر تک سینے سے لگائے رکھے' ماں سے محروم تھا۔ ایک نقلی ماں ملی تھی جو ماں تھی ہی نہیں اور اس نے کبھی مجھے سینے سے نہیں لگایا تھا۔ فرید خان' ہم دونوں کو دیکھتا رہا اور اس کے بعد اندر

سے ایک چھوٹی بچی اور ایک بچہ بھی باہر آ گیا۔
"ارے ارے تم لوگ اسکول نہیں گئے آج؟"
"نہیں بھیا جی جلدی چھٹی ہو گئی تھی۔" لڑکی نے جواب دیا اور پھر میری طرف رخ کر کے بولی۔
"سلطان چاچا آپ۔"
میں خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔ ماں بولی۔
"آ بیٹھ کہاں چلا گیا تھا تو' بڑا بے وفا نکلا۔ ہم تو سوچ رہے تھے کہ اب تو ہمیں کبھی نہیں ملے گا۔"
اچانک ہی میرے ذہن میں خیال آیا اور میں نے فرید خان کو اشارہ کیا۔ فرید خان میرے قریب آ گیا تھا۔
"فرید خان میری ایک بات مان لو گے۔"
"ہاں ہاں بولو جہانو۔"
"مجھے سلطان ہی رہنے دو سمجھے۔ یہ لوگ مجھے سلطان سمجھ رہے ہیں تم مجھے سلطان کہہ کر ہی پکارو میں ان کا دل نہیں توڑنا چاہتا۔ ساری بات انہیں بتاؤ گے تو یہ دکھی ہو جائیں گے۔"
فرید خان بھی جذباتی آدمی تھا۔ ایک لمحے تک میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔
"ٹھیک ہے مگر میں تمہیں جہانو ہی کہوں گا۔"
"بعد میں دیکھ لیں گے کہ کیا ہو گا۔"
بہر حال کچن میں کھانا پکاتی ہوئی لڑکی باہر نکل آئی تھی اور سلطان بھیا کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ میں تجزیہ کر رہا تھا' حیدر شاہ صاحب کی شاندار حویلی کا اور اس چھوٹے سے گھر کا۔ درحقیقت یہ گھر اس حویلی سے کہیں زیادہ بڑا تھا کیونکہ یہاں محبتیں بستی تھیں۔
دالان میں تخت پر بیٹھ کر پالک کا ساگ اور آلو روٹی کے ساتھ کھائے تو جو لطف آیا اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے ضرورت سے زیادہ کھا لیا۔ پھر بولا۔

"فرید خان یار اب میں کسی قابل نہیں رہا ہوں۔ میں لیٹ کر سو جاؤں گا۔"
"تو بھیا کہنے کی کیا بات ہے۔ آرام کرو۔" فرید خان نے کہا۔
دالان کے تخت پر میرے لیے بستر لگا دیا گیا اور میں لیٹ گیا۔ ذہن نجانے کن کن خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ لوگ میرے آنے سے کتنا خوش تھے' میں دیکھ کر ہی حیران تھا اور دل میں مَیں نے سوچ لیا تھا کہ یار فرید خان میں تو تنہا آدمی ہوں بے بس اور بے سہارا' لیکن تیری زندگی اب بدلنی چاہیے اور یہ کام میرے لیے بالکل مشکل نہیں تھا۔
فرید خان نے بھی ٹیکسی بند کر دی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنا دھندا چھوڑ کر صرف میری محبت میں یہاں آ گیا ہے۔
میں کافی دیر تک سویا۔ جاگا تو نور جہاں نے چائے میرے سامنے رکھ دی۔ نور جہاں اس بڑی لڑکی کا نام تھا جس نے مجھے پیار سے بھیا کہہ کر مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ باقی چھوٹے بچے تھے اتنا پیار کر رہے تھے مجھے' ماں نے کہا۔
"نیند پوری ہو گئی تیری سلطان۔"
"جی ماں جی!"
"کیا بات ہے تیری آواز کچھ بدل سی گئی ہے۔ سنا ہے بہت بڑا آدمی ہو گیا ہے۔"
"بڑے آدمی کی آواز بدل جاتی ہے ماں جی۔"
"آواز بھی بدل جاتی ہے اور انداز بھی بدل جاتا ہے۔" عمر رسیدہ عورت نے کہا۔
"میرا انداز کچھ بدلا ہے۔"
"نہیں لگ تو ویسا ہی رہا ہے' مگر غائب کہاں ہو گیا تھا۔"
"بس ماں جی بہت سے جھمیلوں میں پھنس گیا

تھا آپ لوگ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے آپ سے جان چھڑائی ہے۔"

"ہاں سوچ تو یہی رہے تھے۔ پر آج تو واپس آ گیا بالکل پہلے جیسا ہی لگ رہا ہے سوائے اس کے کہ تھوڑا سا موٹا ہو گیا ہے اور آواز بدل گئی ہے۔"

"اور یہ اندازہ نہیں لگایا آپ نے ماں جی کہ تھوڑا سا چھوٹا بھی ہو گیا ہے۔" فرید خان نے کہا۔

"ارے ہاں ہاں واقعی' یہ اپنی عمر سے کم لگنے لگا ہے۔ مگر باہر کی ہوا ایسی ہی ہوتی ہے انسان کا حلیہ ہی بدل دیتی ہے خیر اب یہ بتا کہ تو کب آیا ہے۔"

"کل ہی تو آیا ہوں ماں جی' پریشان پھر رہا تھا کہ مجھے میرا دوست نظر آ گیا۔"

"کیوں ادھر نہیں آ سکتا تھا کیا؟"

"بس شرم آ رہی تھی ادھر آتے ہوئے۔"

"شرم......"

"ہاں!"

"کیوں؟"

"ماں جی اتنے دنوں سے نہ میں نے کوئی خط لکھا نہ یہاں آیا۔ بس یونہی اسی لیے شرم آ رہی تھی۔

"بات تو واقعی شرمانے کی ہے' ہم نے تجھے اپنے سے الگ کب سمجھا ہے؟"

"تو پھر معاف کر دو نا۔"

"ارے وہ تو تیری شکل دیکھتے ہی تجھے ہم نے معاف کر دیا تھا۔ صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا تھوڑی کہتے ہیں۔" بزرگ عورت نے کہا۔

میں درحقیقت خوش ہو گیا تھا۔ جتنا اداس اور تنہا پھر رہا تھا اب یہ اداسی اور تنہائی نہیں رہی تھی۔ دو بہنیں اور ایک بھائی مل گیا بلکہ دو بھائی مل گئے تھے۔ فرید خان بھی مجھے اپنے سگے بھائیوں کی طرح چاہنے لگا تھا اور ماں جی بھی۔

دو تین دن تک میں گھر سے باہر نہیں نکلا۔ فرید خان نے بھی ٹیکسی بند رکھی تھی' میں نے ہنستے ہوئے اس سے کہا۔

"یار فرید خان ایک بات بتا۔ میرے لیے تو نے اپنا کاروبار ہی بند کر دیا۔"

"تیرے لیے تو میں اپنی سانسیں بھی بند کر سکتا ہوں جہانو۔ تو کیا سمجھتا ہے مرد ہوں میں بھی مرد۔"

"وہ تو ٹھیک ہے میرے مرد بھائی لیکن یہاں گھر کے اخراجات کا بھی تو مسئلہ ہوتا ہے۔"

"پیسے پڑے ہیں میرے پاس اچھے خاصے۔ تھوڑے تھوڑے کر کے جمع کر رہا ہوں' ٹیکسی کے مالک کو اپنے پاس سے دے دوں گا تھوڑے سے پیسے۔ اس کے بعد دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔"

"کس کی ٹیکسی ہے؟"

"ہے یار ایک بابا۔ بڑا ہی کنجوس' بڑا ہی کمینہ ہے۔ کیا بتاؤں۔ ویسے یہ ایک خاص نسل ہوتی ہے جہانو جو فطری طور پر بڑے ذکیل ہوتے ہیں اور انسان کو انسان نہیں سمجھتے۔"

"فرید خان دیکھو میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ بالکل تنہا ہوں۔ ہمارے تمہارے درمیان بہت سے رشتے قائم ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک ہم دونوں ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔"

"لے میں تو سب کچھ بتا چکا ہوں تجھے اپنے بارے میں۔"

"ہاں مگر تم نے مجھ سے میرے بارے میں کبھی نہیں پوچھا۔"

"میں نے تجھے آدھا سلطان سمجھا ہے اور آدھا جہانو۔ سلطان کے بارے میں مجھے سب کچھ معلوم ہے جہانو کو جب وقت ہوگا مجھے اپنے بارے میں بتا

دے گا۔"

"چلو پھر آج ایک کام کرتے ہیں ٹیکسی کے مالک کو ٹیکسی کا تین دن کا بھاڑا دے آتے ہیں اور اس کے بعد بیٹھ کر باتیں کریں گے کچھ تھوڑی سی۔"

"جیسے تمہاری مرضی طبیعت اکتا گئی ہوگی گھر سے۔"

"نہیں فرید خان اس گھر سے طبیعت کبھی نہیں اکتا سکتی۔"

"ارے واہ۔ کیا اچھی باتیں کر رہے ہو تم۔"

"تو پھر چلیں باہر نکلیں۔"

"ہاں کیوں نہیں۔"

میں تیار ہوا۔ فرید خان بھی تیار ہو گیا اور اس کے بعد ہم باہر نکل آئے۔ میں نے کہا۔

"چلو پہلے اسے پیسے دے دیتے ہیں کیا سوچ رہا ہوگا تمہارے بارے میں۔"

"جان نکل رہی ہوگی سوچ رہا ہوگا ٹیکسی لے کر بھاگ گیا ہوں میں آؤ چلتے ہیں اس کے پاس۔"

ہم دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر چل پڑے۔ ایک خاص علاقے میں پہنچنے کے بعد ہم ایک گیراج کے سامنے رکے تو دو تین لڑکے جو گیراج میں کام کر رہے تھے زور زور سے چیخنے لگے۔

"آ گیا..... آ گیا..... آ گیا فرید خان آ گیا۔ بابا صاحب فرید خان آ گیا۔" اندر سے ایک موٹے تازے بدن کا عمر رسیدہ آدمی باہر نکل آیا اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر فرید خان کو گھورنے لگا۔ فرید خان مسکراتے ہوئے نیچے اتر گیا۔ وہ اپنی جیب میں پیسے لایا تھا۔ اس نے پیسے نکال کر بوڑھے بابا کو دیئے اور بولا۔

"بابا ذرا طبیعت خراب ہو گئی تھی میری اس لیے تمہارے پاس نہیں آ سکا یہ تین دن کا بھاڑا لے لو۔"

"تو نے تو میری جان نکال لی تھی فرید خان۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ تو کہیں پھوٹ لیا۔"

"پیسے رکھو اور زیادہ بکواس نہ کرو۔ تم جانتے ہو فرید خان کا مائنڈ کیسا ہے۔"

بابا نے فرید خان کی بات کا برا نہیں مانا اسے جو رقم ملی تھی وہ اس کی خواہش کے مطابق تھی ہم لوگ وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ فرید خان بولا۔

"اب کیا کرنا ہے۔"

"یار ہوٹل چلنا ہے ہوٹل کے مالک کا بھی حساب کتاب چکتا کر دیا جائے۔"

"ہاں..... ہاں چلو چلو۔ ابھی میرے پاس کافی پیسے ہیں آٹھ ہزار روپے جمع کیے تھے میں نے سب لے آیا ہوں۔"

"میں ہنسنے لگا۔" میں نے اس سے کہا۔

"یار فرید خان مجھے بھی تو خدمت کا کوئی موقع دو۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"تمہیں ایک بات بتاؤں فرید خان! پیسے کافی ہیں میرے پاس کمی نہیں ہے چنانچہ تم پریشان نہ ہو۔"

میں فرید خان کی شکل دیکھنے لگا وہ خاموش ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ہوٹل پہنچ گئے۔ میں نے یہاں ٹیکسی رکوائی اور فرید خان سے بولا۔

"تم ٹیکسی میں بیٹھو میں آتا ہوں تھوڑی دیر کے بعد ہوٹل کا حساب چکتا کر کے۔"

فرید خان نے گردن ہلا دی اور میں ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے کمرے میں پہنچا دروازہ کھولتے ہی ایک نگاہ میں مَیں نے بدلے ہوئے حالات کا اندازہ لگا لیا۔ پورا کمرہ تتر بتر پڑا ہوا تھا۔ میرا مختصر سامان الٹ پلٹ کر پھینک دیا گیا تھا میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں سمجھ گیا کہ کون یہاں آیا ہے اور کیوں آیا ہے۔ یقینی طور پر ان بابا صاحب کے آدمی ہوں گے جو راستہ میں نظر آئے تھے اور انہوں نے مجھے اپنا سوٹ کیس دے دیا تھا۔ وہ لوگ سوٹ

کیس کی تلاش میں ہی آئے ہوں گے اور انہوں نے میرا یہ سامان تتر بتر کر دیا ہوگا۔ غرض یہ کہ میں مختصر اً طور پر اپنا سارا سامان سمیٹ کر باہر آیا۔ ہوٹل کا بل ادا کیا اور واپس فرید خان کی ٹیکسی میں آ بیٹھا۔

''اب کدھر چلیں؟'' فرید خان نے پوچھا۔

''چلو بس آوارہ گردی کرتے ہیں' کہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔'' میں نے جواب دیا اور فرید خان نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ ابھی اس نے چند ہی سڑکیں طے کی تھیں کہ فرید خان بولا۔

''پیلے رنگ کی ایک کار ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ پہلے مجھے صرف شبہ ہوا تھا لیکن اب یقین ہو گیا ہے کہ ہوٹل سے وہ ہمارے پیچھے چلی ہے۔''

''ارے...... اوہ...... اچھا۔ میں سمجھ گیا وہ کون ہو سکتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کون ہیں؟''

''یار کچھ نہیں...... کچھ بچے ہیں جو میرے ساتھ کھیلنا چاہتے ہیں' تم ایک کام کرو کسی ایسی سنسان جگہ ٹیکسی روک لو جہاں زیادہ ٹریفک نہ ہو۔'' میں نے کہا' فرید خان شانے ہلا کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ ٹیکسی دوڑاتا رہا۔ پیلی کار کو میں نے بھی دیکھ لیا تھا۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے کرنا کیا چاہیے' کیا فرید خان کے سامنے اپنے آپ کو نمایاں کر دوں۔ وہ حیران رہ جائے گا' چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

''فرید خان یہاں ٹیکسی روک دو' میں ذرا نیچے جھاڑیوں کی طرف جاؤں گا۔''

''پیشاب کرنا ہے۔''

''ہاں! تم سمجھ گئے۔''

''تو یار راستے میں بولا ہوتا نا' میں ادھر روک دیتا۔''

''مجھے پیشاب نہیں کرنا فرید خان ایک چھوٹا سا معاملہ ہے بعد میں تمہیں بتا دوں گا۔'' میں نے جواب دیا اور فرید خان حیران پریشان میری صورت دیکھتا رہا۔

میں ٹیکسی رکوا کر نیچے اترا اور جھاڑیوں کی جانب بڑھ گیا۔ جھاڑیوں میں پہنچ کر میں نے بھیروں کو آواز دی۔

''بھیروں سوٹ کیس لے کر یہاں آ جاؤ اور ان جھاڑیوں میں چھپا دو۔''

دوسرے لمحے میں نے جھاڑیوں میں ہلکی سی لرزش محسوس کی اور سوٹ کیس کی جھلک دیکھ لی۔ اتنی دیر میں پیلی گاڑی سے چار آدمی نیچے اترے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول نظر آ رہے تھے۔ وہ دوڑتے ہوئے نیچے آ کر جھاڑیوں کے پاس پہنچ گئے' انہوں نے پستول میری جانب کر دیا۔

''جہانو ہے تیرا نام؟''

''ہاں! ہاں! زیادہ بکواس مت کرو' سوٹ کیس لینے آئے ہو۔'' میں نے کہا اور وہ سارے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ انہیں شاید اس لہجے کی توقع نہیں تھی۔

''کدھر ہے سوٹ کیس؟''

''چابی ہے اس کی تمہارے پاس؟''

''کیا کہنا چاہتا ہے؟''

''آؤ چیک کر لو' پیر صاحب نے بھیجا ہے تمہیں' میں تو مصیبت میں پڑ گیا تھا' تمہاری یہ امانت سنبھالے۔''

وہ پھر ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

''جہانو...... سوٹ کیس کھولا تھا تم نے؟''

''ہاں کھولا تھا اور میں نے اس میں رکھے ہوئے ہیرے اور ہیروئن بھی دیکھ لی ہے۔''

''کہاں ہے سوٹ کیس؟'' ان میں سے ایک خطرناک شکل کا آدمی بولا۔

"وہ جھاڑیوں میں نظر آرہا ہے اٹھاؤ میں اس کا نمبر بتارہا ہوں تمہیں تالا کھولو اور اپنی چیزیں سنبھال لو۔"

وہ تیزی سے سوٹ کیس کی جانب دوڑے تھے پھر انہوں نے سوٹ کیس کھول کر اس کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ ان کے چہرے پر حیرت کے نقوش تھے۔

"کیا یہ سوٹ کیس تم نے یہاں چھپایا ہوا تھا؟"

"ہاں!"

"اور تمہیں پتا تھا کہ ہم لوگ تمہارا پیچھا کررہے ہیں؟"

"ہاں! ہوٹل میں رکھنا مناسب نہیں تھا کوئی بھی اس پر ہاتھ ڈال سکتا تھا اور مجھے بھی گرفتار کیا جاسکتا تھا۔"

"تو تم اس کو اس طرح چھوڑ کر بھاگ گئے۔"

"میں نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ الگ بات ہے تم لوگ اپنی اوقات میں رہو اور زیادہ فضول بکواس مت کرو۔ اب سوٹ کیس تمہارے پاس پہنچ گیا۔ اب میری بات سنو یہ سوٹ کیس اسی حالت میں بابا صاحب کے پاس پہنچنا چاہیے ان کو میرا اسلام کہنا کہ میں نے ان کی امانت کی حفاظت کی ہے اور سنو تمہارا دماغ اگر بیچ میں خراب ہوا تو مجھے ہر طرح کا دماغ ٹھیک کرنا آتا ہے۔"

"پاگل ہو گیا۔ پیر صاحب سے کون پنگا لے سکتا ہے۔ مال ہم نے چیک کرلیا ہے تم بے فکر رہو مال پیر صاحب کے پاس اسی طرح پہنچ جائے گا ویسے کیا تم جانتے تھے کہ ہم تمہارا پیچھا کررہے ہیں۔"

"ہاں...... ہوٹل سے تم میرے پیچھے لگے تھے۔ ہوٹل میں بھی تم نے تلاشی لی تھی کیا پاگل سمجھا تھا تم نے مجھے کہ اتنا قیمتی سوٹ کیس میں ہوٹل میں چھوڑ دیتا۔"

"مگر تم غائب کہاں ہو گئے تھے۔"

"جہنم میں...... اب دفع ہو جاؤ فوری طور پر...... چلو۔" میں نے کہا اور ان میں سے ایک نے سوٹ کیس اٹھایا۔ حیرت سے شانے ہلائے اور پھر وہ سب سڑک کی جانب چل پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی روانہ ہو گئی تھی۔

فرید خان دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھا ہوا تھا اور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے پاس جا کر مسکراتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"کیا لفڑا تھا یار...... ابھی میرے کو بتاؤ نہیں تو میرا دماغ پھٹ جائے گا۔"

"تمہیں بہت ساری باتیں بتانی ہیں چلو کوئی ایسی پرسکون جگہ تلاش کرتے ہیں جہاں بیٹھ کر باتیں کرسکیں۔"

"چلو۔"

ہم لوگ ایک پارک میں پہنچ گئے بڑا خوبصورت پارک تھا اور اس میں بیٹھنے کے لیے کافی جگہ تھی۔ فرید خان نے ٹیکسی ایک جگہ کھڑی کردی اور ہم دونوں ایک بنچ پر جا بیٹھے۔

"ہاں فرید خان میں تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں مختصر بتاؤں گا۔ ایک ایسی انوکھی جگہ پرورش پائی میں نے جہاں میں ایک نوکر کی حیثیت سے زندگی بسر کررہا تھا۔ ان لوگوں کا سلوک میرے ساتھ بالکل اچھا نہیں تھا۔ فرید خان میں نہیں جانتا میرے ماں باپ کون ہیں کون تھے اور میں اس کوٹھی تک کیسے پہنچا۔ میں نے اسی کوٹھی میں آنکھ کھولی تھی اور وہیں پر بڑا ہوا تھا۔ جب مجھے احساس ہوا کہ کوٹھی والوں کا رویہ میرے ساتھ اچھا نہیں ہے تو میں نے کوٹھی چھوڑ دی۔ نجانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا اور پھر مجھے تھوڑی سی رقم حاصل ہو گئی جو میں نے بہت سی محفوظ جگہوں پر چھپا دی ہے۔ یہ سوٹ کیس ایک پیر صاحب کا تھا وہ ٹرین میں مجھے ملے تھے سوٹ کیس میں اسمگلنگ کا سامان تھا۔ ہیروئن اور ہیرے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔

میں اگر چاہتا تو ان پر قبضہ بھی کر سکتا تھا اور یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے لیکن میں نے سوچا کہ بلاوجہ دشمنی مول لینی نہیں چاہیے۔ میرے پاس خود اتنی رقم موجود ہے کہ میں اپنا کام کر سکتا ہوں۔ یہ رقم میں نے بینکوں وغیرہ میں جمع کی ہوئی ہے۔ میرے پاس ان کے کاغذات بھی ہیں' ساری چیزیں موجود ہیں۔ مجھے دولت کی کوئی پرواہ نہیں ہے' سمجھ رہے ہو نا اور مجھے حاصل کرنا بھی آتا ہے۔ بس یہ ہے میری کہانی۔''

فرید خان حیرت سے یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''سوٹ کیس میں ہیرے اور ہیروئن تھی؟''

''ہاں!''

''اور تم نے اپنی نیت ثابت رکھی؟''

''میری نیت ہمیشہ ثابت ہے کیونکہ میرے پاس بہت کچھ ہے مجھے اللہ نے بہت کچھ دیا ہے۔''

''کمال کی بات ہے تم تو واقعی سلطان نکلے۔''

''نہیں فرید خان تمہارے گھر میں جو سکون ہے اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اب تم نے میرے بارے میں جان لیا۔ سنو ہم جتنی جلدی ممکن ہو سکے یہ ٹیکسی اس کے مالک کو واپس کر دیں گے' تم اگر ٹیکسی ہی چلانا چاہتے ہو تو فوری طور پر اپنی ٹیکسی خرید لو۔''

''کک...... کک...... کیا۔'' فرید خان ہکلا گیا۔

''ہاں!''

''ہم...... مگر کیا تمہارے پاس اتنے پیسے ہیں کہ ہم اپنی ٹیکسی خرید سکتے ہیں۔''

''میں تمہارے لیے دس ٹیکسیاں خرید سکتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور فرید خان کے بدن میں ہلکی سی کپکپاہٹ دوڑ گئی۔ پھر آہستہ سے بولا۔

''خدا کی قسم دیکھو مجھے نہیں معلوم تھا جہانو کہ تم اتنے دولت مند آدمی ہو۔ میں نے اس لیے تم سے دوستی نہیں کی تھی بس تم سے صرف سلطان کے نام پر دوستی کی تھی۔''

''دوبارہ کبھی یہ بات مت کہنا' تم نے جو محبت جو انعام مجھے دیا ہے۔ اس کا کوئی جواب نہیں ہے میں اس کا بدل تمہیں کبھی نہیں دے سکتا۔''

فرید خان آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگا۔ مجھے صاف لگ رہا تھا جیسے وہ میری بات سے تھوڑا سا الجھ گیا ہے۔ صاف ظاہر تھا اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا اسے الجھن تو ہو ہی جانی تھی کیونکہ میرا خود اپنا کردار بھی ذرا مشکوک سا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ فرید خان کو کچھ عرصہ بعد مجھ پر اعتبار ہو جائے گا اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا' ویسے مجھے یہ گھر بڑا قیمتی محسوس ہوا تھا۔

وہاں سے واپسی میں فرید خان بڑا حیران تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔

''جہانو! کیا ہو رہا ہے یار اس دنیا میں' تم بتا رہے ہو کہ وہ بہت پہنچے ہوئے پیر صاحب تھے۔''

''پہنچے ہی ہوئے تھے یار! تم شکل دیکھ لو تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتے کہ یوں اسمگلر ہوں گے۔''

''ہاں...... شکل پر تو خیر نہیں لکھا ہوتا لیکن بہر حال کیا کہتے ہو تم اس بارے میں۔''

''میں کیا کہوں گا فرید خان دنیا نگاہوں کے سامنے ہے۔''

''کیا یہ لوگ واقعی سوٹ کیس اسی طرح ان کے پاس پہنچا دیں گے؟'' فرید خان نے سوال کیا۔

''اگر نہیں بھی پہنچائیں گے تو ہم پر کیا فرق پڑتا ہے۔ پیر صاحب جب بھی ملے میں انہیں بتا دوں گا۔''

''نہیں میرا مطلب ہے وہ یہ تو نہیں سمجھیں گے کہ سوٹ کیس تم نے ہضم کر لیا ہے۔''

''یار میرے پاس اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اب

اتنی قوت ہے کہ میں ہر ایک کو سمجھا سکتا ہوں کہ میں نے کیا کیا ہے اور کیا نہیں کیا۔"

فرید خان خاموش ہو گیا۔ پھر ہم گھر پہنچ گئے' گھر کا ماحول وہی تھا اسی شام میں نے بھیروں سے کچھ رقم طلب کی۔ رقم اتنی تھی کہ میں تھوڑا بہت کام کر سکوں۔ فرید خان کو ٹیکسی دلانے کی ضرورت نہیں تھی' چنانچہ ہم نے باہم مشورے سے ایک بہت اچھی گاڑی خریدی۔ میں نے فرید خان سے کہہ دیا تھا کہ ہم ابھی اسی محلے میں رہیں گے لیکن آہستہ آہستہ مکان کا بندوبست بھی کر لیں گے اور اس کے بعد مزے کی زندگی گزاریں گے۔ فرید خان بولا۔

"یار وہ تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے مگر تم یہ نہیں بتاؤ گے کہ اتنی بڑی رقم تمہارے پاس آئی کہاں سے میرا مطلب ہے کہ تمہارا ماضی جیسا کہ تم نے مجھے بتایا کہ ایک ایسے گھر میں تم نے پرورش پائی۔"

"بس فرید خان' قدرت کسی نہ کسی طرح ہر شخص کو اس کی تقدیر کے مطابق دے دیتی ہے۔"

فرید خان سمجھ گیا کہ میں اسے زیادہ تفصیل نہیں بتانا چاہتا۔ اچھا انسان تھا اور پھر اس کے بعد اس نے مجھ سے زیادہ بحث نہیں کی۔

ہماری نئی گاڑی ہمارے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ عام طور سے یہ ہوتا تھا کہ میں اور فرید خان باہر نکل جاتے تھے۔ میں نے خاصی رقم فرید خان کے نام سے بینک میں جمع کرا دی تھی تاکہ اگر میرے ساتھ کوئی واقعہ پیش آ جائے تو فرید خان کو پریشانی نہ ہو۔ بس ایک جذبہ تھا میرے دل میں اس کیلئے۔ بہت اچھا ساتھی بہت اچھا دوست ملا تھا' ادھر اس کی دونوں بہنیں مجھے بڑے پیار سے سلطان بھائی کہا کرتی تھیں اور ماں جی بھی یہی سمجھ رہی تھیں کہ میں سلطان ہی ہوں اور اس بات سے وہ بہت خوش تھیں کہ میں نے اب ان کے ساتھ رہنا شروع کر دیا ہے۔ ماں کو اس بات کا علم تھا کہ میں یعنی سلطان ملک سے باہر جا کر یعنی دبئی وغیرہ جا کر بہت ساری رقم کما کر لایا ہوں اور اب یہ رقم خرچ ہو رہی ہے۔ فرید خان نے کتنی ہی بار کہا تھا کہ اسے شرم آتی ہے اس سے بہتر تھا کہ ٹیکسی ہوتی اور وہ ٹیکسی چلاتا۔

"نہیں فرید خان! ہمیں آگے چل کر بہت کچھ کرنا ہے' ہم دنیا دیکھ رہے ہیں' تم نے مجھے دوست اور بھائی کہا ہے تو بس اس سلسلے میں مجھ سے کوئی تعارض نہ کرو ورنہ میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔"

"کیا؟" وہ بولا۔

"میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

"ارے نہیں نہیں ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔"

"بس تم کسی بات سے الجھنا نہیں' ایک وعدہ تم سے کرتا ہوں' فرید خان میں نے ماں باپ نہیں دیکھا۔ میرا کوئی بہن بھائی بھی نہیں تھا لیکن میرے دل میں ایک جذبہ ہے اور خاص طور سے تمہاری ماں کو دیکھنے کے بعد تو مجھے یہ احساس ہو چکا ہے کہ ماں اس کائنات کی سب سے عظیم ہستی ہے اگر اولاد کو یہ ہستی حاصل ہو تو میں تم سے یہ بات کہہ رہا تھا کہ ماں کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ کبھی کوئی دغا نہیں کروں گا۔ ہم دونوں بہت اچھے رہیں گے' میرے پاس جو رقم ہے وہ اتنی ہے کہ ہم سب کے ساتھ برسوں گزار سکتے ہیں۔ اس لیے تم اس کی فکر مت کرو کہ کیا ہو رہا ہے کیا نہیں ہو رہا۔ بس اعتماد کر سکو تو ٹھیک ہے ورنہ مجھے جواب دے دو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"بھول کر بھی مت سوچنا جہانو کہ تم میرے پاس سے جاؤ گے۔ تم میری زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہو اور پھر میری بہنیں' میری ماں اور بھائی سب تمہیں نجانے کیا سمجھتے ہیں' کبھی جانے کی کوشش نہ کرنا' جیسا

تم کہو گے میں ویسا ہی کروں گا۔"
"بس صرف ایک بات کہتا ہوں تم سے اخراجات وغیرہ کے معاملے میں اور دوسرے معاملات میں پریشان مت ہونا۔ میرے ساتھ وقت گزارو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
"ٹھیک ہے ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا۔ جیسا آپ بولتے ہو۔"
فرید خان کا لہجہ بھی درست ہو گیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور ہونے کے ناتے وہ کچھ ایسی الٹی سیدھی زبان بولنے لگا تھا لیکن اب جب سے میرے ساتھ تھا بالکل ٹھیک ٹھاک بولنے لگا تھا......
پھر ایک دن ہم ایک بازار سے گزر رہے تھے کہ میں نے ایک جلوس دیکھا۔ بہت ہی قیمتی کھلی ہوئی گاڑی تھی جس میں سبز کپڑوں میں ملبوس کوئی بزرگ بیٹھے ہوئے تھے حالانکہ خاصا فاصلہ تھا لیکن ایک لمحے میں مَیں نے اندازہ لگا لیا کہ گاڑی میں بیٹھا ہوا شخص وہی پیر ہے جس نے مجھے سوٹ کیس دیا تھا۔ اس کے پیچھے چلنے والے لوگ کچھ نعرے لگا رہے تھے' میں نے فرید خان سے کہا۔
"فرید خان' ہمیں اس جلوس کا پیچھا کرنا ہے۔"
"خیریت؟ کیا خاص بات ہے اس میں؟"
"اس کا پیچھا کرو بعد میں تمہیں تفصیل بتاؤں گا۔"
"ارے باپ رے باپ کہیں یہ وہی پیر تو نہیں ہے جس کے بارے میں تم نے مجھے بتایا تھا۔"
"چلتے رہو...... چلتے رہو۔"
فرید خان نے بڑی چالاکی سے گاڑی اس جلوس کے تعاقب میں لگا دی' اس میں اور بھی بہت سی گاڑیاں تھیں اور وہ جلوس میں چل رہی تھیں۔ اس طرح دیکھنے والے بھی یہ سمجھ سکتے تھے ہماری گاڑی بھی جلوس میں شامل ہے' جلوس کا تعاقب کیا جاتا رہا اور پھر یہ ایک انتہائی پوش علاقے میں واقع ایک عمارت کے سامنے رک گیا' یہاں بڑی اچھی اچھی کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ بہت ہی خوبصورت مکانات چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے' یہ عمارت ان سارے مکانات سے بہت زیادہ خوبصورت تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کی چھت پر ایک بت سا بنا ہوا تھا جس پر ایک جھنڈا لہرا رہا تھا' یہ تو پتا چل گیا تھا کہ جلوس کی منزل یہی عمارت ہے۔ میں نے فرید خان سے کہا۔
"فرید خان وہ سامنے جو درخت نظر آ رہا ہے یہاں گاڑی روک دو۔" فرید خان خاموشی سے اس طرف چل پڑا۔ میری نگاہیں اس عمارت کے سامنے رک جانے والی گاڑیوں پر لگی ہوئی تھیں۔ میں نے ان بزرگ کو کار سے اترتے ہوئے دیکھا۔ ان کے مرید بڑے اہتمام سے انہیں اندر لے جانے لگے......
سب سے زیادہ حیرت مجھے ان قیمتی کاروں پر تھی جو اس جلوس میں شامل تھیں۔ زندگی کی الجھنوں سے تنگ آئے ہوئے تو ہم پرست لوگ تو ایسے معاملات میں بہت زیادہ متاثر ہو جاتے ہیں لیکن یہ کاریں ایسے لوگوں کی نہیں تھیں' یقینی طور پر یہ صاحب حیثیت لوگ ہوں گے جو ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ یعنی انہیں ان بزرگ سے دلچسپی ہوگی۔
بہر طور اگر بابا پیر صاحب سچ مچ کوئی پیر ہوتے تو روحانیت کا ایک مقام ہوتا ہے اور لوگ ان سے متاثر ہوتے ہیں لیکن ان پیر صاحب کے بارے میں مجھے جو واقفیت حاصل ہوئی تھی وہ ذرا مختلف تھی اور یہی بات میرے لیے باعث حیرت تھی۔
مجمع چھٹنے لگا۔ لوگ پیر صاحب کو یہاں تک چھوڑنے آئے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ منتشر ہونے لگے۔ گاڑیاں واپس جانے لگیں لیکن چند گاڑیاں وہیں رہ گئی تھیں۔ میں نے فرید خان کو اشارہ کیا اور

ہم دونوں نیچے اتر آئے اور عمارت کی جانب بڑھنے لگے۔ اطراف میں اب اکا دکا لوگ ہی نظر آرہے تھے۔ عمارت کے بیرونی دروازے پر بڑے بڑے ڈسپنسر لگے ہوئے تھے جو غالباً لوگوں کے پانی پینے کے لیے تھے۔ بڑے دروازے پر آستانہ پیر امیر شاہ لکھا ہوا تھا...... ''پیر امیر شاہ'' میں نے مدھم سے لہجے میں کہا۔

بہرحال یہ ایک دلچسپ بات تھی کہ میں اس حقیقت تک پہنچ گیا تھا۔ عمارت کی شان و شوکت یہ بتا رہی تھی کہ پیر صاحب جو کچھ کر رہے ہیں وہ اپنی جگہ لیکن ان کا کاروبار نہایت شاندار پیمانے پر چل رہا ہے۔ کچھ دیر تک میں اور فرید خان وہاں رکے رہے اس کے بعد ہم دونوں واپس کار میں آبیٹھے۔

''بتاؤ جہانو یہ وہی پیر صاحب ہیں جن کے بارے میں تم نے بتایا تھا کہ انہوں نے ریل میں یہ سوٹ کیس تمہارے حوالے کیا تھا۔''

''ہاں! بالکل وہی ہے۔''

''عجیب لوگ ہیں یہ...... یہ پیر مریدی کا چکر کبھی ختم نہیں ہوگا' غریب لوگ جب اپنی مشکل کا کوئی حل نہیں پاتے تو ایسے ہی لوگوں کا آسرا پکڑتے ہیں اور یہ ان کی غربت میں سے اپنا حصہ نکال لیتے ہیں۔ سڑکوں پر طوطے فال نکالتے پڑے ہیں اور ان کو دیکھو ان کا بھی دھندا چلتا ہے۔ بس غریب لوگوں کی بات تو الگ ہے وہ تو پریشان حال ہوتے ہیں تو پیری مریدی کے چکر میں پڑتے ہیں لیکن تم نے یہ گاڑیاں دیکھیں ایک سے ایک شاندار کار تھی۔ ان لوگوں کا ایسے پیروں سے کیا واسطہ ہوتا ہے۔''

''ان لوگوں کا ہی تو اصل واسطہ ہوتا ہے ان پیروں سے خود پیر صاحب اسمگلر ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کے پاس آنے والے لوگ اسی طرح کے ہوں گے۔''

ہم لوگ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے اور اس طرح کے کام کرتے رہے۔ پھر ایک دن میں نے اس سے کہا۔

''یار فرید خان میں ان پیر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا کہتے ہو اس بارے میں۔''

''ٹھیک ہے بولو کیا کرنا ہے؟''

''بس تم مجھے وہاں اتار دو۔ بعد میں دیکھوں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

''کوئی خطرہ نہ پیش آجائے تمہیں۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے' میں ہر قسم کے خطرات سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ فرید خان بولا۔

''تم بہت بہادر ہو یہ بات تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

میری خواہش کے مطابق فرید خان نے مجھے آستانے پر اتار دیا۔ شام کے چار بجے تھے۔ آستانے پر خاموشی طاری تھی۔ بڑے مؤدب انداز میں لوگ آجا رہے تھے۔ میں دروازے پر پہنچا تو دو عقیدت مندوں نے میرا استقبال کیا اور مجھ سے میری آمد کے بارے میں پوچھا۔

''امیر شاہ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''ان سے ملاقات مغرب کی نماز کے بعد ہی ہو سکے گی۔ تم مغرب کی نماز کے بعد آجانا انتظار کرنا چاہو تو یہیں انتظار کر لو۔''

''ٹھیک ہے میں دور سے آیا ہوں' انتظار کیے لیتا ہوں۔'' میں نے کہا اور ان لوگوں نے گردن ہلا دی۔ مجھے عمارت کے ایک اندرونی حصے میں ایک طرف بٹھا دیا گیا جہاں انتظار گاہ بنی ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے وہاں بیٹھا حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ وقت کچھ اور آگے بڑھا تو لوگ آنا جانا شروع ہو گئے۔ ان کے لیے

نشست گاہیں بنی ہوئی تھیں' میں نے کچھ صاحب حیثیت لوگوں کو بھی دیکھا وہ اپنی اپنی گاڑیوں میں آئے تھے۔

ایک بی ایم ڈبلیو سے ایک بھاری بھرکم آدمی نیچے اترا تھا اور بھی ایسی قیمتی گاڑیاں تھیں۔ مغرب کی نماز کا وقت ہوا اور وہیں آستانے میں نمازِ باجماعت ادا کی گئی۔ پھر اس کے بعد سب کو ایک ہال نما کمرے میں لے جایا گیا جہاں فرشی نشست تھی۔ ایک سامنے والے حصے میں اسٹیج سا بنا ہوا تھا جس پر قالین بچھا ہوا تھا۔ اسٹیج کے عقب میں ایک خوبصورت چوبی دروازہ نظر آ رہا تھا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا' اس دروازے سے مغرب کی نماز کے بعد آخرکار پیر امیر شاہ صاحب برآمد ہوئے۔ سفید لبادے میں ملبوس تھے' زلفیں دراز' چہرے پر جلال' خاموشی سے مجمع پر ایک نگاہ ڈالی اور اسٹیج پر آ بیٹھے۔ ان کے عقیدت مندوں نے ان کے گرد گھیرا ڈال دیا تھا اور اس کے بعد پیر صاحب نے تقریر شروع کر دی۔ بڑا ہی ٹھہرا اور مضبوط لہجہ تھا' تلقین دین کی دی جا رہی تھی' نیک کاموں کی طرف راغب ہونے کے مشورے دیے جا رہے تھے۔ خاصی لمبی تقریر تھی' اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

کچھ لمحے مکمل سکوت طاری رہا۔ آخرکار پیر صاحب نے کہا۔

''اب آپ لوگوں میں سے جسے مجھ سے کوئی کام ہے وہ اپنی اپنی باری سے میرے پاس آ جائے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور اسی دروازے سے اندر داخل ہو گئے' بعد کے انتظامات یہاں موجود ملازموں یا عقیدت مندوں نے سنبھال لیے تھے۔ سب سے پہلے وہی بی ایم ڈبلیو والا اندر گیا تھا اور کوئی سات منٹ کے بعد واپس آیا تھا۔ اس وقت پیر صاحب سے ملاقات کرنے والوں میں میرے علاوہ سات افراد شامل تھے۔ چوتھے نمبر پر جب مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا گیا تو میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''میں سب سے آخر میں جانا چاہتا ہوں جناب۔''

''ٹھیک ہے بیٹھ جایئے۔''

لوگ آتے جاتے رہے اور اس کے بعد میرا نمبر آ گیا۔ میں اس دروازے سے اندر داخل ہوا تو اندر بڑے سے کمرے میں پیر صاحب ایک چوکی پر پالتی مارے بیٹھے ہوئے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور چہرہ جلال میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے سلام کیا تو انہوں نے گردن سے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں ان کے سامنے دوزانوں بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں ان کے پر جلال چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اب دنیا سے اتنا ناواقف بھی نہ رہا تھا میں کہ چہرے کے تاثرات نہ پہچانتا۔ انہوں نے جب آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا تو میں نے اچھی طرح سے محسوس کیا کہ انہوں نے مجھے پہچان لیا ہے اور ان کے پورے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا ہے۔ ان کے اندر فوراً تبدیلی رونما ہوئی' انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر مجھ سے بولے۔

''اٹھو...... دروازہ اندر سے بند کر دو۔ اور وہ جو کونے میں کرسی پڑی ہوئی ہے اسے اٹھا کر میرے پاس لے آؤ۔''

''آپ نے مجھے پہچان لیا شاہ صاحب۔'' میں نے آہستہ سے کہا اور پلٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ چند لمحات خاموش رہے پھر بولے۔

''ہاں میں اگر چاہتا تو اس سے انکار بھی کر سکتا تھا لیکن تمہارے لیے میرے دل میں بڑا تاثر ہے۔ میں اکثر تمہارے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ تم میرے آدمیوں کو اس ہوٹل میں نہیں ملے جہاں تم نے قیام کیا تھا۔''

''شکریہ! مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے نظرانداز

نہیں کیا۔"
"کیا اس سے پہلے بھی تم آستانے آ چکے ہو۔"
"نہیں۔"
"پھر تمہیں آستانے کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔"
"ایک دن جب آپ جلوس کی شکل میں تشریف لارہے تھے تو میں نے آپ کو وہاں دیکھا تھا۔"
"ہاں! شہر سے باہر گیا ہوا تھا کچھ مریدوں کے اہم کام کرانے تھے۔ خیر تمہاری آمد سے میں خوش ہوں' اگر تم مجھے نہ ملتے تو میں کچھ دن کے اندر اندر تم سے رابطے کے لیے کوشش کرتا۔"
"یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ نے مجھے اتنی عزت دی ہے۔"
"تمہارا نام جہانزیب ہے نا اور تم نے کہا تھا کہ لوگ تمہیں جہانو کہتے ہیں۔"
"جی شاہ صاحب!"
"یہاں آ کر تم نے یہ سب کچھ دیکھا۔"
"جی شاہ صاحب۔"
"اور اس پر غور بھی کیا ہوگا۔"
"زیادہ نہیں کیونکہ پہلی بار دیکھا ہے۔"
"ہاں! میں تم سے ذرا صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے جہانزیب کہ اس دنیا کے رنگ ڈھنگ بدل گئے ہیں' میں تم سے متاثر ہوں اس لیے یہ بات کر رہا ہوں تم سے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دن اگر تم میری مدد نہ کرتے تو میری شخصیت بکھر کر رہ جاتی۔ بہت بُرے لوگ بھی زندگی میں ایک بار اچھے انداز میں ضرور سوچتے ہیں۔ اگر وہ اچھائی ان کے ذہن میں نقش ہو جائے تو اس سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔
اس دن میں اس قدر بے بس ہو گیا تھا کہ میرے سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہو گئی تھیں اور پھر تم نے میرے ذہن میں بہت گہرا نقش چھوڑا۔ پستول کے زور پر اگر تم وہ سب کچھ کرتے تو یہ یقینی بات ہے کہ میرے لیے بہتر نہ ہوتا۔ میں یہ ضرور سوچتا کہ تم بذاتِ خود کس شخصیت کے مالک ہو۔ تم نے مجھے بے بس کر دیا تھا اور اس کے بعد میری مدد کی۔ اس چیز نے مجھے پریشان کر رکھا ہے' دیکھو جہانو میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو لیکن میرا کام اس دنیا کو پڑھنا اور اسے سمجھ کر اس کے بارے میں فیصلے کرنا ہے اور اس سلسلے میں مجھے کافی مہارت ہے۔ ویسے بھی میں نے کافی تعلیم حاصل کی ہے۔ نفسیات میں بھی مجھے تھوڑا بہت دخل ہے اور ان تمام چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے تمہاری شخصیت میں مجھے جو کچھ نظر آیا ہے یا آیا تھا اس پر مجھے مکمل اعتماد ہے۔ میں اس میں کسی شک و شبے کو جگہ نہیں دے سکتا۔ یہ تو فیصلہ تم ہی کر سکتے ہو کہ میری باتیں سچ ہیں یا غلط۔"
"نہیں شاہ صاحب! آپ نے اس دنیا کے بارے میں جو رہنمائی کی ہے میری' مجھے اس کا اچھی طرح تجربہ ہو چکا ہے۔ حالانکہ دنیا جس رُخ پر سفر کر رہی ہے اور جینے کے ڈھنگ جس طرح بدل گئے ہیں وہ میرے لیے حیران کن ہیں۔"
"ہاں یقیناً میرا تجربہ یہی کہتا ہے کہ تم اپنی عمر سے بہت آگے بڑھ گئے ہو اور اس کی کچھ وجوہات یقیناً ہوں گی' اپنے بارے میں تفصیل بتانا پسند کرو گے۔"
"نہیں' بس وہ چیزیں بتا سکتا ہوں آپ کو جو دنیا کے سامنے ہیں...... میرا ماضی' میرے اندر کی تبدیلیاں ابھی میرے ذہن کی امانت ہیں اور میں اپنے آپ کو محفوظ بھی رکھنا چاہتا ہوں۔"
"خوب۔ یہ جرأت کسی عام آدمی کی نہیں ہو سکتی' سچائیوں کو ذہن میں چھپانا تو سب کو آتا ہے لیکن ان کا

اس بے باکی سے اظہار کسی معمولی آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہے میں تم سے تمہارے ماضی کے بارے میں نہیں پوچھتا۔ چلو حال کے بارے میں بتاؤ کس انداز میں زندگی گزار رہے ہو؟"

"آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟" میں نے کہا اور پیر امیر شاہ نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ پھر بولے۔

"میرے پاس آنے کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔"

"جی ہاں! اس دن آپ کو اس رنگ میں دیکھنے کے بعد جب آپ ایک جلوس کی شکل میں تشریف لا رہے تھے، میرے ذہن میں آپ کے لیے شدید تجسس پیدا ہو گیا ہے اور میں اسی تجسس کے زیر اثر یہاں پہنچا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ مجھے نظر انداز نہیں کریں گے، اگر آپ مجھے ایک عام آدمی کی طرح نظر انداز کر دیتے تو میں سوچتا کہ جو کچھ ہوا وہ ایک وقتی معاملہ تھا اور آپ دوہری شخصیت کے مالک ہیں۔ لیکن اس کے بعد میں آپ کے بارے میں کوئی کرید نہ کرتا۔"

"کیوں؟ یہ بات تو خلافِ فطرت ہوتی۔" پیر صاحب نے کہا۔

"جی ہاں! خلافِ فطرت ضرور ہوتی لیکن میں یہ سوچتا کہ وہ بات جو کسی طرح مجھ سے متعلق نہیں ہے اس کے لیے الجھنیں کیوں مول لی جائیں۔"

"کمال کر رہے ہو...... کمال کر رہے ہو۔ آنکھوں کے راستے دل میں اترتے جا رہے ہو۔" پیر صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ بولے۔

"لیکن میرا سوال اب بھی قائم ہے، زندگی موجودہ وقت میں کس طرح گزار رہے ہو۔"

"بس یوں سمجھ لیجئے کہ ایک بے روزگار سا آدمی ہوں۔ تھوڑے بہت پیسے ہیں جن میں ایک دوست کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوں۔"

"عمر کتنی ہے تمہاری؟" پیر صاحب نے دلچسپ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"عمر کے بارے میں کبھی نہ کوئی سوچنے والا تھا اور نہ میں نے خود اس کے بارے میں سوچا۔ عمر کا اندازہ تو اس وقت ہوتا ہے جب ہوش مند ہونے کے بعد والدین سالگرہ کیا کرتے ہیں یا دوست احباب اس پر توجہ دیتے ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہوش کی ایک عمر گزاری ہے۔ جس میں محنت مزدوری کے سوا کچھ نہیں کیا۔"

"تعلیم کہاں سے حاصل کی؟"

"کوئی تعلیم نہیں ہے، بس یوں سمجھ لیجئے کہ زندگی سے واقفیت ہو گئی ہے۔"

"کیا بات ہے...... کیا بات ہے۔ زندگی کے اور کون کون سے امور سے واقفیت ہے۔"

"کبھی اس بارے میں نہیں سوچا لیکن کوئی بھی رنگ سامنے آ جائے تو اجنبی نہیں معلوم ہوتا۔"

"میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں کہ شاید برسوں کے بعد کوئی میرے ذہن میں اترا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی ریکارڈ بج رہا ہے۔ تمہیں دیکھ کر بس ایک شوخ کھلنڈرے سے نوجوان کا تصور دماغ میں ابھرتا ہے مگر تمہاری باتیں ایک فلاسفر کی باتیں ہیں۔"

"آپ یقین کیجئے بس آپ سے ملنے کا دل چاہا تو اس لیے آ گیا اگر آپ توجہ نہ دیتے تو چلا جاتا اور دوبارہ کبھی آپ کے پاس نہ آتا۔"

"تو تم یقین کر لو میں خود تمہیں تلاش کرتا اور تم سے ملتا۔ ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اس دن تم نے کتنی کامیابی سے وہ سوٹ کیس پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکال لیا تھا اور مجھے میرے آدمیوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ تم جانتے ہو کہ اس

سوٹ کیس میں کیا ہے۔ اس کے باوجود تم نے بڑے آرام سے اسے میرے آدمیوں کے حوالے کر دیا اور یہ بھی کہا کہ اس میں سے ایک بھی چیز کم ہوئی تو تم ان کا ستیاناس کر دو گے۔"

"جی!"

"کیوں؟"

"وہ آپ کی امانت تھی۔"

"ویری گڈ...... ویری گڈ۔ جو لوگ اپنا مقام پہچانتے ہیں وہ اپنا مستقبل بھی بنانا جانتے ہیں۔ اچھا ٹھیک ہے میں کچھ کرتا ہوں تمہارے لئے، تم ایک بات بتاؤ، زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا ہے۔"

"نہیں۔ بس یہ سوچا ہے کہ زندگی خود میرے بارے میں فیصلہ کرے۔"

"واہ...... واہ...... واہ...... واہ...... خیر ہاتھ ہمیشہ صاف ستھرے ہونے چاہئیں لیکن صرف اس حد تک کہ صابن سے دھو لیے گئے ہوں اور ان پر میل یا گرد کے ذرات نہ ہوں۔ باقی گہرائیوں میں کیا ہوتا ہے، سمجھدار لوگ کبھی اپنے ہاتھوں سے نہیں ظاہر ہونے دیتے۔"

"کہیں میری گفتگو گستاخی کی حد میں نہ شامل ہو جائے جناب۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بہت عرصے کے بعد اتنی کھری باتیں سننے کو مل رہی ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ میرے حلقہ بدوش میرا کتنا احترام کرتے ہیں۔ احترام کرنے والوں کا ایک مجمع ہے جو میرے گرد اکٹھا رہتا ہے لیکن میں دوستیوں کا بھی قائل ہوں اور دوست ہمیشہ ضروری ہوتے ہیں۔ تم بے دھڑک مجھ سے بات کرو۔ میں نے آخر کار تمہیں اپنے دوستوں میں شامل کر لیا ہے۔"

"بہت بڑی بات ہے میرے لئے...... بہت بڑی بات ہے۔ آپ نے صاف ہاتھوں کی بات کی تھی شاہ صاحب آپ مجھے یہ بتایئے کہ آپ کی زندگی بھی تو دوہری ہے۔ کیوں؟"

امیر شاہ کے چہرے پر آہستہ آہستہ گہری سنجیدگی طاری ہو گئی۔ پھر اس نے کہا۔

"ہاں جہانو! بہت سے انسان ایسے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو سچائیوں کے راستے پر چلانے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ ان کا ذہن اسی انداز میں سوچتا ہے وہ زندگی کے ہر شعبے میں نیکیوں اور سچائیوں کے راستوں کو پسند کرتے ہیں لیکن جب وہ اپنے اطراف میں دیکھتے ہیں تو اپنے آپ کو تنہا پاتے ہیں۔ بہت دور سے گزرنے والے جو ناہموار راستوں میں اپنا سنہرا مستقبل تلاش کر رہے ہوتے ہیں، صرف مسکراتی نگاہوں سے سچائیوں کے راستے پر چلنے والوں کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور وہ یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ وہ اس راستے پر تنہا کیوں ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی راستہ تبدیل کر کے انہی لوگوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ تب کہیں جا کر اسے ان کے درمیان مقام ملتا ہے۔"

میں یہ گہری بات سن رہا تھا اور میرے رگ و پے میں ایک بجلی سی تڑپ رہی تھی۔ میرا ذہن ان سے اتفاق کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں آپ کی بات سے پوری طرح متفق ہوں۔"

"تو پھر مجھ پر اس حد تک اعتماد ضرور کرو کہ اپنے مستقبل کا کوئی حصہ میرے حوالے کر دو۔ میں تمہارے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا یہ معاوضہ ہوگا شاہ صاحب اس چھوٹے سے کام کا جو میں نے آپ کے لیے کیا تھا۔"

"نہیں۔ یہ دوستی ہوگی۔ تم نے کہا ہے کہ تمہارے قرب و جوار خالی ہیں، عزیز یا رشتہ دار یا کوئی ایسا نہیں

ہے۔ ماں باپ بھی نہیں ہیں' کیا یہ ٹھیک ہے۔"

"ہاں! خون کا کوئی رشتہ میرے ساتھ نہیں ہے لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ایک تنہا انسان کو اپنا رفیق بنا کر اسے خرید لیا ہے۔ میں ان کی محبت کا مقروض ہوں۔"

"ٹھیک اگر انسانی فطرت میں یہ بات نہ ہوتو زندگی کا کاروبار کبھی آگے نہ بڑھے۔ خیر ٹھیک ہے' میں تم سے ایک آخری بات اور کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی فرمائیے۔"

"کیا تم میرے ساتھ شامل ہونا پسند کرو گے۔"

"مرید بن کر۔"

"نہیں دوست بن کر۔"

"ہاں! آپ جیسے انسان کی دوستی کسے قبول نہ ہوگی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ پھر اگر میں تم سے یہ کہوں کہ زندگی کے راستے گزارنے کے لیے کہیں نہ کہیں سے تربیت حاصل کرنا ضروری ہوتی ہے تو کیا تم اس چیز کو تسلیم کرو گے۔"

"سو فیصدی۔"

"پھر ٹھیک ہے ایسا کرو ایک شخص سے مل لو میں تمہیں اس کے بارے تفصیل بتائے دیتا ہوں بلکہ یہ کارڈ رکھ لو تم۔ یہ بولو کب تک اس کے پاس پہنچو گے۔"

"ملنے کی وجہ کیا ہوگی شاہ صاحب؟"

"بس میں کہہ رہا ہوں تمہارا اس سے ملنا ضروری ہے۔ یوں سمجھ لو کہ میرے ایک منصوبے کی تکمیل کا ایک حصہ ہے یہ۔"

شاہ صاحب نے ایک کارڈ نکال کر میرے حوالے کیا اور میں اس پر درج شدہ نام اور پتہ پڑھنے لگا۔

"یہاں تک پہنچنے میں دقت تو نہیں ہوگی۔"

"نہیں میرا خیال ہے بالکل نہیں۔"

"کل پانچ بجے اس کے پاس پہنچ جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ایسا ہی کروں گا۔"

"انہیں بتا دینا کہ تم میرے دوست ہو۔"

"ٹھیک ہے اب میں جاؤں؟"

"بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر اور سنو یہاں جب بھی آؤ میرے مرید کی حیثیت سے ہی آنا اور مجھ سے ملاقات سب سے آخر میں کرنا تا کہ اس کے بعد میرے اور تمہارے درمیان مداخلت کرنے والا کوئی نہ ہو۔"

"میرے لیے اور کوئی حکم ہے؟"

"تم سے ہماری دوستی بہت گہری رہے گی۔"

"آپ نے مجھے اس قابل سمجھا ہے۔"

"کیوں نہیں"

میں نے پیر صاحب سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی تو انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ میں رُک کر حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

"تم سے ہاتھ ملانے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن"

"جی لیکن۔"

"میرا ایک مقام ہے میرے عقیدت مند میرے ہاتھ چومنے میں ہی اپنا کلیان سمجھتے ہیں جبکہ ان میں سے بہت سے لوگوں کو ہاتھ بھی چومنے کی اجازت نہیں ملتی۔"

"اوہ..... ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور واپسی کے لیے آ گیا' مجھے اندازہ تھا کہ پیر صاحب گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔

☆☆☆

فرید خان اور اس کے اہل خانہ مجھ سے بے حد خوش تھے۔ فرید خان کو میں نے اپنی زندگی کے بارے میں سب کچھ ہی بتا دیا تھا سوائے اس کے کہ بھیروں میرے قبضے میں ہے۔ ایک ایسی قوت جس سے میں

اچھے اچھوں کو ناکوں چنے چبوا سکتا تھا۔ یہ پیر صاحب مجھے ملے تھے اور میں ان کی شخصیت کے بارے میں سوچ رہا تھا جاننا چاہتا تھا کہ پیر امیر شاہ مجھے کس طرح استعمال کرنا چاہتا ہے' ویسے یہ حقیقت ہے کہ میں اس سے بہت کچھ سیکھ سکتا تھا لیکن اگر وہ مجھے کسی مسئلے میں اپنا آلۂ کار بنانا چاہتا ہے تو یہ اس کی حماقت ہوگی۔ میں حکمران تھا محکوم کبھی نہیں بن سکتا تھا اور یہ بات اسے بہت جلدی پتہ چل جائے گی۔

دوسرے دن فرید خان بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔ ناشتے کے بعد میرے پاس آ بیٹھا اور بولا "تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں جہانو۔"

"بولو میری جان۔"

"جہانو! میں ٹیکسی چلاتا تھا' محنت مزدوری کرتا تھا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ بھر رہا تھا لیکن جب سے تم ملے ہو میں محنت سے جی چرانے لگا ہوں' ہمارے پاس شاندار گاڑی ہے لیکن بے مقصد دن بھر کھڑی رہتی ہے یا تمہیں کہیں جانا ہوتا ہے تو اس پر چلے جاتے ہو۔ یار میں سوچ رہا ہوں کہ کوئی کام کیوں نہ شروع کیا جائے۔"

"دیکھو فرید خان! دنیا جب روشنی کی جانب بڑھتی ہے تو وہ اپنے ماحول کو منور دیکھنا چاہتی ہے' ہم لوگوں کی زندگی بے سکون نہیں ہے' ہاں تھوڑا بہت وقت گزارنے کے بعد مستقبل کے بارے میں کچھ فیصلے ضرور کرنے ہونگے تو وہ کرلیں گے جلدی نہیں ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جہانو تم سے زیادہ میرے قریب اور کون ہوسکتا ہے۔ میں نے ابھی تو اپنی منزل کا تصور بھی نہیں کیا' دنیا کے بنائے ہوئے راستوں پر جب مجبوراً قدم رکھا تو یہ سوچا کہ اب شدید محنت کر کے آگے بڑھوں گا لیکن میرے یہ قدم رک گئے ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو لیکن آگے کے بارے میں تو سوچنا چاہیے۔ کسی بھی راستے پر دوڑنے کی کوشش کی جائے تو اس کے لیے قدم اتنے مضبوط تو ہونے چاہئیں کہ ہلکی پھلکی چوٹوں سے سنبھالیا جاسکے' یہ کیا کہ ٹھوکر کھائی گرے اور مر گئے' زندگی کی کہانی ختم ہوگئی' آپ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ اسمگلنگ کر کے دولت مند بن جاتے ہیں' برے کاموں میں دولت کا حصول بے شک ایک آسان چیز ہے لیکن وہ لوگ بھی تو ہوتے ہیں جو برے کاموں کو ختم کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔ پہلے اپنے اردگرد اتنی مضبوط دیواریں کھڑی کریں کہ نہ تو کوئی ان دیواروں کو ہلا سکے اور نہ ان کی بلندی عبور کرسکے' کیا سمجھے۔"

"یار تُو تو فلسفی ہے پورے کا پورا' میں کیا جواب دوں تیری باتوں کا۔" فرید خان اس بات پر مسکرانے لگا تھا' میں نے پھر کہا۔

"فرید خان! اب میں اپنے آپ کو میں نہیں ہم کہوں گا تم میری زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ بن چکے ہو۔ ہم دونوں ابھی ایک وسیع و عریض میدان میں کھڑے ہیں جس کا آخری سرا مجھے نظر نہیں آرہا۔ ہمیں اس پر چلنا ہے' ان ویران اور ناہموار راستوں کو عبور کرنا ہے۔ کیا سمجھے' یہ سب کرنا ہے ہمیں' میرا عزم میری امنگیں ہیں حوصلے ہیں اور پھر بقول آپ کے' منزل پر پہنچنے کے راستے بنائے جاتے ہیں' کیا سمجھے۔"

"ٹھیک ہے بابا ٹھیک ہے ہاتھ جوڑتا ہوں تیرے۔" فرید خان مجھ سے کافی بے تکلف ہوگیا تھا۔ پھر میں نے اس سے کہا۔

"ہمیں جلد بازی بالکل نہیں کرنی فرید خان بس ذرا کسی محفوظ راستے کی تلاش ہے۔"

فرید خان نے گردن ہلادی' مقررہ وقت پر میں اپنی روانگی کی تیاریاں کرنے لگا' امیر شاہ کو کسی طور

نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جس شخص کے پاس وہ مجھے بھیج رہا ہے وہ کیا ہے اور امیر شاہ کا مجھے وہاں بھیجنے کا مقصد کیا ہے' وقت مقررہ پر تیار ہو کر باہر نکل آیا' گاڑی چلانا میں نے فرید خان سے سیکھ لی تھی چنانچہ اس وقت میں نے فرید خان کو ساتھ نہیں لیا تھا' میں نے بتائے ہوئے راستے کی جانب گاڑی دوڑائی اور آخر کار اس عمارت تک پہنچ گیا جس کا پتہ مجھے دیا گیا تھا۔

بہت خوبصورت عمارت تھی' میں نے کال بیل بٹن پر انگلی رکھ دی' دروازہ کھلنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا تھا' خوبصورت نیلے رنگ کے اسکرٹ میں ملبوس ایک تقریباً اکیس سالہ لڑکی نے دروازہ کھولا تھا' بہت ہی اسمارٹ اور خوبصورت نظر آرہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر استقبالیہ مسکراہٹ پھیل گئی اس نے کہا۔

''مسٹر جہانزیب۔''

''جی۔''

''تشریف لائیے' بیگ صاحب آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔''

میں نے ان بیگ صاحب کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا' بس خاموشی سے اندر کی جانب بڑھ گیا تھا۔ لڑکی مجھے لیے ہوئے ڈرائنگ روم تک آئی' اس نے دروازہ کھول کر ہاتھ کے اشارے سے اندر چلنے کے لیے کہا ڈرائنگ روم جگمگ کر رہا تھا' انتہائی قیمتی فرنیچر' موٹا قالین' چھت پر لگا ہوا قیمتی فانوس' اطراف کی سجاوٹ بھی بے مثال تھی' اس نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''میں بیگ صاحب کو اطلاع کیے دیتی ہوں۔'' لڑکی نے کہا اور میں نے آہستہ سے گردن ہلا دی۔ چنانچہ وہ باہر نکل گئی' میں خاموشی سے اس دروازے کی جانب دیکھتا رہا' زیادہ دیر نہیں گزری تھی صرف دو منٹ کے بعد دروازہ آہستہ سے کھلا اور ایک دراز قامت شخص خوبصورت سے گاؤن میں ملبوس اندر داخل ہوا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا اور میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا' آنے والا خوش شکل آدمی تھا' اس کے چہرے پر ڈاڑھی تھی' بال انتہائی نفاست سے ترتیب دیئے گئے تھے لیکن وہ کافی بڑے بڑے تھے جس بات سے میرے ذہن کو جھٹکا لگا تھا وہ یہ تھی کہ صرف معمولی سی تبدیلی کے ساتھ یہ شخص سو فیصد پیر امیر شاہ ہی تھا' فرق صرف اتنا سا تھا کہ امیر شاہ ذرا بے ترتیب نظر آتا تھا جبکہ اس شخص کی ڈاڑھی مونچھوں اور بالوں میں ترتیب تھی اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اس نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا۔

''مجھے اجمل بیگ کہتے ہیں۔''

''میں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا' آواز بھی امیر شاہ سے مختلف نہیں تھی' وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔

''ہاں اب آپ بتایئے مسٹر جہانزیب' کیسے مزاج ہیں آپ کے؟''

میں اس پر اچھی طرح غور کر رہا تھا اور اب یہ بات میری سمجھ میں آچکی تھی کہ اجمل بیگ درحقیقت امیر شاہ کا دوسرا روپ ہے' میں نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں ہے شاہ صاحب کہ آپ نے مجھے حیران کر دیا ہے۔''

''او ہو تم یقیناً مجھے امیر شاہ سمجھ رہے ہو گے' لوگوں کا خیال ہے کہ میں اس کا ہم شکل ہوں' لیکن ذرا غور کرو تو تم کو مجھ اور اس میں فرق نظر آئے گا۔''

بے شک اس نے جو بھی کچھ کہا تھا وہ میں نے سنا' لیکن میری مسکراہٹ میرے ہونٹوں سے چپکی رہی' پھر میں نے کہا۔

"اگر آپ مجھے یہ باور کرانا چاہتے ہیں شاہ صاحب کہ آپ امیر شاہ نہیں ہیں تو میں اخلاقاً خاموش ہو جاؤں گا' ہو سکتا ہے کہ آپ کسی وجہ سے اپنی شخصیت چھپا رہے ہوں لیکن ایک بات آپ سے عرض کر دوں جب کوئی اجنبی کسی اجنبی سے ملتا ہے تو اس کے انداز میں اس قدر اطمینان نہیں ہوتا چہرے کے تاثرات چھپائے جا سکتے ہیں لیکن آنکھوں کا تجسس کبھی نہیں چھپایا جا سکتا اور آپ کی آنکھیں اس بات کا اظہار کر رہی ہیں کہ آپ کسی شناسا سے مل رہے ہیں' میں بہت بڑی بات کر رہا ہوں لیکن آپ یقین کیجیے کہ آپ لاکھ بار کہیں گے کہ آپ امیر شاہ نہیں ہیں تو میں خاموش ضرور ہو جاؤں گا مگر اس پر یقین نہیں کروں گا۔"

اجمل بیگ یا امیر شاہ کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ دروازے پر پھر آہٹ ہوئی اور اس بار جو عورت اندر داخل ہوئی اس کی عمر تیس بتیس سال سے کم نہیں تھی لیکن اس نے اپنے آپ کو بہت فٹ رکھا ہوا تھا' بے حد متناسب بدن کی مالک بہت ہی خوبصورت لباس' چہرے پر ایک پروقار متانت پھیلی ہوئی تھی' ہلکا سا میک اپ ہلکا سا زیور چال میں ایک انوکھا بانکپن۔ اس نے مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور ہاتھ آگے بڑھاتی ہوئی بولی۔

"یقیناً آپ مسٹر جہانزیب ہیں۔"

بہرحال میں نے کسی جھجک کا مظاہرہ نہیں کیا اور اس نے اپنے نرم اور ہلکے سے گرم ہاتھ میں میرے ہاتھ کو چند لمحات دبائے رکھا' پھر اسے چھوڑے بغیر بولی۔

"مجھے نیلم خان کہا جاتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی' تبھی امیر شاہ یا اجمل بیگ نے کہا۔

"نیلم خان اپنا تعارف کرا چکی ہیں' باقی تفصیلات بعد میں بتائی جائیں گی آپ دیکھ لیجیے نیلم خان' یہ آپ کے جہانزیب عرف جہانو ہیں لیکن یہ مجھے اجمل بیگ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں' اب آپ بتائیے میں انہیں کیا جواب دوں؟"

"آپ انہیں بتا دیجیے شاہ صاحب کہ آپ اجمل بیگ نہیں بلکہ امیر شاہ ہی ہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے' اب ہم کیا کر سکتے ہیں' ٹھیک ہے جہانو' تم ہمیں امیر شاہ ہی کہہ سکتے ہو لیکن بہتر یہ ہو گا کہ یہاں تم ہمیں بیگ صاحب کہہ کر مخاطب کرو' یہ میڈم نیلم خان ہیں' ہماری دست راست اور ہمارے تمام کام کی نگران اور وہ لڑکی جس نے تمہیں یہاں ریسیو کیا اس کا نام ڈینی ہے' ڈینی ولسن' تم یہ سمجھ لو کہ ہم تینوں دوستوں کی طرح رہتے ہیں' ڈینی کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ تمہاری خاطر مدارت کا بندوبست کرے تمہیں اس بات پر ضرور حیرت بھی ہو گی کہ آستانے کا

زندگی

زندگی کسی میدانِ کارزار کا نام نہیں' یہ جلوہ گاہ حسن کی جلوہ گاہ ہے۔ یہ ایک رونق بازار ہے۔ جس میں سے خریدار گزرتا ہے وہ خریداری کرتا ہے اور اس کا سرمایہ ختم ہو جاتا ہے اور پھر تعجب ہے اس کی خریداری دھری رہ جاتی ہے' وہ خالی ہاتھ واپس لوٹتا ہے رونقِ بازار قائم ہی رہتی ہے اور خریدار ختم ہوتے رہتے ہیں۔ زندگی کسی الجھے سوال کا نام نہیں یہ ایک پُر لطف منظر ہے' ایک سننے والا نغمہ ہے۔ ایک سوچنے والا منصوبہ نہیں یہ ایک مشکل معمہ نہیں' زندگی تو بس زندگی ہے کسی کا احسان ہے' کسی کی دین ہے اور کسی کا عمل ہے۔ اچھے اعمال ہمیں بچا لیتے اور بُرے اعمال ہمیں برباد کر دیتے ہیں' زندگی حسن کی جلوہ گاہ ہے۔

حمنہ سحر ...... قصور

امیر شاہ یہاں اجمل بیگ کے نام سے کیوں رہتا ہے' بیٹے دنیا بہت عجیب وغریب جگہ ہے' انسان کو نجانے کیسی کیسی شخصیتوں سے واسطہ پڑتا ہے' ابھی تمہیں یہ نہیں معلوم ہوگا کہ پیر امیر شاہ کی شخصیت صرف دوہری ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ ہے' تم سوچو گے کہ میں تمہاری طرف کیوں متوجہ ہوا ہوں' جبکہ مجھے ہر طرح سے بہت سے سہارے حاصل ہیں تو تم یہ سمجھ لو کہ میری نگاہیں بہت گہرائیوں تک چلی جاتی ہیں اور اس خوبی کی بناء پر میں نے دنیا میں اپنے لیے بڑی جگہ بنا رکھی ہے' میں نے تمہارے اندر جو کچھ دیکھا ہے وہ میں اپنی زبانی کیا کہوں' تمہیں نیلم خان بتائے گی' کیوں نیلم کیا کہتی ہو تم جہانزیب کے بارے میں' اصل میں نیلم خان کا کہنا یہ ہے کہ ان سے بڑا چہرہ شناس اور کوئی نہیں ہے۔"

"میں صرف اتنا ہی کہوں گی بیگ صاحب کہ آخر ایسی کوئی شخصیت تھی جسے پیر امیر شاہ نے اس قابل سمجھا کہ اسے اپنا جانشین بنائے اور جہاں تک جہانزیب کی چہرہ شناسی کا تعلق ہے تو میں آپ کو یہ بتاؤں کہ یہ انتہائی ٹھوس فطرت کا ایک دلیر نوجوان ہے جو اپنے فیصلے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔"

"گڈ' میں ہمیشہ تمہاری چہرہ شناسی سے متاثر ہوتا ہوں' چلو اب وقت ضائع کیے بغیر جہانزیب کو اپنا مقصد بتا دو' جہانزیب دنیا میں جینے کے لیے سب سے بڑا سہارا دولت ہوتی ہے' پہلا سوال میں تم سے یہ کرنا چاہتا ہوں کہ تمہیں دولت سے دلچسپی ہے۔"

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور اندازہ لگایا کہ امیر شاہ کیا کہنا چاہتا ہے' میں اندر سے کیا تھا اور کس طرح دولت میرے لیے ایک بے حقیقت چیز تھی یہ میں ہی جانتا تھا اور امیر شاہ اپنے آپ کو لاکھ پیر فقیر کہہ لے لیکن اتنا مجھے یقین تھا کہ وہ میری شخصیت سے کبھی واقف نہیں ہو سکتا' بھیروں کے بارے میں اسے کبھی نہیں معلوم ہو سکتا' اس وقت مجھے اس کے مزاج کے مطابق بات کرنی چاہیے چنانچہ میں نے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں' اپنے لیے ایک بہترین مستقبل کون نہیں چاہتا؟"

"لیکن دولت کو حاصل کرنا آسان کام نہیں ہے۔"

"ہاں کیوں نہیں' ورنہ ساری دنیا دولت مند کیوں نہ ہوتی' تاہم میں اس دنیا کو سمجھنا چاہتا ہوں۔"

"میں تمہیں اس دنیا کے بارے میں سب کچھ سمجھاؤں گا۔"

"مگر ایک بات میں آپ سے کہوں کہ میں جرم کے راستے دولت کا حصول نہیں چاہتا۔" میرے ان الفاظ پر نیلم خان اور امیر شاہ نے مجھے چونک کر دیکھا پھر بولا۔

"جرم کیا ہوتا ہے؟"

"ہر وہ کام جو قانون کی گرفت میں آئے۔"

"اگر تم یہ بات کہتے ہو تو میں تمہیں بتاؤں کہ جس وقت تم اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر نکلتے ہو اور جو عمل کرتے ہو اس میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہوتا جو قابل گرفت نہ ہو اور اگر کوئی بھی لمحہ قابل گرفت نہیں ہوتا تو اسے قابل گرفت بنا لیا جاتا ہے بشرطیکہ کسی کو شبہ ہو جائے کہ تم مستقبل کے بڑے آدمی بننے والے ہو یا بن چکے ہو' دنیا میں لاتعداد کاروبار چل رہے ہیں' ہاں اگر تم جرم اس کو کہتے ہو یعنی قتل یا ڈاکہ زنی یا بلیک میلنگ یا کوئی اور ایسا کام جو کسی کو زندگی سے دور کردے تو میں اسے مان لیتا ہوں' البتہ دوسری چیز ہوتی ہے کاروبار' کاروبار کے لیے بڑے بڑے کاروباری لوگوں کی زندگی کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو وہ بہت ایمانداری سے اپنا کام کرتے ہیں' لیکن اس کاروبار میں بہت سے لوگوں کو گھاٹا بھی ہوتا ہے'

کاروبار کاروبار ہی ہوتا ہے' نفع نقصان زندگی کے ساتھ ہوتا ہے' اصل چیز فن ہے اور اگر تم فن کے ذریعے دولت حاصل کرو انسانی کمزوریوں کو سمجھ کر ان سے فائدہ اٹھاؤ تو ہم اسے جرم کی حد میں نہیں لا سکتے' بے شمار لوگ ایسے ہیں جو اپنی تفریح کے لیے لاکھوں اور کروڑوں روپے ضائع کر دیتے ہیں۔ اگر ضائع کرنے والی دولت میں سے تھوڑا سا حصہ تمہارا ہو جائے تو کیا تم اسے جرم کہو گے۔ میرے خیال میں وہ جرم نہیں ہوتا' میں چاہتا ہوں کہ تم فنکار بنو' فن سے مارو اور یہ دیکھو کہ کون شخص تمہارے لیے کس قدر کارآمد ہو سکتا ہے' کیا سمجھے؟''

''جی سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''مثلاً اس میں ایک عمل ہوتا ہے بلیک میلنگ' کسی کی کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھانا ہوتا ہے جو اس کو کہیں بھی تباہ کر سکتی ہے یا اس کے ہاتھوں کسی کو نقصان پہنچانے کے بعد اس پر طاری ہو جاتی ہے۔''

''لیکن ہے تو یہ بلیک میلنگ۔''

''ہم بلیک میلنگ نہیں کہہ سکتے اسے' یہ ایک طریقۂ کار ہے۔'' امیر شاہ بولا اور پھر مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا' میں نے محسوس کیا کہ نیلم خان بڑے غور سے میرے چہرے کا جائزہ لیتی رہی ہے۔ اس نے کہا۔

''یہ بات میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ جہانزیب ہمارے بہترین ساتھی ثابت ہوں گے۔''

میں مسکراتا ہی رہا تھا' غرض یہ کہ میری پھر باقاعدہ پیر امیر شاہ سے ملاقاتیں ہوتی رہیں' جب کوئی خفیہ گفتگو کرنا ہوتی تھی وہ مجھے اجمل بیگ کی کوٹھی میں بلا لیتا تھا اور لیکچر دیا کرتا تھا۔ آخر کار میں نے دل میں سوچا کہ اس زندگی سے بھی لطف حاصل کیا جائے۔ یہ ایک الگ ہی زندگی ہوتی ہے۔

☆☆☆

میں امیر شاہ کے لیے باقاعدہ کام کرنے لگا' اس نے میرا برین واش کر دیا تھا' پہلے میں قانون کو بہت بڑی چیز سمجھتا تھا اور یہ سوچتا تھا کہ لاقانونیت وطن دشمنی ہوتی ہے جو مجھے نہیں کرنی چاہیے لیکن رفتہ رفتہ امیر شاہ مجھ پر اثر انداز ہوتا جا رہا تھا اور پھر نیلم خان کی قربت الگ مجھے ذہنی طور پر بھٹکا رہی تھی۔ فرید خان میرا بھٹکا ہوا پن محسوس کر رہا تھا اس نے کئی بار مجھ سے کہا۔

''کیا بات ہے' کیا تم امیر شاہ کے مریدوں میں شامل ہو چکے ہو؟''

''کافی حد تک۔''

''یار پتہ نہیں کیوں مجھے وہ نقلی پیر معلوم ہوتا ہے کوئی گڑبڑ ہے۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

آخر کار نیلم خان ایک دن مجھ سے کہنے لگی ''سنو' بابا صاحب کچھ مال دوسرے شہر بھیجنا چاہتے ہیں' ان کا کہنا ہے کہ تمہاری نگرانی میں یہ مال جائے گا۔''

''مال سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''پاؤڈر...... ہیروئن۔''

''ارے کیا بابا صاحب یہ بھی کرتے ہیں؟''

''اب تک تمہیں اس بارے میں نہیں معلوم ہو سکا۔'' نیلم خان بولی۔

''ہاں بابا صاحب کی باتوں سے مجھے کچھ لگتا تو تھا کہ وہ کچھ غیر قانونی عمل کرتے ہیں۔''

''کچھ زیادہ نہیں میرے بھولے راجہ۔ پیر امیر شاہ ایک زبردست بلیک میلر ہیں' شاہ بہت بڑے اسمگلر ہیں' چاروں طرف سے دولت آتی ہے' تم ان کی امیری کا اندازہ نہیں لگا سکتے جو کچھ بھی ہے' خیر اب مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں کچھ مال لے کر جانا ہے' ان کا کہنا ہے کہ ایک بار جب وہ ٹرین سے آ رہے تھے اور ان کے پاس

بہت بڑی رقم کی ہیروئن اور ہیرے تھے تو انہوں نے ایک سوٹ کیس تمہیں دے دیا تھا جسے تم نے نہایت صفائی سے نکال لیا' وہ یہی کہتے ہیں کہ تم بہت ہی ذہین انسان ہو' یہ مال جو ہم لے کر جا رہے ہیں' کروڑوں کی ملکیت کا ہے اور اگر ہم اسے صحیح جگہ پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تو یقین کرو اس کا معاوضہ بہت زبردست ہوگا۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے' پیر بابا کا۔''

''بس تم اسے احتیاط سے لے کر جاؤ گے اور میں تمہیں بریف کروں گی اور میں خود بھی تمہارے ساتھ ہی ہوں گی۔''

میں تیار ہو گیا تھا' آخر کار وہ وقت بھی آ گیا جب ایک ڈبل کیبن گاڑی جسے نیلم خان ڈرائیو کر رہی تھی مال لے کر چل پڑی' مال کو بڑے بڑے پیکٹوں میں چھپایا گیا تھا اور یہ پیکٹ ڈبل کیبن پر لاد دیے گئے تھے' ہم لوگ چل پڑے' نیلم خان سے میری کافی بے تکلفی ہو گئی تھی' ویسے بھی وہ بڑی دلچسپ اور دلکش عورت تھی' مجھے ابھی ان معاملات کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن نیلم خان رفتہ رفتہ مجھے اس طرف بھی لا رہی تھی۔

ایک دفعہ اس نے دھوکے سے مجھے شراب بھی پلا دی تھی اور میں دنیا سے بے خبر ہو گیا تھا۔ اب اس بے خبری کے عالم میں نیلم خان نے مجھے کون کون سے انسانی رموز سے آگاہ کیا تھا مجھے اس کا اندازہ تو نہیں تھا لیکن ہلکا ہلکا سا خمار یہ بتاتا تھا کہ میری زندگی میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ جس کا مجھے علم نہیں ہے' البتہ اس دن کے بعد سے میں نیلم خان میں بہت دلچسپی لینے لگا تھا' میں جانتا تھا کہ ہمارے ساتھ جو مال بھرا ہوا ہے وہ کروڑوں روپے کی مالیت کا ہے' اسے احتیاط سے منزل پر پہنچانا ہے اور شاید پہلے کی طرح کوئی خطرہ بھی درپیش تھا کیونکہ بارہ گھنٹے کے سفر کے بعد جب ہم ایک پراسرار سے پہاڑی علاقے سے گزر رہے تھے اچانک ہی دور سے پولیس کے کئی ٹرک نظر آئے' جنہوں نے سڑک کا راستہ روکا ہوا تھا' نیلم خوف سے لرز کر رہ گئی' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''جہانزیب مخبری ہو گئی اور اب ہماری خیر نہیں ہے' تھوڑے عرصے پہلے اسمگلنگ کی روک تھام کے لیے کچھ نئے آرڈر جاری کیے گئے ہیں ان میں ایک آرڈر یہ ہے کہ اگر اسمگلر کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جائے تو انہیں وہیں گولی مار دی جائے۔''

پولیس والے واقعی اس طرح مستعد تھے کہ اگر ہم ذرا سی گاڑی کی رفتار بھی ہلکی کرنے کی کوشش کرتے تو وہ ہمیں گنوں سے بھون ڈالتے۔

''اب بتاؤ ہم کیا کریں؟'' نیلم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''چلتے ہیں دیکھتے ہیں۔'' میں نے بے پروائی سے کہا اس وقت مجھے بھیروں یاد آ گیا تھا جو بڑے کام کی چیز تھا اور میں نے سرگوشی کے عالم میں بھیروں سے کہا۔

''بھیروں ان پیکٹوں میں جو مال ہے اسے غائب کر دو۔'' پھر بھیروں کی سرگوشی سنائی دی۔

''ٹھیک ہے ایسا ہو جائے گا۔''

نیلم نے پریشان لہجے میں کہا ''تم خاموش ہو گئے ایک دم' کیا ہمارا آخری وقت آ گیا ہے؟''

''نہیں نیلم' بے فکر رہو انہیں کچھ نہیں ملے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''کچھ نہیں ملے گا؟''

''ہاں۔''

''مم...... مگر......''

''میں نے کہا نا وہ لوگ اندھے ہو جائیں گے اور ہمارا مال تلاش نہیں کر پائیں گے۔''

نیلم نے کوئی جواب نہیں دیا' گاڑی آہستہ آہستہ پولیس کے نزدیک پہنچ گئی۔ ایک خونخوار سی شکل کے افسر اعلیٰ نے کہا۔

"نیچے اتر آؤ تم لوگ۔"

ہم لوگ نیچے اتر کر کھڑے ہو گئے تو افسر اعلیٰ نے نیلم کو دیکھتے ہوئے کہا:

"کیا ہے تمہاری گاڑی میں؟"

"کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے آپ چاہیں تو تلاشی لے سکتے ہیں۔" خونخوار شکل کے افسر نے نیلم کو گھورتے ہوئے کہا۔

"بہت چالاک معلوم ہوتی ہے تو میرا نام بھی گل باز خان ہے' اڑتی ہوئی چڑیا کے پر گن لیتا ہوں' بیوقوف بنا رہی ہے' مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تم لوگ ہیروئن کی کھیپ جا رہے ہو اور اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ اگر تمہارے پاس سے ہیروئن برآمد ہو گئی تو تمہیں اسی جگہ پر گولی مار کر ختم کر دیا جائے گا۔"

نیلم کا تو رنگ فق ہو گیا تھا لیکن میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "افسر صاحب' ہم خود بھی سچے وطن پرست ہیں وطن کو کبھی نقصان پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے آپ یہ خیال دل سے نکال دیجیے کہ ہم کوئی منشیات وغیرہ لے کر جا رہے ہیں۔"

"تلاشی ہو جاتی ہے ابھی۔"

اور اس کے بعد کئی پولیس والے ہمارے ڈبل کیبن گاڑی پر چڑھ گئے' انہوں نے بڑی بے دردی سے وہ پیکٹ کھولنا شروع کر دیئے جن میں ایسا سامان اور ایسی ہی دوسری چیزیں تھیں جو سرحدی علاقوں میں استعمال ہو سکتی تھیں' مثلاً لنڈے کے موٹے موٹے کپڑے اور ایسی ہی دوسری چیزیں پولیس والے سامان کی تلاشی لیتے رہے' نیلم آنکھیں بند کر کے ایک جگہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی جو سڑک کے کنارے اُگا ہوا تھا میں بھی گاڑی سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا تھا اور بھیریوں کی کارکردگی کا جائزہ لے رہا تھا۔

ہیروئن کیا' کوئی چیز اس میں سے برآمد نہ ہوئی تو افسر اعلیٰ کا چہرہ بگڑ گیا اس نے غراتے ہوئے اپنے اسسٹنٹ سے کہا۔

"اگر مال پیکٹوں میں نہیں تو گاڑی کے مختلف حصوں میں تلاش کرو۔" اور اب اس کے بعد تلاشی شروع ہو گئی' تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہمیں یہاں گزارنا پڑا' پولیس آفیسر اب شرمندہ نظر آ رہا تھا اس نے کہا۔

"مخبری غلط ہوئی ہے دوست' تمہیں تکلیف دی گئی لیکن تم ایک بات خود بھی سمجھتے ہو کہ پولیس کے فرائض کیا ہوتے ہیں' ہم نے صرف اپنا فرض پورا کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا ہے تم سے معافی چاہتے ہیں لیکن ایک اچھے شہری کی حیثیت سے تم ہمارے اس عمل کا برا نہیں مانو گے اور معاف کیجیے گا میڈم آپ کو بھی تکلیف ہوئی آپ جا سکتی ہیں۔"

نیلم خان نے جواب نہ دیا اس نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی لیکن وہ بری طرح چکرائی ہوئی تھی' پھر جب اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ ہم لوگ کافی دور نکل آئے ہیں تو اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"مال کہاں گیا جہانو۔ کروڑوں روپے مالیت کی ہیروئن تھی وہ اور ہمیں اسے ایک جگہ ڈلیور کرنا تھا' یہ کیا ہو گیا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟"

"نہیں بتاؤ پلیز' تم نے مجھے کس طرح اطمینان دلا دیا تھا کہ وہ لوگ مال برآمد نہیں کر سکیں گے' کیا واقعی اب ہم وہ مال ڈلیور نہیں کر سکیں گے۔"

"معمول کے مطابق۔"

''کیا مطلب؟''
مال وہیں موجود ہے۔''
''پپ...... پھر وہ......''
''اندھے ہوگئے تھے۔''
''یہ کیسے ممکن ہے؟'' نیلم آہستہ سے بڑبڑائی اور بات بالکل ٹھیک تھی' مقررہ جگہ پہنچنے کے بعد وہ مال پیکٹوں میں تلاش کیا گیا اور وہ آسانی سے حاصل ہو گیا۔ نیلم کی خوشی کی انتہا نہیں تھی' ہم نے وہاں دو دن قیام کیا اور ان دو دنوں میں نیلم مجھ پر پروانہ وار نثار ہوتی رہی' میں بھی اب اس زندگی کا عادی ہو گیا تھا لیکن نیلم اس بات پر بہت حیران تھی کہ میں نے آخر کیا جادو کیا کہ پولیس والوں کو مال نہیں ملا۔
''شاید تم مسمریزم جانتے ہو؟''
''یہ کیا ہوتا ہے؟'' میں نے حیرانی سے کہا اور نیلم ہنسنے لگی' لیکن اس وقت کے بعد سے ذرا سی تبدیل ہوگئی۔
ہم لوگ وہاں سے واپس آگئے فرید خان خوش تھا اور اب وہ نہایت مطمئن زندگی گزار رہا تھا اس نے پیار سے میرا استقبال کیا اور بولا۔
''یار اب تو تم ہمارے ہاتھ ہی نہیں لگتے' بچیاں بھی شکایت کر رہی تھیں کہ بھائی جان کا اب کوئی پتہ نہیں ہوتا۔''
''بس تم دیکھ لو میں نے تم لوگوں سے کہا تھا نا کہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی میری وجہ سے' میں تمہارے لیے بندوبست کر رہا ہوں۔''
اور میں نے واقعی بندوبست کیا' پیر امیر شاہ سے کہہ کر ایک خوبصورت سے علاقے میں ایک چھوٹا سا مکان حاصل کیا جہاں انہیں منتقل کر دیا۔ اس کے علاوہ اتنی رقم انہیں مہیا کر دی کہ فرید خان بڑے آرام سے زندگی بسر کر سکے۔

میں فرید خان کے ساتھ ہی اس کے گھر میں منتقل ہوا تھا' لیکن میرے دل کی بے کلی اور بے چینی کبھی کم نہیں ہوتی تھی' رات کی تنہائیوں میں جب کبھی جاگ جاتا تو کچھ بے نقش چہرے میری آنکھوں میں گردش کرتے رہتے' میرا ان سے رشتہ تھا' وہ کون تھے کیا تھے میں انہیں کوئی نام نہیں دے سکتا تھا' لیکن وہ میرے اپنے تھے' ایک عورت ایک مرد' لیکن ان کے چہرے کے نقوش تاریکی میں چھپے ہوتے تھے' آہ کہیں یہ تاریکی سے باہر آجائیں' میں نے ایک دن اس سلسلے میں بھیروں سے بھی رابطہ کیا۔
بھیروں کے بارے میں میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ مجھ سے خوش نہیں ہے۔ جو کچھ میں نے اس کے ساتھ کیا تھا اس سے وہ بالکل ناخوش تھا' لیکن وہ کڑا اس کی کلائی میں موجود تھا جو اسے میری غلامی پر مجبور کر رہا تھا' میں نے اس سے کہا۔
''بھیروں! میں جانتا ہوں تو مجھے پسند نہیں کرتا' لیکن اس دنیا میں کون کسے پسند کرتا ہے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل کام ہے' میرے سارے کام کرتا ہے تو مجھے یہ بتا کیا تو مجھے میرے ماں باپ کے بارے میں بھی بتا سکتا ہے وہ کون تھے اور کہاں تھے۔''
بھیروں کچھ لمحے خاموش رہا پھر اس نے اپنی مخصوص آواز میں کہا۔ ''نہیں...... مجھ پر لازم ہے کہ تم جو حکم دو میں اس کی تعمیل کروں' میری مجال نہیں ہے کہ میں تمہارے کسی ایسے حکم سے گریز کر سکوں لیکن یہ بات میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔''
میں خاموش ہو گیا۔ پیر صاحب کے لیے میں مسلسل کام کر رہا تھا اور اب مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ پیر صاحب اس ملک کے بہت بڑے اسمگلر ہیں اور دنیا کی ہر چیز کی اسمگلنگ کرتے ہیں وہ بہت سے معاملات میں مجھے واقفیت ہوتی

جا رہی تھی کئی بیرونی ممالک سے بھی ان کا رابطہ تھا' لیکن وہاں کے لیے پیر صاحب نے مجھے نہیں استعمال کیا تھا' البتہ جن سرحدوں پر اسمگلنگ کی اشیاء پہنچائی جاتی تھیں' وہاں تک میرا ہی ذریعہ استعمال کیا جاتا تھا' مجھے نہیں معلوم تھا کہ نیلم نے پیر صاحب کو میرے بارے میں کیا کیا بتایا ہے' لیکن میری ناتجربے کاری مجھے نیلم سے متاثر کر گئی تھی کیونکہ اس نے مجھے دنیا کے دوسرے معاملات سے آگاہ کیا تھا اور اکثر میں اس سے اس کے بارے میں بات بھی کرتا رہتا تھا۔

''نیلم! مجھے ایک بات بتاؤ' تم جس قدر میرے قریب آ گئی ہو' کیا تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ ایک دن ہم لوگ جدا بھی ہو جائیں گے۔''

میں نے ایک لمحے کے اندر نیلم کی آنکھوں میں مسکراہٹ دیکھی لیکن دوسرے لمحے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور بولی۔

''جدائی کا تصور بھلا تمہارے ذہن میں کیوں آیا؟''

''بس ایسے ہی نیلم بتا بھی چکا ہوں میں ایک عجیب وغریب انسان ہوں' میں نے جیسا کہ تمہیں بتایا کہ ایک ایسی جگہ پرورش پائی ہے جہاں میری حیثیت کا کوئی تعین نہیں ہوتا تھا لیکن میں وہاں نوکروں کی طرح ہی کام کرتا تھا۔ کبھی کسی نے مجھے میرے بارے میں نہیں بتایا بلکہ انہوں نے ایک نقلی ماں میرے حوالے کر دی تھی جو آخرکار منظر عام پر آ گئی' نیلم میری زندگی کی سب سے بڑی طلب اور خواہش ہے کہ کسی طرح مجھے میرے ماں باپ مل جائیں۔''

نیلم نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولی۔

''تو تم اس سلسلے میں پیر صاحب سے بات کیوں نہیں کرتے؟''

''کیا مطلب؟''

''وہ تمہیں اپنے علم سے بتا دیں گے کہ تمہارے ماں باپ کون تھے اور کہاں تھے؟''

میں نے عجیب نگاہوں سے نیلم کو دیکھا پھر کہا ''تم جانتی ہو نیلم کہ پیر صاحب بہروپیے ہیں' انہوں نے جو روپ بھر رکھا ہے وہ جعلی ہے' اصل میں وہ کچھ اور ہی ہیں' اگر اس کے باوجود تم مجھے انہی پیر صاحب سے اپنے معاملے میں معلوم کرنے کا مشورہ دے رہی ہو تو اس کا مقصد ہے کہ تم مجھ سے مخلص نہیں ہو۔''

''ایسی بات نہیں ہے جہانو' میرے کہنے کا مطلب کچھ اور تھا' تم یہ تو دیکھ ہی رہے ہو کہ پیر صاحب بے شمار لوگوں کا کام کرتے ہیں' ان کے ہزاروں مرید ہیں جو پیر صاحب کے لیے دنیا کا ہر کام سرانجام دیتے ہیں' ان کے مریدوں میں ایسے بھی کچھ لوگ نکل سکتے ہیں جو تمہارے بارے میں معلومات کریں' تم ایک مرتبہ ان سے رجوع کر کے تو دیکھو' بلاوجہ ہی انہیں اتنی شہرت اور عظمت حاصل نہیں ہوئی ہے' ٹھیک ہے میں مانتی ہوں کہ تم ان کے لیے بہترین کارکن ثابت ہوئے ہو لیکن تم کیا سمجھتے ہو کیا تم سے پہلے ان کا کام نہیں ہو رہا تھا' ان کا یہ کام کرنے والے ان کے بہت سے مریدین تھے اور شاید وہ اب بھی باہر کی دنیا میں یہ سارے کام کر رہے ہوں لیکن تم جو کام سرانجام دے رہے ہو وہ بھی بڑی حیثیت کا حامل ہے اور پیر صاحب تمہاری بے حد قدر کرتے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے میں ان سے اپنا مدعائے دل ظاہر کروں۔ کیا ان کے پاس ایسا کوئی علم ہے کہ وہ مجھے میرے ماں باپ کا پتہ بتا سکیں؟''

''شاید میں علم کے بارے میں تو نہیں کہتی' لیکن وہ اس قدر ذہین ضرور ہیں کہ انہوں نے ہزاروں لوگوں کو اپنا عقیدت مند بنا رکھا ہے' ممکن ہے وہ کوئی ذریعہ نکال لیں۔''

چنانچہ میں نے پیر امیر شاہ سے اپنے دل کی بات

کہی، شاید نیلم امیر شاہ کو پہلے اس بارے میں بتا چکی تھی، وہ تھوڑی دیر تک آنکھیں بند کئے رہے، پھر انہوں نے کہا۔

"میں پوری کوشش کروں گا کہ اس بارے میں پتہ چلا سکوں، تم فکر مت کرو، ہو سکتا ہے بہت جلد میں تمہارے ماں باپ کے بارے میں تفصیلات بتا دوں۔"

میں خاموش ہو گیا، کیا کہہ سکتا تھا کہ پیر صاحب کے وسائل کتنے ہیں، جتنا میں اس بہروپئے کو جانتا تھا اس کے مطابق تو اس کے پاس علم وغیرہ کچھ بھی نہیں تھا، بس آرٹسٹ تھا، فنکار تھا اور اپنے فن سے بڑے بڑے لوگوں کو بیوقوف بنائے ہوئے تھا۔ تاہم خود بھی میں خاموش ہو گیا کہ شاید پیر صاحب اس بارے میں کچھ کر سکیں۔

یہ سارے سلسلے جاری تھے، میں بے شمار جگہوں پر پیر صاحب کے لیے کام کر چکا تھا اور بھیروں اس بارے میں میرا مددگار ثابت ہوتا تھا، یہ بات کبھی بھی نیلم کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ جب بھی پیر صاحب کے اسمگلنگ کے مال پر چھاپے پڑتے ہیں وہ مال کہاں جاتا ہے اور کس طرح نارکوٹکس کے عملے کی نگاہوں سے محفوظ رہتا ہے، بھیروں میرا بہترین مددگار تھا اور میرا وقت گزر رہا تھا۔

میں نے فرید خان کو دوستی کا پورا پورا حق دیا تھا اس کے پاس اپنا گھر بھی تھا اور میں نے اسے ایک چھوٹا موٹا کاروبار کرا دیا تھا، میں جانتا تھا کہ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، کب اور کہاں میرا کھیل ختم ہو جائے، مجھے اس سے کوئی الجھن بھی نہیں تھی، زندگی میں کوئی ایسا کردار تھا ہی نہیں جس کے لیے مجھے زندہ رہنے کی خوشی ہو، اس طرح کافی وقت گزر گیا۔

پھر ایک دن جب میرا جنون انتہا کو پہنچ گیا تو میں نے ایک عمل کیا، میں اپنے ان ساتھیوں کی مدد سے کام کرنے لگا جو امیر شاہ کے دیئے ہوئے تھے اور خاصے جرائم پیشہ تھے، ایک عمارت کا انتخاب کیا اور ان لوگوں کو حکم دیا کہ حیدر شاہ کو اغوا کر کے لے آئیں، حیدر شاہ صاحب کے لیے میرے دل میں ہمیشہ ایک عجیب سا احساس رہا اس شخص نے میرے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا۔ انتہائی خود غرض اور مغرور قسم کا انسان تھا اور کبھی اس نے میرے ساتھ انسانیت کا سلوک نہیں کیا تھا، مجھے کوئی دقت نہ ہوئی لیکن جب حیدر شاہ کو اغوا کر کے اس ہال میں پہنچا دیا گیا جہاں مجھے اس سے ملاقات کرنی تھی تو میں اپنی اصل شکل میں اس کے سامنے پہنچا۔

تیز روشنیوں میں حیدر شاہ کی آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں، لیکن اس نے مجھے فوراً ہی پہچان لیا حالانکہ اب مجھ میں اور پرانے جہانزیب یا جہانو میں زمین آسمان کا فرق تھا، حیدر شاہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا، اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا، اس نے چند لمحات میری صورت دیکھنے کے بعد کہا۔

"اگر مجھ سے غلطی نہیں ہو رہی ہے تو تم جہانو ہو؟"

"ہاں...... آپ سے غلطی نہیں ہو رہی ہے حیدر شاہ۔"

"مم...... مگر تم...... تم جرائم پیشہ بن گئے ہو، تم نے اغواء برائے تاوان کا کھیل شروع کر دیا ہے؟"

"کیا اب بھی اس بات پر آپ مجھے ڈانٹیں گے؟"

"نہیں میں ڈانٹوں گا نہیں۔ البتہ ایک بات ضرور کہوں گا کہ گندا خون ہمیشہ گندا ہی ہوتا ہے۔"

"حیدر شاہ دوبارہ اس طرح کے الفاظ اپنے منہ سے مت نکالنا، ورنہ تمہاری زبان نکال کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں گا، زندگی بھر افسوس کرتے رہو گے، تم نے میرے بچپن سے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ اس قابل نہیں ہے کہ تمہاری عزت کی جائے، وہ وقت اور تھا یہ وقت اور ہے، میرے ماں باپ جو کوئی بھی ہیں

دوسری بار اگر تم نے انہیں گندا خون کہا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

ایک بار پھر حیدر شاہ کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا' وہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا' پھر بولا۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے یہ تو ہونا ہی تھا۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

میرے لیے اب برداشت کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا' میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور حیدر شاہ کے پاس پہنچ گیا۔

"کیا کہا۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

"ہاں یقینی طور پر تم کسی ایسے ماں باپ کی اولاد ہو جو......

لیکن حیدر شاہ کے منہ سے جو...... کا لفظ ہی نکلا تھا کہ میرے الٹے ہاتھ کا تھپڑ اس کے گال پر پڑا اور وہ زمین پر قلابازی کھا گیا' اتنا ہی زوردار تھپڑ تھا' میں آگے بڑھا اور میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا' حیدر شاہ کے منہ سے خون کی لکیر بہہ رہی تھی۔

"بیٹھ جاؤ حیدر شاہ' یہ پہلا تھپڑ ہے تمہارے بے شمار تھپڑوں کے جواب میں' ایک ایک تھپڑ کا حساب لوں گا میں ایک ایک تھپڑ کا' ہاں تو میرے ماں باپ گندا خون تھے۔"

حیدر شاہ کے چہرے پر اب کسی قدر خوف نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا "ٹھیک ہے جہانو' پہلے لوگ نمک کا بڑا خیال رکھتے تھے تم نے اس کوٹھی کا نمک کھایا ہے لیکن اس کے بعد تم نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا ہے؟"

"کبھی نہ کرتا کبھی نہ کرتا' اس نمک کی قیمت جب کبھی موقع آیا ادا کر دوں گا' لیکن میرے ماں باپ

حُسن

حُسن سیاہ بالوں میں نہیں بلکہ اس پاکیزہ ہالہ میں ہے جو اُن بالوں کے گرد محیط ہے۔

خوبری بڑی آنکھوں میں نہیں بلکہ اس نور میں ہے جو اُن آنکھوں سے پھوٹتا ہے۔

خگلابی ہونٹوں میں نہیں بلکہ اس شیرینی میں ہے جو اُن ہونٹوں سے ٹپکتی ہے۔

خمدار گردن میں نہیں بلکہ اس کیفیت میں ہے جو ذرا آگے کی طرف گردن جھکانے سے پیدا ہوتی ہے۔

حُسن جسم کی خوب صورتی میں نہیں بلکہ روح کی عظمت میں پوشیدہ ہے۔

حُسن سفید رنگت میں نہیں بلکہ دل کے آئینے کے اُجلے پن میں پنہاں ہے۔

ارشد کمال...... فیصل آباد

کے بارے میں اگر کوئی بھی ایک لفظ غلط کہے گا تو میں اسے زندہ دفن کر دوں گا' بتاؤ میرے ماں باپ کون تھے تم مجھے کہاں سے لائے؟" میں نے آگے بڑھ کر حیدر شاہ کا گریبان پکڑ لیا' میری آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا' حیدر شاہ نے میری شکل دیکھی اسے شاید صورت حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا اس نے کہا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہا' میں ایک مرتبہ کسی کام سے باہر گیا تھا' ہم لوگ اتفاق سے اپنی گاڑی کھلی چھوڑ گئے' میری بیوی میرے ساتھ تھی' جب ہم واپس آئے لیکن تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ پچھلی سیٹ سے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی اور ہم چونک گئے' پلٹ کر دیکھا تو تم گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پڑے ہوئے تھے اور چھوٹے سے تھے۔ ہم دنگ رہ گئے چاروں طرف دیکھا بعد میں ہمیں ایک پرچہ پڑا ہوا

نظر آیا گاڑی روک دی تھی میں نے۔ میری بیگم نے وہ پرچہ اٹھایا اس پر اردو میں ایک تحریر لکھی ہوئی تھی۔

''انسانوں سے ایک انسان کی درخواست ہے۔ یہ ہمارا بچہ ہے' جائز ہے' ہم دونوں شادی شدہ ہیں۔ میں کینسر کا مریض ہوں' میرے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ میں اس بچے کی پرورش کر سکوں' کون جانے کب میں اس دنیا سے چلا جاؤں' میرے بعد میری بیوی تنہا رہ جائے گی' ہم اس بچے کا بوجھ نہیں سنبھال سکتے۔ ہماری غربت ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتی۔ چنانچہ میں اسے آپ کی گاڑی میں چھوڑے جا رہا ہوں۔ یہ آپ کے پاس میری امانت ہے' روز محشر میں اس امانت کے بارے میں آپ سے سوال کروں گا اور آپ کو جواب دینا ہوگا۔

احمد حسن

''میں تمہیں گھر لے آیا۔ لیکن ظاہر ہے سڑکوں کی غلاظت کو میں اپنے خاندان میں جگہ نہیں دے سکتا تھا' میں نے تمہیں ایک ملازمہ کے حوالے کر دیا اور اس سے کہا کہ وہ تمہیں اپنا بیٹا بنا کر پالے اور اس کے بعد تم جوان ہوئے' یہ ہے تمہارا ماضی۔''

''آپ نے کبھی ان لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جو مجھے آپ کی کار میں چھوڑ گئے تھے؟'' میں نے سوال کیا۔

''میرے جوتے کو غرض پڑی تھی تمہارے جیسے نالی کے کیڑے تو جگہ جگہ کلبلاتے پھر رہے ہیں' ہر ایک کے بارے میں تو معلومات حاصل نہیں کی جا سکتیں' تمہاری جو اوقات تھی اسی اوقات میں تمہیں پرورش کیا جانے لگا' لیکن ایک بات کہوں اور تھپڑ مار سکتے ہو مجھے' کیونکہ تمہی ایسا کر سکتے ہو' اچھا خون اور غلط خون' اپنی یہی پہچان رکھتا ہے' مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم جرائم کی دنیا میں نکل آئے ہو اور پتہ نہیں کیا کیا کر رہے ہو گے' دیکھو لڑکے اگر تمہارا خون اچھا ہوتا تو تم ایک وطن پرست بہادر نوجوان ہوتے لیکن میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ تم اس وقت ایک جرائم پیشہ آدمی ہو' اس سے تمہارے خون کا اندازہ ہوتا ہے اور مجھے مارو' قتل کر دو لیکن یہ بات میں جو کہہ رہا ہوں بنیادی حیثیت رکھتی ہے' اچھا خون کبھی خراب نہیں ہوتا' تمہیں چاہے کتنے ہی غلط راستے ملتے لیکن اگر تمہاری رگوں میں اچھا خون ہوتا تو تم اس وقت ایک محب وطن اور اچھے انسان ہوتے' کیا بات ہے انتظار کیوں کر رہے ہو' میرے ان الفاظ پر اپنے دل کی بھڑاس نکالو کیونکہ تمہارے ضمیر میں شرافت کا کوئی وجود نہیں ہے۔'' حیدر شاہ نے کہا۔

میں سن ہو گیا تھا' اس سے بڑی گالی شاید کائنات میں کسی کو نہ دی گئی ہو' بہت دیر تک میں ساکت رہا پھر وہاں سے ہٹ آیا' باہر آ کر میں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ حیدر شاہ کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جاؤ اور اسے کسی ایسی جگہ چھوڑ آؤ جہاں سے وہ اپنے گھر واپس جا سکے اور میری ہدایت پر عمل کیا گیا لیکن اس کے بعد کرب کا ایک طوفان میرے وجود میں رقصاں ہو گیا' کیا واقعی میں اچھا خون نہیں ہوں' وہ خط جو حیدر شاہ نے مجھے سنایا تھا اس بات کی نشاندہی تو نہیں کرتا تھا کہ وہ تو اپنی بے کسی سے مجبور ہو کر مجھے ایک کار میں ڈال گئے تھے برے لوگ ہوں گے۔

یہ سوچیں نجانے کب تک جاری رہیں' پھر امیر شاہ کا خیال آیا' وہ جرائم پیشہ شخص جو لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا اور ملک کو نقصان پہنچا رہا تھا' اگر میں ایک محب وطن ہوں تو مجھے اس کا آلۂ کار نہیں ہونا چاہیے لیکن سوچ کے راستے بہت زیادہ دور تک نہ جا سکے' دل میں ایک پھانس ضرور چبھ گئی تھی اور سوچوں میں ڈوب گیا تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ پھر ذہن

بری طرح الجھنوں کا شکار ہو گیا۔ ایک شام نیلم خان کے ساتھ ایک جگہ بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا کہ نیلم خان نے کہا۔

''کیا بات ہے جہانو! کئی دن سے تم الجھے الجھے سے ہو؟''

''ہاں' میں کرب کا شکار ہوں' میں بڑی الجھن میں مبتلا ہوں۔''

''اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں ایک بہت ہی عمدہ دوا دوں' تم دیکھنا تمہاری کیفیت کس قدر بہتر ہو جاتی ہے۔'' چنانچہ میں بادل نخواستہ تیار ہو گیا' جو دوا اس نے مجھے پلائی تھی وہ انتہائی بدمزہ اور مکروہ قسم کی تھی' میں نے اسے پی تو لیا لیکن منہ بناتے ہوئے کہا۔

''نیلم کیا تھا یہ' کتنا بدبودار اور بدمزہ۔''

''دوائیں مزیدار تو نہیں ہوتیں' لیکن تم اس کا نتیجہ دیکھنا۔''

اور نتیجہ میں نے دیکھ لیا' مجھے کوئی ہوش نہیں رہا تھا' زبان لڑکھڑا رہی تھی' نیلم اپنی تمام لطافتیں مجھ پر نمایاں کر رہی تھی اور میں توجہ کی نگاہ سے انہیں دیکھ رہا تھا' پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور دوا پیو اور ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' میں نے کافی دوا پی اس کے ساتھ اور واقعی بہت ٹھیک ہو گیا' ترنگ میں مزیدار باتیں کر رہا تھا' نیلم میری آغوش میں موجود تھی اور میں زندگی سے روشناس ہو رہا تھا' وہ کہنے لگی۔

''تم نے کبھی مجھے اپنے ماضی کے بارے میں سب کچھ نہیں بتایا' تم یقین کرو میں تمہارے لیے اکثر الجھنوں کا شکار رہتی ہوں۔''

''کیوں؟'' میں نے لڑکھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔

''تم حیرت ناک ہو' تمہارے پاس کوئی ایسی طاقت ضرور ہے جس سے تم اسمگلنگ کرتے ہوئے انہیں بیوقوف بنا دیتے ہو اور بعد میں سب کچھ نمایاں ہو جاتا ہے۔''

''یہ سب بھیروں کا کمال ہے!''

''بھیروں' یہ کیا ہوتا ہے؟''

جواب میں میں نے اسے شروع سے آخر تک ساری تفصیل بتا دی اور وہ حیران رہ گئی' لیکن اس وقت میں حیران رہ گیا جب عالم ہوش میں پیر امیر شاہ نے مجھ سے کہا۔

''تم غضب کی شخصیت ہو میری آنکھوں میں دیکھو اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔''

میں نے حیرانی سے امیر شاہ کی آنکھوں میں دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے میرے ذہن سے کوئی عجیب سی چیز گزر گئی ہو' سوچ کی ایک گہری لکیر' کوئی ایسی چیز جو مجھے سلا رہی ہو۔ پھر شاید میں سو گیا' امیر شاہ کی آنکھوں سے نکلنے والی برقی شعاعیں مجھے سلانے میں کامیاب ہو گئی تھیں' لیکن میرا بدن سو رہا تھا نہ ذہن اور زبان دونوں چیزیں کام کر رہی تھیں۔

''ہاں تو تمہارے قبضے میں بھیروں ہے اور تم نے اس کے ہاتھ میں غلامی کا کڑا پہنایا ہوا ہے۔''

''ہاں' وہ کڑا میں نے اسے دھوکے سے پہنا دیا تھا اور جب تک وہ کڑا اس کے ہاتھ میں ہے وہ میرا غلام رہے گا اور اس کڑے کو صرف میں ہی اس کے ہاتھ سے اتار سکتا ہوں۔''

''یعنی جو بھی وہ کڑا اس کے ہاتھ میں پہنائے گا وہ اس کا غلام ہوگا؟''

''ہاں امیر شاہ۔'' میں نے کہا۔

''ذرا بلاؤ تو سہی اپنے بھیروں کو' ہم بھی تو دیکھیں وہ کیا ہے؟'' امیر شاہ نے کہا اور میں اس وقت اس کے ہر حکم کا پابند تھا' میں نے بھیروں کو آواز دی تو وہ حاضر ہو گیا۔

''یہ ہے بھیروں۔'' میں نے کہا۔

"ہاں اور میں اس کے ہاتھ میں یہ کڑا دیکھ رہا ہوں۔ اب تم ایک کام کرو یہ کڑا اس کے ہاتھ سے اتارو۔" امیر شاہ نے کہا اور میں کھڑا ہو گیا' بھیروں ساکت نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا' میں نے آگے بڑھ کر بھیروں کا ہاتھ پکڑا اور اس کے ہاتھ سے وہ کڑا اتار لیا' امیر شاہ کے چہرے پر خوشی کے آثار پھیل گئے تھے اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"لاؤ اب یہ کڑا مجھے دے دو میں اسے اپنے ہاتھ سے بھیروں کو پہناؤں گا اور اس کے بعد سے بھیروں میرا غلام ہوگا۔"

میں تو امیر شاہ کے ٹرانس میں تھا اور ہپناٹزم کے زیر اثر یہ سارے عمل کر رہا تھا' لیکن بھیروں امیر شاہ کا غلام نہیں تھا' پہلے بھی وہ دھوکے میں مارا گیا تھا' چنانچہ اس نے جھپٹا مار کر کڑا میرے ہاتھ سے چھین لیا اور اس کے بعد قہقہے لگاتا ہوا وہاں سے بھاگ گیا' امیر شاہ منہ دیکھتا رہ گیا تھا' میں تو تھا ہی اس کے ٹرانس میں' میں نے کچھ نہ کہا لیکن امیر شاہ کافی دور تک بھیروں کے پیچھے دوڑا تھا مگر اس کی کیا مجال تھی کہ بھیروں کو پکڑ سکتا۔ بھیروں غائب ہو گیا تھا' امیر شاہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

پھر اس نے مجھے اپنے ٹرانس سے آزاد کر دیا' لیکن اس سے پہلے اس نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں اس کے ٹرانس سے آزاد ہو کر یہاں سے نکل جاؤں گا اور میں نے ایسا ہی کیا' بھیروں سے میں نے کوئی سوال نہیں کیا تھا' لیکن ایک انوکھی بات تھی جب میں ایک نیند سو کر جاگا تو ساری صورت حال میرے علم میں آ گئی' امیر شاہ نے میرے ساتھ دھوکا دہی کی تھی اور میں فریب کھا گیا تھا' بھیروں میرے قبضے سے نکل چکا تھا اور اب میں ایک عام آدمی کے سوا کچھ نہیں تھا' لیکن اس کے بعد ایک جرائم پیشہ شخص کا ذہن کام کرنے لگا' حیدر شاہ کے الفاظ میرے خون میں تیزاب بن کر دوڑتے رہتے تھے اور پھر میں نے اپنی ذہانت سے کام شروع کر دیا۔

امیر شاہ کو بہت افسوس تھا کہ اس نے ایک کام کے آدمی کو ناکارہ بنا دیا اور وہی بات ہوئی کہ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم' نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے' بھیروں بھی ہاتھ نہیں آ سکا تھا اور میں بھی ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا۔

ایک شام اس نے اعتراف کیا کہ اس سے بہت بڑی غلطی ہو گئی' اب کیا کیا جائے کس طرح بھیروں کے حصول کے لیے دوبارہ کوشش کی جائے۔ ظاہر ہے میرے ذہن میں اس کے لیے انتقام کی آگ دہک رہی تھی' میں اس کے تمام رازوں سے واقف ہو چکا تھا اور وہ بھی میرے اوپر بہت بھروسہ کرتا تھا' لیکن حیدر شاہ نے اور کچھ کیا ہو نہ کیا ہو ایک کام ضرور کیا تھا کہ میرے دل میں وطن پرستی کی شمع روشن کر دی تھی اور اب میری سوچوں میں یہی رہتا تھا کہ اپنے پیارے وطن کے لیے میں کتنا بڑا نقصان دہ ثابت ہوا ہوں' میرا ذہن رفتہ رفتہ بڑی قوتیں حاصل کرتا جا رہا تھا۔

امیر شاہ نے تو اپنا جال پھیلا رکھا تھا لیکن میں اب دن رات امیر شاہ کے خلاف ہی سوچتا رہتا تھا' اس دوران میری ملاقات رمضان خان سے ہوئی اور میرے ذہن میں ایک منصوبہ پروان چڑھنے لگا' میں نے دو تین گھنٹے تک رمضان خان سے بات چیت کر کے ایک منصوبہ بنایا اور رمضان خان کو اس منصوبے کا انچارج بنا دیا' پیسوں کی میرے پاس کمی نہیں تھی' فرید خان کو میں نے دوسرا سلطان دے دیا تھا اور وہ آرام سے زندگی گزار رہا تھا' لیکن میں اب مضطرب تھا' رمضان خان نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اس نے ایک ایسا گروہ تیار کیا جو میرے اشارے پر عمل کرنے کے لیے ہر وقت مستعد رہتا تھا۔

یہ زیادہ تر جرائم پیشہ لوگ تھے لیکن ایسے جو جرم کی دنیا سے دور رہنا چاہتے تھے مگر وہ دنیا انہیں نہیں چھوڑتی تھی' ان کی ضرورتیں اسی طرح سے پوری ہوتی تھیں اور ان ضرورتوں کی ذمے داری میں نے خود سنبھال لی' امیر شاہ کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی لیکن میں نے اس کے لیے جو کام انجام دے دیئے تھے انہوں نے اسے بڑی حیثیت دے دی تھی اور وہ انتہائی دکھی تھا کہ بھیروں کو میرے قبضے سے نکلوانے کے بعد اس کی صورت حال خراب ہوگئی ہے لیکن میں نے کچھ اور کام شروع کر دیا' میں نے جو اپنا کام کیا تھا وہ بالکل ہی الگ تھا۔ امیر شاہ ایسی کسی ذہانت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا جو طریقۂ کار میں نے وضع کیا تھا اس میں ایک شخص میرا دست راست ثابت ہوا جسے رمضان خان ہی نے منتخب کیا تھا جس کا نام آصف جوگی تھا۔

آصف جوگی کافی تعلیم یافتہ انسان تھا لیکن بے گناہ چھ سال کی جیل کاٹ چکا تھا اور اس طرح وہ عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا' انتہائی ذہین اور کارآمد شخص تھا' میں نے اسے اس بات کے لیے قائل کر لیا کہ برائی کے خلاف جنگ کرتے ہوئے بھی اگر کچھ برائیوں سے کام لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے' ہم نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ یہ تھا کہ جس طرح بھی بن پڑے یہ معلومات اصل کی جائیں کہ امیر شاہ اسمگلنگ کے سلسلے میں اور دوسرے جرائم کے سلسلے میں کس کس طرح کام کرتا ہے اور کن کن لوگوں سے اس کا واسطہ رہتا ہے' اس معلومات سے بڑے بڑے انکشاف ہوئے تھے لیکن میرا ذہن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا' میں یہ سوچ رہا تھا کہ میرا خفیہ گروہ جرائم پیشہ افراد کے خلاف کام کرے اور اس طرح کہ جو جرم مجھے امیر شاہ کے ذریعے علم میں آئے میں امیر شاہ کے لیے اس کی

اہل تصوف کی کرامت

کہتے ہیں کہ حضرت خواجہ عثمان ہارونی رحمتہ اللہ علیہ ہندوستان تشریف لا رہے تھے کہ راستے میں ان کا گزر ایک ایسے مقام سے ہوا جہاں پارسیوں کا بڑا آتش کدہ تھا۔ حضرت خواجہ عثمان ہارونی رحمتہ اللہ علیہ نے اس کے قریب قیام کیا اور اپنے خادم کو بھیجا کہ افطار کے واسطے آگ پر روٹی پکا لائے' خادم گیا تو آتش پرستوں نے آگ نہ دی حضرت کو خود اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا جب آپ آگ کے قریب پہنچے تو وہاں ایک بوڑھا موحد مختار نام کا سات برس کے لڑکے کو گود میں لیے کھڑا تھا حضرت نے اس سے گفتگو کی' آپ نے اس سے فرمایا کہ آگ ایک فانی چیز ہے ایک چلو پانی سے معدوم ہو جاتی ہے اس کو کیوں پوجتے ہو؟ اور جو خالق کائنات ہے جو اس آگ کا خالق ہے اسے کیوں نہیں پوجتے۔ اس نے کہا کہ آگ ہمارے مذہب میں بڑا مرتبہ رکھتی ہے اس کو کیوں نہ پوجیں۔ حضرت نے کہا کہ تم اتنی مدت سے آگ کی صدق دل سے پرستش کرتے ہو کیا تم یہ کر سکتے ہو کہ اپنا ہاتھ یا پاؤں اس آگ میں ڈالو اور وہ نہ جلائے۔ بوڑھے موحد نے کہا جلانا آگ کی خاصیت ہے جو اس میں ہاتھ ڈالے گا جل جائے گا۔ حضرت نے موحد کی یہ بات سن کر موحد کے فرزند کو اس کی آغوش سے لیا اور خود یہ آیت کریمہ پڑھتے ہوئے آگ میں داخل ہو گئے قلنا یانارُ کونی برداً وسلاماً علیٰ ابراہیم۔ یہ دیکھ کر موحد اور اس کے ساتھی حیران اور پریشان ہو گئے' آگ کے گرد شور کرنے لگے اور آہ و فغاں بلند کرتے مگر اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ تھوڑے دیر کے بعد حضرت خواجہ اس بچے کے ساتھ آگ کے شعلوں میں سے اس طرح نکلے کہ ان کے کپڑوں پر کوئی داغ دھبہ نہ تھا تمام آتش پرست یہ حال دیکھ کر ششدر رہ گئے اور حضرت کی کرامت دیکھ کر ان کے ہاتھ پر ایمان لائے' سات سالہ بچے کا نام ابراہیم اور بوڑھے موحد کا کا نام شیخ عبداللہ رکھا۔ سید العارفین کے مصنف کا کہنا ہے ان دونوں ہستیوں کے عالیشان مقبرے میں نے دیکھے اور قیام بھی کیا۔

رفیق احمد..... نوابشاہ

طرف قدم بڑھاؤں لیکن پس پردہ میں ان لوگوں کو معلومات فراہم کروں جو جرم کے خلاف کام کرنے کو تیار ہوں گے، جن کا سربراہ آصف جوگی تھا' آصف جوگی نے بھی کچھ لوگوں کو اس کام کے لیے منتخب کیا تھا اور یہ سب بڑے زبردست لوگ تھے یعنی وہ جو کسی نہ کسی جگہ بے گناہ جیل کاٹ چکے تھے اور اب تک جرم کی چکی میں پس رہے تھے' جب انہیں مالی فراغت حاصل ہوئی تو وہ وطن کے لیے کام کرنے کو تیار ہو گئے اور اس کے بعد میں نے آخری عمل کیا جو میرے ذہن میں تھا' امیر شاہ مجھ پر اعتبار کرتا تھا میں نے اس سے ایک فرمائش کی میں نے کہا کہ وہ ان لوگوں کو جو اس کے لیے کام کرتے ہیں بلا کر ایک میٹنگ کرے اور اس میٹنگ میں وہ یہ اعلان کرے کہ میں اس کا نائب ہوں اور اب ان لوگوں سے میرا ہی تعلق رہے گا' امیر شاہ نے اس کی وجہ پوچھی تو میں نے مسکرا کر کہا۔

''شاہ جی! میں چاہتا ہوں کہ اب آپ صرف مجھے ہدایات دیں اور اس کے علاوہ کچھ نہ کریں۔'' امیر شاہ اس کے لیے تیار ہو گیا' چنانچہ جن جن لوگوں کو وہاں بلایا گیا ان کے بارے میں جان کر میں حیرت سے دنگ رہ گیا' اتنی بڑی بڑی شخصیتیں تھیں کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ جرائم میں ملوث ہوں گے۔ میرا ان سب سے تعارف کرایا گیا اور امیر شاہ نے میری ہدایت کے مطابق کہا۔

''دوستو! میں نے زندگی میں آپ لوگوں کے ساتھ مل کر بہت کچھ کیا ہے اور اب بھی کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا' لیکن میں نے ایک نوجوان خون تیار کیا ہے جو اب میرے دست راست کی حیثیت سے کام کرے گا' میں چاہتا ہوں کہ بیرونی دنیا کے سفر پر نکل جاؤں اور تھوڑا سا وقت سکون کا گزار کر آؤں۔''

میں نے جو منصوبہ امیر شاہ کے سامنے پیش کیا تھا یہ سارا کام اس کے تحت ہو رہا تھا' لیکن میرے دل میں کچھ اور بھی تھا' اس دوران میں اس رہائش گاہ میں جہاں امیر شاہ نام بدل کر رہتا تھا ایک ایسا تہہ خانہ تلاش کر چکا تھا جو میرے کام کا ثابت ہو سکتا تھا' تمام لوگوں نے میرے ساتھ تعاون کا فیصلہ کیا اور مجھے جہانو شاہ کے نام سے پکار کر میری خدمات قبول کر لیں' امیر شاہ کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ جس طرح اس نے بھیروں کو میرے قبضے سے نکال دیا تھا اس طرح وہ خود بھی کسی ایسے جال میں پھنس جائے گا جو اس کے لیے عذاب جان ہی ثابت ہو گا اور وہ میرے اس جال میں پھنس چکا تھا۔

چنانچہ یہ اعلان تو وہ کر ہی چکا تھا کہ وہ بیرون ملک دورے پر جا رہا ہے' اس دن ایک باقاعدہ ڈنر میں جو اس کے دوسرے گھر میں تھا' نیلم خان امیر شاہ اور میں شریک تھے' میں نے امیر شاہ سے کہا کہ میں ایک منصوبہ بنا چکا ہوں اور اس منصوبے کے تحت کام کرنا چاہتا ہوں' وہ میرے ساتھ آئے' میں ان دونوں کو اس تہہ خانے میں لے گیا' میرے پیچھے آصف جوگی اپنے بارہ آدمیوں کو لے آیا تھا جنہوں نے اس دوسری کوٹھی کا نظام سنبھال لیا اور تمام ملازموں کو پابہ زنجیر کر لیا۔

پھر اس کے بعد میں امیر شاہ کو تہہ خانے میں لے گیا' نیلم خان بھی ساتھ تھی جو اب میری گہری دوست بن چکی تھی' یہاں پہنچ کر میں نے امیر شاہ سے کہا۔

''شاہ جی حقیقت یہ ہے کہ آپ کو اس طرح سے کام کرتے دیکھ کر اب مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے' میں چاہتا ہوں کہ اب آپ واقعی آرام کریں' نیلم خان آپ کی خدمات کے لیے آپ کے ساتھ رہے گی۔ باقی آپ کو اسی تہہ خانے میں قیام کرنا ہو گا' کھانے پینے کی تمام چیزیں آپ کو ملیں گی اور اگر کچھ دوسرے معاملات ہوئے تو ان کے لیے آپ سے مشورہ کیا

جاتا رہے گا۔"

"میں سمجھا نہیں جہانو۔" امیر شاہ نے حیرانی سے کہا۔

"آپ اب یہاں قید ہیں اور نیلم خان تم بھی اپنے آپ کو اس تہہ خانے کا قیدی سمجھو' یہاں تمہیں ہر طرح کی چیزیں کھانے پینے کو ملیں گے' تہہ خانہ اتنا بڑا ہے کہ تم تھوڑی بہت ورزش کر کے بھی جی سکتے ہو' میں فیصلہ کروں گا کہ تمہارا مستقبل کیا ہوگا۔"

"کیا بکواس کر رہا ہے تو ادھر دیکھ میری آنکھوں میں۔" امیر شاہ نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا' لیکن میں ہنس پڑا۔

"نہیں امیر شاہ' اپنی آنکھوں میں دکھا کر تم نے مجھ سے بھیروں چھین لیا' اب اگر دوبارہ تم نے مجھ سے اپنی آنکھوں میں دیکھنے کے لیے کہا تو میں بڑے اطمینان سے تمہاری یہ دونوں آنکھیں پھوڑ دوں گا' سمجھ رہے ہو۔"

میرے لہجے کی سفاکی کو امیر شاہ نے محسوس کر لیا تھا' ادھر آصف جوگی اپنے چھ ساتھیوں کے ساتھ تہہ خانے میں آ گیا تھا' چنانچہ امیر شاہ کو بالکل ہی خالی کر دیا گیا' اس کے پاس جو کچھ تھا وہ سب لے لیا گیا' اس سے وعدہ کیا گیا کہ اس کے لیے نئے لباس اور دوسری چیزیں مہیا کر دی جائیں گی اور اس کا خیال رکھا جائے گا اس کے بعد نیلم شاہ کو بھی یہی تمام باتیں کہی گئیں وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"مگر میں نے تو کچھ نہیں کیا ہے۔"

"جس نے جو کچھ کیا ہے مجھے معلوم ہے نیلم خان' بس آرام کرو۔"

ان دونوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر میں باہر نکل آیا' البتہ تہہ خانے کی نگرانی کے لیے میں نے بہت ہی ذمے دار لوگوں کو منتخب کیا تھا جن کی کمان آصف جوگی نے ہی سنبھال رکھی تھی کیونکہ دوسرے بڑے بڑے لوگوں کے سامنے امیر شاہ نے مجھے اپنے نائب کا درجہ دے دیا تھا اس لیے وہ سب میرا احترام کرنے لگے اور میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ یہ کام انتہائی دلچسپ تھا بہت سے دوست مجھ سے ٹکرائے لیکن ہوتا یہ تھا کہ میں ایسے منصوبے ترتیب دیتا جن کے تحت وہ جرائم پیشہ لوگ اپنا جرم تو کرتے لیکن اس کے بعد فوری طور پر پولیس کے شکنجے میں آ جاتے۔

ایک خفیہ نام سے میں نے اپنا کام شروع کر رکھا تھا اور پولیس کے اعلیٰ افسران سے میرا ٹیلی فونک رابطہ رہتا تھا' وہ لوگ بھی خوش تھے کہ میں بڑے بڑے معاملات میں ان کے ساتھ تعاون کرتا ہوں' البتہ چند افراد ایسے تھے جن سے میری براہ راست ٹسل چل رہی تھی اور ان میں ایک اہم نام صفدر شاہ تھا۔

صفدر شاہ بڑے لمبے ہاتھوں کا مالک تھا' اربوں ڈالر اِدھر اُدھر کر دیتا تھا اور وطن کے خزانے کو ناقابلِ تسخیر نقصان پہنچا رہا تھا' میرا پہلا شکار وہی بنا اور میں کھل کر اس کے سامنے آ گیا لیکن امیر شاہ کے نائب کی حیثیت سے نہیں جس کا نام جہانزیب شاہ پکارا جاتا تھا بلکہ اس دوسرے نام سے جو آصف جوگی کی حیثیت سے منظرِ عام پر آیا تھا۔ صفدر شاہ اور میرے درمیان ایک دلچسپ آنکھ مچولی شروع ہو گئی اور ہم دونوں نے اپنے کھیل کا آغاز کر دیا لیکن اس میں مَیں ایک پازیٹو کیریکٹر تھا۔

انشاء اللہ باقی آئندہ ماہ



زلیخا

کشاف اقبال

قارئین! صبراً جمیل کے الفاظ تو یقینا آپ سب نے ہی قرآن پاک میں پڑھے ہوں گے۔ صبر جمیل کا لفظی ترجمہ "خوبصورت صبر" ہے۔ اس سے مراد ایسا صبر ہے جس میں شکایت نہ ہو' فریادہ نہ ہو' جزع فزع نہ ہو' ٹھنڈے دل سے اس مصیبت کو برداشت کیاجائے جو ایک اعلیٰ ظرف انسان پر آپڑی ہو۔

ایک ایسے صدیق شخص کی کہانی جس نے برہانِ الٰہی کی بنا پر اپنے نفس کو دعوتِ عیش قبول کرنے سے روکا۔

شموسم بہار نے پورے اسلام آباد کو اپنے سحر میں جکڑا ہوا تھا ہر سو سبزہ تھا۔ طراوت تھی' خزاں کے سوکھے پتے جھڑ چکے تھے مگر ایمان کی زندگی میں شاید خزاں کا موسم پلکیں بچھائے ایک بار پھر اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ عارض اس سے دور جارہا تھا' چھ ماہ کے کے لیے ایمان کو اکیلا چھوڑ کر اومان جارہا تھا۔

ایمان فیصل مسجد کی گھاس پر جو بہار کے موسم کی نمی کے باعث چمک رہی تھی آکر بیٹھ گئی۔ سر پر نفاست کے ساتھ دوپٹا اوڑھے وہ عارض کے مسجد سے باہر آنے کا انتظار کررہی تھی جو اندر نماز عصر ادا کررہا تھا۔ اس کی آنکھ میں آنسو تھے پر وہ انہیں اپنے شریک حیات کے سامنے نہیں کرنے دیتی۔ انہیں اپنے اندر اتارلے گی کیونکہ وہ اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھی کہ اس کے آنسو عارض کی سب سے بڑی کمزوری ہیں لہٰذا وہ اس بہتے دریا کو اپنے اندر اتارلے گی' ضبط کرے گی پر عارض کو اومان جانے سے ہرگز نہیں روکے گی' نہ ہی اسے یہاں رکنے کا کوئی اشارہ دے گی۔ وہ اس دریا کو اپنے اندر اتارنے کی کوشش کررہی تھی کہ اس نے ایک نظر پلٹ کر مسجد کی جانب دیکھا۔ عارض چہرے پر ایک پُرسکون مسکراہٹ لیے اس کے پاس آرہا تھا۔

عارض نہایت حسین اور خوش دل تھا۔ نماز' روزہ اور تمام عبادات کے رنگ اس کی روح میں اس طرح سرائیت کرگئے تھے کہ اس کی صورت بھی اس کی عبادتوں کی شہادت دینے لگی تھی۔ ایک نور تھا اس کے خوش باش چہرے پر۔

''آپ نے نماز پڑھ لی؟'' وہ عارض کے آنے پر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جی پڑھ لی اور دعا میں اللہ سے آپ کو مانگا۔'' عارض نے پاس والی بنچ کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''پر میں تو آپ کی ہی ہوں' آپ کے نکاح میں ہوں۔'' وہ دونوں اب بنچ پر بیٹھ چکے تھے۔

''ہاں تم میرے نکاح میں ہو پر میں چھ ماہ کے لیے اومان جارہا ہوں نہ اس لیے ڈر لگتا ہے کہ یہ طویل عرصہ مجھے تم سے دور نہ کردے۔'' عارض آس پاس کے لوگوں کو دیکھتا ایمان سے مخاطب تھا۔

جو آنسو ایمان نے اپنے اندر اتارے تھے'



آہستہ آہستہ وہ اب عیاں ہو رہے تھے پھر بھلا ہو اس بارش کا جس نے ان آنسوؤں کی پردہ پوشی کردی' وہ دونوں اب بھیگ رہے تھے۔

"آپ کو یاد ہے ہمارا نکاح اسی مسجد میں ہوا تھا اور آج بھی ہم یہاں موجود ہیں۔ ہم نے اس روز وعدہ کیا تھا کہ کبھی ایک دوسرے سے دور نہیں ہوں گے۔" کچھ دیر کو وہ خاموش ہوئی پھر دوبارہ سے کہنے لگی۔

"وقت دو لوگوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے میں بڑا کردار ادا کرتا ہے پر دو لوگ ایک دوسرے سے اس وقت تک جدا نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ خود نہ چاہیں۔" بارش کی رفتار آہستہ آہستہ تیز ہوتی جا رہی تھی یہ وہ آخری بارش تھی جو ایمان عارض کے ہمراہ محسوس کر رہی تھی اس کے بعد وہ چھ ماہ تک کے لیے اس کے ساتھ کوئی بارش' کوئی برف باری کوئی احساس محسوس نہیں کر سکے گی۔

"میرا دل کرتا ہے کہ میں ہمیشہ یہیں رہوں' پر آٹھ ماہ بعد تمہاری رخصتی ہے اور پھر ہمارا ولیمہ اس کے تمام تر اخراجات میں خود اٹھانا چاہتا ہوں اور تو اور یہ میری پڑھائی کے اختتام کے بعد پہلی جاب ہے اور سیلری بھی اچھی خاصی مل رہی ہے۔ چھ ماہ کے اس پروجیکٹ میں مجھے اتنا پیسہ مل جائے گا کہ میں اچھے طریقے سے تمام تقریبات سرانجام دے سکوں گا پھر میں یہیں جاب پر لگ جاؤں گا' ہمیشہ کے لیے' فی الحال مجھے یہاں اتنے کم عرصے میں اتنی اچھی جاب نہیں مل سکتی لہٰذا مجھے امان جانا پڑے گا۔ تم سمجھ رہی ہو ایمان؟" اس کا ہاتھ ایمان کے ہاتھ میں تھا اور اس کی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"جی میں سمجھ رہی ہوں عارض! آپ بے فکر ہو کر وہاں جائیں' آپ مجھے بہت یاد آئیں گے پر پتا نہیں کیوں ایک عجیب سا ڈر میرے اندر سانسیں لے رہا ہے عارض!"

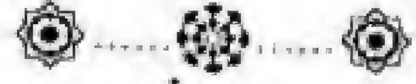
"کیسا ڈر؟" عارض نے اچنبھے انداز میں اسے دیکھا۔

"کہیں آپ کو وہاں کوئی زلیخا نہ مل جائے۔" اس کا انداز اور زیادہ متین ہو گیا۔

"کیا مطلب تمہارا؟" عارض کچھ دیر کو رکا پھر بولا۔

"میں اپنے نکاح اور اس سے بھی زیادہ اپنی محبت سے کبھی بے وفائی نہیں کر سکتا اور یہ بات میں اس مسجد کو دیکھ کر کہہ رہا ہوں جہاں ہم نے ایک دوسرے کے درمیان محبت کا عہد باندھا تھا۔"

محبت میں کھو جانے کا خوف دونوں طرف تھا اور وہ محبت کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھتی جہاں دونوں طرف کھو جانے کا خوف اتفاع پر ہو' اپنا لوہا منوا ہی لیتی ہے۔



ٹھیک شام ساڑھے پانچ بجے جہاز کوئین عالیہ انٹرنیشنل ائر پورٹ پر لینڈ کر چکا تھا۔ عارض اردن کے دارالحکومت امان پہنچ چکا تھا' اردن مسلمانوں کا ملک تھا' ملکاؤں شہزادوں کا مالک۔ عارض کی قسمت اتنی اچھی تھی کہ اسے یہاں کے سیون اسٹار ہوٹل Le Royal Dmman سے مارکیٹنگ ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنے کی آفر آئی تھی اس نے تو بس ایسے ہی اپنی سی وی یہاں بھیج دی تھی مگر اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی نوکری ایک سیون اسٹار ہوٹل میں لگے گی۔ وہ بھی اتنے قلیل عرصے میں۔

ایک سفید کیب جس پر Le Royal Dmman لکھا ہوا تھا' عارض کو لینے کے لیے آئی اور وہ اس میں بیٹھا Le Royal Dmman کی جانب چل پڑا' عارض کے مطابق امان واقعی بہت خوب صورت جگہ تھی پر شاید وہاں کے لوگ کافی ماڈرن تھے۔ کھلے عام وہ لباس پہنتے جو کسی مغربی ملک میں فخر سے پہنے جاتے ہوں۔

عارض لی رائل تک رسائی حاصل چکا تھا اس ہوٹل کی بلڈنگ نہ زیادہ اونچی تھی نہ ہی چھوٹی مگر چوڑائی میں کافی وسیع تھی۔ تین گول حصوں پر مبنی وہ بلڈنگ آنے جانے والوں کی نگاہوں کا مرکز ضرور تھی۔ نچلا گول حصہ سب سے زیادہ وسیع تھا' پھر دوسرا حصہ اس سے تھوڑا کم اور تیسرا اور آخری حصہ ان دو حصوں کے مقابل سب سے کم وسیع تھا پر ان دو کے مقابل کافی لمبا تھا۔ بنانے والے نے یقیناً بہت نفاست کے ساتھ وہ بلڈنگ بنائی تھی' عارض گاڑی سے اترا تو اس کے عین بعین ہوٹل کی دل آویز انٹرنس تھی اس نے اپنے قدم آگے کی طرف بڑھائے ہی تھے کہ دو آدمی جو پروفیشنل کلرکوں کی طرح ٹو پیس سوٹ پہنے ہوئے تھے اس کے منہ در منہ آ کھڑے ہوئے اور عارض کی پیشوائی کرنے کے بعد اسے اپنے ساتھ گیسٹ روم کی جانب لے جانے لگے۔

لی رائل باہر سے جتنا حسین تھا اندر سے اس سے بھی کہیں زیادہ دلکش اور آرٹسٹک تھا' اتنا سکوت تھا اس ہوٹل میں کہ آواز اگر کوئی آ بھی رہی تھی تو صرف جوتوں کے فلور سے لگنے لگی۔ بالآخر عارض کا کمرہ ان دو نوجوانوں نے اسے دکھا ہی دیا جو دسویں فلور پر بنا تھا۔

''یہ کمرہ آپ کا ہے سر! یہاں آرام کریں' چھ ماہ تک کے لیے آپ یہیں ٹھہریں گے۔'' ان میں سے ایک نوجوان اپنے دونوں ہاتھ کمر کے اطراف باندھتا ہوا مخاطب ہوا۔

''بہت شکریہ!'' عارض اب اپنے کمرے کا معائنہ کرنے لگا تھا جو کسی شہزادے کے کمرے سے کچھ کم نہ تھا۔

''آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو 80 ڈائل کر دیجیے گا اور ہاں......'' وہ کچھ دیر کو رکا پھر بولا۔

''آج رات ٹھیک دس بجے تم نئے ورکر کے لیے ایم ڈی صاحبہ کی طرف سے آئی وی کیفے میں ایک چھوٹی سی کوکاک ٹیل پارٹی ہے آپ بھی انوائٹڈ ہیں۔ آئی وی کیفے ہوٹل کی لابی پر ہے' آیئے گا ضرور۔'' وہ بے شک ایک کلرک تھا پر اس کے بات کرنے کا انداز نہایت رکھ رکھاؤ والا تھا

صومالیہ میں پاک فوج کا کردار

صومالیہ میں سوا کروڑ آبادی ہے اور اٹھانوے فیصد مسلمان ہیں نہایت پختہ قسم کے۔ ان کی پختگی کا اندازہ یہاں سے لگایا جا سکتا ہے کہ پورے چالیس سال تک عیسائی مشنریاں وہاں کام کرتی رہی ہیں اور چالیس سالوں میں ایک آدمی بھی عیسائی نہیں بنا سکے۔ امریکا نے اپنے پادریوں کی سرزنش کی کہ ہم نے تم پر اتنا روپیہ خرچ کیا ہے تم نے چالیس سالوں میں ایک آدمی بھی عیسائی نہیں بنایا۔ ایک رپورٹ کے مطابق مغربی ممالک اب وہاں سے اپنی مشنریاں نکال رہے ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔ اب وہاں دوسرے طریقے سے حملہ آور ہو رہے ہیں۔ وہاں تیل کے کنویں اتنے ہیں کہ اگر سارے نکل آئیں تو سعودیہ سے بھی وہاں تیل زیادہ ہے صومالیہ کے ساتھ سوڈان لگتا ہے۔ سوڈان کے حکمران نے بڑے احسن طریقے سے تھوڑی تھوڑی کر کے اسلامی اصلاحات نافذ کی ہیں۔ کل تک جو بھوکے مرتے تھے اب کافی حد تک گندم میں خود کفیل ہو گئے ہیں۔ امریکا چونکہ اسلام سے خائف ہے اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف ہے۔ وہ اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اقوام متحدہ کو استعمال کر رہا ہے۔ اب وہاں سات ہزار پاکستانی فوج بھیجی گئی ہے اپنوں کے ساتھ لڑنے کے لیے۔ شروع شروع میں چار پانچ امریکی فوجی ہلاک ہوئے ہیں اور بس۔ اب پاکستانی فوجی آگے آگے ہیں اور بھارت کے فوجیوں کو اسپتال پر لگایا ہوا ہے وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے ہیں اور پاکستانی فوجی لڑتے ہیں۔ صومالیہ کے فوجی بھی نمازیں پڑھتے ہیں اور پاکستانی فوجی بھی نمازیں پڑھ کر ان پر حملہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں پاکستانیو! تم ہمارے ساتھ کیوں لڑتے ہو؟ تم ہمیں امریکا کے ساتھ لڑنے دو ہم اس کے ساتھ نمٹ لیں گے مگر پاکستانی فوج امریکا کے ہاتھوں استعمال ہو رہی ہے۔

ذخیرۃ الجنان ج:۱۳ ص:۷۷

انتخاب: سید عاقب علی......راولپنڈی

شاید سیون اسٹار ہوٹلز کے کلرکوں کا انداز ایسا ہی ہوتا ہو عارض سر جھٹک کر بولا۔

"میں ضرور آؤں گا ان شاء اللہ۔"

"یہ بھی آپ کی جاب کا حصہ ہے سر! اس پارٹی میں تمام نئے ورکرز کا آپس میں انٹروڈکشن ہوگا اور یہی موقع ہے ایم ڈی صاحبہ سے اچھا تعلق قائم کرنے کا۔" عارض اس کی سن کم رہا تھا اور اپنے کمرے کا معائنہ زیادہ کر رہا تھا۔

"مجھے کیا ضرورت آن پڑی ان سے تعلق قائم کرنے کی۔ مجھے صرف اپنے کام سے مطلب ہے۔" کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھتا عارض اپنے آپ میں بڑبڑا رہا تھا۔

"کچھ کہا سر آپ نے؟" کلرک نے اچنبھے انداز سے پوچھا۔

"نہیں کچھ نہیں۔" عارض صفائی پیش کر رہا تھا۔

"آپ کا دن اچھا گزرے۔" وہ دونوں الوداعی کلمات کہتے وہاں سے روانہ ہو گئے۔

عارض اب اپنے روم میں تنہا تھا' اس نے کھڑکی پر سے مردن پردہ پورا ہٹایا تو پورے اومان کا منظر اس کی آنکھوں میں بھر آیا۔ کتنا خوب صورت لگ رہا تھا ایم ڈی صاحبہ کا شہر اس کھڑکی سے۔ کچھ دیر کو وہ یونہی پورے شہر کا کھڑکی سے معائنہ کرنے لگا پھر اچانک اسے ایک خیال آیا۔

"کہیں آپ کو وہاں کوئی زلیخا نہ مل جائے۔"

آخر ایسا کیا تھا جو ایمان کہنا چاہ رہی تھی' وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا پر بہت جلد سمجھنے والا تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے فوراً اپنی بیگم کو فون کیا۔

"وعلیکم السلام! کیسے ہیں عارض؟ پہنچ گئے

اومان؟'' فون کے دوسری جانب سے ایک سریلی آواز آئی۔

''جی پہنچ گیا اور تو اور مجھے یہاں ہوٹل میں گیسٹ روم بھی فراہم کیا گیا ہے' بہت خوب صورت ہے یہ شہر اور اس سے بھی کہیں زیادہ خوب صورت یہ ہوٹل۔ کاش تم بھی یہاں ہوتی تو میں تمہارے ساتھ پورا شہر گھومتا۔ تم بہت یاد آرہی ہو ایمان! تم ٹھیک تو ہونہ؟ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

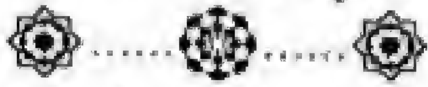
عارض کی مردانہ آواز میں کوئی جادو تھا جو سننے والے پر ایک انوکھا اثر ڈالتا تھا۔ آدمی تو حسین تھا ہی اوپر سے اس کی آواز' پورے اومان کی لڑکیاں اس کے حسن کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنے ہاتھ کاٹ لیں مگر اس کو یہاں اب تک کسی لڑکی نے نہیں دیکھا تھا نہ ہی اس کا سامنا کسی لڑکی سے اب تک ہوا تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں آپ میری فکر مت کریں' اپنے کام پر دھیان دیں۔ مجھے آپ کا انتظار کرنا بہت اچھا لگ رہا ہے' آپ کو پتا ہے وہ محبت ہمیشہ ادھوری رہتی ہے جس میں انتظار کے وسیع پل شامل نہ ہوں۔ انتظار ایک حسین نعمت ہے جو محبت کی دین ہے اور یہ میں اب جان رہی ہوں۔'' وہ مطمئن تھی اور اس بات کی گواہی اس کی آواز دے رہی تھی۔

''میری جان ہو تم ایمان! تم بہت اچھی ہو' آئی لو یو۔'' عارض اپنے جذبات کا اظہار ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر کرنے لگا۔

''آئی لو یو ٹو عارض!'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد عارض دوبارہ بولا۔

''اب مجھے اجازت دو' رات میں ہوٹل میں ایک پارٹی ہے' مجھے اس کے لیے کپڑے دیکھنے ہیں۔ میں نے تو اب تک اپنا سوٹ کیس بھی نہیں کھولا' سفر کی تھکن بہت ہے پر یہ پارٹی بھی میری نوکری کا حصہ ہے۔ اپنا خیال رکھنا' میں پھر کال کروں گا' اللہ حافظ۔'' عارض مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد اپنے کپڑے نکالنے لگا۔



رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے' عارض بلیک ٹو پیس سوٹ اور انڈگو شرٹ میں ملبوس کسی شہزادے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ نور تو ویسے ہی اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا اور اوپر سے آج وہ ٹو پیس سوٹ میں...... آج تو عارض کو ضرور کوئی نہ کوئی زلیخا ملنے ہی والی تھی۔ عارض اس سوچ میں گم ہو گیا کہ اگر آج ایمان اس کے ساتھ ہوتی تو وہ اس نفیس ڈیزائننگ والے شیشے کے سامنے اس کے ساتھ کھڑا ہو کر ایک سیلفی ضرور لیتا۔ اس نے اپنے بال سنوارے اور پرفیوم لگاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

آئی وی کیفے کی ایک سمت دو عورتیں پیانو کی بورڈ کے پاس کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں وائلن تھا اور دوسری لڑکی کی بورڈ کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھی یونہی وہ دونوں ماحول کو ایک خوشگوار دھن سے رنگین بنا رہی تھیں۔ نیلی اور فون کارپٹ پر چلتے عارض کیفے کے اندر آچکا تھا جہاں کافی رونق لگی ہوئی تھی مگر پھر بھی ایک سکون تھا وہاں' شاید اس دھن کے باعث۔

عارض کے قدم رکھتے ہی پورے آئی وی کیفے کا ماحول ہی بدل گیا۔ ایک لمبے قد کی لڑکی جو وائلن بجا رہی تھی' عارض کو دیکھتے ہی اس کا وائلن کارپٹ پر جا گرا اور ایک سناٹا سا چھا گیا۔ جبکہ دوسری لڑکی کا ہاتھ کی بورڈ کے ایک ہی بٹن پر دب

کر رہ گیا اور تو اور کیفے کی تمام عورتوں کا رویہ بھی ان دو لڑکیوں سے کچھ کم نہ تھا۔ عارض کو دیکھتے ہی ان تمام عورتوں کے ہاتھ سے پائن ایپل جوس کے گلاس چھوٹ گئے اور چھن کرکے آواز آئی جس کے باعث کیفے کا ماحول اور زیادہ حساس ہوگیا۔

عارض چونکہ عورتوں سے نظریں نہیں ملاتا تھا' وہ عورتوں سے پردہ نہیں کرتا تھا پر ان کے سامنے نظریں جھکا کر چلتا تھا لہٰذا اس کو پتا بھی نہ چلا کہ یہ تمام ہلچل صرف اس کی وجہ سے ہی ہوئی ہے۔ وہ ان آوازوں کو نظرانداز کرتا اندر چلتا گیا اور نئے ورکرز سے ملنے لگا' اسے پتا بھی نہ تھا کہ کیفے کی تمام عورتوں کی نظریں اس پر جمی ہوئی ہیں۔

ایم ڈی صاحبہ اپنے شوہر کے بازوؤں میں ہاتھ ڈالے کیفے میں داخل ہوئیں ان کا استقبال اتنے شاندار طریقے سے ہوا کہ عارض کی نظریں اس جوڑے پر پڑ ہی گئیں۔

''ہماری شادی میں ہم بھی اسی طرح سے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ چلیں گے ایمان! تم میرے پاس ہوگی اور میں تمہارے پاس......؟'' وہ اپنے آپ میں باتیں کر ہی رہا تھا کہ اس نے دیکھا ایم ڈی صاحبہ اس کو دیکھتے ہی شوہر کا ہاتھ چھوڑ کر اس کے پاس آرہی ہیں۔

''السلام علیکم میم!'' اب وہ اس کے عین سامنے آکھڑی ہوئی لہٰذا عارض کو گفتگو کا آغاز کرنا ہی تھا۔

''وعلیکم السلام! میرا نام لائبہ ہے' میں اس ہوٹل اور کمپنی کی ایم ڈی ہوں اور آپ کی مشکور کہ آپ ہمارے یہاں کام کرنے آئے۔'' وہ عارض کے گلے لگی اور اس سے باتیں کرنے لگی شاید عورتوں کا مردوں کے ساتھ گلے ملنا بڑی کمپنیوں میں عام

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔

☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں' صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔

☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔

☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔

☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کرواکر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کردیا ہے۔

☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔

☆ ''گفتگو'' کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3' تاریخ تک مل جانے چاہیے۔

☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔

7' فرید چیمبرز' عبداللہ ہارون روڈ' کراچی۔

☆ نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہٰذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں۔

سمجھا جاتا ہوں۔ عارض سوچ میں پڑ گیا پھر ایک دم سے خود کو ان کے پاس سے تھوڑا دور کیا۔

وہ ایک نازک اور نہایت حسین و جمیل عورت تھی' نیچرل بیوٹی میں سب سے آگے۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور نیلی تھیں اور لباس ملکاؤں کی طرح زمین تک گرا ہوا تھا شاید اگر وہ اس کے گلے تھوڑی دیر اور لگے رہتی تو اس کی نیت پھسل جاتی مگر عارض کو بھلے اپنی بیوی بھی یاد ہو نہ ہو برہانِ الٰہی ضرور یاد تھی۔

''مرحبا! میں لائبہ کا شوہر ہوں' آپ مجھے زباب کہہ سکتے ہیں۔ اس کمپنی میں میرا کوئی اتنا خاص کام نہیں بس اس ہوٹل کی مارکیٹنگ دوسرے ملک و شہر میں کرتا ہوں۔ میں یہاں بہت کم آتا ہوں' کام ہی اتنا ہوتا ہے۔'' زباب اب اپنی بیوی کو اپنے بازوؤں کی گرفت میں لیے ہوئے تھا پر لائبہ کی نظریں اب بھی عارض کی طرف کھنچی چلی جا رہی تھیں۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' عارض اور زباب باتوں میں مصروف ہو گئے پر لائبہ عارض کو ہر جانب سے دیکھے جا رہی تھی اور یہ بات عارض بھی بار بار نوٹ کر رہا تھا۔

''ہاں بس کل دوبارہ جا رہا ہوں زرقہ' کئی سیمینارز ہیں انہیں اٹینڈ کرنا ہے پھر چھ ماہ بعد یہاں آؤں گا۔'' عارض کی شخصیت اتنی پُرکشش تھی کہ ایک ایم ڈی کا شوہر بھی اس سے اس طرح بات کرنے لگا کہ جیسے اس کا کوئی دوست یار ہو۔

لائبہ کا شوہر بھی کافی ہینڈسم اور گڈ لکنگ تھا' کچھ ہی دیر بعد ایم ڈی صاحبہ نے سب کو ان کے کام ان کے ڈیپارٹمنٹس بتا دیئے اور کہا کہ کل سے سب کو اپنے اپنے کام پر لگ جانا ہے۔ وہ جب وہاں سے واپس گئی تو کسی لڑکے کے گلے نہیں لگی سوائے عارض کے اور اس کے گالوں کو چوما بھی۔ عارض کو اس کا یہ انداز بہت عجیب لگا وہ سر جھٹک کر اپنے دسویں فلور پر جانے لگا۔

معمول کی طرح عارض جب بھی اپنے گھر میں ہوتا تو شلوار قمیص پہنا کرتا' اب بھی اس نے یہی کیا' فریش ہو کر وہ اپنے بستر پر جا گرا۔

''کہیں آپ کو وہاں کوئی زلیخا نہ مل جائے۔'' کیا سوچ کر کہی تھی ایمان نے وہ بات۔ عارض گہری سوچ میں پڑ گیا' کیوں ایمان کی کہی وہ بات اسے سچ ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

''کیا وہ تمام آوازیں جو میرے کیفے میں اندر گھسنے کے ساتھ آئیں' وہ میرے لیے تھیں؟'' وہ اپنے آپ میں ہزار باتیں سوچنے لگا پھر سر جھٹک کر سو گیا' آج وہ کافی تھک چکا تھا۔

دوسرے دن سے نوکری آفیشل طور پر شروع ہو چکی تھی' عارض اپنی عمدہ کارکردگی دکھا کر تمام ورکرز کو حیران کر رہا تھا وہ جو بھی کام کرتا لگن اور دل سے کرتا۔

تین ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا اور عارض اب بھی اتنے ہی جوش کے ساتھ کام کر رہا تھا جتنا وہ پہلے کرتا تھا۔ عارض کے کاموں سے متاثر ہو کر ایک روز لائبہ نے اسے شہر یار ریسٹورنٹ میں اسپیشل ڈنر آفر کیا۔ عارض کا وہ آفر قبول کرنے کا بالکل دل نہ تھا پر وہ ریسٹورنٹ لائبہ کا تھا وہ فرم اور عارض کو جو سیلری ملتی تھی وہ بھی ان ہی کے ذریعے ملتی تھی لہٰذا اسے مانتے ہی بن پڑی۔

شہر یار ریسٹورنٹ کی رائل کا سب سے مشہور ترین ریسٹورنٹ ہے جو ہوٹل کے دوسرے مرحلے پر بنا ہوا ہے۔ عارض نے عشا کی نماز ادا کی اور بلیو

جینز اور ڈارک بلیو ٹی شرٹ پہنتا شہریار کی جانب چل پڑا۔

''مرحبا!'' وہ خوش باش انداز میں پہلے سے ہی وہاں موجود تھی۔ ''آؤ یہاں بیٹھو۔'' اس کے انداز سے لگ نہیں رہا تھا کہ وہ کسی بڑی کمپنی کی ایم ڈی ہے۔ عارض خاموشی سے چلتا لائبہ کے سامنے والی چیئر پر آ بیٹھا۔

''کیا لینا پسند کرو گے؟ یہاں کا عریبین گرل بہت مشہور ہے۔'' وہ اس کی باتوں پر ہاں ہوں کر رہا تھا۔

''عارض...... مجھے تم سے کچھ بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' لائبہ اب سنجیدہ ہو گئی تھی کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بالآخر لائبہ نے ہی لب کھولے۔

''جی کہیے' میں سن رہا ہوں۔'' عارض کا منہ اس کی طرف پر نظریں اس خوب صورت میز پر مرکوز تھیں۔

''میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں شاید اس وقت سے جب سے تم کو دیکھا تھا' میری محبت قبول کرو گے؟'' لائبہ نے عارض کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''مجھے معاف کیجیے گا لائبہ صاحبہ پر شاید آپ بھول رہی ہیں کہ آپ شادی شدہ ہیں اور آپ کے شوہر بھی ہیں۔'' عارض نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم ہے پر مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا' تم جب تک یہاں ہو تب تک میرے پاس نہیں رہ سکتے؟ ایک بار میری طرف دیکھو میں اتنی بُری نہیں ہوں عارض!'' عارض اس کی جانب دیکھ لیتا تو بہت زیادہ چانس تھے کہ وہ

غزل

زمانے کے عجب رنگ دیکھے زمانے کی قسم
تیری محبت میں بہت کچھ گنوایا تیرے یارانے کی قسم
اک پری چہرہ رات بھر سونے نہیں دیتا
اس معصوم سے چہرے انجانے کی قسم
چاہنے والے اور بھی ہوں گے مگر ہم سا کہاں
جس نے ہمیں برباد کیا اس کے دوستانے کی قسم
جو تو نے پلائی تھی آج تک نہیں اتری
تیرے تقدس کی قسم تیرے میخانے کی قسم
جو پہلوئے یار میں گزرے، وہ لمحے مقام رکھتے ہیں
جو گزرا وقت اس کے گزر جانے کی قسم
ساگر اس شخص کی کچھ مجبوریاں ٹھہری ہوں گی
وہ ایسا تو نہ تھا، اس کے وعدہ نبھانے کی قسم

ساگر منچن آبادی...... منچن آباد

غزل

نا گھر ہے، نا جھونپڑا بالکل ہی نہتے ہیں
پھر بھی رئیس ہیں ہم کہ ترے دل میں رہتے ہیں
سنتے نہیں وہ حیرانگی ہے کہ بہرے بھی نہیں
برسوں سے دو بول پیار کے جو کہتے ہیں
پیوستہ ہے تیر دل میں جو نکلتا ہی نہیں
دن رات تو کیا ہر لحہ عذاب سہتے ہیں
دکھتے نہیں ہیں دکھ مجھ کو کہ نیم بینا ہو گیا میں
بد پرہیزی بھی غضب کی کہ ہر دم اشک بہتے ہیں
اس کی طلب میں سجدے کیے جو سب رائیگاں
سجدہ کرو تو طلب خدا میں یہی سب سے کہتے ہیں
ہماری تو نا ہی پوچھو کہ ہم مقید ہیں راز
ہر ایک دل میں چپکے سے قید رہتے ہیں

مومن راز...... اسلام آباد

اپنا صبر کھو دے۔ دعوت عیش خود چل کر اس کے پاس آئی تھی۔

''میں آپ کو ایک بات بتا تا چلوں' میری ایک بیوی ہے جو میرا اسلام آباد میں انتظار کر رہی ہے۔ آپ بھلے اپنے شوہر کو دھوکا دیں پر میں مر کر بھی اپنی شریک حیات کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ زندگی ہے وہ میری اور مجھے اس کے علاوہ دنیا کی کوئی بھی عورت قابل قبول نہیں' چند ماہ کے لیے بھی۔'' وہ وہاں سے اٹھا اور چل دیا۔

''تم کو تو میں اپنا بنا کر ہی رہوں گی عارض! تمہارا حسن مجھے اب اور صبر کرنے نہیں دیتا۔ تم میرے ہو کر رہو گے۔'' لائبہ نے منصوبہ بنانے والے انداز کے ساتھ کہا۔

''کہیں آپ کو وہاں کوئی زلیخا نہ مل جائے۔'' وہ اپنے کمرے میں آچکا اور کپڑے اب تک تبدیل نہیں کیے تھے' ایمان کے کہے جملے پھر سے اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ عارض کو لگا تار ہچکیاں آنے لگیں تو اسے اپنی بیوی یاد آئی۔

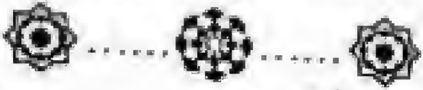
''السلام علیکم! کیسی ہے میری ایمان؟'' وہ اپنی بیوی سے بات کر کے اپنی ساری ٹینشن بھلا دینا چاہتا تھا۔

''بالکل ٹھیک! کیسا رہا آپ کا دن؟'' فون کی دوسری جانب سے آواز آئی۔

''اچھا گزرا' ابھی بہت ہچکیاں آئیں تو سوچا تمہیں فون کر لوں' تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا نا؟'' عارض لائبہ والا قصہ سنا کر اسے کسی قسم کے شبہات میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

''پر میں نے تو آپ کو یاد کیا ہی نہیں' یہ ہچکیاں کس کے لیے تھیں عارض!'' وہ شرارتی انداز قائم کرتے ہوئے بولی۔

عارض نے وہ رات ایمان سے بات کرنے میں گزار دی جو سکون عارض کے لیے ایمان سے بات کرنے میں رکھا تھا وہ کسی اور چیز میں کہاں تھا۔



پانچ ماہ کا عرصہ گزر گیا اب مزید ایک ماہ اسے یہاں رکھنا تھا۔ عارض ان پانچ ماہ میں اتنا تو کما ہی چکا تھا کہ آرام سے اپنی شادی کے تمام اخراجات اٹھا سکے پر اسے یہ پروجیکٹ پوری طرح ختم کرنا تھا۔ ڈیل سائن ہو چکی تھی۔

ایک رات تو حد ہی ہو گئی' رات کے ڈھائی بجے ان دو کلرکس میں سے ایک عارض کے روم کا دروازہ پیٹنے لگا۔

''کیا ہوا؟ سب خیریت ہے؟'' عارض نیند سے اٹھ کر دروازے تک آیا وہ کلرک بہت گھبرایا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

''سر...... سر...... ایم ڈی صاحبہ کی طبیعت بہت خراب ہے' ان کو سانس لینے میں مسئلہ ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ آپ کے پاس آ جاؤں' آپ پلیز کچھ کیجیے۔'' وہ بوکھلاتے ہوئے بولا۔

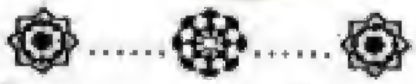
عارض بھاگتا ہوا لائبہ کے روم میں گیا' اپنا لباس تبدیل نہیں کیا وہی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی جو وہ عموماً رات میں پہنا کرتا تھا۔

''تم آ گئے نا میرے پاس۔'' عارض کمرے میں داخل ہوا تو پیچھے سے لائبہ نے کمرے کی کنڈی لگا دی۔

''یہ کیا بے ہودہ مذاق ہے؟ ہٹیے مجھے جانا ہے۔'' عارض طیش میں آ کر بولا۔ لائبہ فوراً اس کے گلے لگ گئی اور پھر لگے رہی۔

''تم میری طرف کیوں نہیں دیکھتے' میری آنکھوں میں دیکھو تمہارے لیے کتنی محبت ہے۔

آج کی رات میرے پاس رک جاؤ عارض!'' وہ اس کا گریبان پکڑے اس سے التجا کر رہی تھی۔
عارض نے اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کی تو لائبہ نے اسے بستر کی جانب دھکا دے دیا' وہ اب اس کے قریب آ گئی تھی۔
''دیکھو میری طرف کیا کمی ہے مجھ میں؟ تمہاری بیوی اور میرے شوہر کو کچھ پتا نہیں چلے گا' ہمارے پیار کا......''
عارض نے لائبہ کو دھکا دیا اور کمرے کی کنڈی کھولنے لگا' لائبہ نے اسے پیچھے سے دبوچا اور بہت کوشش کی کہ وہ باہر جانے نہ پائے پر اس کی کوشش ناکام رہی اور اس کے دبوچنے کے نتیجے میں عارض کی قمیص پیچھے سے پھٹ گئی۔
اس نے نہایت عاجزی کے ساتھ خدا سے مدد کی التجا کی۔ ''اے ربّ! میں ایک کمزور انسان ہوں' میرا اتنا بل بوتا کہاں کہ ان بے پناہ ترغیبات کا مقابلہ کر سکوں۔ تُو مجھے سہارا دے اور مجھے بچا۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے قدم نہ پھسل جائیں۔''
عارض کمرے سے باہر نکلنے لگا تو زباب سامنے کھڑا تھا اور اس کے منہ پر سرپرائز کے الفاظ تھے۔ وہ اپنی بیوی کو چھ ماہ کا بول کر ایک ماہ قبل آ نے پر سرپرائز دینا چاہ رہا تھا پر وہ اس منظر کو دیکھ کر خود وحشت میں آ گیا۔
''زباب...... زباب دیکھو یہ میرے ساتھ زبردستی کرنے میرے کمرے تک آیا تھا۔ پلیز مجھے اس سے بچالو۔'' وہ اپنے شوہر کے سینے سے جا لگی۔
''زباب! یہ جھوٹ بول رہی ہے' میرا یقین کرو میں ایسا ہرگز نہیں ہوں۔'' عارض اپنی پاکیزگی پیش کرنے لگا۔
''عارض مجھے پتا ہے کہ تم ایک شریف انسان ہو پر میں تمہاری بات کا کیسے یقین کرلوں؟'' زباب جیسے عارض کے منہ سے سچائی سننا چاہتا تھا۔
''دیکھو میری قمیص پیچھے سے پھٹی ہے' اس کا مطلب زبردستی میرے ساتھ کی گئی ہے اگر میری قمیص آگے سے پھٹی ہوتی تو یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ تمہاری بیوی کے ساتھ زبردستی ہوئی ہے مگر ایسا نہیں ہے۔'' زباب نے عارض کی بات سمجھی پھر اسے یقین ہو گیا کہ وہ صحیح ہے اور اس کی بیوی غلط۔
''مجھے تم پر یقین ہے مگر میں نہیں چاہتا کہ تم اب یہاں رہو' تم یہاں رہو گے تو شاید لائبہ پھر سے تمہاری طرف کھنچی چلی جائے گی لہٰذا تم کل یہاں سے چلے جانا اور پلیز میری باتوں کا بُرا مت ماننا۔'' زباب اس سے کہتا لائبہ کو لے کر اس کے کمرے میں چلا گیا اور دوسرے روز عارض اپنی ایمان کے پاس!



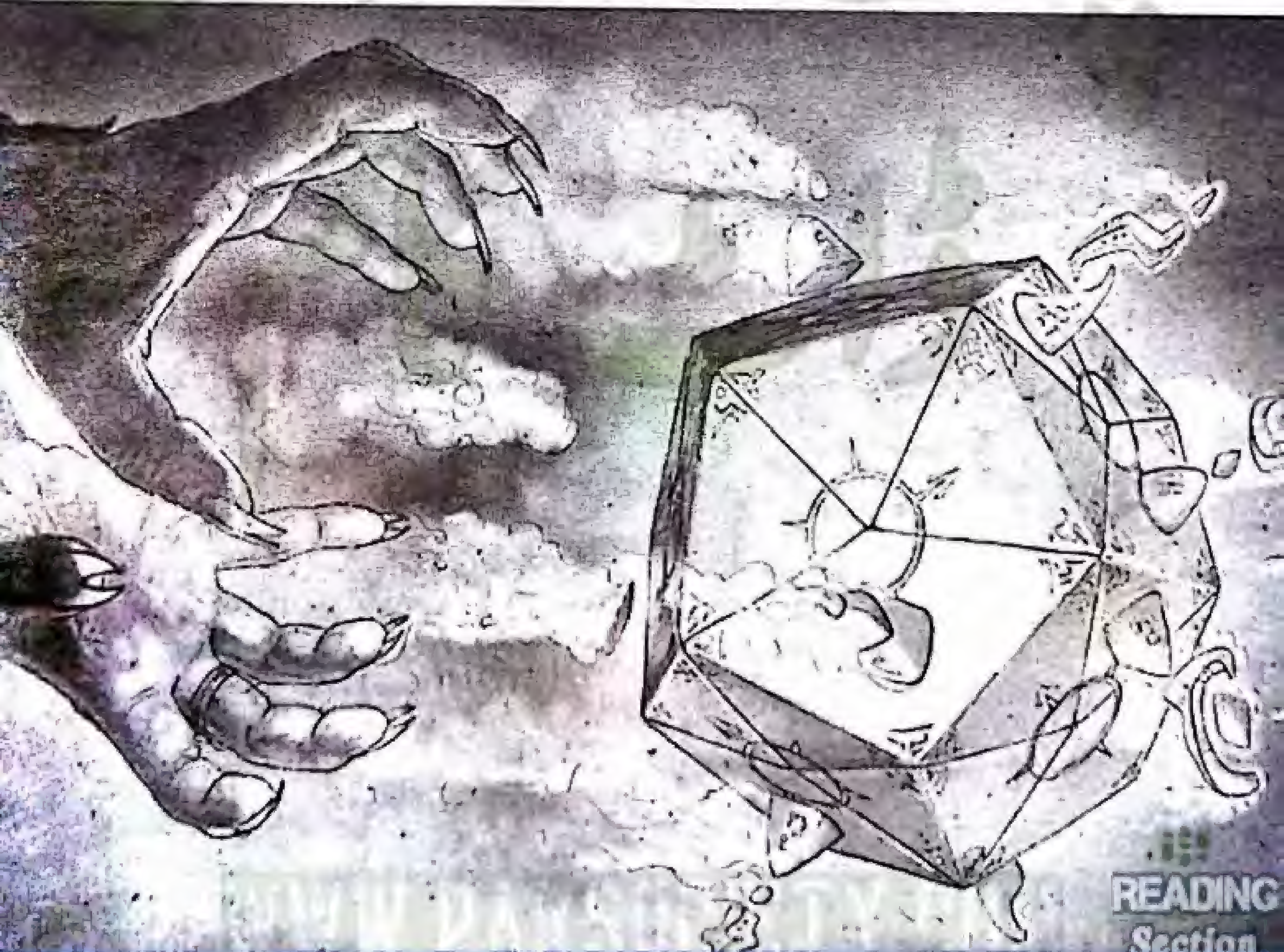
تو یہ تھی اس اعلیٰ ظرف عارض کی کہانی......
قارئین! اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے
''بُری عورتیں بُرے مردوں کے لیے ہیں اور بُرے مرد بُری عورتوں کے لیے اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے۔''
اور جب یہ بات اللہ نے کہہ دی ہے تو پھر عارض کو ایمان کا ہی ہونا تھا اب چاہے کتنی ہی زلیخائیں اس کی زندگی میں آئیں وہ صبر کرے گا' ضبطِ نفس کرے گا۔ بے شک اللہ فرماتا ہے۔
''بے شک جو پرہیزگاری اور صبر کرے تو اللہ نیکیوں کا نیگ ضائع نہیں کرتا۔''



بنت غزہ

زرین قمر

عمان کی نیوال فرسخ ایک ذہین بہادر اور محب وطن صحافی ہے اس نے اپنے آپ کو صرف فلسطین کے مسلمانوں کی آواز بلند کرنے اور اقوام عالم تک پہنچانے کی ذمہ داری کے لیے وقف کردیا ہے۔ وہ فلسطین میں عمان کے رویا ٹی وی چینل کے ہیڈ آفس کی ہیڈ بھی ہے 2 جولائی 2015 کو ایک سولہ سالہ مسلمان لڑکے محمد ابو القدیر کی برسی کے موقع پر پروگرام کی کوریج کے دوران اس کے چہرے پر یہودی دہشت گردوں نے تیزاب پھینک دیا وہ ایک مقامی ہیلتھ کلینک میں زیر علاج ہے لیکن اس کے جذبہ حب الوطنی میں کوئی کمی نہیں آئی وہ آج بھی اپنے مسلمان بہن بھائیوں کے لیے اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔



نیوال فرخ فلسطین میں اپنے آفس میں بیٹھی تھی وہ عمان کی رہنے والی تھی اور اسے "رویا" ٹی وی چینل کی طرف سے رپورٹر کی حیثیت سے یہاں بھیجا گیا تھا رپورٹر کے ساتھ ساتھ اپنے اس آفس کی ہیڈ بھی تھی اس کی ٹیم دس افراد پر مشتمل تھی جن میں کیمرہ مین، ایڈیٹر، رپورٹر اور کچھ ٹیکنیکل فیلڈ کے لوگ شامل تھے۔ نیوال کو بچپن ہی سے صحافتی دنیا نے متاثر کیا تھا اور اسے ایک ذمہ دار صحافی بننے کے لیے زیادہ جدوجہد نہیں کرنا پڑی تھی کیونکہ کچھ تو اس کا شوق اور کچھ اس کے والد کی سرپرستی نے اس کا کام آسان کر دیا تھا اس کے والد بھی ایک اونچے درجے کے صحافی تھے۔

نیوال نے جب صحافت میں ماسٹرز کی سند حاصل کی تو اس نے اپنے لیے رپورٹر کی فیلڈ کو چنا کیونکہ اسے ہمیشہ ہی سے حریت اور بہادر شخصیات سے پیار تھا وہ بہادری کے کارناموں کو پسند کرتی تھی اور اسے مسلمانوں کی موجودہ زوال پذیر ہوتی ہوئی اقدار کا بڑا دکھ تھا وہ ان لوگوں کا ساتھ دینا چاہتی تھی یا ان لوگوں کو اپنی کوریج میں نمایاں مقام دینا چاہتی تھی جو آزادی کے لیے اور خاص طور سے مسلمانوں اور اسلامی دنیا کی بقا اور آزادی کے لیے برسرِپیکار ہوں اسے امید تھی کہ ایک نہ ایک دن ضرور یہ اہم مقصد حاصل ہوگا اور دنیا میں ایک بار پھر مسلمانوں کو اپنا جائز مقام حاصل ہوگا۔

کشمیر ہو یا فلسطین ویت نام ہو یا میانمار (برما) پاکستان ہو یا یمن وہ ہر مسلمان ملک کے واقعات کی رپورٹنگ کرتی تھی آج کل اس کی تعیناتی فلسطین میں تھی جو اس نے اپنی خواہش پر ہی لگوائی تھی اس کی ایک وجہ اس کی دوست فاراحا تھی جو غزہ کے جنوبی علاقے "شجایا" میں رہتی تھی وہ ان دنوں بہت پریشان تھی اس کے علاقے میں اسرائیلی فوجیوں کی پرتشدد کارروائیاں بہت بڑھ گئی تھیں اور نیوال اپنی رپورٹنگ کے ساتھ ساتھ اس کی مدد بھی کرنا چاہتی تھی۔

اس وقت وہ اپنے آفس میں بیٹھی ٹی وی کی نشریات دیکھ رہی تھی جس میں ایک خبر نشر ہو رہی تھی جس میں بتایا جا رہا تھا کہ غزہ کے مشرقی حصے میں واقع خان یوسف کیمپ کے علاقے "مواصی" میں اسرائیلی فوجیوں نے کارروائی کی ہے اور وہاں کے ایک رہائشی صبیح ابوشمالا کو تشدد کا نشانہ بنایا ہے یہ خبر دیکھتے ہی نیوال اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی۔

"شوشے۔" اس نے اپنے کیمرہ مین کو آواز دی۔

"جی میڈم۔" شوشے نے فوراً ہی جواب دیا تھا۔

"جلدی اپنے کیمرے سنبھالو، ہمیں ابھی "مواصی" کی طرف جانا ہے۔"

"لیکن میڈم وہ تو کافی دور ہے، ہم تو اس وقت غزہ کے مشرقی حصے میں تجایا میں موجود ہیں راستے میں کئی چیک پوسٹ پڑیں گی۔"

"میں جانتی ہوں، کیا تم آج پہلی بار جا رہے ہو۔" نیوال نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"نہیں میڈم...... وہ...... دراصل۔"

"کچھ نہیں...... جلدی کرو...... ہمیں آدھے گھنٹے میں روانہ ہونا ہے۔ ضروری چیزیں ساتھ لے لینا۔ میں شاید اپنی دوست فاراحا سے بھی ملنے جاؤں کیونکہ وہ بھی اسی علاقے میں رہتی ہے۔" نیوال نے کہا۔

"جی میڈم۔" شوشے نے دھیمی آواز میں کہا۔

پھر نیوال نے آفس سے نکلنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی اور جلد ہی وہ لوگ آفس کی گاڑی

میں مصواصی کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

میں ہوں غزہ کی بیٹی
میرے بہت سے رنگ ہیں
میرا حوصلہ میرا دبدبہ
سبھی دیکھ دیکھ کر دنگ ہیں
میں ہوں غزہ کی بیٹی
میرے بہت سے رنگ ہیں
میرا قلم تلوار ہے
اس میں بلا کی دھار ہے
میں ہوں غزہ کی بیٹی
میرے بہت سے رنگ ہیں

نیوال گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھی اپنی لکھی ہوئی ایک تازہ آزاد نظم گنگنا رہی تھی۔ اگلی سیٹ پر شوشے ڈرائیور کے برابر میں بیٹھا بڑے انہماک سے اس کی آواز سن رہا تھا۔

''میڈم آپ کی آواز میں ترنم کے ساتھ ساتھ جوش بھی ہے۔'' اس نے تعریفی انداز میں کہا

''یہ میرا شوق ہے شوشے میں اپنی نظمیں شائع نہیں کراتی بس لکھتی ہوں، اور خود ہی محظوظ ہوتی ہوں۔''

''یہ آپ کی نظم ہے؟'' شوشے نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، مجھے بچپن ہی سے رزمیہ شاعری پسند ہے۔'' نیوال نے کہا۔

''بہت خوب۔'' شوشے نے تعریف کی۔

''ہمیں روانہ ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے ہم کتنی دیر میں مواصی تک پہنچیں گے۔'' نیوال نے ڈرائیور سے پوچھا۔

''بس میڈم دس، پندرہ منٹ اور لگیں گے۔ ابھی ایک چیک پوسٹ اور بیچ میں آئے گی۔'' ڈرائیور نے بتایا۔

''ابھی دو تو گزری ہیں ان اسرائیلی فوجیوں نے زندگی اجیرن کر دی ہے ہر تھوڑے فاصلے پر ایک چیک پوسٹ اور پھر وہاں خوامخواہ دیر لگاتے ہیں روزانہ کے آنے جانے والوں سے بھی دیر تک وہی روز کے گھسے پٹے سوالات کر کے وقت خراب کرتے ہیں اور ذہنی اذیت بھی دیتے ہیں۔'' نیوال نے ناگواری سے کہا۔

''جی میڈم، وہ ایسا صرف غزہ میں رہنے والے مسلمانوں کے ساتھ ہی کرتے ہیں بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو غزہ سے ملازمت کے لیے اسرائیلی علاقوں میں جاتے ہیں انہیں تو روزانہ صبح اور شام اس بے سرو پا کارروائی سے گزرنا پڑتا ہے۔'' شوشے نے کہا۔

''ہاں، میں جانتی ہوں میں بھی اس ناگوار مرحلے سے گزرتی رہتی ہوں۔'' نیوال نے کہا۔

''لیں آگے آخری چیک پوسٹ بھی آ گئی ہے۔'' شوشے نے کچھ دور نظر آنے والی اسرائیلی چوکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں سڑک کو لوہے کے موٹے پائپ کی المونٹ لگا کر بند کر دیا گیا تھا اور سڑک کے دونوں اطراف ایک ایک فوجی گن لیے کھڑا تھا جبکہ ان کے باقی ساتھی سڑک کے ایک کنارے بنی ہوئی چوکی میں بیٹھے تھے جو اصل میں ضابطے کی کارروائی کرنے والے تھے ڈرائیور نے چوکی کے قریب لے جا کر گاڑی روک دی۔

''میں دیکھتا ہوں میڈم۔'' ڈرائیور نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں ہم سب کو ہی اترنا ہوگا۔ تمہیں معلوم ہے وہ ایک ایک فرد کی تلاشی لیتے ہیں ان کے کارڈ بھی دیکھتے ہیں اور روزانہ ان کا نام...... کام...... سب کچھ پوچھتے ہیں وہی ایک

جیسے سوالات۔'' انہوں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ شوشے نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

'' سڑک کے کنارے کھڑا فوجی ان کی طرف بڑھا تھا۔

'' تم لوگ کہاں جارہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

'' مواصی۔'' ڈرائیور نے جواب دیا۔

'' تینوں؟'' احمقانہ سوال کیا گیا۔

'' ظاہر ہے ایک ساتھ ہیں، ایک گاڑی میں سفر کر رہے ہیں تو ایک ہی جگہ جارہے ہیں۔'' شوشے نے جواب دیا۔

'' زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں۔'' فوجی نے غصے سے کہا پھر گاڑی کی طرف بڑھا تھا جس پر بڑے بڑے حروف میں ''رویائی وی'' لکھا تھا اور مونوگرام بنا تھا۔

'' صحافی ہو؟'' روز والا سوال دہرایا گیا۔

اس بار شوشے نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا تھا

'' جی۔'' اس بار نیوال نے جواب دیا۔

'' چلو سب لوگ چوکی میں چلو، صاحب سوال کریں گے۔'' فوجی نے کہا اور وہ تینوں چوکی کی جانب بڑھ گئے۔

'' کہاں جارہے ہو؟'' پھر وہی سوال دہرایا گیا اس بار پوچھنے والا فوجی افسر تھا۔

'' مواصی۔'' نیوال نے کہا۔

'' کیوں؟'' پوچھا گیا۔

'' ایک خبر کے پیچھے جارہے ہیں۔'' شوشے نے جواب دیا۔

'' کون سی خبر؟'' آفیسر نے پوچھا۔

'' مواصی میں کسی شہری کے ساتھ کوئی واقعہ ہوا ہے۔'' نیوال نے گول مول بات کی۔

'' تو؟'' بڑے اکھڑ انداز میں پوچھا گیا۔

'' تو رپورٹ بنانی ہے رویائی وی کے لیے۔'' نیوال نے گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اس کا مقصد انہیں گاڑی کا مونوگرام اور نام دکھانا تھا۔

'' صحافی ہو؟'' پوچھا گیا۔

'' آپ جانتے تو ہیں کئی بار اِدھر سے یہ گاڑی اور ہم لوگ گزرتے ہیں۔'' نیوال نے ناگواری سے کہا۔

'' لیکن ہم بھی تو یہاں اپنی ڈیوٹی کرنے بیٹھے ہیں میڈم۔'' اسی ناگواری سے جواب دیا گیا۔

'' ہوگئی ڈیوٹی؟'' نیوال نے پوچھا۔

'' کیا مطلب بہت جلدی میں ہو، خیریت۔'' آفیسر نے مشکوک انداز میں کہا۔

اور نیوال نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

'' میرا مطلب ہے کہ ضابطے کی کارروائی ہوگی ہو تو ہم آگے جائیں۔'' نیوال نے پھر کہا۔

'' یہ تمہارا روز روز اس راستے سے بلاوجہ گزرنا ہمیں شک میں مبتلا کرتا ہے۔'' آفیسر نے کہا۔

'' آپ کو اپنے ادارے کا کارڈ بھی کئی بار دکھا چکے ہیں اور اپنا شناختی کارڈ بھی پھر کیا شک ہے۔'' نیوال نے ناگواری سے کہا۔

'' یہ کہ شناخت ٹھیک ہونا اس بات کا ثبوت نہیں کہ تم لوگ وہاں کسی اور کارروائی میں ملوث نہیں ہو۔'' آفیسر نے بے دھڑک الزام لگا دیا۔

'' کیا مطلب؟'' نیوال نے غصے سے کہا ہے۔

'' میرا مطلب ہے اتنی عجلت نہ کریں ہمیں بھی مطمئن ہونے دیں میڈم۔'' آفیسر نے نہایت چبھتی ہوئی نظروں سے نیوال کے جسم کا جائزہ لیتے ہوئے کہا اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی

نیوال تلملا کر رہ گئی اس بار اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔
فوجی افسر نے اس کے بعد ان تینوں کے کارڈ چیک کیے تھے روزانہ کی طرح باہران کی گاڑی بھی چیک کی گئی تھی۔
''واپسی کتنی دیر میں ہے اور جہاں جارہی ہو وہاں کا پتا بھی لکھواؤ۔'' فوجی افسر نے کہا۔
نیوال نے شوشے کو اشارہ کیا تھا اور اس نے ابو شمالا کا پتا لکھوایا دیا تھا جس پر فوجی افسر کے چہرے پر ناگوار تاثرات ابھرے تھے۔
''ہوں......تو یہ بات ہے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا گویا وہ صبح ٹی وی پر نشر ہونے والی خبر سے باخبر تھا کہ اسرائیلی فوجیوں نے صبیح ابوشمالا پر تشدد کیا ہے۔''
''صبیح ابو شمالا سے تمہارا کیا واسطہ ہے۔'' آفیسر نے پھر نیوال سے پوچھا۔
''میں صحافی ہوں اور خبر کی رپورٹنگ کے لیے جا رہی ہوں اس کے لیے متاثرہ شخص سے میرا رابطہ ہونا یا نہ ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔'' نیوال نے کہا۔
''چلو مان لیتے ہیں۔'' فوجی افسر نے دریا دلی کا مظاہرہ کرنے والے انداز میں کہا اور ان تینوں کے کارڈ واپس کردیے جو اس بات کا اظہار تھا کہ وہ جاسکتے ہیں۔
''دیکھنا میڈم خیال رکھنا آپ کا کوئی تعلق اس شخص سے نہ ہو......ورنہ......!''
فوجی افسر نے دھمکی والے انداز میں کہا۔
''ورنہ؟'' نیوال بھی اسی انداز میں اس پر چڑھ دوڑی اور وہ سٹپٹا گیا۔
''کک......کچھ نہیں......ورنہ شاید آپ مشکل

میں پڑ جائیں۔" فوجی افسر نے کہا۔
"ہونہہ۔" نیوال نے حقارت سے کہا اور چوکی سے باہر آ گئی۔
پھر وہ لوگ وہاں سے آگے روانہ ہو گئے تھے اس چوکی پر اور بھی لوگ اور گاڑیاں کھڑی تھیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بھی کافی دیر سے اس ضابطے کی کارروائی سے گزر رہے تھے۔
جیسے ہی ان کی گاڑی مواصی کے علاقے میں داخل ہوئی تو انہیں دور سے ہی کھجوروں کے بے شمار درخت نظر آنے لگے وہ صبیح ابوشمالا کی زمین تھی اور وہ لوگ اس کے گھر پہنچنے ہی والے تھے۔
صبیح ابوشمالا کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو 1948ء میں Nakba کے علاقے سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے تھے صبیح ہجرت کرنے والا اکیلا مسلمان نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ اس کی فیملی، رشتے دار اور تقریباً اٹھارہ ہزار فلسطینیوں نے ہجرت کی تھی اس وقت بھی بہت سے مسلمانوں کو شہید کیا گیا تھا اور بعد میں مسلمانوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ مجرموں کے خلاف جلد ہی کارروائی کی جائے گی جواب تک نہیں ہوئی تھی۔
1948ء میں جب صبیح ابوشمالا نے ہجرت کی تھی اس وقت اس کی عمر صرف گیارہ سال تھی اور صبیح کے خاندان نے غزہ کی پٹی پر خان یوسف کے ریفیوجی کیمپ میں پناہ لی تھی کیونکہ یہاں کی آبائی زمینیں ہیں جن پر کھجوروں کے باغات لگے ہیں اس کے علاوہ اور بھی کھیتی باڑی کی جاتی ہے صبیح ابوشمالا کی چھوٹی سی زمین ہے جو اسے ورثے میں ملی ہے یہ غزہ کی پٹی پر پچیس میل لمبی اور چھ میل چوڑی جگہ ہے جو غزہ کی حد بندی لائن سے کچھ آگے تک چلی گئی ہے جس کے لیے پچھلے چھیاسٹھ سالوں سے ہر سال صبیح کو اسرائیلی حکومت کے پاس اپنی زمین کے کاغذات کی فوٹو اسٹیٹ جمع کرانا پڑتی ہے جس میں اس کا نقشہ موجود ہے۔ اور اس کے ساتھ اس کے آباؤ اجداد کے وصیت ناموں کی کاپیاں بھی لگائی جاتی ہیں پھر بھی یہ زمین ہمیشہ صبیح ابوشمالا اور اسرائیلی فوجیوں کے درمیان تنازع کا باعث بنی رہتی ہے۔
"اتنی بڑی زمین کا مالک ہونے کے باوجود صبیح ابوشمالا کو کیا پریشانی ہے جو وہ ان یہودی فوجیوں سے الجھ پڑتا ہے۔" شوشے نے نیوال سے پوچھا۔
"تمہیں معلوم ہے شوشے کہ اس کی زمینوں کا کچھ حصہ متنازع علاقہ میں بھی جاتا ہے اور اسے وہاں درختوں کی دیکھ بھال اور پانی دینے کے لیے جانا پڑتا ہے جو اسرائیلی فوجی پسند نہیں کرتے جو لوگ غزہ کی پٹی کے اس حصے میں رہتے ہیں انہیں دوسری طرف جانے کی اجازت نہیں۔" نیوال نے کہا۔
"وہ دیکھیں میڈم، وہاں کچھ لوگ جمع ہیں۔" شوشے نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"ہاں، وہ صبیح ابوشمالا کا گھر ہے۔" نیوال نے کہا۔
"لیکن وہاں اتنے لوگ کیوں جمع ہیں۔" اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر ان کی گاڑی نیوال کے گھر کے قریب پہنچ کر رک گئی تھی اور ان کی گاڑی دیکھ کر صبیح ابوشمالا کی ملازم ان کی طرف آیا تھا۔
"آیئے میڈم۔" اس نے انہیں خوش آمدید کرتے ہوئے کہا وہ شمالا سے واقف تھا کیونکہ وہ پہلے بھی شمالا سے ملنے آتی رہی تھی۔
"تمہارے مالک کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔
"وہ زخمی ہیں۔ اندر آپ کے منتظر ہیں۔"

ملازم نے جواب دیا۔

''چلو۔'' نیوال نے شوشے کو گاڑی سے سامان نکالنے کا اشارہ کیا اور ملازم کے ساتھ گھر کی طرف بڑھ گئی۔

''سلمان اتنے لوگ کیوں جمع ہیں۔'' نیوال نے ملازم سے پوچھا۔

''وہ حادثہ کی خبر سن کر صبح سے جمع ہو گئے ہیں مالک سے ملنا چاہتے ہیں۔'' ملازم سلمان نے جواب دیا۔

نیوال کی ملاقات صبیح ابوشمالا سے اس کے کمرے میں ہوئی تھی اس کے جسم پر کئی جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔

''اوہ، یہ کیا ہو گیا؟'' نیوال نے پریشانی سے کہا۔

''وہی جو ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔'' شمالا نے جواب دیا۔

''آپ 77 سال کے ہو چکے ہیں اس عمر میں یہ سارے کام۔'' نیوال نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''یہ کام میری ذمہ داری ہے نیوال میں درختوں کی دیکھ بھال کیسے چھوڑ سکتا ہوں وہ ختم ہو جائیں گے...... اگر میں نے ان کی دیکھ بھال نہیں کی تو اسرائیلی فوجیوں کا خواب پورا ہو جائے گا۔'' صبیح نے کہا۔

''اسرائیلیوں کا خواب؟'' نیوال نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں مجھے اڑتی اڑتی خبر ملی ہے کہ وہ میری اس زمین پر جانوروں کا فارم بنانا چاہتے ہیں۔''

''اوہ، لیکن کیوں؟'' نیوال نے پوچھا۔

''ظاہر ہے یہ زمین متنازع ہے 1948ء سے پہلے یہ ساری زمین میرے آباؤ اجداد کی تھی لیکن جب 1948ء میں غزہ کا علاقہ مسلمانوں کے لیے رہائش کے لیے دیا گیا تو بہت سی زمینیں اس پیمائش سے باہر رہ گئیں جو مسلمانوں کے حصے میں آتی تھیں لیکن اس کے مالکان ان سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں کم سے کم میں تو ہرگز بھی اپنی زمین نہیں چھوڑ سکتا۔''

''اور آپ چھیاسٹھ سال سے اس کے لیے لڑ رہے ہیں۔''

''ہاں نہ صرف لڑ رہا ہوں بلکہ میں اپنے علاقے میں جاتا ہوں درختوں کی دیکھ بھال کرنے والوں کے ساتھ اپنے درختوں کی دیکھ بھال کرتا ہوں انہیں کھاد مٹی کی جو ضرورت ہوتی ہے وہ دیتا ہوں۔ ان کی آبیاری کرتا ہوں۔'' صبیح نے کہا۔

''اور اس جرم پر اسرائیلی فوجیوں کے ظلم کا نشانہ بھی بنتے ہیں۔'' نیوال نے کہا شوشے ان دونوں کی گفتگو کی ویڈیو بناتا جا رہا تھا۔

''آج صبح کیا ہوا تھا؟'' نیوال نے پوچھا۔

''وہی جو اکثر ہوتا ہے میں اپنے درختوں کی آبیاری کے لیے گیا تھا ادھر چند اسرائیلی فوجی آ نکلے اور مجھ سے وہاں آنے کی وجہ پوچھی میں نے وجہ بتائی تو کہا کہ تمہیں اپنے علاقے سے ادھر نہیں آنا چاہیے تھا جب میں نے کہا کہ میری زمینیں ہیں تو مجھے مارنے لگے۔'' شمالا نے بتایا۔

''وہ تو ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔'' نیوال نے کہا۔

''جب یہ حصہ تقسیم ہوا تھا تو کہا گیا تھا کہ اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے برابر کے حقوق ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے وہ حاکم بن گئے ہیں اور ہمیں محکوم بنا دیا ہے وہ یہودی ہیں اور ہم مسلمان وہ ظالم ہیں اور ہم مظلوم ہم میں اور ان میں کوئی بھی قدر مشترک نہیں ہے۔''

''میں آپ کے غم میں برابر کی شریک ہوں۔''

نیوال نے کہا۔

''1948ء میں مسلمانوں سے جو معاہدہ کیا گیا تھا اس پر بالکل عمل نہیں کیا گیا۔ برابری کے حقوق دینے کے بجائے انہوں نے مسلمانوں سے سب کچھ چھین لیا، ہمارے گھر...... ہمارے کاروبار...... سب کچھ...... اب ہمارے پاس اپنی نئی نسل کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں سوائے ان اسلامی اقدار کے جو نسل در نسل ہمارے سینوں میں منتقل ہوتی چلی آئی ہیں۔'' صبیح ابوشمالا کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

''آپ اتنے مایوس کیوں ہیں ایک نہ ایک دن آپ اپنا مقصد حاصل کرلیں گے۔'' نیوال نے صبیح کا حوصلہ بڑھایا۔

''کب، کس دن ہمارے پاس اپنے بچوں کو دینے کے لیے وراثت میں کوئی دولت کوئی جائیداد کوئی مکان نہیں ہے ہم صرف انہیں اچھی تعلیم حاصل کرنے، اچھی اقدار اپنانے کے لیے کہہ سکتے ہیں یا پھر انہیں اپنے پرائے وقتوں کی کہانیاں سنا سکتے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد کون تھے وہ اس سرزمین کے مالک تھے وہاں یہاں کس حیثیت میں رہتے تھے لیکن پھر یہ سب ان سے کس طرح چھین لیا گیا اور یہ یہودی جو اس سرزمین کو ہولی لینڈ کہتے ہیں انہوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا ہے۔'' صبیح کی آواز میں دکھ و کرب آسانی سے محسوس کیا جا سکتا تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں ورنہ آپ کی طبیعت اور خراب ہو جائے گی آپ کو تو خوش ہونا چاہیے آپ کے بیٹے ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ کا بڑا بیٹا غزہ کے ایک یورپین اسپتال میں ڈاکٹر ہے دوسرا بیٹا Unrwa کے اسکول میں پرنسپل ہے اور تیسرا بیٹا ٹیچر ہے اور آپ کے بہت سے رشتہ دار پورے غزہ میں مختلف پیشوں سے منسلک ہیں۔'' نیوال نے اس کی ہمت بڑھائی جس پر صبیح کے چہرے پر ایک مایوس کن مسکراہٹ بکھر گئی۔

''آپ بہت باہمت ہیں کہ اس عمر میں بھی اتنی محنت کرتے ہیں لیکن میں آپ سے درخواست کروں گی کہ آپ اسرائیلی فوجیوں سے جھگڑا مول نہ لیا کریں۔'' نیوال نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''تو کیا میں اپنی زمین ان کے حوالے کر دوں؟'' صبیح نے پوچھا۔

''نہیں، لیکن کوشش کیا کریں کہ آپ ایسے وقت وہاں پانی دینے جائیں جب کوئی فوجی آس پاس موجود نہ ہو۔''

''یہ ممکن نہیں وہ ہر وقت وہاں ہوتے ہیں کیونکہ انہوں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ میری ان زمینوں پر جانوروں کا فارم بنائیں گے۔'' صبیح نے اداسی سے کہا۔

''تو آپ تنہا ان کا مقابلہ کیسے کریں گے؟'' نیوال نے پوچھا۔

''میں تنہا نہیں ہوں سارے غزہ کے لوگ میرے ساتھ ہیں کیونکہ یہ صرف میرا مسئلہ نہیں ہے مجھے زمینوں کی وجہ سے تو کسی اور مسلمانوں کو کسی اور وجہ سے انہوں نے تنگ کیا ہوا ہے وہ چاہتے ہیں کہ ہم غزہ کی ایک چھوٹی سی پٹی سے بھی محروم ہو جائیں۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔'' نیوال نے اسے کریدا۔

''تم رپورٹر ہو، تم نہیں جانتی؟ تم اچھی طرح جانتی ہو تم صبح تک ایسی ہزاروں خبریں دیکھتی ہو جمع کرتی ہو نشر کرتی ہو تم سب جانتی ہو۔'' صبیح نے کہا۔

''ہاں میں جانتی ہوں لیکن میں آپ کے منہ سے سننا چاہتی ہوں شاید کوئی ایسا واقعہ آپ جانتے ہوں جو میرے علم میں نہ ہو۔''

''سب واقعات ایک جیسے ہی تو ہوتے ہیں کسی مسلمان کی زمین چھین لی کسی کا گھر تباہ کر دیا کسی کو ملازمت سے نکال دیا کہیں بے مقصد بمباری کر کے لوگوں کو ہلاک کر دیا۔ سب ایک جیسے ہی واقعات تو ہوتے ہیں جن کا مقصد صرف اور صرف مسلمانوں کو تنگ کرنا انہیں تکلیف پہنچانا اور فلسطین جسے وہ اپنی ہولی لینڈ یا متبرک زمین کہتے ہیں وہاں سے مسلمانوں کو نکال باہر کرنا۔'' صبیح نے کہا۔

''ہاں یہ سب تو میں جانتی ہوں۔'' نیوال نے تاسف سے کہا لیکن میں نے بھی عزم کر رکھا ہے کہ میں ان کے مکروہ چہرے دنیا میں دکھاتی رہوں گی اگر ان کا میڈیا ان کی طرفداری کرتا ہے اور صرف ان کی خبریں نشر کرتا ہے تو ہمارے پاس بھی ذرائع ہونا چاہئیں کہ ہم اپنی بات پوری دنیا کو بتا سکیں اور یہ بتا سکیں کہ حقائق وہ نہیں ہے جو اسرائیلی میڈیا پر دکھائے جا رہے ہیں بلکہ اصل حقائق دنیا سے چھپائے جا رہے ہیں میرا یہاں آنے کا مقصد بھی یہی تھا میں نے آپ کی جو ویڈیو بنائی ہے وہ میں اپنے روپاٹی وی پر دکھاؤں گی اس کے علاوہ میں اس جگہ کا معائنہ بھی کرنا چاہوں گی جو تنازع کا باعث ہے اور جہاں یہ واقعہ ہوا ہے۔'' نیوال نے کہا۔

''ٹھیک ہے کھانے کا وقت ہو گیا ہے آپ کھانے کے بعد وہاں جا سکتی ہیں میرے کچھ لوگ آپ کو وہاں لے جائیں گے لیکن محتاط رہیے گا۔'' صبیح نے کہا۔

کچھ دیر بعد جب صبیح ابوشمالا کے گھر کے وسیع دالان میں کھانے کا دستر خوان بچھایا گیا تھا اور نیوال اپنی ٹیم کے ساتھ وہاں پہنچی تھی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی کہ کھانے کے لیے وہاں بڑی تعداد میں لوگ جمع تھے اسے بہت حیرت ہوئی کیونکہ یہ موقع کسی تقریب کا بھی نہیں تھا اور اتنے لوگ گھر کے افراد بھی نہیں ہو سکتے تھے۔

''یہ سب لوگ کون ہیں؟'' نیوال نے صبیح کے ملازم سلمان سے پوچھا۔

''یہ سب ابوشمالا سے محبت کرنے والے ہیں جو کبھی انہیں تنہا نہیں چھوڑتے۔'' سلمان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' نیوال نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''دراصل ابوشمالا نے ان لوگوں پر بڑے ہی احسانات کیے ہیں ان میں سے ہر کوئی کسی نہ کسی انداز میں ابوشمالا کی مدد لیتا رہتا ہے کچھ لوگوں کو وہ ماہانہ اخراجات کے لیے رقم دیتے ہیں جو انہیں زمینوں کی آمدنی ہوتی ہے کچھ کے لیے احکامات ہیں کہ میں فیملی کے ساتھ ہی کھانا کھائیں گے کیونکہ وہ رہتے بھی ابوشمالا ہی کے علاقے میں ہیں اور ان کے گھر کسی نہ کسی اسرائیلی حملے میں تباہ ہو گئے ہیں چنانچہ ابوشمالا نے انہیں اپنی زمینوں پر رہنے کی اجازت دے دی ہے اور کھانے کا انتظام سب کے لیے یہاں ہوتا ہے۔'' سلمان نے تفصیل بتائی۔

''بہت خوب گویا اسرائیلوں کے ظلم وستم جھیلنے کے باوجود اور اس بے یقینی میں کہ کل کو یہ زمینیں اس کی ملکیت رہیں یا نہ رہیں وہ اتنے لوگوں کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں؟'' نیوال کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی...... ابوشمالا کا کہنا ہے کہ یقین تو ہمیں

اپنی زندگی کا بھی نہیں ہوتا کہ ہم کب تک ہیں اور کب اس دنیا سے چلے جائیں گے رزق دینے والا اللہ ہے وہ کہیں نہ کہیں سے اپنے بندوں کے لیے اسباب پیدا کردیتا ہے ابھی زمینیں ہیں تو سبب بنا ہوا ہے اور جب زمینیں نہ رہیں تب بھی وہ کوئی نہ کوئی سبب پیدا کردے گا۔''

''ہاں...... یہ تو حقیقت ہے'' نیوال نے کہا۔

وہ صبیح ابوشمالا کے خیالات جان کر بہت متاثر ہوئی تھی صبیح کی زمینوں کے لیے اسرائیلی فوجیوں سے لڑائی صرف اس کی اپنی جائیداد یا اپنی ذات کے لیے نہیں تھی بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی تھی جنہیں اس نے سہارا دیا ہوا تھا اور ان کے لیے رزق کا ذریعہ بنا ہوا تھا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد نیوال صبیح کے چند لوگوں اور اپنی ٹیم کے ساتھ جائے وقوعہ کا معائنہ کرنے گئی تھی۔

صبیح ابوشمالا کا انٹرویو لینے اور اس کی زمینوں پر جائے وقوعہ کی ویڈیو بنانے کے بعد نیوال واپس اپنے آفس آ گئی تھی اس نے اپنی دوست فاراحا سے ملاقات کا ارادہ بھی ترک کردیا تھا جو جاعا کے علاقے میں اس کے آفس سے کچھ فاصلے پر ہی رہتی تھی یہ کام اس نے پھر کسی روز کے لیے رکھ دیا تھا کیونکہ اسے کافی دیر ہوگئی تھی اور اسے اپنی جمع کی ہوئی معلومات کو رپورٹ کی شکل بھی دینا تھی تاکہ رویائٹی وی پر وہ صبیح کے ساتھ ہونے والے واقعے کی اصل وجوہات منظر عام لاسکے۔

اپنا کام مکمل کرنے کے بعد اس نے رپورٹ اور ویڈیو یونائٹ شفٹ کے انچارج کے حوالے کی تھی اور آرام کرنے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی جو خاص طور سے اسے رہائش کے لیے دیا گیا تھا رویا ٹی وی کے ملازمین کے لیے ان کی حکومت نے رویا ٹی وی کی عمارت کے احاطے ہی میں ملازمین کی رہائش کا انتظام کیا تھا۔

دوسرے روز علی الصبح جب نیوال کی آنکھ کھلی اور وہ ضروریات سے فارغ ہوکر اپنی ٹیبل پر پہنچی تو ایک دل دہلا دینے والی خبر اس کی منتظر تھی شجاعا ہی کے علاقے میں اس کے آفس سے کچھ دور ایک سولہ سالہ لڑکے کو کل رات اغوا کرلیا تھا اور وہ تاحال لاپتا تھا نیوال نے فوراً اس کے والدین سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

''شوشے، چلو ابھی چلتے ہیں میں اس لڑکے ابوقدیر کے والدین سے ملنا چاہتی ہوں۔''

اس نے اپنے کیمرہ مین سے کہا۔

''پھر وہ جلد ہی ابوقدیر کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا بھلا اسے کوئی کیوں اغوا کرے گا۔'' نیوال نے کہا۔

''کوئی بھی پیسوں کے لیے یہ کام کرسکتا ہے مجھے پتا چلا ہے کہ ابوقدیر کے والد خاصی اچھی حیثیت کے مالک ہیں اور فلسطینیوں میں خاصے مقبول بھی ہیں۔'' شوشے نے بتایا۔

''کیا ان سے کسی کی دشمنی؟'' نیوال نے کہا۔

''نہیں میں نہیں سمجھتا، لیکن اصل معاملہ تو وہاں جاکر ہی پتا چلے گا۔'' شوشے نے کہا۔

ابوالقدیر کے گھر پہنچنے پر وہ حیران رہ گئے تھے۔ وہاں لوگوں کی بہت بڑی بھیڑ جمع تھی انہیں بتایا گیا کہ اغوا ہونے والے ابوقدیر کی لاش ملی ہے اور ابھی اسرائیلی یہودی فوجی اس کی لاش چھوڑ کر گئے ہیں۔

''کیا، اسرائیلی فوجی؟'' نیوال نے حیرت سے کہا۔

''ان کا اس معاملے سے کیا تعلق؟''

''کچھ پتا نہیں۔'' شوشے نے کہا پھر وہ لوگ اپنے کیمرے لیے ہوئے گھر میں داخل ہو گئے تھے گھر کے صحن میں ایک پلنگ پر ابو قدیر کی لاش پڑی تھی جس پر چادر ڈھک دی گئی تھی قدیر کی ماں بہت رو رہی تھی اور بار بار اس پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

''اف میرے خدا۔'' نیوال نے افسردگی سے کہا اس سے گھر کے اندر کا ماتمی منظر دیکھا نہیں جا رہا تھا ابو قدیر کے رشتے دار محلے والے، دوست احباب سب ہی جمع تھے اور بے ساختہ رو رہے تھے۔ ہر طرف سے آہ و بکا کی آوازیں آ رہی تھیں۔

نیوال کو اندازہ تھا کہ اس وقت ابو القدیر کی والدہ اس حالت میں نہیں کہ ان سے کوئی بات کی جا سکے چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک دو روز کے بعد ان کا بیان لے گی لیکن فی الحال اس واقعے کے پیچھے جو حقائق تھے ان کے بارے میں اس نے ابو القدیر کے والد سے معلومات حاصل کرنا مناسب سمجھا۔

''کیا ہوا تھا، ابو القدیر کو کس نے اغوا کیا تھا؟'' نیوال نے ابو القدیر کے والد حسین ابو القدیر سے سوال کیا۔

''کچھ بھی نہیں ہوا، اس کی کسی سے بھی دشمنی نہیں تھی۔ میرا بیٹا بہت ملنسار اور خوش مزاج تھا۔'' محمد ابو القدیر کے والد روتے جا رہے تھے۔

''تو اسے کس نے اغوا کیا اور کیوں؟''

''سننے میں یہی آیا ہے کہ کچھ اسرائیلی فوجی اسے گھر کے قریب ہی سے اٹھا کر لے گئے تھے لیکن وہ یونیفارم میں نہیں تھے وہ سادہ کپڑوں میں تھے۔''

''لیکن اس نے ایسا کیا کیا تھا جو اسے اغوا کیا گیا۔''

''اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا دراصل اس علاقے میں کچھ عرصہ پہلے تین عیسائی لڑکے قتل ہوئے تھے ہمیں نہیں معلوم یہ کس نے کیا لیکن اس کا الزام مسلمانوں پر لگایا جا رہا تھا اور یہودی مسلمانوں سے بدلا لینا چاہتے تھے کوئی بھی مسلمان ہو انہوں نے تین دن پہلے ایک مسلمان بچی کو بھی اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بر وقت لوگوں نے دیکھ لیا اور ان کی مداخلت سے یہودی ناکام ہو گئے لیکن وہ نعرے لگا رہے تھے کہ ''ہم بدلہ لیں گے مسلمانوں سے بدلہ لیں گے۔''

''اور کل رات ابو القدیر ان کے ہاتھ لگ گیا۔'' اس کے والد نے روتے ہوئے کہا۔

''آپ دیکھیں اسے کتنا تشدد کر کے ہلاک کیا گیا ہے۔'' اس کے والد نے میت کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر اسے دکھایا اور وہ پیچھے کو ہٹ گئی وہ اس منظر کو دیکھ نہیں سکی تھی محمد ابو القدیر کو تشدد کرنے کے بعد ہلاک کیا گیا تھا۔

''اس کی لاش قریبی جنگل سے ملی ہے۔''

''قاتلوں کا پتا چلا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ابھی تو نہیں ہم نے علاقے کے پولیس اسٹیشن میں رپورٹ درج کرائی تھی انہوں نے ہی ڈھونڈھ کر یہ لاش صبح ہمارے حوالے کی تھی۔''

اس کے بعد نیوال نے حسین ابو القدیر سے مزید بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا وہ موقع پر موجود لوگوں سے ان کے تاثرات ریکارڈ کرتی رہی تھی اور محمد ابو القدیر کی تدفین تک وہیں رکی رہی تھی اس کے بعد وہ اپنے آفس واپس آ گئی تھی۔

دوسرے روز وہ دوپہر کے قریب محمد ابو القدیر کے گھر پہنچی تھی اسے گھر کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا

گیا تھا کمرے میں ایک شیلف پر محمد ابوالقدیر کے کچھ سرٹیفکیٹ انعامات اور تصویریں قرینے سے سجے ہوئے تھے کچھ دیر میں ابوالقدیر کی ماں سوہا کمرے میں داخل ہوئی تھی اس کے ساتھ محمد ابو القدیر کے والد حسین ابوالقدیر بھی تھے۔ وہ دونوں نیوال کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔

''یہ محمد ابوالقدیر کی تصویریں ہیں۔'' نیوال نے کہا۔

''جی۔ وہ بہت ذہین تھا۔'' اس کے والد نے جواب دیا۔

''اتنی کم عمری میں اتنے سرٹیفکیٹ؟'' نیوال نے حیرت سے کہا۔

''جی ہاں اسے انعامات لینے اور سرٹیفکیٹ جمع کرنے کا شوق تھا وہ اکثر مختلف مقابلوں میں حصہ لیتا تھا اور انعام حاصل کرتا تھا۔'' اس کے والد نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا کسی سے اس کی دشمنی تھی۔'' نیوال نے موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''نہیں بالکل نہیں۔'' اس کے والد نے جواب دیا جبکہ والدہ بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔

''میں نے آپ کو کل بھی بتایا تھا کہ قتل میرے بیٹے سے کسی کی دشمنی کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ یہ قتل مسلمانوں سے یہودیوں کی نفرت کی وجہ سے ہوا یہودیوں نے تین یہودی لڑکوں کی حادثاتی موت کو قتل قرار دیا اور ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرایا اور کہا کہ ہم ان کے قتل کا بدلہ مسلمانوں سے لیں گے۔ اس کے لیے انہوں نے کسی خاص مسلمان کا نام نہیں لیا بلکہ کہا کہ وہ مسلمانوں سے بدلہ لیں گے یعنی ان کے بدلہ لینے کے لیے بس یہ ضروری تھا کہ دوسرا شخص مسلمان ہونا چاہیے چاہے وہ قاتل ہو یا نہ ہو۔''

''انہوں نے ناحق میرے بیٹے کو مارا ہے۔'' محمد ابوالقدیر کی ماں پہلی بار بولی۔

''وہ تو کبھی کسی سے لڑتا بھی نہیں تھا اس کے دوست تو اس کے سیدھے پن کا مذاق اڑاتے تھے وہ بہت ملنسار تھا ہر وقت لطیفے سناتا رہتا تھا۔'' محمد ابوالقدیر کی والدہ نے سسکی لیتے ہوئے کہا۔ نیوال غور سے سن رہی تھی۔

''ابھی اس نے گریجویشن کا امتحان دیا تھا اس کا ابھی رزلٹ نہیں آیا ہے۔'' اس کی ماں رونے لگی۔

''صبر کریں اللہ بے نیاز ہے وہ محمد ابوالقدیر کے قاتلوں کو ان کے انجام تک ضرور پہنچائے گا۔'' نیوال نے کہا۔

''میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہماری مدد کریں۔'' محمد ابوالقدیر کی والدہ نے کہا۔

''آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہیں۔'' نیوال نے پوچھا۔

''صرف اتنا چاہتی ہوں کہ آپ کو پتا ہے کہ اسرائیلی ٹی وی میرے بیٹے اور میرے بیٹے جیسے دوسرے ناحق مار دیے جانے والے مسلمانوں کی رپورٹ ٹی وی پر نہیں دکھائے گا اور نہ ہی عوام کو درست حقائق سے آگاہ کرے گا میں چاہتی ہوں کہ آپ دنیا کو سچ بتائیں اور خاص طور سے یہ ضرور بتائیں کہ مسلمانوں کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے وہ جو کام نہیں کرتے وہ کام ان سے منسوب کیے جاتے ہیں انہیں ناحق ظلم کا نشانہ بنایا جاتا ہے انہیں اپنا آبائی علاقہ اور گھر چھوڑنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ہمیں انصاف چاہیے مجھے اپنے معصوم بیٹے کا قتل کا بدل چاہیے میں چاہتی ہوں کہ میرے بیٹے کا قاتل بھی اپنے عبرت انگیز انجام کو پہنچے۔'' محمد ابو القدیر کی ماں رو رہی تھی۔

''میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔''حسین ابوالقدیر نے کہا۔

''کیا آپ کو امید ہے کہ آپ کو انصاف ملے گا۔''نیوال نے پوچھا۔

''میں کوشش تو ضرور کروں گا امید پر دنیا قائم ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مجھے انصاف مل جائے۔'' حسین ابوالقدیر نے کہا۔

''اور اگر انصاف نہ ملا بلکہ اس کے بدلے آپ کو مزید ظلم کا نشانہ بنایا گیا تو؟''نیوال نے پوچھا۔

''اس کے لیے ہم تیار ہیں۔ صبح شام تو ان کے ظلم کا نشانہ بن رہے ہیں۔ ناکردہ گناہوں کی سزا سہہ رہے ہیں تو پھر کیوں نہ ہم اپنا حق لینے کے لیے جدوجہد کریں۔''حسین ابوالقدیر نے کہا۔

''پھر آپ کب تک کورٹ سے رجوع کریں گے۔''

''بہت جلد، میں کوئی اچھا وکیل دیکھ کر معاملات طے کروں گا اور آپ کو بھی خبر کروں گا۔'' حسین ابوالقدیر نے کہا۔

محمد ابوالقدیر کے گھر سے واپس آتے ہوئے نیوال نے گھر کے سامنے سڑک کے دوسری طرف بنے ایک پرندوں کے خوب صورت سے اسٹور پر بیٹھے لڑکے سے محمد ابوالقدیر سے کچھ سوالات کیے۔

''آپ کا نام کیا ہے۔''اس نے لڑکے سے پوچھا۔

''عابدین۔''لڑکے نے جواب دیا دیکھنے سے اس کی عمر پندرہ سولہ سال تک لگ رہی تھی۔

''آپ کی کیا عمر ہے؟''نیوال نے پوچھا۔

''پندرہ سال۔''

''آپ محمد ابوالقدیر کو جانتے ہیں۔''نیوال نے پوچھا۔

''جی ہاں بہت اچھی طرح وہ میرا دوست تھا۔''لڑکے نے جواب دیا۔

''کیا کبھی اس سے آپ کی لڑائی ہوئی؟''

''نہیں کبھی نہیں۔ وہ اور میں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے وہ فارغ اوقات میں میرے پاس اس اسٹور پر آجاتا تھا اسے پرندے بہت پسند تھے وہ بہت ہنس مکھ تھا۔''

''اس کے بارے میں کوئی اور بات آپ ہم سے شیئر کرنا چاہیں گے۔''نیوال نے پوچھا۔

''جی میرے پاس محمد ابوالقدیر کی ایک ویڈیو ہے جو میں اکثر دیکھتا ہوں۔''عابدین نے جواب دیا۔

''کیا وہ ویڈیو ایک دن کے لیے ہمیں دے سکتے ہو؟''نیوال نے پوچھا۔

''جی ہاں ضرور۔''عابدین نے کہا اور دکان میں رکھی ویڈیو نیوال کے حوالے کردی۔ پھر نیوال واپس اپنے آفس میں آ گئی تھی۔

''نیوال نے چند ہی گھنٹوں میں محمد ابوالقدیر کی رپورٹ کو مکمل شکل دے دی تھی جس کے ساتھ تمام حقائق بیان کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں بنائی ہوئی ویڈیو، اس کے والدین کا انٹرویو اور محمد ابوالقدیر کے دوست کی دی ہوئی ویڈیو بھی لگا دی تھی یہ رپورٹ جب رویانی وی پر نشر ہوئی تو لوگوں کے بہت سے ردعمل آنا شروع ہوگئے تھے رویانی وی کے دفتر کے فون جاگ پڑے تھے اس میں یہودی اور مسلمان سب ہی کے ردعمل شامل تھے۔ یہودیوں کے خیال میں اس میں سراسر قصور محمد ابوالقدیر کا رہا ہوگا جبھی اسے مارا گیا کچھ یہودی مسلمانوں کو قصوروار ٹھہرا رہے تھے کچھ نیوال کو برا کہہ رہے تھے۔

''ہم دیکھ لیں گے۔ یہ نیوال جانبداری سے کام لیتی ہے۔ مسلمانوں کی حرکتیں نہیں بتاتی یہ نہیں بتاتی کہ مسلمان کیسے اسرائیلی فوجیوں پر اور

ان کی گاڑیوں پر پتھر مارتے ہیں اس لڑکے نے بھی کچھ کیا ہوگا تبھی اس کے ساتھ یہ ہوا ہم دیکھ لیں گے نیوال کو بھی دیکھ لیں گے۔'' ایک یہودی تو بہت طیش میں آ گیا تھا اور اس نے فون پر ہی بہت باتیں سنا ڈالیں۔

''آپ نے سنا میڈم لوگ کتنے برہم ہو رہے ہیں ان میں سچ سننے کا حوصلہ ہی نہیں۔'' شوشے نے کہا جس نے اس یہودی کی کال ریسیو کی تھی۔

''ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' شوشے نے نیوال کو مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔

''ہوں دیکھا جائے گا اتنا آسان بھی نہیں ہے یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے میں دیکھ لوں گی۔'' نیوال نے ایک عزم سے کہا۔

''لیکن آپ جانتی ہیں کوئی غلط حرکت کرنا ان کے لیے ناممکن نہیں ہے انہیں اسرائیلی حکومت اور فوج کی حمایت حاصل ہے۔'' شوشے نے کہا۔

''میں جانتی ہوں وہ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتے ہیں۔ یہی نا جو وہ اور مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان پر بے جا ظلم کرنا...... انہیں پریشان کرنا ان کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنا مجھے ان سب باتوں کا علم تھا اور میں ان سب باتوں کے لیے تیار ہو کر یہاں آئی تھی ڈر کر یہاں سے بھاگنے کے لیے نہیں۔'' نیوال نے جواب دیا۔

اس روز صبح سے شام تک لوگوں کے تاثرات وصول ہوتے رہے تھے مسلمانوں نے نیوال کے کام کی تعریف کی تھی کہ وہ کس بہادری سے سچائی کو بے نقاب کر رہی ہے۔ اسے لمبی عمر کی دعائیں دی تھیں ان کا کہنا تھا کہ آج کے اندھیرے دور میں جب مسلمانوں پر غزہ میں بے جا ظلم ہو رہے ہیں نیوال جیسے ہمدرد ان کے لیے روشنی کی ایک کرن ہیں فون پر اور ایس ایم ایس کے ذریعے آنے والے تاثرات کو نیوال نے ٹی وی پر بھی ٹکر کی صورت میں چلوا دیا تھا۔

دوسرے روز سے ایس ایم ایس آنا کم ہو گئے تھے اور چند دن کے بعد لوگ آہستہ آہستہ اس واقعہ کو بھول گئے تھے۔

''شوشے چلو محمد ابو القدیر کے گھر چلتے ہیں دیکھیں اس کے والد نے اس معاملے میں کیا پیش رفت کی ہے وہ کہہ رہا تھا کہ وہ مجرموں پر مقدمہ کرے گا لیکن مجرم کون ہو سکتا ہے آج ان سے مل کر مزید معلومات لیتے ہیں۔'' نیوال نے اپنے کیمرہ مین سے کہا۔

''ٹھیک ہے میڈم میں تیاری کرتا ہوں۔'' شوشے نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد وہ لوگ محمد ابو القدیر کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے تھے یہاں ان کو محمد ابو القدیر کی والدہ نے ریسیو کیا تھا وہ انہیں ڈرائنگ روم میں لے گئی تھی اس وقت حسین ابو القدیر گھر پر موجود نہیں تھا۔

''میں آپ کی خیریت لینے آئی ہوں۔'' نیوال نے کہا۔

''شکریہ آپ نے اتنا خیال کیا ورنہ عام طور پر صحافی خبر بنا کر چلے جاتے ہیں اور خبر اخبار یا ٹی وی پر لگانے کے بعد ان کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے پھر وہ پلٹ کر نہیں آتے۔'' سوہا ابو القدیر نے کہا۔

''میں ان میں سے نہیں ہوں یہ کام میں ڈیوٹی سمجھ کر اور اپنے شوق اور اپنے مسلمان بہن بھائیوں کی سچ کی آواز دنیا تک پہنچانے کے لیے کر رہی ہوں اس کے لیے مجھے ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رابطے میں رہنا ہوتا ہے میرا ماننا ہے کہ

بعض اوقات کہانی خبر نشر کرنے پر نہیں بنتی بلکہ خبر نشر ہونے کے بعد بھی بنتی ہے جو زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔'' نیوال نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' سوہا نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ ایک خبر تو وہ ہوتی ہے جسے لوگ سن لیتے ہیں اور درگزر کر دیتے ہیں اور ایک خبر وہ ہوتی ہے جسے سن کر وہ اپنے اپنے انداز میں سوچنے لگتے ہیں اس پر رائے دیتے ہیں اور بعض اوقات خود بھی اس خبر کا حصہ بن جاتے ہیں جیسے محمد ابو القدیر کے معاملے میں ہوا۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھی۔'' سوہا نے کہا۔

''دیکھیں ایک خبر چلی کہ شجاعا میں تین عیسائی لڑکوں کو قتل کر دیا گیا۔ اس خبر میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ شاید یہ قتل مسلمانوں نے کیا ہے حالانکہ یہ غلط تھا لیکن کچھ لوگوں نے اسے دیکھ کر فیصلہ کیا کہ وہ مسلمانوں سے ان تین عیسائی لڑکوں کے قتل کا بدلہ لیں گے اب ان کے سامنے کوئی ایک مسلمان نہیں تھا جس کو وہ الزام دے سکتے یا جس کے خلاف ان کے پاس کوئی ثبوت ہوتا بس انہوں نے کسی بھی مسلمان سے بدلا لینا تھا چنانچہ پہلے ایک مسلمان لڑکے کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی اور اس میں ناکامی کے بعد اتفاق سے محمد ابو القدیر ان کے ہاتھ لگ گیا اور انہوں نے اپنے انتقام کی پیاس بجھا لی۔'' نیوال نے کہا اور سوہا نے ایک گہری سانس لی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔

''صبر کریں ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کو انصاف ملے گا۔ یہ بتا میں محمد ابو القدیر کے معاملے میں کچھ پیش رفت ہوئی؟'' نیوال نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' سوہا نے سسکی لیتے ہوئے کہا۔

''ہم نے شجاعا کے تھانہ میں اپنے بیٹے کے اغوا کی رپورٹ لکھوائی جس پر انہوں نے اسے تلاش کیا اور اس کی لاش قریبی جنگل سے برآمد کر کے ہمارے حوالے کی پھر انہوں نے مزید تحقیقات کی اور پتا لگایا کہ محمد ابو القدیر کو کن لوگوں نے اغوا کیا تھا تو انہیں چھ لوگوں کے نام پتا چلے ہیں اور انہوں نے انہیں گرفتار کر لیا ہے حسین ابو القدیر خود ان لڑکوں سے جا کر ملا ہے وہ چھ کے چھ لڑکے یہودی ہیں۔'' سوہا نے بتایا۔

''حسین ابو القدیر کہاں ہیں؟'' نیوال نے پوچھا۔

''وہ ان لڑکوں کے خلاف عدالتی کارروائی کرنا چاہتا ہے اسی سلسلے میں گیا ہوا ہے اس نے کسی وکیل سے بات بھی کی ہے آج شاید کچھ معاملات طے ہو جائیں۔'' سوہا نے بتایا۔

''اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔ محمد ابو القدیر بے قصور تھا۔ ان شاء اللہ دیکھیے گا کہ مجرم اپنے انجام کو پہنچیں گے۔'' نیوال نے کہا۔

ابھی وہ لوگ باتیں کر ہی رہے تھے کہ حسین ابو القدیر کمرے میں داخل ہوا اور نیوال کو دیکھ کر چونک گیا۔

''اوہ، آپ بھی آئی ہوئی ہیں۔'' اس نے حیرت سے کہا۔

''جی ہاں میں معلوم کرنے آئی تھی کہ محمد ابو القدیر کے معاملے میں کچھ پیش رفت ہوئی۔'' نیوال نے پوچھا۔

''ہاں میں اس سلسلے میں گیا ہوا تھا۔'' حسین ابو القدیر نے بیٹھتے ہوئے کہا اور اپنے ہاتھ میں پکڑے بیگ میں کچھ کاغذات نکال کر نیوال کے سامنے رکھ دیے۔

''یہ تو یروشلم ڈسٹرکٹ کورٹ کے کاغذات

ہیں۔'' نیوال نے کاغذات دیکھتے ہی کہا۔

''ہاں میں نے بڑی تگ و دو کے بعد یہاں پر محمد ابوالقدیر کے قتل کا مقدمہ درج کرایا ہے۔'' حسین ابوالقدیر نے کہا۔

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کو انصاف ملے گا۔'' نیوال نے پوچھا۔

''شاید۔'' حسین ابوالقدیر نے بے یقینی سے کہا۔

''لیکن کوشش کرنا میرا کام ہے میں اپنے بیٹے کے خون کو رائیگاں نہیں جانے دوں گا۔''

''کچھ پتا چلا پہلی پیشی کب ہے؟'' نیوال نے پوچھا۔

''یوں تو پیشی میں بہت وقت لگتا لیکن میرے وکیل نے کوشش کر کے ایک ماہ آگے کی تاریخ رکھوا دی ہے۔'' حسین ابوالقدیر نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں بھی اس پیشی پر آؤں گی میں اس کی رپورٹ بناؤں گی اور دنیا کو دکھاؤں گی کہ محمد ابوالقدیر کے قتل کا مقدمہ اسرائیلی کورٹ میں کیسے لڑا جاتا ہے وہ اسے انصاف دیتے ہیں یا نہیں۔''

''انہیں انصاف دینا ہوگا۔'' محمد ابوالقدیر کی ماں سوہا نے روتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ میں اپنے بیٹے کی ایک تصویر تھی اور وہ بے ساختہ رو رہی تھی۔

''میں نے تمہیں سمجھایا ہے یوں ہر وقت مت رویا کرو ایسے رونے سے کچھ نہیں ہوگا جو کچھ ہو سکتا ہے میں کر تو رہا ہوں۔'' حسین ابوالقدیر نے اپنی بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں سوہا رونے سے وہ واپس نہیں آ سکتا لیکن اس کے مجرموں کو سزا دلوانے سے اس جیسے بہت سے بچے ان مجرموں کے ظلم سے بچ سکتے ہیں۔'' نیوال نے کہا۔

''میں کیسے نہ روؤں نیوال دیکھو...... دیکھو یہ تصویر۔'' سوہا نے ایک اور تصویر نیوال کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا نیوال نے تصویر اس کے ہاتھ سے لے لی اس تصویر میں ایک بڑے ہال میں اسکول کے بچے اسکول یونیفارم اور سیاہ رنگ کے گاؤن میں بیٹھے تھے اور سامنے اسٹیج پر کچھ اساتذہ بیٹھے تھے ایک ڈائس رکھا ہوا تھا جہاں اسکول کے پرنسپل کھڑے کسی طالب علم کو سند دے رہے تھے نیوال سمجھی اس تصویر میں سوہا اپنے بیٹے کو دیکھ کر رو رہی ہوگی اس نے بہت نظر دوڑائی لیکن اسے محمد ابو القدیر کہیں بھی نظر نہیں آیا اس نے سوالیہ نظروں سے حسین ابو القدیر کی طرف دیکھا وہ اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

''اس تصویر میں محمد ابوالقدیر موجود نہیں ہے۔'' حسین ابوالقدیر نے کہا۔

''یہ تصویر اس کی موت سے چند ہفتے بعد کی ہے اس میں اس کے تمام کلاس فیلوز موجود ہیں۔'' حسین ابوالقدیر نے کہا۔

''محمد ابوالقدیر نے اسی سال گریجویشن اچھے نمبروں سے کیا تھا اسے بھی اس تقریب میں شرکت کرنا تھی اسے بھی سند ملنا تھی لیکن اس کی کرسی خالی ہے۔'' سوہا نے روتے ہوئے کہا اور نیوال نے ایک بار پھر غور سے تصویر کا جائزہ لیا اس ہال میں موجود کرسیوں میں واقعی ایک کرسی خالی تھی جس پر ایک پرچی لگی تھی جو صاف طور پر پڑھی نہیں جا رہی تھی۔

''یہ میرے بیٹے کی کرسی ہے یہاں اسے بیٹھنا تھا لیکن اب صرف اس کرسی پر اس کے نام کی پرچی لگی ہے۔'' سوہا پھر رو رہی تھی۔

''اس کی سند میں نے وصول کی تھی۔'' حسین ابوالقدیر نے کہا۔

''میرے بیٹے نے کتنے ارمانوں سے گریجویشن کیا تھا وہ بڑا آدمی بننا چاہتا تھا تمہیں تو معلوم ہے نیوال غزہ میں ان حالات میں مسلمانوں کے بچے کتنی مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد گریجویشن کرتے ہیں لیکن ان ظالموں نے سب کچھ خاک میں ملا دیا۔ میرے بچے کی ساری محنت...... اس کے سارے ارمان میں کس کس بات کا ماتم کروں مجھے صبر نہیں آسکتا میرا ایک ہی بیٹا تھا اب ہمارا نام لیوا کوئی نہیں ہوگا نیوال۔'' سوہا بے اختیار رو رہی تھی حسین ابوالقدیر سے برداشت نہیں ہوسکا تو وہ بھی کمرے سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔

''خاموش ہوجاؤ سوہا، یوں رونے سے کچھ نہیں ہوگا دیکھوں میں تمہاری بہن کی طرح ہوں میں تمہارا درد سمجھ سکتی ہوں میں کورٹ میں جاؤں گا میں مقدمے کی کارروائی پر نظر رکھوں گی اور مجھ سے جو بھی مدد ہوسکی میں کروں گی بس اب ہم یہی کرسکتے ہیں وہ تو چلا گیا۔ وہ واپس نہیں آسکتی لیکن ہم اس کے مجرموں کو سزا تو دلوا سکتے ہیں۔'' نیوال نے اسے سمجھایا۔

''کافی دیر بعد سوہا خاموش ہوگئی تھی اور نیوال واپس آفس چلی گئی تھی اسے شدت سے اگلے ماہ کی اس تاریخ کا انتظار تھا جب یروشلم کی سٹی ڈسٹرکٹ کورٹ میں محمد ابوالقدیر کے مقدمے کی پہلی پیشی ہونے والی تھی۔

جس روز پہلی پیشی تھی۔ نیوال وقت سے کچھ پہلے ہی کورٹ پہنچ گئی تھی اس کے ساتھ حسب معمول شوشے بھی موجود تھا لیکن اسرائیلی انتظامیہ کی طرف سے اسے سختی سے منع کر دیا گیا تھا کہ وہ پیشی کے موقع پر کورٹ روم میں کوئی تصویر نہیں بنائے گی نا ہی کسی قسم کی کوئی ریکارڈنگ کرے گی اور اس کے ہامی بھرنے کے بعد اسے کمرہ عدالت میں جانے کی اجازت دی گئی تھی۔

جب محمد ابوالقدیر کے قاتلوں کو کمرہ عدالت میں لایا گیا تو ان کے ہاتھوں میں آہنی کڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ لیکن ان تینوں کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی یا افسوس کے تاثرات نہیں تھے بلکہ وہ مسکرا رہے تھے اور طنزیہ نظروں سے حسین ابوالقدیر کی طرف دیکھ رہے تھے ان تینوں کے ساتھ ان کا وکیل موجود تھا۔

''آپ نے بتایا تھا کہ محمد ابوالقدیر کے قتل کے شبے میں چھ افراد کو گرفتار رکھا گیا ہے۔'' نیوال نے حسین ابوالقدیر سے پوچھا۔

''ہاں لیکن ان میں سے تین کو چھوڑ دیا گیا کیونکہ وہ بے قصور تھے ان تینوں نے اقرار کیا ہے کہ انہوں نے محمد ابوالقدیر کو قتل کیا لیکن ان میں سے بھی ایک جس کا نام بن ڈیوڈ ہے دراصل اس نے میرے بیٹے کو قتل کیا باقی دونوں اس کے ساتھی ہیں انہوں نے اغوا میں مدد کی اور قتل کے وقت بھی ساتھ تھے لیکن قتل بن ڈیوڈ نے کیا ہے۔'' حسین ابوالقدیر نے نیوال کو بتایا۔

کچھ دیر بعد کمرۂ عدالت میں جج داخل ہوا سب احترام میں کھڑے ہوگئے اس کے سیٹ پر بیٹھنے کے بعد ضابطے کی کارروائی شروع ہوئی جس میں مجرموں پر فرد جرم لگائی گئی لیکن کسی سے کوئی بیان نہیں لیا گیا اور چند منٹ کی کارروائی کے بعد اگلی تاریخ دے دی گئی کیونکہ مجرموں کے وکیل کی درخواست تھی کہ اسے اس کیس کی تیاری کے لیے کچھ مہلت چاہیے اس روز وہ دل برداشتہ ہوکر واپس آگئے۔

''کم از کم مجرموں کی پیشی پر ان کے بیانات تو

لینا چاہیے تھے۔" نیوال نے راستے میں حسین ابو القدیر سے کہا۔

"ہاں لیکن مجھے اندازہ ہے کہ اسرائیلی ادارے اس کیس کو یا تو بہت جلد ختم کر دیں گے یا لمبے عرصے تک ہمیں کورٹ کے چکر لگوائیں گے۔" حسین ابوالقدیر نے کہا۔

"آج کی صورت حال دیکھ کر مجھے بھی یہی اندازہ ہو رہا ہے۔" نیوال نے کہا۔

"حالانکہ اگر کوئی عرب کسی یہودی کو مارتا ہے تو عدالت کی صرف دو پیشیوں میں فیصلہ ہو جاتا ہے اور مجرم کو پھانسی دے دی جاتی ہے اور دوسرے دن اس کا گھر منہدم کر دیا جاتا ہے۔" حسین ابو القدیر نے کہا۔

"ہاں میں جانتی ہوں۔" نیوال نے کہا پھر وہ حسین ابوالقدیر سے رخصت ہو کر اپنے دفتر کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔

ابھی وہ عدالت ہی میں تھی کہ اسے اطلاع ملی کہ اسرائیلی فوجیوں نے مواصی کے علاقے میں راکٹوں سے حملہ کر دیا ہے وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی ہوئی دفتر پہنچی۔

"میڈم اب کیا کرنا ہے۔" شوشے نے اس سے پوچھا۔ وہ اس کے ساتھ تھا۔

"بعض ضروری چیزیں لو اپنے کیمرے اپنے ساتھ کچھ لوگ جو مختلف مقامات پر مختلف لوگوں سے بات کریں گے جو بھی ضروری سامان درکار ہو ساتھ لے لینا۔" نیوال کہا اور خود اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

آدھے گھنٹے بعد وہ پھر مواصی کی طرف جا رہی تھی اس کے ساتھ اس کی پوری ٹیم تھی۔ اس بار بھی مختلف چوکیوں پر اسے روکا گیا تھا آخری چوکی پر پھر اس کی جھڑپ ایک اسرائیلی فوجی افسر سے ہو گئی تھی۔

"بھئی ہم کتنی بار اپنا شناختی کارڈ دکھائیں ابھی راستے میں دو چوکیوں پر دکھا چکے ہیں ہم ایمرجنسی میں ہیں ہمیں فوراً جائے وقوعہ پر پہنچا ہے۔" نیوال نے کہا۔

"ہاں اور جائے وقوعہ پر پہنچ کر اپنی مرضی سے رپورٹنگ کرو گی صرف اپنے مطلب کی خبر دکھاؤ گی۔" اسرائیلی فوجی نے غصے سے کہا۔

"یہ میرا کام ہے مجھے کیسے کرنا ہے یہ فیصلہ میں کروں گی ہم صحیح یا غلط کا فیصلہ نہیں کرتے صرف خبر دکھاتے ہیں اس پر رائے نہیں دیتے ہم بغیر کسی تعصب کے رپورٹنگ کرتے ہیں۔" نیوال نے کہا۔

"میں جانتا ہوں تم کیا کرتی ہو، میں بھی رویانی دی دیکھتا ہوں تم نے ابوشالا کی خبر کو بھی نمک مرچ لگا کر چلایا تھا۔"

"دیکھو مجھ پر الزام مت لگاؤ اور مجھے جانے دو تمہارا کام صرف ہمیں چیک کرنا ہے تم ہمیں روک نہیں سکتے میرے پاس حکومت کا اجازت نامہ موجود ہے جس کی وجہ سے میں اس علاقے میں تعینات ہوں اور اپنی خدمات انجام دے رہی ہوں اگر کوئی اعتراض ہے تو حکام سے رجوع کرو یا کورٹ میں جاؤ۔" نیوال نے غصے سے کہا اسرائیلی فوجی بھی طیش میں آ گیا تھا۔ لیکن شوشے نے فوراً ہی مداخلت کی اور معاملے کو سلجھانے کی کوشش کی۔

"دیکھیں جناب ہم ڈیوٹی پر ہیں آپ بھی اپنی ڈیوٹی کر رہے ہیں آپ ضروری کارروائی کریں اور ہمیں جانے دیں پلیز۔"

"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔" اس فوجی افسر نے ایک ماتحت کو اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ

ضروری چیکنگ کے بعد انہیں جانے دیا جائے پھر کچھ لمحوں میں وہ لوگ فارغ کر دیے گئے تھے اور وہ آگے روانہ ہو گئے تھے۔

مواصی کے علاقے میں داخل ہوتے ہی ان پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہر طرف گھروں کا ملبہ پڑا تھا چند روز پہلے جو گھر صحیح سلامت کھڑے تھے ان میں سے زیادہ تر ملبے کا ڈھیر بن گئے تھے۔ لوگ ملبے میں اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کو ڈھونڈ رہے تھے ہر طرف چیخ و پکار تھی کوئی رو رہا تھا کوئی اللہ کو پکار رہا تھا کوئی عزیزوں کو آوازیں دے رہا تھا اور ملبہ ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اوہ خدایا ان ظالموں کو کب رحم آئے گا۔ بھلا ان نہتے شہریوں کا کیا قصور ہے جو آئے دن انہیں نشانہ بنایا جاتا ہے۔'' نیوال نے دکھ سے کہا اور پھر اپنی ٹیم کو اشارہ کیا کہ وہ کام کا آغاز کرے سب لوگ اپنے کیمرے اور مائیک لے کر اطراف میں بکھر گئے تھے اور لوگوں کو تسلی دیتے اور ان کے تاثرات ریکارڈ کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔

اسرائیلی طیاروں نے راکٹ برسانے میں کوئی تمیز نہیں رکھی گئی تھی۔ اسپتالوں، رہائشی بلڈنگوں، اسکولوں، غرض کوئی بھی جگہ ایسی نہیں تھی جسے استثنیٰ دیا گیا ہو ایک اسکول میں کچھ خاندانوں نے پناہ لی ہوئی تھی ان میں بوڑھے، عورتیں، بچے سب ہی تھے اس اسکول کی عمارت پر بھی راکٹ لگا تھا اور بہت سے لوگ زخمی ہوئے تھے۔

ہر طرف ایمبولینس سائرن بجاتی ہوئی دوڑ رہی تھیں ایک بچہ ایک مکان کے ملبے پر بیٹھا رو رہا تھا۔ نیوال اس کی طرف بڑھی۔

''کیا ہوا، تمہاری امی کہاں ہیں؟'' اس نے بچے کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا بچے کی عمر بہ مشکل تین سال تھی اور وہ ملبے کی طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر رو رہا تھا۔

''امی امی۔'' وہ بار بار کہہ رہا تھا لیکن غم کی شدت اور کم عمری کی وجہ سے اس سے زیادہ نہیں بتا رہا تھا نیوال نے شوشے کو اشارہ کیا اور اس بچے کی ویڈیو بنوائی۔

''فوراً ٹی وی پر چلا دو اگر کوئی اسے جانتا ہو، اور یہاں موجود بستی کے لوگوں سے بھی پوچھو اگر کچھ پتا نہ چلے تو اسے ابوشمالا کے گھر لے جانا۔'' اس نے اس خیال سے کہا کہ ابوشمالا ایسے بے گھروں کو سہارا دیتا تھا۔

''ابوشمالا کا گھر بھی تباہ ہو گیا ہے۔'' شوشے نے بتایا۔

''اوہ...... اچھا تم اس بچے کو کسی ذمہ دار کے حوالے کرو اور جلدی یہاں کا کام مکمل کرو پھر ابوشمالا کی طرف بھی جانا ہے۔'' نیوال نے کہا۔

''کیا ہوا تھا بی بی۔'' اس نے چند قدم دور ایک عورت کو کھڑے دیکھ کر پوچھا وہ زار و قطار رو رہی تھی۔''

''کچھ پتا نہیں چلا بچے ادھر گراؤنڈ میں کھیل رہے تھے اچانک ہی راکٹوں سے حملہ ہوا اور چند ہی منٹوں میں یہ اونچی اونچی عمارتیں ملبے کا ڈھیر بن گئیں۔'' وہ عورت بتا رہی تھی۔

''یہاں بچے کھیل رہے تھے ان کے تو پرخچے اڑ گئے کوئی بھی نہیں بچا۔'' وہ رو رو کر کہہ رہی تھی۔

''اسرائیلی تو پاگل ہو گئے ہیں وہ یو این کے قوانین بھی توڑ رہے ہیں رہائشی علاقوں کو بھی نشانہ بنا رہے ہیں۔'' نیوال نے کہا وہ ساتھ ہی ساتھ اپنے پروگرام کی کوریج بھی کرتی جا رہی تھی۔

لوگ اپنی مدد آپ کے اصول پر کام کر رہے

دوسری ضروریات کا بھی خیال کرتے ہیں غزہ کے سارے ہی لوگ سوگ کی کیفیت میں ہیں ایک غم ختم نہیں ہوتا دوسرا شروع ہو جاتا ہے ایک میت میں سے شرکت کر کے آتے ہیں تو دوسری میت میں شرکت کرنے چلے جاتے ہیں۔ اللہ ہم پر کرم کرے۔'' ابوشمالا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''ہاں اور ان لوگوں کے پاس نہ تو گورنمنٹ کی مدد ہے نہ ہی دنیا کی وہ ایک دوسرے کے غم اور ضروریات آپس میں ہی بانٹتے ہیں لیکن کب تک آخر دنیا کو ہمارا کب احساس ہوگا۔'' نیوال نے افسوس سے کہا پھر اس نے محمد ابوالقدیر کے قتل کے بارے میں ابوشمالا کو بتایا جسے سن کر اسے بہت افسوس ہوا۔

''میں نے وہ خبر دیکھی ہے تمہارے ہی ٹی وی پر اس کے مقدمے کا کیا ہوا؟'' ابوشمال نے پوچھا۔

''مقدمہ ابھی شروع ہوا ہے میرا خیال ہے انتظامیہ اسے لمبا کھینچے گی اور حسین ابوالقدیر کو تھکانے کی کوشش کرے گی۔'' نیوال نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''ہاں ان لوگوں سے اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ ابوشمالا نے کہا۔

''جہاں تک میں سمجھا ہوں حسین ابوالقدیر بھی میری طرح ہے ہم جیسے لوگ جھوٹ نہیں بولتے جھکتے نہیں پیچھے نہیں ہٹتے یہودی فوجیوں سے نہیں ڈرتے کیونکہ ہم اصول پر چلتے ہیں اور اصولوں کا سودا نہیں کرتے فلسطین آزادی کے لیے تکلیفیں اٹھا رہا ہے انسانی حقوق کے لیے انسانی عظمت کے لیے رانغ کے شمالی حصے سے لے کر لبنان کے ریفیوجی کیمپ تک شام، اردن، بھی ایسی ہی کہانیوں سے بھرے پڑے ہیں ہم دنیا کو دکھانا چاہتے ہیں کہ ہم اپنے حقوق کی حفاظت کر سکتے ہیں اور ہم اپنے مقدس مقامات واپس لے سکتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہم زیادہ سے زیادہ قربانیاں دینے کے لیے تیار ہیں۔'' ابوشمالا جذبات میں بول رہا تھا۔

نیوال کافی دیر تک ابوشمالا کے پاس رکی تھی اور بہت سی باتیں کی تھیں اسے ابوشمالا کے جذبات جان کر بہت حوصلہ ملا تھا اس کا گھر تباہ ہو گیا تھا لیکن وہ پھر بھی حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ وہ واپس اپنے دفتر چلی گئی تھی اور زندگی کی مصروفیات میں لگ گئی تھی۔

اپنی تمام تر مصروفیت کے باوجود وہ اپنی دوست فاراحا سے بھی ملی تھی وہ بھی اسرائیلی جارحیت کا شکار ہوئی تھی اس کا بھرا گھر دوسرے لوگوں کی طرح تباہ ہوا تھا فی الحال نیوال اسے تسلیاں دینے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکی تھی کیونکہ اس کی فیملی کو ایک رفاہی ادارے نے سپورٹ کی تھی اور پناہ دے دی تھی نیوال، ابوشمالا اور حسین ابوالقدیر سے بھی رابطے میں رہی تھی۔

تمام مشکلات کے باوجود نیوال اپنا کام مستعدی سے کرتی رہی اور معمول کی دشواریاں اس کے راستے میں آتی رہی اسی طرح ایک سال گزر گیا اور اس سال کے دوران حسین ابوالقدیر نے محمد ابوالقدیر کے قتل کے مقدمے کی سولہ پیشیاں نمٹائیں لیکن کہیں آگے نہیں بڑھا پیشی پر پیشی پڑتی رہی اور نئی تاریخیں دی جاتی رہیں نیوال پورے طور پر اس کے ساتھ رابطے میں تھی اور ہر بار اس کو دلاسہ دیتی تھی کہ وہ حق پر ہے اور فیصلہ اس کے حق میں ہوگا پھر یکم جولائی 2015 وہ ایک بار پھر اس سے ملنے گئی اس روز تیسرا روزہ تھا وہ حسین ابوالقدیر کے گھر پہنچی مغرب کی اذان کا وقت

ہونے والا تھا اور حسین ابوالقدیر اور سوہا کھانے کی میز پر بیٹھے تھے گھر میں اداسی چھائی ہوئی تھی نیوال کے وہاں پہنچنے پر حسین ابوالقدیر نے اسے بھی میز پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا نیوال کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس اداسی اور خاموشی کو کس طرح توڑے جو عجیب طرح سے ذہن میں چبھ رہی تھی۔ آخر کار سوہا نے ہی خاموشی توڑی۔

''آپ شاید بہت مصروف رہی تھیں دراصل حالات ہی اتنے خراب ہیں کہ آپ کے لیے ہر لمحے خبروں کو کور کرنا ہوتا ہوگا۔'' سوہا نے کہا اس کے لہجے میں ہلکی سی شکایت تھی۔

''جی...... یہ تو درست ہے لیکن میں حسین صاحب کے ساتھ برابر رابطے میں رہی ہوں اس کے علاوہ کورٹ میں بھی کئی پیشیوں میں حاضر رہی ہوں۔'' نیوال نے کہا۔

''سب بے کار ہے۔'' سوہا نے ناامیدی سے کہا۔

''نہیں فتح حق کی ہوتی ہے' حق کی راہ میں کوشش کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔'' نیوال نے ہمت بندھائی۔

''لیکن میں تو یہ دیکھ رہی ہوں نیوال کہ آج میرے بیٹے محمد ابوشالا کے قتل کو ایک سال ہوگیا ہم نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اس کے قاتلوں کو سزا دلوا سکیں لیکن اب تک کامیابی نہیں ہوئی۔'' سوہا نے کہا اور اسی وقت مسجد سے مغرب کی اذان سنائی دی سب خاموش ہوگئے اداسی اور گہری ہوگئی۔

''ہمیشہ میرا بیٹا افطاری کے وقت بہت خوش ہوتا تھا اپنی پسند کی افطاری بنواتا تھا اور بے چینی سے روزہ کھلنے کا انتظار کرتا تھا۔ روزہ کھولتے ہی ہم باپ بیٹے مسجد میں مغرب کی نماز پڑھنے چلے جاتے تھے لیکن آج...... آج میں اکیلا...... میں اکیلا ہی جاؤں گا۔'' حسین ابوالقدیر نے اداسی سے کہا اور سوہا کی آنکھوں سے پھر آنسو چھلک پڑے۔

''یقین نہیں آتا کہ اس کے بغیر ایک سال گزر گیا ہے یوں لگتا ہے کہ یہ کل کی بات ہو سب کچھ بہت تیزی سے ہوگیا ہے ہم نے کتنی چاہت اور ارمانوں سے اسے پالا تھا تعلیم دلوائی تھی کہ وہ زندگی میں کوئی اچھا مقام حاصل کر کے کامیاب زندگی گزارے گا اور ہمارے بڑھاپے کا سہارا بنے گا لیکن ہم تنہا رہ گئے اور بن ڈیوڈ نے ہماری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ ہمارے پیارے بیٹے کو ہم سے جدا کر دیا اور اس ظلم کی اسے سزا دینے والا بھی کوئی نہیں۔'' سوہا نے کہا۔

''سوہا، نیوال روزہ کھولیں اذان ہوگئی ہے کل محمد ابوالقدیر کی برسی ہے اور غزہ کے لوگوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ''جابا چیک پوائنٹ'' پر ایک جلسے کا اہتمام کیا جائے گا میں نے سب کو اطلاع کر دی ہے مختلف اخباروں اور ٹی وی کے نمائندے بھی آئیں گے آپ بھی آیئے گا میں وہاں اپنے دلی جذبات کا اظہار بھی کروں گا ہوسکتا ہے اس اقدام سے اسرائیلی حکومت پر کوئی اثر ہو اور وہ میرے بیٹے کے حق میں انصاف کریں۔'' حسین ابوالقدیر نے کہا۔

''میں ضرور آؤں گی اور آپ کے پروگرام کی لائیو کوریج اپنے ٹی وی پر دکھاؤں گی۔'' نیوال نے کہا۔

''لیکن شاید اسرائیلی حکام تمہیں اس کی اجازت نہ دیں وہ پہلے ہی تمہاری سرگرمیوں سے پریشان ہیں۔'' حسین ابوالقدیر نے کہا۔

''ہاں مجھے معلوم ہے میں ان کے جھوٹ کی پول کو کھولتی ہوں مجھے بعض موقعوں پر بہت مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔'' نیوال نے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ غزہ کے مسلمانوں کو ستانے کے لیے وہ کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں تمہیں بھی بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔'' حسین ابوالقدیر نے کہا۔

ان لوگوں نے صرف روزہ ہی کھولا تھا لیکن کچھ مزید نہیں کھایا تھا وہ سب محمد ابوالقدیر کے بارے میں باتیں کرنے میں مصروف تھے۔

''میں اسرائیلی کورٹ پر یقین نہیں رکھتا اور میں یقین نہیں سمجھتا کہ وہ ہمیں انصاف دیں گے مجھے شک ہے کہ اگر ہماری ساری کوششوں اور جدوجہد کی وجہ سے یا کسی دباؤ میں آکر انہوں نے مجرموں کو سزا دے بھی دی تو وہ کچھ عرصہ بعد انہیں رہا کردیں گے۔'' حسین ابوالقدیر نے کہا۔

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' نیوال نے پوچھا۔

''صاف ظاہر ہے شروع میں بن ڈیوڈ سینہ ٹھونک کر کہہ رہا تھا کہ میں نے محمد ابوالقدیر کو قتل کیا ہے میں نے عیسائی لڑکیوں کا ایک مسلمان لڑکے سے انتقام لے لیا ہے وہ ایسا ہیرو بننے کے لیے نہیں کہہ رہا تھا بلکہ یہ سچ تھا اور وہ سرعام اس کو مان رہا تھا لیکن اب مقدمہ ہونے کے بعد وہ اپنے بیان سے بدل گیا اب وہ کہتا ہے کہ اس نے ایسا نہیں کہا اور اس کے وکیل اب کیس کو نیا رخ دے رہے ہیں۔'' حسین ابوالقدیر نے بتایا۔

''کیا مطلب؟ بن ڈیوڈ نے عدالت کے سامنے تو اقرار کیا تھا۔'' نیوال نے پوچھا۔

''ہاں لیکن اب وہ بدل گیا ہے اب وہ نہیں مانتا بلکہ پچھلی دو پیشیوں میں تو وہ کورٹ میں عجیب حرکتیں کر رہا تھا جیسے اس کا ذہنی توازن خراب ہوگیا ہو اور اس کے وکیل مقدمے کو دوسرا رنگ دے رہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ بن ڈیوڈ مقدمے کے لیے فٹ نہیں ہے اور اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے ہم کورٹ میں جاتے ہیں تو وہ طنزیہ انداز میں ہمیں دیکھ کر ہنستا ہے ہمارا مذاق اڑاتا ہے اور اس کے وکیل اس حرکت کو اس کا پاگل پن قرار دے رہے ہیں صاف ظاہر ہے وہ اسے بچانا چاہتے ہیں۔''

''ہوسکتا ہے۔'' نیوال نے کہا۔

''تمہیں پتا ہے محمد ابوالقدیر کے قتل سے ایک دن پہلے بن ڈیوڈ نے تین اسرائیلیوں کی آخری رسومات میں شرکت کی تھی اور پھر ایک اجتماع جلوس میں اسرائیلی لوگوں کے ساتھ مل کر وہ نعرے لگا رہا تھا۔''

عربوں کے لیے موت
مسلمانوں کے لیے موت

مجھے اندازہ ہے کہ اس ظالم نے میرے بیٹے کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا اس نے اسے جنگل میں لے جاکر اسے لائٹر کا کیمیکل پلایا اور پھر اسے آگ لگادی اور ڈاکٹری رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ مرنے سے پہلے اس پر تشدد بھی کیا گیا تھا۔''

''جو کچھ ہوگیا وہ ہوگیا...... اس کے لیے اب ہم کچھ نہیں کرسکتے سوائے اس کے کہ مجرم کو سزا دلوائیں۔'' نیوال نے افسردگی سے کہا سوہا پھر اپنے بیٹے کے قتل کے ذکر پر رونے لگی تھی اور نیوال اس کو خاموش کرانے میں مصروف ہوگئی تھی حسین ابوالقدیر نماز پڑھنے چلا گیا تھا۔

''خاموش ہوجاؤ سوہا، تمہارا محمد ابوالقدیر بھی اداس ہوگا تمہارے رونے پر اسے یاد کرو تو اللہ سے اس کی مغفرت کی دعا کرو وہ تمہیں صبر دے گا۔'' نیوال نے سوہا کو سمجھایا۔

''میں نے حسین سے بہت بار پوچھا ہے کہ یہ

مقدمہ کب تک چلے گا کب فیصلہ ہوگا ایک سال ہوگیا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اسے کچھ اندازہ نہیں آخر ایسا کیوں ہے؟ اسرائیلی تو ایسے مقدموں کا فیصلہ دو پیشیوں میں کر دیتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ کسی عرب نے کسی یہودی کو مارا ہو تو فیصلہ دو پیشیوں میں ہو جاتا ہے اور پھر اس عرب کا گھر بھی تباہ کر دیا جاتا ہے لیکن ہم مسلمانوں کو انصاف نہیں ملتا۔ میرے بیٹے کو بھی انصاف نہیں ملے گا۔'' سوہا رو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد حسین ابوالقدیر نماز پڑھ کر واپس آ گیا تھا سوہا بھی پرسکون ہوگئی تھی چنانچہ نیوال نے رخصت کی اجازت چاہی۔

''مجھے یقین ہے صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے ہماری فیملی کو نظر انداز کیا جارہا ہے میں اگر اس دنیا کی ساری دولت جمع کر کے بھی اس مقدمے پر لگا دوں تب بھی میرا بیٹا تو واپس نہیں آ سکتا۔'' حسین ابوالقدیر نے کہا۔

''فرض کریں اگر آپ کو انصاف نہیں ملا تو پھر آپ کیا کریں گے؟'' نیوال نے پوچھا۔

''میں نے انٹرنیشنل کرمنل کورٹ میں کیس دائر کرنے کے بارے میں سوچا ہے اور یہ کیس اسرائیلی اسرائیلی گورنمنٹ کے خلاف ہوگا۔''

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے آپ کو انصاف ملے گا؟'' نیوال نے پوچھا۔

''ممکن ہے کہ مل جائے کیونکہ وہ انٹرنیشنل کرمنل کورٹ ہے اسرائیلی کورٹ نہیں جہاں ہمارے ساتھ امتیازی سلوک کیا جارہا ہے جبکہ میرے بیٹے کے قتل کا انصاف کرنا اسرائیلی کورٹ کی ذمہ داری ہے لیکن ان کا رویہ غلط ہے وہ قاتلوں کا حوصلہ بڑھا رہے ہیں۔'' حسین ابو القدیر نے کہا۔

''آپ نے ٹھیک ہی سوچا ہے۔'' نیوال نے کہا۔

''تمہیں پتہ ہے مجھے لالچ دیا جارہا ہے آفر کی جارہی ہے کہا جارہا ہے کہ ہم لائف انشورنس کی مد میں تمہیں معاوضہ دینے کو تیار ہیں لیکن مجھے کچھ نہیں چاہیے کوئی رقم کوئی شناخت نہیں چاہیے مجھے صرف اور صرف انصاف چاہیے۔'' حسین ابو القدیر نے کہا۔

''ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کو انصاف ضرور ملے گا ہوسکتا ہے کل ہونے والے جلوس میں اسرائیلی حکومت پر کچھ دباؤ پڑے اور وہ آپ کے بیٹے کو انصاف دینے کے بارے میں سوچے۔''

''ہاں دیکھتے ہیں، کل کیا ہوتا ہے۔'' حسین ابو القدیر نے کہا۔ اس کے بعد نیوال ان سے رخصت ہوکر اپنے دفتر کی طرف روانہ ہوگئی تھی۔

رات آٹھ بجے کا ٹائم تھا نیوال راستے میں ہی تھی کہ اسے شوشے کی کال موصول ہوئی جس میں اسے بتایا گیا کہ مواصی کے علاقے میں ایک بار پھر اسرائیلی فوجیوں نے کارروائی کی ہے یہ کارروائی محدود علاقے میں کی گئی ہے اور اس میں 77 سالہ ابوشمالہ کو مار دیا گیا ہے یہ سنتے ہی نیوال نے اپنی گاڑی کا رخ مواصی کی طرف موڑ دیا تھا اور شوشے کو اپنی ٹیم کے ساتھ مواصی پہنچنے کے لیے کہا تھا۔

وہ بہت تیزی سے ڈرائیو کرتی ہوئی مواصی کی طرف جارہی تھی مختلف چیک پوسٹوں سے چیکنگ کراتی ہوئی وہ جب مواصی پہنچی تھی تو رات آدھی ہوچکی تھی لیکن مواصی میں ابوشمالا کے گھر کے باہر لوگوں کا ایک جم غفیر موجود تھا جو چیخ رہے تھے...... رو رہے تھے...... اپنے سروں کو پیٹ رہے تھے وہ

چیٹر

گاڑی کے جی پی ایس کی بدولت یکی چوہدری اور اقبال رانا کو گلشن میں پرانز وریسٹورنٹ ڈھونڈنے میں مشکل پیش نہیں آئی۔ واپسی پر 26 اسٹریٹ پر چڑھنے کے بعد یکی نے گاڑی فیئر فائیو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یار مزا آگیا، اتنا authentic سی فوڈ بہت دن بعد کھایا ہے۔"

"سوپ بھی OK تھا۔ ایسا کرتے ہیں۔ نیکسٹ منتھ پھر وزٹ کرتے ہیں یہاں کا۔" اقبال نے تائید کرتے ہوئے تجویز پیش کی جو نعمان نے قبول کرلی۔ یہ اعزاز شہر کے بہت کم طعام خانوں کو حاصل ہوسکا تھا کیوں کہ ہر ویک اینڈ پر شہر کا کوئی نیا ریسٹورنٹ ڈھونڈ کر وہاں ڈنر کرنا ان دونوں دوستوں کا مشترکہ شوق تھا۔

گاڑی سگنل پر رک چکی تھی۔ نعمان مزید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ معقول حلیے والے ایک ادھیڑ عمر اجنبی نے اسے متوجہ کیا۔

"ایکسیوزمی سر! آپ میرے لیے ایک منٹ Spare کرسکیں گے؟" کوچ والے نے کرایا مانگا تو پتا چلا میں اپنا پرس آفس میں بھول آیا ہوں، اس نے بدتمیزی کرکے یہاں اتار دیا۔

"مہربانی ہوگی اگر آپ......"

"Sorry" نعمان نے اس کی بات کاٹ کر گاڑی بڑھا دی۔

اقبال نے کہا۔ "جینٹل مین لگ رہا تھا، پچاس روپے......"

نعمان نے اسے بھی بات پوری نہ کرنے دی۔

"ڈریسنگ سے دھوکا نہ کھاؤ یار، نفسیاتی حربوں کے ماہر فنکار میدان میں آئے ہوئے ہیں، آج کل۔" اقبال نے حسب عادت بحث سے گریز کیا۔

پچھلے ہفتے نعمان نے اپنی پراپرٹی فرم کی گلشن اقبال برانچ کا دورہ کیا۔ واپسی پر شارٹ کٹ کے چکر میں اس نے گاڑی ایک سائیڈ روڈ پر گھمادی۔ اپنی غلطی کا اسے فوراً ہی احساس بھی ہوگیا۔ دو موٹر سائیکلوں پر سوار بدمعاش شاید کافی دیر سے اس کا پیچھا کررہے تھے۔ انہوں نے سائیڈ پر بائیک لگا کر گن کے اشارے سے اسے رکنے پر مجبور کیا اور ان میں سے دو نعمان کی گاڑی میں سوار ہوگئے۔ ان کے پاس نائن ایم ایم پستول تھے۔ اس سے سب کچھ چھیننے کے بعد عزیز بھٹی پارک کی طرف چلنے کا حکم دیا گیا۔

نعمان نے گھبرا کر کہا۔ "یار تم نے سب کچھ تو لے لیا اور کیا چاہتے ہو؟"

"فکر نہ کرو انکل! ہم Kidnapper نہیں ہیں۔ یہ گاڑی چاہیے ہمیں، اچھے دام نکل جائے گی۔"

"پر اس گاڑی......"

سینئر ڈکیت نے بات کاٹ کر کہا۔ "پتا ہے ہر گاڑی میں ٹریکر فٹ ہوتا ہے آج کل، پر اس کا علاج ہے اپنے پاس۔ چپ چاپ گاڑی آگے بڑھاؤ کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔"

نعمان ان کے اشارے پر مسلسل گاڑی دوڑاتا رہا، حتیٰ کہ راستوں کی شناخت کھو بیٹھا۔ اتنا اندازہ تھا کہ وہ گڈاپ کے علاقے میں بھٹک رہا ہے۔ بالآخر ایک سنسان مقام پر گاڑی رکوا کر اسے پستول کی نوک پر نیچے اتار دیا گیا۔ اگلے ہی لمحہ گاڑی ایک زناٹے سے آگے بڑھی اور گہرے ہوتے اندھیرے میں گم ہوگئی۔

نعمان کچھ دیر بت بنا کھڑا رہا، سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ بالآخر محض چھٹی حس کے سہارے ایک طرف چل پڑا۔ اندھیرا گاڑھا ہورہا تھا۔ بالآخر عشاء کی آذان کی آواز نے اس کی رہنمائی کی۔ ایک دکان کے بورڈ نے بتایا کہ وہ کچی آبادی عبداللہ گبول گوٹھ ہے۔ اسے اپنے رگ و پے میں زندگی لوٹتی محسوس ہوئی۔ اسے یاد آیا وہاں سے لیاری بستی کچھ ہی فاصلے پر ہے جہاں سے شہر پہنچنا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔

آدھے گھنٹے میں وہ لیاری بستی کے وسط سے گزرنے والے کشادہ روڈ پر پہنچ گیا۔ عین اس وقت اسے ایک چنگچی رکشا اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ نعمان نے اسے روکا اور پوچھا۔

"یہ رکشا کہاں جائے گا بھائی؟"

"سر جانی اور کدھر، تیرے کو کہاں جانا ہے؟"

"وہیں چھوڑ دینا بھائی! پر ایک ریکویسٹ ہے، میرے پاس کرایا نہیں ہے، مجھے ڈاکوؤں نے......" چنگچی والے نے بے زاری سے اس کی بات کاٹ دی۔

"کرایا نہیں ہے تو پیدل مارچ کرو نا بابا! ہم نے کوئی ایدھی سینٹر تھوڑی کھول رکھا ہے۔"

بے بس نظروں سے آگے بڑھتے رکشے کو دیکھتے نعمان کے کانوں میں رکشے والے کے آخری الفاظ پڑے۔ وہ اپنے اکلوتے پسنجر کو کہہ رہا ہے۔

"دیکھا، کیسا بابو لوگ کے حلیے میں پھرتا ہے آج کل چیٹر لوگ۔"

محمد عباس ثاقب

شدید غم و غصے کی کیفیت میں تھے نیوال کی ٹیم بھی وہاں پہنچ چکی تھی اور انہوں نے اس ماحول کو کوریج کرنا شروع کردی تھی اس کے علاوہ وہاں موجود کچھ لوگوں سے انہوں نے ابوشمالا کے قتل کی ویڈیو بھی حاصل کرلی تھی جو واردات ہوتے وقت کچھ لوگوں نے چھپ کر بنالی تھی لیکن اس وقت تک اس ویڈیو کا علم اسرائیلی حکام کو نہیں تھا۔

''کیا ہوا؟ یہ سب کیسے ہوا؟'' نیوال نے ابو شمالا کے ملازم سلمان سے پوچھا جو قریب ہی کھڑا رو رہا تھا۔

''وہ اپنے کھجور کے باغات کو پانی دینے غزہ کی پٹی کے دوسری طرف گئے تھے کچھ لوگ ان کی مدد کرنے کے لیے ان کے ساتھ تھے اس بار اسرائیلی فوجیوں نے ان سے کوئی بات کرنے کے بجائے ڈائریکٹ فائرنگ کی اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگئے تھے۔''

''اوہ میرے خدا'' بے ساختہ نیوال کے منہ سے نکلا۔

''کسی نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی؟'' اس نے سلمان سے پوچھا۔

''انہیں تو ہر بار ہی سب لوگ منع کرتے تھے لیکن آپ کو معلوم ہے وہ رکنے والے نہیں تھے پہلے بھی کئی بار اسرائیلی فوجیوں سے ان کی مڈبھیڑ ہوچکی تھی وہ کئی بار زخمی بھی ہوئے تھے لیکن وہ کسی صورت بھی اپنی آبائی زمینوں سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔'' سلمان نے کہا۔

''تدفین کب تک ہے۔'' نیوال نے پوچھا۔

''تدفین تو کل ظہر کے بعد ہوگی ابھی ان کے بیٹوں کو بھی یہاں پہنچنا ہے اور دوسرے عزیز بھی آنے والے ہیں۔''

''اچھا دیکھو مجھے کل محمد ابوالقدیر کی برسی کے موقع پر ہونے والے احتجاجی جلسے میں بھی شرکت کرنا ہے اگر میں وقت پر فارغ ہوگئی تو میں یہاں پہنچ جاؤں گی دوسری صورت میں میرے چینل کی ٹیم یہاں موجود ہے وہ ویڈیو بھی بنائیں گے اور اگر کوئی اور ضرورت پڑے تو بھی تم ان کی مدد لے سکتے ہو؟'' نیوال نے سلمان کو سمجھایا۔

''جی ٹھیک ہے۔'' سلمان نے کہا۔

پھر کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد نیوال شوشے کے ساتھ وہاں سے واپس روانہ ہوگئی تھی اور ایک دوسرے کیمرہ مین کو اس نے ابوشمالا کی آخری رسومات کی فلم بنانے کے لیے چھوڑ دیا تھا جس کے ساتھ چند رپورٹر بھی تھے۔

''دیکھو یہاں موجود لوگوں سے ملنا اور ابوشمالا کے بارے میں ان کے تاثرات ریکارڈ کرنا اس کے علاوہ ابوشمالا کے ساتھ اس کی زمینوں کے سلسلے میں جو زیادتی ہورہی ہے اس کی بھی پوری ہسٹری مجھے چاہیے اس کی تدفین کے موقع پر اگر کوئی اپنے خیالات کا اظہار کرے تو اس کی بھی ویڈیو بنانا ہے میں ابوالقدیر کے جلسے سے واپسی پر یہ سارا میٹریل دیکھوں گی اور اسے ترتیب دے کر رپورٹ بناؤں گی۔'' نیوال نے اپنے عملے کو پوری ہدایات دیں اور پھر شوشے کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگئی۔

''بہت برا ہوا شوشے، ابوشمالا بہت اچھا انسان تھا 77 سال کی عمر کے باوجود اس کا عزم دیکھنے والا تھا۔''

''جی ہاں غزہ کے ہر فرد میں یہی جذبہ موجود ہے۔'' شوشے نے کہا۔

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو میں نے دیکھا ہے

یہاں کا بوڑھا ہو یا جوان مرد ہو یا عورت وہ سب کچھ بھی ہونے سے پہلے فلسطینی ہیں یو این کے سینٹرز میں رہنے والے پناہ گزین ہوں یا اسپتالوں میں پڑے ہوئے زخمی غزہ میں اپنے گھروں میں موجود لوگ ہوں یا قاہرہ میں اپنی صنعتوں میں بیٹھے لوگ سب کا کہنا صرف اور صرف یہ ہے کہ مسلمانوں پر ہونے والا یہ انسانی ظلم تاریخ میں طویل ترین ہے اب ختم ہو جانا چاہیے اور غزہ کو آزادی دلوانے کے لیے ہر شخص بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہے۔'' نیوال نے کہا۔

''میڈم صبیح ابوشمالا نے 77 سال کی عمر تک جدوجہد کی اس نے بہت سے مسلمانوں کی مدد کی اور اپنی آخری عمر تک جدوجہد کرتا رہا۔ کیا اس کی قربانیاں رائیگاں جائیں گی۔ کیا اسے کبھی انصاف مل سکے گا اس کے قاتلوں کو سزا مل سکے گی یا اس کی اولاد کو ان کا حق مل سکے گا ان کی زمین واپس مل سکے گی۔'' شوشے نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے بہت سے سوالات نیوال سے کر دیے۔

''شوشے ابوشمالا نے جو قربانیاں دیں انہیں ہم بھول نہیں سکتے اس طرح جس طرح غزہ کے لیے شہید ہونے والے دوسرے مسلمانوں کو نہیں بھلایا جاسکتا تاریخ انہیں یاد رکھے گی مجھے امید ہے ایک نا ایک دن ہمیں آزادی ضرور ملے گی اور رہ گیا سوال انصاف کا تو اسرائیلی حکومت سے تو امید نہیں کہ وہ انصاف دے سکے اگر اسے انصاف دینا ہوتا تو مسلمانوں کے ساتھ جا زیادتیاں نہ کی جاتیں ہاں ممکن ہے کہ کسی روز صبیح ابوشمالا کی فیملی کا کوئی بچہ انٹرنیشنل کرمنل کورٹ میں اس اسرائیلی کمانڈنگ آفیسر سے جواب طلب کرے جو ابوشمالا کے قتل کا ذمہ دار ہے اور جس کا خیال تھا کہ ابوشمالا قتل کرنے

کے بعد جلا دینا درست تھا جو اپنی زمینوں پر لگے درختوں کو پانی دے رہا تھا جو زمینوں پر لگے درختوں کو پانی دے رہا تھا جو زمینیں اس سے اور غزہ کے دوسرے لوگوں سے چھین لی گئی ہیں اور شاید اب اس کے مرنے کے بعد وہ بنجر ہو جائیں گی اور اسرائیلی ان زمینوں پر جانوروں کے فارم بنالیں گے۔'' نیوال نے اداسی سے کہا۔

صبح ہوتے ہوتے نیوال اور شوشے اپنے دفتر پہنچ گئے تھے جہاں دو گھنٹے رکنے کے بعد نیوال نے محمد ابوالقدیر کی برسی کے موقع پر ہونے والے جلسے کی کوریج کرنے کی تیاری کی تھی اور پھر اپنی ٹیم کے ساتھ حسین ابوالقدیر کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی تھی اس نے حسین ابوالقدیر سے فون پر رابطہ کر کے اسے اپنے آنے کی اطلاع دی تھی اور خواہش کی تھی کہ وہ سوہا اور اس کے ساتھ پہلے اس کے بیٹے محمد ابوالقدیر کی قبر پر ضرور جائے گی اسے معلوم تھا کہ حسین ابوالقدیر کا پروگرام تھا کہ وہ پہلے محمد ابوالقدیر کی قبر پر جائے گا۔

نیوال جب حسین ابوالقدیر کے گھر پہنچی تو اس نے دیکھا سوہا کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جس سے ظاہر تھا کہ وہ روتی رہی تھی اور گھر کے ماحول میں اداسی سے خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

''تم ٹھیک وقت پر آئی ہو نیوال ہم لوگ بس قبرستان جانے کے لیے روانہ ہونے ہی والے تھے۔'' حسین ابوالقدیر نے کہا اور وہ لوگ وہاں سے روانہ ہو گئے قبرستان پہنچنے پر نیوال کی حیرت کی انتہا نہ رہی وہاں بہت سے لوگ پہلے سے جمع تھے نیوال حسین ابوالقدیر اور سوہا ان کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے محمد ابوالقدیر کی قبر کی طرف بڑھے تھے اور قبر پر پہنچ کر سوہا نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا پھولوں کا گلدستہ اور محمد ابوالقدیر کی ایک بڑی سی تصویر اس کی قبر پر پہلے سے رکھے پھولوں کے درمیان رکھ دی تھی لوگ جوش سے نعرے لگا رہے تھے اور کچھ اخباری نمائندے بھی وہاں موجود تھے۔

''نعرہ تکبیر''

''اللہ اکبر۔''

مجمع جوش میں نعرے لگا رہا تھا ایک اخباری نمائندہ حسین ابوالقدیر میری طرف بڑھا۔

''آپ اس موقع پر کچھ کہنا چاہتے ہیں۔''

''میں صرف یہ کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ میرے بیٹے کی جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے تو اس کی قربانی قبول کرے اور مجھے انصاف دلوائے کہ میں اس کے قاتلوں کو سزا دلوانے میں کامیاب ہو جاؤں۔'' حسین ابوالقدیر نے کہا۔

سوہا محمد ابوالقدیر کی قبر کے پاس دوزانو بیٹھ گئی تھی اور بے تحاشا رو رہی تھی۔

''میرے بیٹے کا کیا قصور تھا اسے کسی جرم کی سزا دی گئی مجھے انصاف چاہیے مجھے انصاف چاہیے۔'' وہ روتی جارہی تھی اور مجمع کا جوش وخروش اور بڑھ گیا تھا۔

''ہم محمد ابوالقدیر کے خون کا بدلہ لیں گے ہم بدلا لیں گے۔'' کچھ لوگوں نے نعرے لگائے اور حسین ابوالقدیر نے اچانک ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش رہنے کے لیے کہا۔

''نہیں، ایسے نعرے مت لگائیں میں کسی کے ساتھ ٹکراؤ نہیں چاہتا نہ ہی میں قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہوں میں نے کورٹ میں کیس دائر کیا ہوا ہے۔ میں قانونی سے انصاف مانگ رہا ہوں۔ میں کسی کو بھی اجازت نہیں دوں گا کہ محمد ابوالقدیر کے نام پر وہ کسی کو تشدد کا نشانہ بنائیں۔'' حسین ابوالقدیر

نے کہا جس پر مجمع سے وہ نعرے آنا بند ہو گئے۔

''میں آپ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اب جابا چیک پوائنٹ چلیں جہاں ہمارا پروگرام طے ہوا ہے اور وہاں انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔''

حسین ابو القدیر نے کہا جس پر وہ مجمع جابا چیک پوائنٹ کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

دہاں پہنچنے پر نیوال نے دیکھا کہ جلسے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں میدان کے بیچ میں ایک شامیانہ لگا ہوا تھا جس میں اسٹیج بنایا گیا تھا جگہ جگہ محمد ابو القدیر کی پوسٹر سائز تصاویر لگی ہوئی تھیں اور موقع پر لوگوں کا سیکڑوں کی تعداد میں جم غفیر موجود تھا۔

جلسے کا آغاز تلاوت کلام پاک سے کیا گیا تھا جلسے کے چاروں طرف سیکیورٹی کے خاص انتظامات حکومت کی جانب سے کیے گئے تھے کیونکہ یہ جلسہ حکومت سے اجازت لینے کے بعد منعقد کیا جا رہا تھا موقع پر اسرائیلی فوج کے جوان بھی موجود تھے۔ جن کے ہاتھوں میں رائفلیں موجود تھیں اور جن سے مجمع کے شرکا کو کسی قسم کی سیکیورٹی یا ہمدردی کی امید نہیں تھی ان کی وہاں موجودگی کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ وہ مسلمانوں کی سیکیورٹی سے زیادہ حکومتی اداروں کی مرضی کے مطابق عمل کرنے کے لیے وہاں موجود تھے وہ اکثر موقعوں پر اشتعالی عمل کر چکے تھے اور فائرنگ کر کے لوگوں کو زخمی کرنے کے واقعات بھی ان سے منسوب تھے۔

تلاوت کلام پاک کے بعد حسین ابو القدیر نے نیوال سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنی مشہور نظم ''غزہ کی بیٹی'' سنائے اس موقع پر یروشلم کے بڑے مفتی محمد حسین اور یروشلم کے فلسطینی گورنر عدنان الحسنی بھی موجود تھے۔

اقتباس

''کچھ لوگ ہمیشہ ایسے ہی جاتے ہیں' بن بتائے' بغیر کوئی اپنائمنٹ ہے' وہ اپنا کوئی پتا' فون نمبر بھی بتا کر نہیں جاتے جن پر انہیں رابطہ کر لیا جائے' ان کی کوئی قیمتی چیز بھی پیچھے نہیں رہ جاتی جس کو لینے کے لیے انہیں آنا پڑے۔ انہیں جانے کی اس قدر جلدی ہوتی ہے کہ وہ کوئی جھوٹا وعدہ کرنے کی زحمت بھی نہیں کرتے' کسی نشانی کو دے جانا بھی ان کے نزدیک تضیع اوقات ہوتا ہے۔ وہ تو جھٹ پٹ دروازہ کھڑکی کھول کر یوں نکل جاتے ہیں جیسے پل کے نیچے سے پانی گزر جاتا ہے' آنا فانا۔

اقتباس: راجہ گدھ (بانو قدسیہ)

انتخاب: فائق بھٹی...... پتوکی

''میں ہوں غزہ کی بیٹی
میرے بہت سے رنگ ہیں

نیوال نے مجمع کے پرجوش نعروں کے درمیان اپنی نظم پڑھنا شروع کیا۔

''میرا حوصلہ میرا دبدبہ
سبھی دیکھ دیکھ کر دنگ ہیں

ہجوم ہر شعر پر داد دینے کی جگہ پر نعرے لگا رہا تھا۔

میں ہوں غزہ کی بیٹی میرے بہت سے رنگ ہیں
میرا قلم تلوار ہے
اس میں بلا کی دھار ہے
میں ہوں غزہ کی بیٹی
میرے بہت سے رنگ ہیں
میرا عہد ہے میری ذات سے
لوں گی وطن صیاد سے
میں ہوں غزہ کی بیٹی

میرے بہت سے رنگ ہیں
ایک بار پھر فضا نعرہ تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھی تھی۔

اک دن ضرور آئے گا
پرچم میرا لہرائے گا
میں ہوں غزہ کی بیٹی
میرے بہت سے رنگ ہیں

نیوال نے اپنی نظم ختم کی تو مجمع میں موجود جوشیلے نوجوانوں کے نعروں سے فضا جھوم اٹھی اس کے بعد کچھ نوجوانوں نے رزمیہ گیت بھی پیش کیے اور محمد ابوالقدیر کو خراج عقیدت پیش کیا پھر ظہر کی اذان کا وقت ہوا اور قریبی مسجد سے آنے والی اذان پر مجمع میں خاموشی چھا گئی پھر جلسے میں موجود یروشلم کے مفتی محمد حسین نے ظہر کی نماز باجماعت ادا کرائی اور نماز کے بعد جلسے سے مختصر خطاب بھی کیا۔

نیوال نے اندازہ لگایا تھا کہ جلسے کے لوگوں کا جوش وخروش اسرائیلی سیکیورٹی گارڈز اور فوجیوں کو ذرا پسند نہیں آرہا تھا اس نے خاموشی سے شوشے کو اشارہ کیا اور ان دونوں نے ''پریس'' مارک کی گئی بلٹ پروف لائف جیکٹس پہن لیں جو اکثر ایسے موقعوں پر کوریج کے دوران پہننے کے لیے انہیں اپنی انتظامیہ کی طرف سے دی جاتی تھیں۔

سب سے آخر میں حسین ابوالقدیر کو اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے بلایا گیا اور اس کے اسٹیج پر قدم رکھتے ہی مجمع کا جوش وخروش آسمان پر پہنچ گیا۔

''نعرہ تکبیر
اللہ اکبر''
انتقام......انتقام
ابوالقدیر کا انتقام

لوگ فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے جنہیں حسین ابوالقدیر نے ہاتھ کے اشارے سے خاموش کیا۔

''میرے معزز بھائیوں میں نے آپ سے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ ہم خودکسی سے انتقام نہیں لیں گے ہم قانون کے ذریعے انصاف چاہتے ہیں اور ایک سال سے ثابت قدم ہیں اور تمام مشکلات کے باوجود صرف اور صرف کورٹ سے ہی انصاف کے طلبگار ہیں جس میں میرے ساتھ ٹال مٹول سے کام لیا جارہا ہے۔'' حسین ابوالقدیر کے خاموش ہوتے ہی مجمع نے شیم شیم کے نعرے لگائے۔

''آج 2 جولائی 1915ء ہے میرے بیٹے کو ایک سال پہلے اسی دن قتل کیا گیا تھا آج اس کی برسی کے سلسلے میں ہم یہاں جمع ہوئے ہیں اسے بے قصور مارا گیا صرف اس لیے کہ وہ مسلمان تھا اس سے ان تین عیسائیوں کے قتل کا بدلہ لیا گیا جن کے قتل سے اس کا دور دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔''

''شیم شیم۔'' مجمع نے ایک بار پھر نعرے لگائے۔

''ڈسٹرکٹ کورٹ یہ بات بہت اچھی طرح جانتی ہے کہ میرا بیٹا بے قصور تھا لیکن اس کے باوجود مقدمے کا فیصلہ نہیں کیا جارہا ہے اس کیس کو ایک سال سے لٹکایا ہوا ہے مجھے یقین ہے کہ میرے بیٹے کے قاتلوں کو بچانے کی کوشش کی جارہی ہے اب ایک سال بعد یہ کہا جارہا ہے کہ میرے بیٹے کے قاتل کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے یہ ایک حربہ ہے وہ اسے اس طرح دماغی مریض ثابت کرکے بچائیں اور اگر اسے سزا ہو بھی گئی تو مجھے یقین ہے کہ کچھ عرصہ بعد اسے رہا کردیا جائے گا۔'' حسین ابوالقدیر نے کہا اور اس بات پر مجمع آپے سے باہر ہوگیا۔

''ظالموں حساب دو
قتل کا حساب دو
مجمع نے نعرے لگانا شروع کر دیے وہ بہت پر جوش ہو گئے تھے حسین ابو القدیر نے انہیں خاموش رہنے کے لیے کہا لیکن وہ کچھ سننے کو تیار نہیں تھے اسی دوران میں وہ جلوس وہاں سے جابا کی گلیوں میں جانے کے لیے روانہ ہونے لگا تو اسرائیلی فوجیوں نے فائر کھول دیا لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہونے لگے افراتفری کا عالم ہو گیا کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا ایسے میں اچانک نیوال کو کسی نے کاندھوں سے پکڑ کر پیچھے کی طرف گھمایا نیوال اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکی اور زمین پر گر گئی اس کے چہرے پر دائیں جانب شدید جلن ہو رہی تھی اسرائیلی سیکیورٹی فورسز آنسو گیس کے شیل بھی برسا رہی تھیں ہر طرف دھواں ہی دھواں پھیل گیا تھا لوگ منتشر ہونا شروع ہو گئے تھے اور نیوال زمین پر پڑی آہستہ آہستہ اندھیروں میں گم ہوتی چلی گئی تھی۔

''جب نیوال کی آنکھ کھلی تو وہ ایک قریبی ہیلتھ کیئر سینٹر میں ایک بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کے قریب ایک سسٹر کھڑی تھی جو اس کے بازو میں لگی ہوئی ڈرپ میں انجکشن ڈال رہی تھی۔

''کک...... کیا ہوا...... میں یہاں...... کیا ہوا...... میں تو...... میں تو محمد ابو القدیر کے جلسے میں تھی میں یہاں کیسے؟'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو زخم آئے ہیں آپ کو بے ہوشی کی حالت میں یہاں لایا تھا'' سسٹر نے اسے بتایا۔

''اسی لیے نیوال کو محسوس ہوا جیسے اس کے چہرے پر دائیں جانب کوئی سخت چیز لپٹی ہوئی ہے اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ چہرے کے اس حصے میں شدید چبھن تھی اور وہاں

بے عزتی

ادریس: "آج ایک دوست نے میری بڑی بے عزتی کی۔"

وقار: "وہ کیسے؟"

ادریس: "وہ مجھ سے پوچھنے لگا تمھیں گانا آتا ھے۔"

وقار: "اس میں بے عزتی کی کیا بات ھے' بالکل سیدھی سی بات پوچھی اس نے۔"

ادریس: "لیکن اس نے کافی دیر تک میرا گانا سننے کے بعد یہ سوال کیا تھا۔"

عظمت علی...... گجرات

پٹیاں سی لپٹی ہوئی تھیں۔

''یہ کیا...... یہ کیا ہے؟'' نیوال نے پوچھا۔

''کسی نے آپ کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا ہے۔'' سسٹر نے کہا۔

''اوہ۔'' بے ساختہ نیوال کے منہ سے نکلا اور اسے یاد آیا کہ جلسے میں جب فائرنگ ہونے لگی تھی تو کسی نے اسے پیچھے سے پکڑ کر کھینچا تھا اور وہ زمین پر گر گئی تھی پھر اسے اپنے چہرے پر چبھن اور شدید جلن محسوس ہوئی تھی اور آنسو گیس کی شدت سے اسے سانس لینے میں بھی تکلیف ہو رہی تھی پھر شاید وہ زخمی حالت میں بے ہوش ہو گئی تھی۔

''میرے ساتھی...... میرے ساتھ میرا عملہ بھی تھا۔'' نیوال نے پوچھا۔

''آپ کا فوٹو گرافر شوشے بھی اسی سینٹر میں ایڈمٹ ہے وہ زخمی ہوا ہے اسے ابتدائی امداد دی جا رہی ہے۔'' سسٹر نے اسے بتایا اس وقت حسین ابو القدیر نیوال کے کمرے میں داخل ہوا اس کی بیوی

سوہا بھی اس کے ساتھ موجود تھی۔

''خدا کا شکر ہے کہ تمہیں ہوش آ گیا تم کل سے بے ہوش تھیں۔'' حسین ابوالقدیر نے نیوال سے کہا اور اس کی طرف آج کا اخبار بڑھا دیا۔

''شجاعا 3 جولائی، جابا ڈسٹرکٹ چیک پوسٹ پر محمد ابوالقدیر کی برسی کے سلسلے میں ہونے والے ایک جلسے میں اسرائیلی سیکیورٹی فورسز کی کارروائی کے دوران رویائی وی کے دو نمائندے شوشے (فوٹو گرافر) اور نیوال (رپورٹر) شدید زخمی ہوئے ہیں۔ نیوال رویائی وی کے فلسطین آفس کی ہیڈ بھی ہیں ان کے چہرے پر کسی تخریب کار نے تیزاب پھینک دیا ہے وہ تقریب کی کوریج کر رہی تھیں رویائی وی کے دونوں نمائندوں کو ایک مقامی ہیلتھ سینٹر میں منتقل کر دیا گیا ہے جہاں انہیں طبی امداد دی جا رہی ہے۔''

نیوال نے یہ خبر پڑھنے کے بعد اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میرے بیٹے کی برسی میں شرکت کے موقع پر آپ کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا۔'' سوہا نے آگے بڑھ کر نیوال کا ہاتھ تھام لیا۔

''نہیں آپ اداس نہ ہوں میرے ساتھ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے میں جانتی ہوں میں جس طرح اپنا کام کر رہی ہوں اور غزہ کے لوگوں کی درست خبریں ٹی وی پر نشر کر رہی ہوں اس کے لیے مجھے ذہنی طور پر تیار رہنا ہے کہ میرے ساتھ بھی ایسی انتقامی کارروائی کی جا سکتی ہے۔'' نیوال نے اداسی سے کہا۔

''آپ بہت بہادر ہیں۔'' حسین ابوالقدیر نے کہا۔

''میں تو اپنی سرزمین کی ایک ادنیٰ خادم ہوں میں اس کا حق ادا نہیں کر پائی ہوں۔'' نیوال نے کہا۔

''نہیں، ایک لڑکی ہونے کے ناتے اپنے گھر والوں سے دور اس علاقے میں جہاں ہر وقت جان کو خطرہ ہے آپ کا اپنی ڈیوٹی لگوانا اور اتنی ایمانداری اور سچائی سے اپنا فرض ادا کرنا بہت بڑی بات ہے۔'' سوہا نے کہا۔

''کاش میں محمد ابوالقدیر کے مقدمے میں بھی آپ کی کوئی مدد کر سکتی۔'' نیوال نے کہا۔

''آپ کر سکتی تھیں آپ نے خلوص دل کے ساتھ کیا ہے اور محمد ابوالقدیر اور ابوشمالا کے قتل کے درست حقائق منظر پر لانے ہی کی سزا آپ کو دی گئی ہے۔''

''میں ایسی ہزار سزائیں بھگتنے کے لیے تیار ہوں لیکن اپنی سرزمین کے لیے ایک صحافی ہونے کے ناتے میں یہی کر سکتی ہوں۔''

''میرے بیٹے محمد ابوالقدیر کو انہوں نے ایک بار جلایا ہے اور میں اور میری بیوی روزانہ اس آگ میں جل رہے ہیں۔ بھلا وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں کوئی بھی شخص کسی جانور کو بھی زندہ نہیں جلا سکتا تو پھر انہوں نے ایک زندہ انسان کو...... اوہ میرے خدایا اسے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔ جنہوں نے بھی یہ کیا وہ انسان نہیں ہو سکتے وہ جانوروں سے بدتر ہیں۔'' حسین ابوالقدیر کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

''آپ ہمت نہ ہاریں ہمارے ساتھ ہونے والا ظلم ایک نہ ایک دن ضرور بند ہوگا اللہ کا وعدہ ہے کہ جب ظلم حد سے بڑھتا ہے تو ختم ہو جاتا ہے وہ ہماری مدد ضرور کرے گا اگر ہم میں ابوشمالا جیسے افراد موجود ہیں تو ایک نہ ایک دن ہماری فتح ہوگی اگر آپ کو انصاف نہ ملے تو آپ انٹرنیشنل کرمنل

کورٹ میں اپنے بیٹے کا مقدمہ لے جائیں گا اسے ضرور انصاف ملے گا اور مجھے امید ہے کہ ابو شمالا کے بچوں میں سے کوئی ضرور اپنے والد کا اپنی زمینوں کا مقدمہ بھی انٹرنیشنل کرمنل کورٹ میں لے جائے گا انصاف ہوگا کیونکہ ہزاروں مسلمان غزہ اور فلسطین کی آزادی کے لیے جدوجہد کررہے ہیں وہ انسانی حقوق اور مسلمانوں کی عظمت کے لیے لڑ رہے ہیں۔ صرف غزہ میں نہیں بلکہ یہ جدوجہد اب رافع کے شمالی حصے سے لے کر کشمیر تک افغانستان سے لے کر پاکستان تک جہاں پاکستان کی بہادر فوج دشمنوں کے خلاف جنگ عضب لڑ رہی ہے یہ مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد ہے انصاف ضرور ہوگا صرف محمد ابوالقدیر اور ابوشمالا کا نہیں بلکہ تمام ان مسلمانوں کا جنہیں ناحق مارا گیا۔'' نیوال جذبات میں بولتی جارہی تھی۔

''ان شاء اللہ۔ ایک دن ضرور آئے گا جب تمہاری کہی ہوئی باتیں درست ثابت ہوں گی۔'' سوہا نے کہا۔

''ہاں ایسا ضرور ہوگا، تم بھی رونا دھونا چھوڑو اور میری آواز کے ساتھ اپنی آواز بلند کرو۔'' نیوال نے کہا۔

میں ہوں غزہ کی بیٹی
میرے بہت سے رنگ ہیں
اس کے ساتھ سوہا نے بھی دہرایا
میں ہوں غزہ کی بیٹی
میرے بہت سے رنگ ہیں
میرا قلم تلوار ہے
اس میں بلا کی دھار ہے
میں ہوں غزہ کی بیٹی
میرے بہت سے رنگ ہیں

خیالِ جدائی

جدا ہونا اتنا اہم اور میٹھا غم ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی میں تمہیں شب بخیر کہتا رہوں گا۔ (ولیم شیکسپیئر)

محبت میں چند گھنٹے مہینوں کے برابر اور چند دن برسوں کے برابر لگتے ہیں اور ایک لمحے کی جدائی ایک عمر کی جدائی محسوس ہوتی ہے۔ (جان ڈرائی ڈن)

موت کی طرح جدائی بھی محبوب کی یاد کو دھندلا دیتی ہے اور ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وقت نے بیچ میں کیسی کیسی دیواریں کھڑی کردی ہیں۔ (الیور گولڈ اسمتھ)

جدائی بعض اوقات دوستی میں رس گھول دیتی اور اسے زیادہ میٹھا بنادیتی ہے۔ (جے ہوویل)

جانے والا ان لوگوں سے زیادہ خوش نصیب ہوتا ہے جنہیں وہ چھوڑ جاتا ہے۔ (ایڈورڈ ڈیولاک)

ہر جدائی موت سے مشابہت ہے۔ (جارج ایلیٹ)

محمد ندیم عطاری...... کراچی

سوہا اور نیوال ایک ساتھ بول رہی تھیں اور قریب کھڑے ہوئے حسین ابوالقدیر کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے وہ ایک نئی سحر ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔



انصاف

اقبال بھٹی

محبت اور نفرت کا شمار فطری جذبوں میں ہوتا ہے لیکن دونوں کی نوعیت مختلف ہوتی ہے' محبت خود بخود بغیر کسی جواز کے جنم لیتی ہے لیکن نفرت کا جنم ردعمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔
محاذ جنگ پر دشمن سے نبرد آزما سپاہیوں کا احوال' انہیں اپنے افسر سے نفرت ہوگئی تھی۔

"یہاں کیا کر رہے ہو جوان۔" لیفٹیننٹ برناڈ نے ترش اور حقارت آمیز لہجے میں رنگروٹ سے پوچھا۔ جو کام سے فارغ ہونے کے بعد ایک درخت کی چھاؤں میں سستا رہا تھا۔

"میں آرام کر رہا ہوں سر۔" رنگروٹ نے بوکھلا کر جواب دیا۔

"آرام کی جگہ درخت کا سایہ نہیں، محاذ کے اگلے مورچے ہیں اگر تمہیں پھر کبھی اس طرح درخت سے ٹیک لگا کر آرام کرتے ہوئے دیکھا تو تمہارا تبادلہ اگلے مورچوں پر کرادوں گا، سمجھے...... بطخ کی اولاد۔"

☆☆☆......

لیفٹیننٹ برناڈ سے کوئی بھی خوش نہیں تھا۔ لوگوں کو اور خاص طور پر نچلے رینک کے فوجیوں کو تو اس سے سخت نفرت تھی۔ پھر اس کے ہم منصب ساتھی بھی اس سے عاجز بلکہ متنفر تھے۔

وہ عام طور سے ساؤتھ ڈیوون ٹریننگ رجمنٹ میں ہفتے کے روز، انچارج آفیسر کے فرائض بھی انجام دیتا تھا اور بیرکوں میں جھانکتا پھرتا تھا۔ آف رجمنٹ ہالی ڈے کے لیے پاس جاری کرنا بھی اس کی ذمے داری تھی اور اپنی اس ذمے داری سے وہ نہ صرف لطف اندوز ہوتا تھا بلکہ ناجائز فائدہ اٹھانا بھی اپنا حق سمجھتا تھا بعض اوقات لوگ اس کے رویے سے پریشان ہوکر تعطیل گزارنے کے لیے چند گھنٹوں کا پاس لینا بھی گوارا نہیں کرتے تھے اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

اس کی بعض عادتیں بڑی خبیثانہ تھیں۔ مثال کے طور پر بیرکس کے معائنے کے دوران وہ اچانک ہی انگلی کو تھوک لگا کر کسی کھڑکی کے شیشے پر پھیرتا تھا اگر انگلی میلی ہو کر واپس آتی تھی تو کھڑکی کی صفائی کے ذمے دار افسر یا رنگروٹ کی شامت آجایا کرتی تھی سزا کے طور پر اس کا راشن کم کر دیا جاتا تھا۔

اس کی ایک مکروہ عادت، نجی سامان کی تلاشی لینے کی بھی تھی۔ وہ سوٹ کیسوں کا سامان کھول کر فرش پر بکھیر دیا کرتا تھا اور اگر کسی کے سامان میں سے رسالہ نکل آتا تو اس کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہتی۔

وہ رسالہ ضبط کر کے اس شخص کو کڑی دھوپ یا برفانی راتوں میں بیرک کے کھلے میدانوں کا چکر لگانے کا حکم دیا کرتا تھا۔

اس کی زیادتیاں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ جونیئر کمیشن افسر اور بندوقچی سب ہی یہ دعا کرنے لگے کہ یا تو لیفٹیننٹ برناڈ مارا جائے یا پھر انہیں نازیوں کے خلاف مقابلے پر بھیج دیا جائے۔ لیفٹیننٹ برناڈ کے مقابلے میں نازیوں سے لڑنا انہیں زیادہ آسان لگتا تھا۔

برناڈ کی اذیت پسندی اور خباثت کے باعث اس کے بہت سے شکار بڑی سنجیدگی سے یہ سوچنے لگے تھے کہ کاش تربیت کے دوران بھٹکی ہوئی کوئی گولی اس کی موٹی گردن کے آر پار ہوکر ان کے سارے دلدر دور کردے۔

☆☆☆......

ایک روز رنگروٹ اسمتھ بڑے جوش و خروش سے اپنی

گن صاف کرتا ہوا مقبول گیت گنگنا رہا تھا اس کی رگوں میں مسرتوں کا رد دوڑ رہا تھا کیونکہ آج اس کی منگیتر ہیلن اس سے ملنے آ رہی تھی ہیلن سے آخری ملاقات دو ماہ قبل ہوئی تھی اور دونوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ جنگ ختم ہوتے ہی شادی کر لیں گے۔ ہیلن ایک اسپتال میں نرس تھی اسے اسمتھ سے زیادہ معاوضہ ملتا تھا اور دونوں کو توقع تھی شادی سے قبل اتنی رقم پس انداز ہو جائے گی کہ وہ ایک فلیٹ کے مالک بن جائیں گے۔ ہیلن سے اسمتھ کی پہلی ملاقات ایک ہوٹل میں اس وقت ہوئی تھی جب اسمتھ ابھی فوج میں بھرتی نہیں ہوا تھا اور ہیلن تربیت حاصل کر رہی تھی۔ وہ اس کے قریب والی میز پر اپنی سہیلی کے ساتھ بیٹھی قہقہے لگا رہی تھی کہ اچانک خطرے کے سائرن بج اٹھے اور بمباری شروع ہو گئی۔ ایک بم اچانک ہی ہوٹل کے قریب آ کر گرا اور اس کے دھماکے سے ہیلن بے ہوش ہو گئی اسمتھ نے فوراً اسے بازوؤں میں اٹھا لیا اور ایک محفوظ مقام تک پہنچا دیا اور جب ہیلن نے آنکھ کھولی تو وہ اس کے چہرے سے گرد صاف کر رہا تھا۔

وہ اتنی متاثر ہوئی کہ اپنا دل ہار بیٹھی اور پھر انہوں نے ایک جان دو قالب ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی دوران اسمتھ کو بھی فوج میں بھرتی کر لیا گیا کچھ روز تو اسے اسی شہر ہی میں رکھا گیا پھر ٹریننگ رجمنٹ میں بھیج دیا گیا جس کا دفتر شہر سے بیالیس میل دور تھا۔ اس سے رخصت ہوتے وقت ہیلن نے وعدہ کیا تھا کہ جب بھی موقع ملا وہ اس سے ملنے ضرور آئے گی۔ جنگ میں شدت اور محاذ سے زخمیوں کی مسلسل آمد کے باعث نرسوں کو ٹھیک سے سونے کی بھی فرصت نہیں تھی تاہم ہیلن جدائی کے دو ماہ بعد کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر رجمنٹ کے دفتر پہنچ ہی گئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اسمتھ اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”کیا ہوا ہیلن۔“ اس نے تڑپ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں ایک ہفتے سے بالکل آرام نہیں کیا کیونکہ اسپتال میں زخمی بہت زیادہ ہیں اور عملہ کم ہے لیکن فکر کی کوئی بات نہیں اب میں ٹھیک ہو جاؤں گی تمہیں دیکھ کر ساری تھکن دور ہو گئی ہے۔“

ہیلن کے جانے کے بعد وہ دیر تک سوچتا رہا کہ وہ کتنی اچھی ہے اور یہ بھی کہ جنگ ختم ہونے پر ان کی زندگی کتنی خوشگوار ہو جائے گی۔

اور آج ہیلن پھر آنے والی تھی۔ اس نے اسپتال سے واپس آنے والے ایک لیفٹیننٹ کے ذریعے اسمتھ کو پیغام بھیجا تھا کہ اسے چند گھنٹے کی چھٹی مل رہی ہے اور وہ پورے تین گھنٹے اس کے ساتھ گزار سکے گی۔

وہ گنگناتا ہوا رائفل لے کر نہر پر چلا گیا۔ اس نے رائفل ایک طرف رکھی اور خوب مل مل کر نہایا۔ اس نے ایک پرانا جوڑا پہلے ہی دھو کر استری کر دیا تھا آج اس نے ایک ہفتے بعد کھرچ کھرچ کر شیو بھی بنایا تھا۔

نہانے کے بعد وہ کپڑے تبدیل کر ہی رہا تھا کہ اچانک برناڈ کی منحوس صورت دکھائی دی۔ ”کیا ہو رہا ہے، رنگروٹ اسمتھ۔“ اس نے تلخ اور حقارت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

”نہا رہا تھا سر۔“ اسمتھ نے خوشدلی سے جواب دیا کیونکہ آج وہ نہ تو اپنا موڈ خراب کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی برناڈ کی ناراضگی کا متحمل ہو سکتا تھا۔

”نہر میں نہا رہے تھے کیوں؟“

وہ.......مگر سر.......!“

”اگر مگر کچھ نہیں، تم بیرک کے احاطے میں کنویں پر کیوں نہیں نہاتے؟“

”بس.......سر.......وہ یہاں ذرا لطف آتا ہے۔“

”تم اپنے لطف کے لیے ضابطوں کی خلاف ورزی کرتے ہو۔“ برناڈ نے خونخوار لہجے میں الزام لگایا۔

”خلاف ورزی.......مگر سر.......نہر میں نہانے پر کوئی پابندی تو نہیں۔“

”بکواس مت کرو، جوان۔“ برناڈ نے پیر پٹختے ہوئے کہا۔ ”اپنے افسر سے بات کرنے کا سلیقہ سیکھو بحث مت کرو۔“

”سوری سر.......مگر.......!“

''مگر.....!'' برناڈ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''مگر جوان تم رائفل لے کر نہا رہے تھے۔''

''نہیں سر..... میں نے رائفل کپڑوں پر رکھ دی تھی۔''

''بے پروا۔'' لیفٹیننٹ کے چہرے پر فاتحانہ چمک نمودار ہوگئی۔

''تم نے رائفل کو خود سے جدا کر کے ضابطہ نمبر ۳ کی خلاف ورزی کی ہے اگر آج تمہاری ملاقات نہ آرہی ہوتی تو میں تمہیں گارڈ روم میں بند کردیتا۔''

''سوری سر..... آپ کا شکریہ۔''

''ہاں میں تمہیں گارڈ روم میں بند کر کے سزا دے سکتا ہوں۔ لیکن میں اتنا ظالم نہیں ہوں۔ میں بھی انسان ہوں لیکن کیونکہ تم نے ضابطے کی خلاف ورزی کی ہے اور پھر اپنے افسر سے بحث کے مرتکب بھی ہوئے ہو لہٰذا تمہیں سزا ضرور ملے گی۔''

''وہ کیا سر؟'' اسمتھ ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار تھا۔

''تمہاری ملاقات منسوخ کی جاتی ہے۔''

''نہیں.....!'' اسمتھ اچھل پڑا وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ برناڈ اتنا کمینہ بھی ہوسکتا ہے اس نے کئی بار احتجاج کیا خوشامدیں کیں مگر لیفٹیننٹ برناڈ ٹس سے مس نہ ہوا۔

......☆☆☆......

اس شام اسمتھ اور اس کے ساتھی بیرک کی دوسری منزل کی کھڑکیوں سے باہر جھانکتے رہے چار بجے ایک نازک سی لڑکی اسپتال کی وین سے اتر کر گیٹ پر آئی وہاں موجود محافظ نے جسے دوسرے رنگروٹوں نے سب کچھ بتادیا تھا بڑی ہمدردی سے ہیلن کو آگاہ کیا کہ اس کی ملاقات نہیں ہوسکی جس پر ہیلن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور پھر محافظ کو اسمتھ کے لیے کچھ تحائف دے کر واپس چلی گئی ہیلن کو روتے دیکھ کر اسمتھ تو بے حال ہوگیا لیکن دوسروں کے غصے کی انتہا نہ رہی، وہ سب اس بات پر متفق تھے کہ برناڈ نے ظلم وستم کی انتہا کردی ہے۔

اس رات اسمتھ کو نیند نہیں آئی وہ کروٹیں بدلتا رہا اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ دیا اور اس کے ساتھی دیر تک یہی سوچتے رہے کہ کاش وہ اس یونٹ کے بجائے نازیوں کی قید میں ہوتے۔

......☆☆☆......

پھر رضا کار فوجی جوئی برناڈ کا شکار بنا۔

لیفٹیننٹ برنارڈ انچارج افسر کی حیثیت سے گارڈ روم میں سپاہیوں کے لکھے ہوئے خطوط سنسر کررہا تھا اس کا کام صرف یہ تھا کہ خطوط سے ایسے جملے کاٹ دے جو فوجی کام سے متعلق ہوں، بیشتر افسر سنسر کے کام سے نفرت کرتے تھے کیونکہ اس طرح انہیں اپنے ساتھیوں کے ذاتی امور پڑھنا پڑتے تھے لیکن برناڈ کو اس کام میں بڑا لطف آتا تھا وہ خط پڑھتے پڑھتے زور سے قہقہہ لگاتا اور پھر اردلی کی موجودگی میں با آواز بلند خط کا کوئی دلچسپ حصہ پڑھنے لگتا۔ بعض اوقات وہ ناشائستہ تبصرے بھی کرتا تھا اس روز بھی وہ یہی حرکت کررہا تھا اس کے ہاتھوں میں جوئی کا خط تھا جو اس نے اپنی بیوی کو لکھا تھا۔

''آہا سنو.....!'' اس نے اپنے اردلی سے کہا۔

''دیکھو کیا لکھا ہے..... لکھتا ہے کہ مجھے نیند نہیں آتی تم یاد آتی ہو اور پھر اس نے قطعی نجی زندگی کے بارے میں ایک جملہ بھی پڑھ کر سنایا۔ اسی لمحے جوئی کسی کام سے گارڈ روم میں آیا اور اس نے اپنے جملے پہچان لیے۔

''سر..... معاف کیجیے یہ خط اس لیے نہیں دیے گئے کہ آپ انہیں دوسروں کو سنائیں۔'' وہ غصے سے تلملا کر بولا۔

برناڈ بھی سرخ ہوگیا۔ غالباً اسے احساس ندامت ہوا تھا۔ لیکن اس نے چکنے گھڑے کا سا انداز برقرار رکھا۔ ''تم جاہل ہو جوئی، میں تمہارا افسر ہوں، جاؤ اپنا کام کرو۔''

جوئی، غصے میں بھرا ہوا گارڈ روم سے نکلا اور بیرک میں پہنچ کر گالیاں بکنے لگا اس روز اس نے کئی ساتھیوں کے سامنے عہد کیا کہ اگر محاذ پر کبھی برناڈ سے آمنا سامنا ہوا تو وہ سب سے پہلے جرمنوں کے بجائے برناڈ کو نشانہ بنائے گا۔

......☆☆☆......

پھر اچانک ہی ایک روز بیرک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہر شخص ایک دوسرے سے گلے مل کر مبارک باد دینے لگا اور

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پوری رجمنٹ میں پھیل گئی کہ لیفٹیننٹ برناڈ اپنی جیپ کے حادثے میں مارا گیا انہیں صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ برناڈ نے جونہی اپنی جیپ اسٹارٹ کی تو ایک زوردار دھماکہ ہوا اور جیپ کے ساتھ برناڈ کے بھی پرخچے اڑ گئے۔ جب لوگوں نے اپنی خوشی پر قابو پالیا تو پھر یہ بحث چھڑ گئی کہ دھماکہ کیوں ہوا؟ بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ وہ کسی ایسی بارودی سرنگ کا شکار ہوا ہے جو جرمن قیدیوں نے فرار ہوتے وقت یہاں پھینک دی ہوگی۔ دراصل کچھ عرصہ قبل تک جرمن قیدی اسی علاقے میں رکھے گئے تھے۔

......☆☆☆......

وقت بدل گیا، جنگ ختم ہوگئی لندن کی رونقیں بحال ہوگئیں دنیا بہت آگے بڑھ گئی اور پھر تیس سال بعد کسی کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ جنگ کتنی تباہیاں لائی تھی۔ ایک روز، سابق فوجی جوئی، جو اب درزی کا کام کرنے لگا تھا ایک دراز قد شخص سے ٹکرا گیا وہ معذرت کرکے آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ اس شخص نے اسے پکڑ لیا۔ ''ارے سنو تو تم جوئی ہو نا، مجھے بھول گئے میں جمی ہوں۔ جم ڈیلی...... ہم بلجیم اور جرمنی میں ایک ہی محاذ پر تھے اور اس سے قبل ہم نے ایک ہی جگہ تربیت حاصل کی تھی۔''

جوئی جمی سے لپٹ گیا جو میڈیکل سارجنٹ تھا اور محاذ پر ایک بم پھٹنے سے زخمی ہوگیا تھا دونوں دیر تک ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے باتیں کرتے رہے اور پھر جب انہیں ہوش آیا تو سکون سے باتیں کرنے کے لیے ایک بار میں گھس گئے۔

باتیں ہوئیں تو سارے پرانے قصے یاد آگئے۔

''تمہیں وہ تو یاد ہوگا برناڈ۔''

''ہاں...... مگر میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ کوئی جرمن قیدی وہاں بارودی سرنگ کس طرح لگا سکتا تھا۔'' جوئی نے مسکراتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''تب پھر یہ کس کی حرکت ہوسکتی تھی جوئی۔''

''وہ بہت خبیث شخص تھا۔'' جوئی نے اپنے گلاس کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''لوگوں کو صرف اس وجہ سے سزا دیتا تھا کہ وہ اس سے مرعوب ہوجائیں تمہیں یاد ہے کہ ایک مرتبہ اس نے اسمتھ کی طرح تمہاری ملاقات بھی منسوخ کردی تھی۔''

''ہاں میری بیوی امید سے ہونے کے باوجود مجھ سے ملنے آئی تھی اور اس کمینے نے ذرا سا بھی لحاظ نہیں کیا پھر اس ذلیل نے مجھ سے کہ میری بیوی باہر کھڑی ہے لیکن میں اس سے مل نہیں سکتا جاؤ، میری جیپ صاف کرو، انجن کے پرزے بھی صاف کرکے انہیں تیل دینا مت بھولنا۔''

''پھر تم نے انجن میں بم رکھ دیا تھا جو اگنیشن میں چابی کے گھومتے ہی پھٹ سکتا تھا۔''

''کک...... کیا؟'' جمی بوکھلا کر اٹھ گیا ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''نہیں دوست ڈرو نہیں،'' جوئی ہنسنے لگا۔ ''میں تمہیں بم لگاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔''

''اوہ، لیکن تم نے مجھے روکا کیوں نہیں تھا؟''

''اس لیے کہ میں خود بھی یہی کام کرنے وہاں گیا تھا پھر جب میں نے تمہیں دیکھا تو خاموشی سے واپس آگیا۔''

''اوہ......!'' جمی کی آنکھیں مسکرانے لگیں۔ ''میری ملاقات اسمتھ سے بھی ہوئی تھی وہ بھی بم لے کر وہاں آیا تھا لیکن وہ مجھے دیکھ کر جھاڑیوں میں چھپ گیا تھا۔''

''اس کا مطلب کہ اس وقت ساری یونٹ اسے ٹھکانے لگانے پر تلی ہوئی تھی۔''

''ظاہر ہے۔'' جمی نے جواب دیا اور طمانیت آمیز انداز میں مسکرانے لگا۔

ذوقِ آگہی

سباس گل

ماں
(انعام یافتہ)

ماں کس قدر پیارا اور خوب صورت لفظ ہے۔ یہ سہ حرفی مختصر سا لفظ اپنے اندر محبت، ایثار، مروت اور شفقت کے مفہوم کا ایک سمندر لیے ہوئے ہے۔ ماں دل کا سرور ہے، آنکھ کا نور ہے، پیار کا تحفہ ہے، محبت کی کلی ہے اور گلاب کا ایک ایسا رنگین و شگفتہ پھول ہے جو سب پھولوں سے پیارا اور حسین ہے۔ اس پھول کی مہک سب سے زیادہ اور مشام نواز ہے۔ ماں ایک ایسا محبت، پیار اور شفقت آمیز ٹھنڈا سایہ ہے جو اپنی اولاد کی ہر تکلیف دکھ بلا اور مصیبت سے محفوظ رکھنے میں اپنی مثال آپ ہے۔ ماں کا لفظ ذہن میں آتے ہی محبت، پیار، ہمدردی اور شفقت کے پھول ایک ایسا چھپر بنتے معلوم ہوتے ہیں جس کے سائے میں اولاد بالکل محفوظ اور سکھی ہوتی ہے۔ ماں کا یہ ٹھنڈا اور سکھ بھرا سایہ نعمت خداوندی ہے اس سائے سے محروم ہوتے ہی اولاد کو احساس ہوتا ہے کہ وہ کتنی بڑی پناہ سے محروم ہو گیا ہے۔ ماں کی مقدر کسی ایسے انسان سے پوچھیں جس کے سر پر ماں کا شفقت بھرا ٹھنڈا سایہ نہ رہا ہو۔ دنیا کنگھال ڈالو، زمین کا چپہ چپہ چھان مارو، ماں کا ٹھنڈا سایہ کہیں نہیں ملتا۔ ماں کے پیار، شفقت بھری گود اور ریشمی آغوش کا دنیا میں کوئی بدل نہیں ہے۔ یہ وہ ہستی ہے جس کے پاؤں تلے جنت ہے، ماں اس دنیا میں بھی راحت اور چین ہے اور اگلی دنیا میں سکھ، آرام اور نجات کا پیغام ہے۔

جویریہ سلیم......راولپنڈی

اچھی بات

بنایا تو سب کو اللہ ہی نے
لیکن
اپنا بنایا کسی کسی کو۔
پھر وہ ساری دنیا کی محبت دکھا کر
پوچھتا ہے اب بتا تیرا میرے سوا کون ہے؟

جویریہ سعید اعوان......اسلام آباد

قیمتی رازِ حکمت

- کلونجی، ہلدی، دار چینی، کالی مرچ، لیموں، جامن، عرق گلاب، سنڈھ
- کھانے والا کبھی شوگر جیسے موذی مرض میں مبتلا نہیں ہوگا ان شاءاللہ پکی بات ہے۔
- اگر کسی کو شوگر ہے تو اوپر والی چیزیں استعمال کرنے سے شوگر کا خاتمہ ہو جائے گا بشرطیکہ انسولین کا ٹیکہ نہ لگاتا ہو، (پیدل واک اور کچھ پرہیز)
- اگر وزن بڑھ جائے تو ادرک اور لیموں کا رس برابر نکال کر 2 چمچ صبح 2 چمچ رات لیں ایک ماہ میں 8 کلو گرام وزن کم ہوگا (مناسب ڈائٹنگ ہلکی واک بھی کریں)
- گیس کے مریض دن کو دودھ پی سکتے ہیں، اجوائن 2 گرام روزانہ کھانے سے کبھی گیس پرابلم نہیں ہوگی (کھانے کے بعد)
- جن خواتین کا دودھ کم ہو جائے وہ مائیں دودھ میں سوف جوش دے کر پی لیا کریں۔ (دودھ زیادہ آئے گا)
- پستہ، کاجو، کینوں، پارس سیب چہرے کو سرخ سفید بناتا ہے
- انگور، چیری، انار کھانے والے کو کبھی خون کی کمی نہیں ہوتی۔

فلک شیر ملک......رحیم یار خان

مہمان نوازی کی آٹھ سنتیں

☆ جب کوئی شخص آپ کے گھر آئے اگر اس کے پاس سامان وغیرہ ہو تو اس کو نہایت حفاظت سے مناسب جگہ رکھیں اس کی سواری کا بندوبست کریں اور صاف ستھری

جگہ پر اچھا بستر بچھا کر دیں بیٹھائیں، کھلائیں، پیشاب پاخانہ کی جگہ بتا دیں تاکہ وہ اپنی ضرورت پوری کرے۔

☆ مہمان کے کھانے پینے کا انتظام کریں اور اپنی حیثیت کے مطابق اچھا کھانا دیں۔

☆ مہمان اور اس کے بال بچوں کی خیریت دریافت کریں اور آنے کی مبارکباد پیش کریں۔

☆ مہمان سے خوشی کے لہجے میں خندہ پیشانی سے بات کریں۔

☆ مہمان کی خوب خدمت کریں کسی بات کی تکلیف نہ ہو۔

☆ زیادہ بے کار باتیں کر کے اسے پریشان مت کریں۔

☆ جو چیز اپنے لیے پسند کریں وہی مہمان کے لیے بھی پسند کریں۔

☆ تین دن تک نہایت عزت و ادب سے رکھیں اگر اس سے پہلے کسی خاص ضرورت کی وجہ سے جانا چاہے تو اسے رہنے پر مجبور مت کریں بلکہ خوشی سے اجازت دے دیں جہاں تک ہو سکے خاطر و مدارت سے رکھیں مہمان کی عزت و اکرام جز و ایمان ہے۔

انتخاب: اشفاق حسن...... کراچی

وقت بہت ظالم ہے

❁ وقت بہت ظالم ہے، انسان کی زندگی میں کبھی کبھی ایسا وقت بھی آ جاتا ہے کہ جب صرف ایک ٹھوکر سے اس کے تمام سنہرے خواب بکھر جاتے ہیں۔

❁ وقت ایسا زخم چھوڑ جاتا ہے، جس کا کوئی علاج نہیں کر سکتا۔ پھر ہم سوچتے ہیں کہ کاش ہم کوئی بے جان تصویر ہوتے، جذبات و احساسات سے عاری،

❁ ہماری نہ کوئی خواہش ہوتی، نہ آرزو۔

❁ یہ تقدیر بھی عجیب چیز ہے، کسی کو مانگے بغیر سب کچھ دے دیتی ہے اور کسی کے قریب سے مسکرا کر گزر جاتی ہے۔

انتخاب: فرحین ریاض...... کراچی

محبت

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو کسی عمل سے وابستہ نہیں ہوتا۔ اچھائی، برائی، کمی بیشی، اونچ نیچ محبت کے سامنے یہ سب بیکار باتیں ہیں۔

انتخاب: مسکان احزم...... فیصل آباد

لاکھوں کی ایک بات

❖ کم بولنے والے نہایت طاقت ور ہوتے ہیں۔

❖ وہم سب سے بڑی بیماری ہے۔

❖ صاف پانی اور گہری نیند سب سے اچھے ٹانک ہیں۔

❖ تندرستی مفت میں ملتی ہے بیماری لوگ خریدتے ہیں۔

❖ تمہارا جسم اللہ کی امانت ہے اسے کمزور نہ ہونے دو۔

❖ تھوڑا کھاؤ گے تو کبھی نہیں پچھتانا پڑے گا۔

❖ ہنسی انسانی جسم کی مشین کے لیے تیل کا کام کرتی ہے۔

❖ تندرستی اور خوب صورتی کی آدھی جان صفائی ہے۔

❖ دعا کرنے سے پہلے اپنی غلطیوں کو سدھارنے کی عادت ڈالو۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

سوٹ

بیگم صاحبہ دکان کے اندر داخل ہوئیں ان کو ان کا دیا ہوا کپڑا جس کا انہوں نے سوٹ سلوانا تھا وہ سوٹ لا کر اس نے بیگم صاحبہ کو دکھایا بیگم صاحبہ تو دیکھتے ہی بھڑک اٹھیں۔ "دیکھو ماسٹر تم نے اتنی زیادہ بے پروائی کیوں دکھائی۔ یہ سوٹ تو میرے ناپ کا ذرا بھی نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہے یہ ڈیزائنر سوٹ تھا اور بیگم صاحبہ سخت گرم ہو گئیں اور غصہ میں آ گئیں ٹیلر ماسٹر بڑی شرمندہ اور معذرت خواہانہ صورت بنائے کھڑا تھا بیگم صاحبہ نے چھ ہزار روپے کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ ٹیلر ماسٹر نے منہ بسورتے ہوئے دراز کھول کر چھ ہزار روپے کے نوٹ بیگم

صاحب کو تھما دیے۔
شام کو ایک اور ماڈرن سی بیگم صاحبہ اندر داخل ہوئیں اور ٹیلر ماسٹر کی طرف دیکھ کر مسکرائیں دوسری طرف سے بھی مسکرا کر ان کا استقبال کیا گیا وہی آج والا سوٹ بیگم صاحبہ کو پیک کر کے دیا کیونکہ ان ہی کے ناپ کا سل گیا تھا بیگم صاحبہ نے چھ ہزار ایک دیے جو اس نے جرمانہ بھرا تھا اور سلائی کے علیحدہ چھ ہزار دے دیے اور کہا۔
''یہ سب میرے منصوبہ کے مطابق کرنے کا بے حد شکریہ۔''
جاوید احمد صدیقی......راولپنڈی
اقتباس
ہماری نئی نسل کسی کے پیچھے چلنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ ''میں خود'' کی قائل ہے۔ اس لیے اب بڑوں کا فرض ہے کہ خود اسپرٹ پیدا کریں، لوگوں کے پیچھے چلے اور پیچھے چل کر ان کا رخ موڑے۔
آگے چل کر رخ موڑنا تو آسان بات ہے، پیچھے چل کر رخ موڑنا بڑی بات ہے۔
انتخاب: صدف آصف......کراچی
لفظ لفظ موتی
❁ زندگی کا المیہ یہ نہیں کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے بلکہ زندگی کا اصل المیہ یہ ہے کہ ہم جینا بہت دیر بعد سیکھتے ہیں۔
❁ اگر کسی اچھے انسان سے غلطی ہو جائے تو درگزر کرنا چاہیے کیونکہ موتی اگر کیچڑ میں بھی گر جائے تو بھی قیمتی ہی رہتا ہے۔
❁ بُرا وقت وہ شفاف آئینہ ہے جو بہت سارے چہرے واضح کر دیتا ہے اور اچھا وقت بادلوں کی طرح ہے جو سورج کی تپش کو بھی روک لیتا ہے۔
❁ شیشے کو توڑنے کے لیے ایک پتھر کافی ہوتا ہے اور دل توڑنے کے لیے ایک لفظ۔
❁ ہمیشہ اپنی چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرو کیونکہ انسان پہاڑوں سے نہیں پتھروں سے ٹھوکر کھاتا ہے۔
❁ اپنا فائدہ سوچے بنا سب کے ساتھ اچھا کرو کیونکہ جو لوگ پھول تقسیم کرتے ہیں ان کے ہاتھوں میں خوشبو ضرور رہ جاتی ہے۔
سدرہ احسان......سمبڑیال
انمول موتی
☯ ایک اچھے دوست کی مثال ایک اچھی خوشبو کی طرح ہے جب بھی تم اس کو یاد کرو گے تو تمہیں اس کی مہک آئے گی۔
☯ کسی کو اپنی صفائی نہ دو کیونکہ جو آپ سے پیار کرتا ہے اس کو ضرورت نہیں اور جو نفرت کرتا ہے وہ کبھی یقین نہیں کرے گا۔
☯ کسی نے پوچھا کہ ماں مر جائے تو دعا کون دیتا ہے؟ فرمایا کہ جھیل سوکھ جائے تو مٹی میں نمی ضرور رہتی ہے اسی طرح ماں کے انتقال کے بعد بھی ماں دعا دیتی رہتی ہے۔
☯ جب تمہیں خوشی ملے تو تین چیزوں کو مت بھولنا
اللہ کو......اس کی مخلوق کو......اپنی اوقات کو
عادل مصطفیٰ......طور جہلم
چند اہم باتیں
☐ انتظار مرتا نہیں ہے، آنکھوں میں جم جاتا ہے، بس آنکھیں مر جاتی ہیں۔
☐ اکثر محبتیں اس لیے ضائع ہو جاتی ہیں کہ ہم وہ محبت غلط انسان کو سونپ دیتے ہیں۔
☐ جب ہم کسی سے رشتہ جوڑتے ہیں تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے بعد میں وجہ ختم ہو جاتی ہے اور صرف رشتہ رہ جاتا ہے۔
☐ اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں کا ذکر ہر ایک سے نہ کرتے کیونکہ دشمن خوش اور دوست پریشان ہوتا ہے۔
کرن شہزادی......بھیر کنڈ، مانسہرہ
مسکرائیے
ایک شخص: ''کیا تم راجہ ہو؟''
دوسرا: ''نہیں میں میراثی ہوں۔''

پہلا شخص: "تم راجہ ہو؟"
میراثی: "نہیں میں میراثی ہوں راجہ نہیں ہوں۔"
وہ شخص: "نہیں سچ بتاؤ تم راجہ ہو۔"
میراثی (غصے میں آ کر)...... "ہاں ہاں میں راجہ ہوں۔"
پہلا شخص: "شکل سے تو میراثی لگتے ہو۔"

لاریب عندلیب...... خیر پور ٹامیوالی

خالق کائنات

☐ اللہ سے نزدیک ہونے کے لیے اللہ کے بندوں سے نزدیک ہو جاؤ (جبران)

☐ اس آدمی سے ہوشیار رہو جو یہ سمجھتا ہے کہ خدا صرف آسمان پر رہتا ہے (برنارڈ شاہ)

☐ تمام علماء اور اساتذہ یہ بات سمجھنے سے عاجز و قاصر ہیں کہ وجود کیونکر ہوا اور یہ کیونکر برابر ہوتا چلا جا رہا ہے ہمیں ایسے خالق حقیقی کا اقرار کرنا ہی پڑتا ہے جو ہمیشہ اور ہر وقت موجود ہے (فلامریاں)

☐ سیکنڈ منٹوں میں منٹ گھنٹوں میں گھنٹے دنوں میں دن ہفتوں میں ہفتے مہینوں میں مہینے سالوں میں سال صدیوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔

☐ سورج اور چاند نکل رہے ہیں ستارے جگمگ کر رہے ہیں زمین پر پودے اگ رہے ہیں ہوا چل رہی ہے درختوں کے پتے ہل رہے ہیں۔ پھول اور پھل نمودار ہو رہے ہیں شبنم گر رہی ہے سمندر میں پانی بہہ رہا ہے۔ کوہ آتش فشاں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں یہ انسان ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہو رہا ہے جانور گھوم رہے ہیں۔ غرض ساری کائنات حرکت میں ہے اور حرکت تحریک اور طاقت کے تابع ہوتی ہے تو پر وہ کون سی تحریک...... وہ کون سی طاقت ہے جس کی وجہ سے کائنات میں حرکت کی یہ دقیق موجود ہے دل سے بے اختیار جواب آتا ہے وہ محرم وہ طاقتور وہی اعلیٰ ذات ہے جس کے وجود کے بارے میں آنکھیں رکھنے کے باوجود اندھے کان رکھنے کے باوجود بہرے اور عقل رکھنے کے باوجود بے وقوف لوگ انکار کرتے ہیں اور ایمان احساس اور بصیرت رکھنے والے اقرار......!" (ابو منان)

حرا قریشی...... بلال کالونی ملتان

موسیقی عذاب الٰہی کا ذریعہ

کہا جاتا ہے جس قوم میں موسیقی پھیل جائے جس قوم میں عورتوں کا پردہ اٹھ جائے جس قوم میں معیشت سود پر آ جائے اس قوم میں زنا ضرور آئے گا۔ وہ قوم زنا سے نہیں بچ سکتی اور جس قوم میں زنا عام ہوتا ہے تو وہ بے حیاء ضرور ہو گی۔ پھر وہ بے حیائی سے بچ نہیں سکتی اور جب وہ بے حیا ہو گی تو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوڑا بے قرار ہو گا پھر تلوار میان سے نکلے گی وہ کوڑا نکلے گا......

بجلیاں تڑپیں گی موسم بدلیں گے ملک کی آنکھ بدلے گی زمین کے تیور بدلیں گے کائنات کی گردش بدلے گی۔

وہ زمین جو مسلمان کے لیے اپنا سینہ بچھاتی تھی وہ زمین زلزلے لائے گی وہ پانی جو موتیوں کی طرح برستا تھا وہ پانی برف بن کر ان پر آگ برسائے گا وہ فرشتے جوان کی دعاؤں پر آمین کہتے تھے ان کی مدد کو اترتے تھے وہی فرشتے ان کے لیے قہر الٰہی بن کے نازل ہوں گے وہ ہوائیں جوان کا پیغام لے کر چلتی تھیں انہی ہواؤں سے اللہ تعالیٰ طوفان کی شکل پیدا کرے گا۔ وہ پانی جوان کو راستے دیتا تھا وہ پانی ان کے ڈبونے کا سامان بنے گا اور وہی کائنات جوان کی تابع تھی اسی کائنات کو اللہ تعالیٰ ان پر مسلط کر دے گا۔

نادیہ گل نادی سیال...... مخدوم پور

ذرا سی مسکراہٹ

ایک شخص نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ "آقا اس دنیا میں خدا کو ڈھونڈا جائے تو کہاں پر نظر آئے گا۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "فجر کی نماز پڑھ کر مسکراتے ہوئے اپنی ماں کی طرف دیکھو گے تو اس میں خدا کی جھلک نظر آئے گی" سبحان اللہ۔

زندگی...... شاہ نکڈر



خوشبوئے سخن

نوشین اقبال نوشی
(انعام یافتہ)

غزل

زندگی کو برت کر اس کے راز سے واقف ہوئے
میں خاموش ہوں تو ہر آواز سے واقف ہوئے
سر اٹھا کر اڑتے پنچھیوں کو دیکھنا تھا آساں
خود پرواز کی تو کرب پرواز سے واقف ہوئے
مجھے دکھ و خوشی کی موسیقی میں نہ تھی تمیز
خود پر گزری تو دونوں کے ساز سے واقف ہوئے
مجھ پر لوگ ہنستے ہنستے کر جاتے طنز بہت
میں ناداں کب ریاکارہ الفاظ سے واقف ہوئے
لہجے میں پیار دل میں ہر شخص عداوت رکھتا
بہت دیر بعد میں اس شہر کے انداز سے واقف ہوئے
دور رہ کر نہ جان سکی اس کی فطرت
قریب رہ کر ہم اس دغاباز سے واقف ہوئے
ابتدا میں ہی تو نے انجام اپنا دکھا دیا
اے محبت میں کب تیرے آغاز سے واقف ہوئے
دو قدم چلی تو وہ چار قدم چل کر آیا فرح
ہم اب جا کر اپنے رب کارساز سے واقف ہوئے

فرح بھٹو (حیدرآباد)

غزل

کاغذ پہ تیرا نقش اتارا نہیں گیا
مجھ سے کوئی خیال سنوارا نہیں گیا
مل کے لگا ہے آج زمانے ٹھہر گئے
تجھ سے بچھڑ کے وقت گزارا نہیں گیا
طوفاں میں بھی ڈوب نہ پائی مری انا
ڈوبا، مگر کسی کو پکارا نہیں گیا
خوشیوں کے قہقہے ہیں ہر اک سمت گونجتے
لگتا ہے کوئی شہر میں مارا نہیں گیا
انسان وحشیوں کی طرح ہیں کہ آج تک
مفہوم زندگی کا ابھارا نہیں گیا
آرائش جمال کسی کام کی نہیں تارا
روئے عمل کو جبکہ نکھارا نہیں گیا

طاہرہ جبین تارا

آنکھیں تیری منتظر ہیں

ابھی سبز رت
میرے آنگن میں ٹھہری ہے
اور وقت کے ہاتھوں کی پوروں میں ہے
ابھی سارے جذبے جواں ہیں
اور آنکھیں تیری منتظر ہیں
ابھی شام آئی نہیں
اور پاؤں بھی ٹھہرے ہوئے ہیں
ابھی لوٹ آؤ کہ پھر تم شاید
کہاں جانے رستوں پر پتھر سی آنکھیں
کسی من چلے کی جبیں پر ملیں

انتخاب: جاوید احمد صدیقی (راولپنڈی)

منتظر پنچھی

یادوں کی منڈھیر پہ بیٹھا
آس کا پنچھی
کب کا اڑ چکا ہوتا
زرکے جنگل سے دور
بے بسی کے ویران میناروں پر
بسیرا کر چکا ہوتا
گر، اس کو یقین نہ ہوتا
تیرے لوٹ آنے کا
تیرے پیار کے پربت میں
ڈوب کے امر ہو جاتا

پرویز احمد دولو (میاں چنوں)

غزل

میں ہواس باختہ ہوا جاؤں
تری ہی سمت بڑھا جاؤں
بدن تیرا ہے کہ ریشم جیسے
جی چاہے اس میں سما جاؤں
چند لمحات کا مختصر قصہ
جو اذان ہو سنا جاؤں
تو ہوا جائے غیر کا
اسی صدمے سے گرا جاؤں

مرا چاند کھو گیا زید
میں لا پتا سا ہوا جاؤں
رانا محمد زید...... (فیصل آباد)

اب کے تو چاند بھی جا اترا غیر کے گھر
ورنہ مقدر میں حسن اندھیرا کبھی نہ تھا
ایم حسن نظامی (قبولہ شریف)

زندگی

سڑکوں پر چلتی رواں دواں
یہ زندگی
خمیدہ کمر جھکے ہوئے کندھے
مزدوری کے لیے سرگرداں و پریشان
معصوم کھلتے گلاب چہرے
حسرت و یاس کی تصویر بنے
بوڑھے اور بے نور چہرے
اپنے ہاتھوں کو پھیلائے
سڑکوں پر چلتی رواں دواں
یہ زندگی
کاروں میں شوفرز کے پیچھے
اکڑی گردنوں والے لوگ
مہنگے جوتے، مہنگے لباس پہنے
کچھ لوگ جن کے چہرے
امپورٹڈ چیزوں سے چمک رہے ہیں
سب رواں دواں ہیں
اپنی اپنی منزل کی طرف گامزن
اپنے اپنے دکھوں کی صلیب اُٹھائے
اپنی اپنی خوشیوں و مسرتوں کے سنگ
ریحانہ سعیدہ (لاہور)

غزل

وعدے کی زنجیر سے وہ بندھا کبھی نہ تھا
میں اس کا تھا مگر وہ میرا کبھی نہ تھا
شناسائی تھی تو بس اتنی سی اس سے
وہ مجھے دیکھتا تھا پر ٹھہرا کبھی نہ تھا
گمنام تھے جو وہ سر عام آ گئے
اس طرح سے ان کا چرچا کبھی نہ تھا
کیسے میرے آنگن کو وہ روشنی دیتا
وہ شام کا ایک پہر تھا سویرا کبھی نہ تھا
ہمیں تو اپنی ہی محبت لے ڈوبی صنم
غموں نے ورنہ ہم کو گھیرا کبھی نہ تھا

اردو ماہیے

سپنوں میں چلے آتے
برہا کے ماروں کو صورت ہی دکھا جاتے
گندم کی بالی ہے
حسن کے مکھڑے پر تیرے نام کی لالی ہے
خوابوں کی حویلی ہے
پریم جھروکے میں دلہن بھی اکیلی ہے
باغوں میں گل بوٹے
جو عشق میں گوندھی ہو اس مہندی کا رنگ نہ چھوٹے
کوئی چوڑی بانہوں کی
محلوں کے تم باسی ہم خاک ہیں راہوں کی
کھیتوں میں کھلی سرسوں
برسوں سے نہیں آئے جو کہتے تھے کل پرسوں
گل کھل گئے راہوں میں
یہ دل نے دی گواہی تو آئے گا بانہوں میں
محمد سلیم اختر (راولپنڈی)

گواہی

وہ سیڑھی جو مرے دل سے
تمہارے دل کے گنبد پر اترتی ہے
شکستہ ہے
وہ کھڑکی جو تمہارے گھر میں کھلتی ہے
مری پہچان اور مکڑی کے جالوں سے اٹی ہے زنگ خوردہ ہے
گواہی دے نہیں سکتے نہ وہ
لیکن مرا اک کام تو کر دو
مری پہچان میں
الجھے ہوئے مکڑی کے سب جالے
مجھے دے دو
کوئی تو ہو
جو مجھ کو میرے ہونے کی گواہی دے
شاعرہ: منصورہ احمد
انتخاب: فیاض علی شاہ (فرینکفرٹ جرمنی)

کس کارن؟

یہ جلوہ نمائی کس کارن، دیوار اٹھائی کس کارن
اب بیچ ہمارے دونوں کے ہے یار جدائی کس کارن
ہر لحظ نظر کے صحرا میں ہر ذرہ ہی مثل لیلیٰ ہے
گھر لوٹ چلو اب اے مجنوں یہ حال سودائی کس کارن
جب خواب جلے تھے سارے ہی ہم راکھ ہوئے تھے تب جل کے
اب آنکھ کے ٹھہرے پانی میں پھر آگ لگائی کس کارن
جب عہد تمہارے کی شیریں رسموں کے سمندر میں ڈولی
پھر کاٹ کر تو نے پتھر کو یہ نہر چلائی کس کارن
کب رہنا ہے سدا بندے نے جب دنیا ساری فانی ہے
عامر دو دن کے لیے پھر تو نے عمر گنوائی کس کارن
عامر زمان عامر (بورے والا)

غزل

دیکھے ہیں جو غم دل سے بھلائے نہیں جاتے
اک عمر ہوئی یاد کے سائے نہیں جاتے
آنکھوں سے خبردار کہ آنکھوں سے نہ نکلیں
گر جائیں یہ موتی تو اٹھائے نہیں جاتے
ہم بھی شب گیسوؤں کے اجالوں میں رہے ہیں
کیا کیجیے دن پھیر کے لائے نہیں جاتے
شکوہ نہیں سمجھائے کوئی چارہ گروں کو
کچھ زخم ہیں ایسے کہ دکھائے نہیں جاتے
فلک غم دل کے چراغوں کی ہے کیا بات
اک بار جلا دو تو بجھائے نہیں جاتے
فلک شیر (رحیم یار خان)

غزل

نیندیں اپنی گنوانا بنتا ہے
آپ کا دل چرانا بنتا ہے
ہم نے کتنوں کو نازنیں ہے کہا
آپ سے پر نبھانا بنتا ہے
ایک تحریک مانگے ہے الفت
آپ کا آنا جانا بنتا ہے
ملنے آؤں چاندنی شب میں
یہاں تو لڑکھڑانا بنتا ہے
نظر آئے ہیں پھر سے کچھ جھلا
راہ کو چھوڑ جانا بنتا ہے
آنکھ میں رک گئے ہیں قطرے سے
اب تیرا مسکرانا بنتا ہے
دھوپ ہم نے کمائی سارا دن
چاند کا اب تو آنا بنتا ہے
جاوید اقبال (فیصل آباد)

غزل

میری زندگی تو فراق ہے، وہ ازل سے دل میں مکیں سہی
وہ نگاہ عشق سے دور ہیں، رگ جاں سے لاکھ قریں سہی
ہمیں جان دینی ہے ایک دن، وہ کسی طرح وہ کہیں سہی
ہمیں آپ کھینچئے در پر، جو نہیں کوئی تو ہم ہی سہی
سر طور ہو سر حشر ہو، ہمیں انتظار قبول ہے
وہ کبھی ملیں وہ کہیں ملیں، وہ کبھی سہی وہ کہیں سہی
نہ ہو ان پر میرا بس نا سہی، کہ یہ عاشقی ہے ہوس نہیں
میں انہی کا تھا میں انہی کا ہوں، وہ میرا نہیں تو نہ سہی
جو ہو فیصلہ وہ سنایئے، اسے حشر پر نہ اٹھایئے
جو کریں گے آپ ستم وہاں، وہ ابھی سہی وہ یہیں سہی
اسے دیکھنے کی جو لو لگی، تو نصیر دیکھ ہی لیں گے ہم
وہ ہزار آنکھ سے دور ہو، وہ ہزار پردہ نشیں سہی
شاعر پیر نصیر الدین نصیر
انتخاب: انصر علی (ساہیوال، پنجاب)

نظم

کہاں مسکرائی ادا سے
کہاں رائحہ آئی ہوا سے
کہ دل درد سے کہہ رہا ہے
ہے آرام اس کی دعا سے
کہاں وہ کہ ہم کو ملے وہ
ملا ہے اسی کی عطا سے
اسی کے لئے سارا گھر ہے
مہک گل اٹھا ہے ہوا سے
مرا لے کے مصرع کھڑی ہے
لکھا ہے لہو سے طلا سے
کہ دل کے کہو حکمراں سے
رہے حاکم دل سدا سے
کہ مسرور ہوں اس لئے ہی

ہوا ہے عطا وہ سما سے
مرا مرسلہ دے دے کوئی
کہ اک لوٹ آئے صدا سے
ملے درد ہی درد ہم کو
کہاں ہے سکوں اس دوا سے
کہاں لوٹ کر آئے ساحل ؟
کھلا ہے مرا در ہوا سے
ساحل فخر (لیہ)

غزل

میانِ دل جو یہاں راستہ بنا ہوا ہے
ترے لیے ہی تو سارا نیا بنا ہوا ہے
جہاں کسی کو بھی خاطر میں کوئی لاتا نہیں
ہمارا ہونا وہاں واقعہ بنا ہوا ہے
وہ جس کے نور سے روشن ہیں انفس و آفاق
وہی چراغ مرا آئینہ بنا ہوا ہے
لگا کے رنگ مجھے تتلیاں بناتا ہوا
وہ بوئے گل سے ہوا، مایوا بنا ہوا ہے
سنہری باغ کا رستہ دکھا رہا ہے مجھے
بدن پہ پھول جو اس کے ہرا بنا ہوا ہے
یہ کس نگاہ سے دیکھا ہے تو نے اس دل کو
چمک دمک کا نیا سلسلہ بنا ہوا ہے
مرے لئے ہے معطر قدیم خوشبو سے
وہ ایک گل کہ جو بوسہ نما بنا ہوا ہے
خدا ہی پوچھے گا اس سے برائے خلقِ خدا
جو ایک شخص زمیں پر خدا بنا ہوا ہے
غلام و شاہ کا اک کھیل کھیلنے کے لئے
وہ بادشاہوں میں سب سے بڑا بنا ہوا ہے
یہ آدمی ہے جو انسان تھا کبھی پہلے
بنایا گیا تھا اسے اور کیا بنا ہوا ہے
سوائے اس کے بھلا کیا ہے واقعہ سارا
ہمارا صبر کسی کی رضا بنا ہوا ہے
بنا ہے اشک کسی آنکھ میں یہ دل کامی
جگر کا خوں کہیں رنگِ حنا بنا ہوا ہے
سید کامی شاہ (کراچی)

خوش بو کا سفر

خوشبو کے سفر میں رات کی رانی
تنہا اداسی مسافتیں ناپتی
دہکتے گالوں پہ لئے چل رہی تھی
رقص شبنم میں آہ و فغاں کے نالے
تنہائی کے ڈر میں گھل رہی تھی
دکھ ہر شاخ سے لپٹا تھا
سیہ راتوں کی آسیب زدہ خاموشی
جڑوں سے جنوں تک پھیلی تھی
زمین کی نمی سے صبا کی لے تک
خوشبو غموں کے سفر میں تھی
سفر کے جس میں ہنسی نہ آئے
غم جو متوجہ تو کریں
مگر soul mate کا شانہ نہ پائیں
زہریلا پھن پھیلائے ناگ پاس بیٹھا
ہر پتے سے ہوس کا جام بھر رہا تھا
دن کو صبا اس کے آنسوؤں کو پی کر
فضا کی سنگت میں ماتم منا رہی تھی
روز سفرِ خوشبو میں فنا ہوتی
رات کی رانی کا نوحہ سنا رہی تھی
پاس ہی دن کا راجہ آن سے
ناامیدی کے چہرے مرائے پھول لئے
بے ثمر انا کا بوجھ سنبھالے ہوئے
اپنے پورے پاں پہ شان سے کھڑا تھا
مریم جہانگیر (اسلام آباد)



آخری قسط

فلسطین

الماس ایم اے

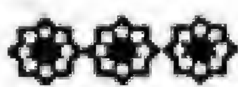
بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ اول' وہ شہر جہاں ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ والہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے۔ وہ شہر جسے سیکڑوں نبیوں نے اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر چنا۔ وہ شہر جو تین مذاہب کے ماننے والوں کے لیے مقدس ترین ہے۔

اسی تاریخی شہر کے پس منظر میں لکھا جانے والا ایک ایسا ناول جسے آپ بار بار پڑھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

الماس ایم اے کے قلم سے تاریخی کہانیاں پسند کرنے والوں کے لیے بطور خاص۔



قیصران بھی جذباتی ہو گیا۔ اس نے جذبات سے پُر بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔
"تم میری ہو جوزی...... میں تمہیں ساتھ لے کر چلوں گا۔"
جوزیفائن نے جلدی سے قیصران کو چھوڑ دیا اور کہا۔ "نہیں قیصران...... میں ابھی تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔"
قیصران کو جوزی کی ایک دم تبدیلی سے تعجب ہوا۔ اس نے پوچھا۔ "کیوں جوزی! تم ابھی کیوں نہیں جا سکتیں؟ تم خود ہی تو اس جہنم سے نکلنا چاہتی ہو۔"
جوزیفائن نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ شہزادہ پلیوگس اسے ڈھونڈتا ہوا راہداری تک پہنچ چکا تھا۔
جوزی نے منہ پھیر کر قیصران سے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔"
جوزی باہر جانا چاہتی تھی مگر قیصران نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر جھک کر اسے بوسہ دیا اور بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"کب آؤ گی جوزی......؟"
جوزی نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور بولی۔ "قیصران! میں نے چار سال تمہارا انتظار کیا ہے۔ کچھ دن تم بھی انتظار کرو۔ شہزادہ دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ اسے میں نے چھوٹے بھائی بلکہ بیٹے کی طرح پالا ہے۔ ملکہ بھی اس کی دشمن ہے۔ جس دن میں نے محسوس کیا کہ شہزادہ اپنی حفاظت کر سکتا ہے اسی گھڑی میں محل چھوڑ دوں گی۔"
جوزیفائن جانے لگی تو قیصران نے اسے خدا حافظ کہا۔
جوزیفائن نے مسکرا کر قیصران کو دیکھا۔ پھر راہداری کی طرف چلی گئی۔ قیصران نے جھانک کر دیکھا۔ جوزیفائن شہزادے کو اس طرح گھسیٹ رہی تھی جیسے ماں اپنے شریر بچے کو کھینچتی ہے۔
قیصران اس اتفاقیہ ملاقات پر بہت خوش تھا۔ اگرچہ ملاقات مختصر تھی لیکن قیصران کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔
پس جب قیصران بستر پر لیٹا تو اس نے اپنی اس ملاقات کو اپنے ذہن میں ترتیب دینا شروع کیا تاکہ کوئی بات رہ نہ جائے۔ قیصران اور جوزی دونوں ہی حد درجہ جذباتی تھے۔ اس وقت کی گفتگو سے قیصران کو یہ اندازہ ضرور ہوا کہ جوزی کا یہ کہنا بڑی حد تک درست معلوم ہوتا تھا کہ اسے محل میں کوئی خاص مقام حاصل ہے اور اس کا مقام ملکہ اینا سے کسی طرح کم نہیں۔ جوزی محل میں کس طرح پہنچی تھی؟ اس بارے میں کوئی بات واضح نہ ہوئی تھی مگر یہ بات درست تھی کہ ولی عہد شہزادے کی پرورش اور نگہداشت جوزی کے سپرد تھی۔ جوزی کی باتوں سے قیصران کو یہ بھی یقین ہو گیا کہ ملکہ اینا کا کردار نہ صرف یہ کہ داغ دار تھا بلکہ اس عورت سے کسی قسم کی مدد یا وفا کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ کیونکہ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو حصولِ مطلب کے لیے بڑے سے بڑا قدم بھی اٹھا سکتی تھیں۔
قیصران کی سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی کہ جوزیفائن اس وقت اس کے ساتھ کیوں نہیں جانا چاہتی۔ جوزیفائن نے شہزادے کی زندگی بچانے کے لیے ضرور سخت انتظامات کیے ہوں گے۔ پس اس کا یہاں سے جانا شہزادے کی ہلاکت کا باعث بن سکتا تھا۔
پس قیصران نے آگے سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور سونے کی کوشش کرنے لگا تاکہ تازہ دم ہو کر صبح قسطنطنیہ کی ملکہ سے گفتگو کر سکے۔



کنا کوزین بازنطینی سلطنت کا ایک طاقت در

سردار تھا۔ یہ شخص ایک انتہائی شاطر اور مفاد پرست انسان تھا۔ سلطنت کے دوسرے امیر وزیر اسے پسند نہ کرتے تھے بلکہ اس کے خوف سے زبان تک نہ ہلا سکتے تھے۔ شہنشاہ اینڈ رونیکس کی زندگی ہی میں کوزین حکومت کے سیاہ وسفید کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ شہنشاہ اس پر بڑا اعتماد کرتا تھا لیکن وہ در پردہ شہنشاہ کی جڑیں کاٹنے میں مصروف رہتا تھا۔ اس نے ملکہ اینا کو ہاتھوں میں لے لیا تھا اور ملکہ اور کوزین کے تعلقات بڑھتے بڑھتے ناجائز حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ کوزین کی بیشتر راتیں ملکہ اینا کی خواب گاہ میں گزرتی تھیں۔ ان رنگین راتوں کی داستان محل کی کنیزوں اور غلاموں کی زبانوں پر تھیں لیکن وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی خاموش رہتے تھے۔

اینڈ رونیکس سوم کی وفات پر کوزین نے اپنے شہنشاہ بننے کا ڈول ڈالا مگر اسے بازنطینی سرداروں کی مخالفت کا شدید سامنا کرنا پڑا۔ ان تمام سرداروں کی سرغنہ اور سردار اعلیٰ جوزیفائن تھی۔ جوزیفائن کہنے کو تو شہزادہ پلیوگس کی آیا اور اتالیق تھی لیکن تمام سردار اس پر مکمل اعتماد کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ شاہی محل میں اگر شہزادے کی حفاظت کوئی کر سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف جوزیفائن ہے۔ جوزیفائن گزشتہ چار سال سے شہزادے کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ جس وقت جوزیفائن شاہی محل میں پہنچی۔ شہزادے کی عمر مشکل سے آٹھ سال تھی۔ جوزیفائن نے بڑی محبت اور محنت سے شہزادے کی نگہداشت کی اور اس کی جان کی حفاظت کی تھی ورنہ کنگا کوزین نے شہزادے کو اپنے راستے سے ہٹانے کی کئی بار کوشش کی تھی لیکن جوزیفائن کی وجہ سے اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

جوزیفائن نے کنگا کوزین کا شہنشاہ بننے کا خواب تو شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا مگر ملکہ اینا کی کوشش اور بعض مفاد پرست سرداروں کی سازش سے کوزین، شہزادے کا والی مقرر کیا گیا لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور آخر کار کوزین نے مجبور ہو کر علم بغاوت بلند کر دیا تھا اور بازنطینی حکومت کے نصف حصہ پر قبضہ کر لیا۔ جوزیفائن کا کوزین سخت مخالف تھا اور اسے اپنے راستے کا کانٹا سمجھتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد وہ جوزیفائن کو عبرت ناک سزا دے گا۔ ملکہ اینا کو بھی جوزیفائن سے نفرت تھی لیکن جوزیفائن کو شہزادہ اپنی سگی ماں سے زیادہ عظیم سمجھتا تھا اور سلطنت کے بہی خواہوں نے جوزیفائن کو قصر شاہی کا پورا کنٹرول دے رکھا تھا۔

صبح کو قیصران بیدار ہوا تو ملکہ کا پیغام آ گیا۔ وہ نہا دھو کر تیار ہوا اور ایک یونانی کنیز کی راہبری میں ملکہ اینا کی خواب گاہ کے برابر والے کمرے میں پہنچا جسے ملکہ نے ملاقات کا کمرہ بنا رکھا تھا۔ اس ملاقاتی کمرے کی جگمگاہٹ سے قیصران کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ ہر چیز بے نظیر اور لاجواب تھی۔ قد آدم آئینہ کے فریم پر جواہرات جڑے گئے تھے۔ میز پر سونے کے گلاس اور صراحیاں چنی ہوئی تھیں۔

قیصران جو چیز دیکھتا تو دیکھتا رہ جاتا۔ ابھی اس نے تمام چیزوں کا سرسری جائزہ بھی نہ لیا تھا کہ سامنے کا دروازہ کھلا اور شہنشاہ قسطنطین کی بیوہ ملکہ اینا شاہانہ کروفر کے ساتھ کنیزوں کے جلو میں داخل ہوئی۔ ملکہ اینا کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ بناؤ سنگھار سے وہ دلہن نظر آتی تھی۔ اپنے بیش قیمت شاہی لباس میں جب وہ ہاتھ ملانے کے لیے قیصران کی طرف بڑھی تو قیصران کو یوں محسوس ہوا جیسے حسن وامارت کا ایک سمندر موجیں مارتا ہوا اس کی طرف آ رہا ہے۔ قیصران ملکہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ ایک تو ملکہ کا بیش قیمت شاہانہ لباس، اس پر ملکہ کی موہنی صورت،

چنانچہ قیصران کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی پرستان میں آ گیا ہو۔

قیصران نے کوشش کر کے جلد ہی خود پر قابو پالیا اور ملکہ اینا کے حضور آداب پیش کیا۔ ملکہ نے بھی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ قیصران کچھ جھجکا۔ مگر آدابِ شاہی کا خیال آتے ہی اس نے اپنا ہاتھ ملکہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ ملکہ نے قیصران کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ سے دبایا اور مسکرانے لگی۔ تمام کنیزیں بھی مسکرا دیں۔ پھر تو جیسے گلستان کھل گیا۔ شوخ و شنگ کنیزوں نے مسکراہٹوں اور دبے دبے قہقہوں کی بارش شروع کر دی۔

ملکہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ قیصران ہوش میں ہونے کے باوجود بوکھلایا سا ایک ایک کا منہ دیکھ رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ حسینوں کے اس حسن بے محابا اور شاداب پر جوانیوں کی تپش سے بوکھلا گیا تھا یا پھر اس کی نظریں کسی اور جمال جہاں آراء کو تلاش کر رہی تھیں۔

ملکہ نے اپنی زرنگار کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔ اس وقت ملکہ کا رخ قیصران کی طرف تھا۔

''خوب رو ترک زادے! تمہارا نام کیا ہے؟''

''قیصران ملکہ محترمہ!'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

ملکہ نے قیصران کو گھورا اور کہا۔ ''لیکن قیصران تمہارے چہرے کے نقوش ترکوں سے زیادہ نصرانی وجاہت کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ محض اتفاق ہے یا اس کی کوئی وجہ اور ہے؟''

قیصران کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اسے پہچان لیا گیا ہے۔ پھر بھی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی اصلیت ہرگز ظاہر نہ ہونے دے گا۔ پس اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اسے محض اتفاق کہا جا سکتا ہے ملکہ عالیہ!''

''عثمانی سلطان کے حرم میں نصرانی بیگمات کی تعداد کتنی ہے؟'' یہ ملکہ اینا کا دوسرا چبھتا ہوا سوال تھا۔

قیصران کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس لیے اس نے جواب دینے کی بجائے خاموشی کا سہارا لیا اور سر جھکا لیا۔

ملکہ کو کوئی جواب نہ ملا تو اس نے ایک لمحہ انتظار کے بعد خود ہی کہا۔

''قیصران! دراصل ہم سلطان سے دوستی کے خواہش مند ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ سلطان بڑے صاحبِ نظر ہیں پس ہم جو تحفہ ان کی خدمت میں پیش کریں گے امید ہے کہ سلطان اسے ضرور پسند فرمائیں گے۔''

''ملکہ عالیہ......'' قیصران نے احتجاج کرنا چاہا مگر ملکہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ ملکہ نے قیصران سے کہا۔

''قیصران! یہ بات آدابِ شاہی کے خلاف ہے کہ ملکہ کی بات درمیان میں کاٹ دی جائے۔ تمہیں اس وقت تک خاموش رہنا چاہیے جب تک ہم اپنی بات مکمل نہ کر لیں۔ ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ ہمارے محل میں جوزیفائن نام کی ایک ایسی حسینہ موجود ہے جس کے حسن کو دیکھ کر چاند بھی شرماتا ہے۔ ہم یہ تحفہ ''سلطان ترکی'' کے حضور پیش کرنا چاہتے ہیں۔''

پھر ملکہ نے قیصران کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ہم اپنی بات مکمل کر چکے ہیں۔ اب تم جو کہنا چاہتے ہو۔ وہ کہہ سکتے ہو۔''

قیصران کے پاس اب کہنے کو کیا رہ گیا تھا؟ وہ انتہائی حواس باختہ ہو گیا تھا۔ ملکہ اینا کس قدر چالاک تھی۔ وہ جوزیفائن سے پیچھا چھڑانے کے لیے کتنی گہری سازش کر رہی تھی۔

''بے چاری جوزیفائن۔'' قیصران نے دل میں کہا۔ اسی وقت ملکہ کی آواز پھر ابھری۔

''ترکی سفیر ہماری حسین پیش کش سے سوچ میں پڑ گئے۔ کیا ہمارا تحفہ سلطان کے شایان شان نہیں؟''

قیصران کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ ملکہ اینا کی پیش کش دراصل جوزیفائن سے پیچھا چھڑانے کی ایک سازش تھی یا وہ خود اس سے سودے بازی کر رہی تھی۔ چنانچہ اس نے سنبھل کر کہا۔

''اے ملکہ! تحفہ کا تو وہ فیصلہ کر سکتا ہے جسے تحفہ دیا جاتا ہے۔ آپ کا تحفہ میرے لیے نہیں ہے۔ اس لیے میں اس سلسلے میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔''

ملکہ اینا نے کرسی پر پہلو بدلا اور اس کے چہرے پر فتح کی سرخی چھلک پڑی۔ وہ نرم لہجے میں بولی۔

''قیصران! ہم تمہارے مرتبے سے واقف ہو چکے ہیں۔ تم دولت عثمانیہ کے ان سرداروں میں ہو جنہیں سلطان کی قربت حاصل ہے۔ اس لیے تم جیسی عظیم ہستی کے لیے بھی ہم جوزیفائن کا تحفہ پیش کر سکتے ہیں۔''

ملکہ کی بات ختم ہوتے ہی قیصران نے سوال کیا۔

''اگر میں یہ تحفہ قبول کروں تو مجھے اس کی کیا قیمت ادا کرنا پڑے گی؟'' قیصران نے خالص تاجرانہ انداز اختیار کیا۔ ملکہ اینا نے قیصران کی طرف ایک تیر پھینکا تھا۔ وہ جوزیفائن کے بدلے میں سلطان یا کم از کم اس کے ایک اعلیٰ افسر کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتی تھی۔ پس یہ سودا اسے کسی طرح مہنگا نہ تھا۔ ملکہ نے کہا۔

''قیمت نہیں بلکہ خدمت۔ فوجی مدد کے معاوضے میں ہم سے نقد رقم قبول کی جائے۔''

قیصران ملکہ کی مکاری خوب سمجھ رہا تھا۔ سلطان ترکی اورخان نے چلتے وقت قیصران کو اشارہ کیا تھا کہ معاوضہ کے لیے زر کے بجائے زمین پر زور دیا جائے مگر ملکہ اینا نقد رقم پر سودا کرنا چاہتی تھی۔

آخر قیصران نے پر وقار لہجے میں کہا۔ ''اگر سلطان ترکوں کے خون کی قیمت نہ لینا پسند کریں تو......؟''

ملکہ کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ ترکوں کو رام کرنا مشکل ہے۔ اس نے ایک لمحہ سوچا پھر بولی۔

''نقد رقم کے علاوہ ہم سلطان کو تحفے میں پچاس کنیزیں بھی دے سکتے ہیں۔ ہاں رقم منہ مانگی دی جا سکتی ہے۔''

قیصران نے دیکھا کہ ملکہ زمین کی بات گول کر گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی علاقہ یا قلعہ دینے پر آمادہ نہیں۔ ہاں نقد رقم دینے پر تیار ہے۔''

''اگر رقم کا اندازہ بتایا جائے تو سلطان کو رضا مند کرنے میں زیادہ آسانی ہو سکتی ہے۔'' قیصران ہر بات کر لینا چاہتا تھا۔

''دس ہزار دوکات (دینار کے برابر)'' ملکہ فوراً بول پڑی۔

یہ بات صاف ہوئی تو قیصران نے دریافت کیا۔

''کوزین کے فتنے کو ختم کرنے کے لیے کتنی فوج کی ضرورت ہوگی۔''

''ملکہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''تیس ہزار کا لشکر کافی ہوگا۔''

قیصران کو ہنسی آ گئی۔ وہ بولا۔ ''اگر ملکہ گستاخی معاف فرمائیں تو میں یہ کہوں گا کہ تیس ہزار ترک لشکر سے تو بلقان کی تمام ریاستوں کو بڑی آسانی سے فتح کیا جا سکتا ہے۔ ملکہ نے ترک لشکر کی طاقت کا شاید غلط اندازہ لگایا ہے۔''

ملکہ شرمندہ ہو گئی۔ اس کو کیا، تمام یورپی ممالک کو ترکوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کا صحیح اندازہ نہ تھا۔

آخر ملکہ نے بے بسی سے پوچھا۔ ''قیصران!

اگر ہمارا اندازہ غلط ہے تو تمہارے خیال میں کتنا لشکر کافی ہوگا۔"

قیصران کو بازنطینیوں کی صحیح طاقت کا اندازہ لگانے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ پس اس نے معصومیت سے پوچھا۔ "کنطا کوزین کے پاس کتنا لشکر ہے؟"

"ہماری اطلاع کے مطابق پچیس تیس ہزار۔" ملکہ نے جواب دیا۔

"آپ کی فوجی طاقت کتنی ہے؟" قیصران نے اس انداز میں پوچھا جیسے یہ کوئی اہم بات نہ تھی۔ حالانکہ یہ ایک اہم راز تھا جس کے افشا ہونے سے جنگ کا نقشہ بدل جایا کرتا ہے۔

مگر ملکہ نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور بولی۔ "اتنی ہی فوج ہمارے پاس بھی ہے۔"

قیصران کے لیے گفتگو ختم ہو چکی تھی۔ اسے اہم باتیں معلوم ہو گئیں۔ ملکہ کی خواہش، جوزیفائن کے بارے میں نئی سازش، فوجوں کی تعداد، ملکہ کے پرمسرت شب و روز غیرہ وغیرہ۔

قیصران کی روانگی سے پہلے ملکہ اینا نے اس کے اعزاز میں دوپہر کو ایک شان دار ضیافت کا اہتمام کیا جس میں مرحوم شہنشاہ کی تمام جائز و ناجائز بیگمات اور شہزادیوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ کنیزوں کی فوج ظفر موج اس کے علاوہ تھی۔ چنانچہ دعوت ہوئی اور بڑی شان دار ہوئی۔

ضیافت کے بعد رقص و نغمہ کی محفل گرم ہوئی۔ چونکہ یہ محفل قیصران کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی اس لیے وہ رقص و نغمہ کی محفل سے اپنا دامن نہیں بچا سکا۔ قیصران کو اپنے وطن کے نغمے سن کر بڑی فرحت ہوئی۔ ایک دیہاتی رقص سے تو وہ اس قدر محظوظ ہوا کہ بے ساختہ اس کے منہ سے تحسین اور آفریں کے وہ کلمات نکلے جو قسطنطنیہ کے نصرانی خوشی کے موقع پر ادا کرتے تھے۔ قیصران کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ لیکن سازوں کے شور میں اس کی آواز دوسروں کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔

ضیافت اور محفل رقص و سرود دونوں ہی خوب تھیں لیکن اس تمام عرصہ میں قیصران کی نظریں بھٹکتی رہیں اور کسی کو تلاش کرتی رہیں۔ آخر وہ نظر آ گئی جس کا انتظار قیصران کو تھا۔ جوزیفائن محفل میں کیا آئی جیسے چاند نکل آیا اور ستاروں کی روشنی ماند پڑ گئی۔ جوزیفائن کے مقابلہ پر بیگمات اور شہزادیوں کا حسن پھیکا پڑ گیا۔ قیصران دوسروں کی نظریں بچا کر جوزیفائن کو دیکھ رہا تھا مگر جوزیفائن قصداً نظریں چرا رہی تھی۔

ایک بار ملکہ اور قیصران کی نظریں ملیں تو ملکہ مسکرائی پھر اس نے سر گھما کر جوزیفائن کو اس انداز میں دیکھا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ قیصران تم بھی جوزیفائن کو دیکھ لو جسے ہم تمہیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ قیصران ملکہ کا اشارہ سمجھ گیا لیکن اس نے جوزیفائن کی طرف نظر نہ کی۔

قیصران جانے سے پہلے ایک بار جوزیفائن سے ملنا چاہتا تھا لیکن کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس سے زیادہ جوزیفائن بااختیار تھی۔ وہ اگر چاہتی تو قیصران سے کسی نہ کسی بہانے مل سکتی تھی۔ قیصران یہی سوچ کر صبر کر گیا۔

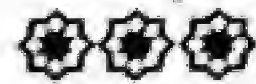
محفل برخاست ہونے کے قریب تھی۔ بیگمات اور شہزادیاں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اسی وقت جوزیفائن تیزی سے قیصران کے قریب آئی اور آہستہ سے قیصران کے کان میں کچھ کہا۔

تھیوڈور کی فتح

ان الفاظ کے پیچھے کچھ اور الفاظ بھی تھے مگر جوزیفائن جس تیزی سے آئی تھی اسی تیزی سے

دوسری طرف نکل گئی۔

قیصران کے لیے تھیوڈور کا نام بالکل نیا تھا۔ تھیوڈور سے جوزیفائن کا کیا مطلب تھا۔ اور یہ تھیوڈور کس چڑیا کا نام ہے؟ جنگ تو ملکہ اینا اور کنٹا کوزین کے درمیان ہو رہی تھی۔ "تھیوڈور" کہاں سے بیچ میں آ گئی۔ بہت غور کرنے کے بعد بھی قیصران کی سمجھ میں کچھ نہ آ سکا۔ آخر قیصران نے تنگ آ کر اس جملے کو ذہن سے نکال دیا۔ وہ خواہ مخواہ ان معموں میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔



سلطنت عثمانیہ کا سلطان اورخان دربار خاص میں امراء اور وزراء سے گفتگو میں مصروف تھا۔ اس کو قیصران کے واپس آنے کی اطلاع دی گئی تو اس نے دربار برخاست کیا اور قیصران کو تخلیہ میں طلب کیا۔

قیصران، سلطان کے سامنے حاضر ہو کر تسلیم بجا لایا۔ سلطان نے مسکرا کر پوچھا۔ "ملکہ اینا کا کیا حال ہے؟"

قیصران نے ادب سے جواب دیا "ملکہ میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ کنٹا کوزین کو شکست دے سکے۔"

"کتنی فوج کی خواستگار ہے ملکہ؟" سلطان نے دریافت کیا۔

"ملکہ نا تجربہ کار ہے اور خوف زدہ بھی۔ وہ بہت بڑا لشکر چاہتی ہے لیکن اس غلام کا خیال ہے......"

قیصران کہتے کہتے ایک دم رک گیا۔ اسے خیال گزرا کہ کہیں وہ سلطان کے حضور گستاخی تو نہیں کر رہا۔ کیونکہ سلطان نے اس کا خیال نہیں پوچھا تھا۔

سلطان نے قیصران کو سہارا دیا۔ "قیصران! گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہارا خیال بھی سننا چاہتے ہیں۔ تمہیں وہاں بھیجنے کا مقصد یہی تھا کہ ہمیں صحیح حالات کا علم ہو سکے۔"

قیصران کو حوصلہ ہوا۔ وہ بولا۔ "اگر چھ سات ہزار عثمانی لشکر ملکہ کو بھیج دیا جائے تو کنٹا کوزین کی بغاوت کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔"

"اور اگر اتنا ہی لشکر کنٹا کوزین کو دے دیا جائے تو وہ کیا کر سکے گا؟"

سلطان کے اس سوال نے قیصران کو الجھن میں ڈال دیا۔ اس کے جانے تک تو کنٹا کوزین کو لشکر دینے کا کوئی ذکر نہ تھا۔ اب سلطان کا اس سوال سے کیا مطلب ہے۔

سلطان نے قیصران کو الجھن میں دیکھا تو نرمی سے کہا۔ "قیصران! تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو صاف صاف کہو۔ ہم تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔"

قیصران کو مجبوراً اپنی رائے پیش کرنی پڑی۔ اس نے کہا۔

"سلطان عالم! عثمانی لشکر کی شجاعت سے ہمارا کوئی دشمن بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر کوزین کو چھ ہزار کا عثمانی لشکر دیا گیا تو وہ آگے بڑھ کر صرف قسطنطنیہ کا محاصرہ کر سکتا ہے اسے فتح نہیں کر سکتا۔"

سلطان نے قیصران کو غور سے دیکھا۔ کچھ سوچا اور پھر کہا۔

"قیصران! تمہارے اندازے میں ضرور حقیقت ہوگی۔ لیکن قسطنطنیہ فتح نہ ہونے کی وجہ تم جانتے ہو؟"

"کیوں نہیں سلطان معظم...... قسطنطنیہ کا محل وقوع ایسا ہے کہ اس پر آسانی سے قبضہ نہیں ہو سکتا۔ ایک طرف بحر اسود اور دو طرف اونچی اونچی پہاڑیاں اس کی قدرتی محافظ ہیں جن سے ٹکرانا خودکشی کے مترادف ہے۔ غلام یہ نہیں چاہتا کہ عثمانی لشکر کا ایک سپاہی بھی بلاوجہ ضائع ہو۔"

سلطان نے دریافت کیا۔ "مدد کی صورت میں کیا پیش کش کی ہے؟"

"ملکہ مدد کی صورت میں دس ہزار دوکات

اور بہت سے غلام اور کنیزیں خدمت اقدس میں پیش کرنے کی خواہش مند ہے۔" قیصران نے ملکہ کی پیش کش دہرادی۔

"کوئی قطعہ زمین؟" سلطان نے دلچسپی سے پوچھا۔

"زمین دینے پر ملکہ آمادہ نظر نہیں آتی۔ ہاں نقد رقم بڑھائی جاسکتی ہے۔" قیصران نے صاف صاف کہہ دیا تاکہ اس پر کوئی الزام نہ رہے۔

سلطان گہری سوچ میں پڑ گیا۔ قیصران کنکھیوں سے سلطان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ آخر سلطان نے سر اٹھایا اور کہا۔

"قیصران! تمہارے آنے سے قبل ہم اسی مسئلہ پر گفتگو کررہے تھے۔ تم جانتے ہو کہ بازنطینی سلطنت کے تمام ایشیائی علاقے سلطنت عثمانیہ کا حصہ بن چکے ہیں۔ اب مسئلہ "داخلہ یورپ" کا تھا۔ کنتا کوزین اور ملکہ اینا کے جھگڑے نے ہمیں یورپ میں پچھلے دروازے سے داخلہ کا سنہری موقع دیا ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ملکہ اینا کے بجائے ہم کنتا کوزین کی مدد کریں۔"

قیصران دم بخود رہ گیا۔ اسے تو خواب میں بھی اس کا خیال نہ تھا۔ یہ فیصلہ اس کے لیے اچانک اور نہایت حیرت انگیز تھا۔ آخر سلطان نے اس کی حیرت دور کردی۔ انہوں نے بتایا۔

"تمہارے جانے کے بعد کنتا کوزین نے بھی اپنی سفارت بھیج کر مدد کی خواہش کی ہے۔ وہ سفارت اب تک ہمارے مہمان خانے میں ہے۔ میں تمہاری واپسی کا انتظار کررہا تھا۔ ملکہ اینا اور کنتا کوزین ہمارے لیے دونوں برابر ہیں۔ ملکہ اینا نے کوئی معقول پیش کش نہیں کی۔ پھر کیوں نہ ہم کوزین کی مدد کریں۔ اس نے نقد رقم کے علاوہ قلعہ زنپ کا مشترکہ کنٹرول......اور بھی کچھ وعدے کیے ہیں۔"

قیصران کیا بولتا۔ کیا جواب دیتا۔ وہ اس فیصلے کی مخالفت کرتا تو کون سنتا؟ اسے کوزین یا ملکہ اینا میں سے کسی سے بھی کوئی ہم دردی نہ تھی۔ دونوں سے ہی اس کا کوئی رشتہ ناتا نہ تھا۔ اور مسلمان ہونے کے بعد تو اس کے لیے وطن کا تصور ہی بدل گیا تھا۔

قیصران کو فکر تھی تو جوزیفائن کی۔ کنتا کوزین اس کا جانی دشمن تھا۔ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد جوزیفائن اس کے ہتھے چڑھ گئی تو اس کا کیا حشر ہوگا؟ یہ سوچ کر ہی قیصران کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

جب تک کنتا کوزین شہزادے کا والی رہا۔ جوزیفائن نے ملکی سیاست میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ اس کی تمام تر توجہ شہزادے کی طرف تھی۔ وہ محل سرا کی ناظم بلکہ مالکہ تھی۔ وہاں اس کا سکہ چلتا تھا۔ جوزیفائن کو ملکہ اینا اور کوزین کے تعلقات سے ضرور چڑ تھی اور اسے یہ بھی خوف تھا کہ کوزین کی عیاش طبیعت کہیں اس پر کوئی مصیبت نہ لے آئے۔ لیکن کوزین کو جوزیفائن پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔

کوزین کی بغاوت کے بعد جوزیفائن کو اور زیادہ محتاط ہونا پڑا۔ اب اسے محل کے علاوہ باہر کی بھی فکر رہتی تھی۔ اسے علم تھا کہ کوزین بدطینت ہے اور وہ جو کچھ بھی کر گزرے وہ کم ہے۔ پھر اس کے ہم درد اب بھی قسطنطنیہ اور محل کے اندر موجود تھے۔ یہ مفاد پرست لوگ ایسے گھلے ملے تھے کی ان کی شناخت مشکل تھی۔ جوزیفائن نے بھی جوابی حملے کے طور پر اپنے آدمی کوزین کے علاقے نیکوٹیکا میں پھیلار کھے تھے۔ کوزین کی فوج اور اس کے خاص ملازموں میں بھی جوزیفائن اور شہزادے کے ہم درد موجود تھے۔ جوزیفائن کو انہی مخبروں کے ذریعہ معلوم ہوا تھا کہ قیصران کے قسطنطنیہ قیام کے دوران کوزین نے بھی

سلطان ترکی سے مدد کی درخواست کی ہے اور سلطان کو زر، زمین کے علاوہ اپنی بیٹی تھیوڈور کو سلطان کے حرم میں داخل کرنے کی پیش کش کی ہے۔ جوزیفائن نے اندازہ کرلیا تھا کہ اتنی بڑی پیش کش کے پیش نظر سلطان، کوزین کی ضرور مدد کرے گا۔ اسی وجہ سے جوزیفائن نے ضیافت کے دوران قیصران کے کان میں کہا تھا کہ "تھیوڈور کی فتح ہوگی۔"

لیکن اس شکست و فتح سے پہلے ہی شاہی محل سرا میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے شاہی محل کے درو بام ہل کے رہ گئے اور خلوص اور اعتماد کے تمام آبگینے چکنا چور ہو گئے۔ جوزیفائن نے احتیاط کے طور پر شہزادے کے لیے الگ باورچی خانہ بنوایا تھا۔ اس نے اس باورچی خانے کے تمام ملازم اپنے اعتماد کے رکھے تھے۔ کھانے کے دوران اس نے یہ انتظام کیا تھا کہ باورچی خانے سے کھانے کی میز تک قدم قدم پر کنیزیں قطار باندھ کر کھڑی ہو جاتیں۔ باورچی انہیں کھانے کی قابیں پہنچاتے اور پھر وہ ہاتھوں ہاتھ ان قابوں کو کھانے کی میز تک لے جاتی تھیں۔ میز پر جو ڈش پہنچتی، سب سے پہلے اسے جوزیفائن چکھ کر اطمینان کرتی اور پھر شہزادے کی طرف بڑھا دیتی تھی۔

اس دن بھی حسب معمول کھانا شروع ہوا۔ قابیں اور ڈشیں آتی رہیں۔ کھانا نکلتا اور تقسیم ہوتا رہا۔ نصف کے قریب کھانا کھایا جا چکا تھا کہ ایک قاب میں جس میں کوئی بھنا ہوا پرندہ تھا جوزیفائن کی میز کے پاس اس کی کنیز کے ہاتھ میں آیا جس نے جوزیفائن کو قاب پیش کرنی تھی۔

قاب کنیز کے ہاتھ میں آئی۔ جوزیفائن نے بغیر اس کی طرف گھومے اپنا ہاتھ قاب لینے کے لیے اس کی طرف بڑھایا لیکن قاب کنیز نے جوزیفائن کو نہ دی۔ ایک لمحہ بعد جوزیفائن نے مڑ کے کنیز کو دیکھا۔ کنیز کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ جس کے نتیجے میں قاب کنیز کے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہوگئی۔

جوزیفائن ایک لمحہ کے اندر معاملہ کی تہہ تک پہنچ گئی۔ اس نے حکم دیا کہ محل سرا کے تمام دروازے فوراً بند کردیے جائیں تا کہ کوئی شخص باہر نہ جانے پائے۔

جوزیفائن کے حکم کے ساتھ ہی پہرہ لگ گیا۔ فوراً تمام دروازے بند کردیے گئے۔ اب جو کھڑا تھا وہ کھڑا اور جو بیٹھا تھا وہ بیٹھا رہ گیا۔

جوزیفائن نے شاہی طبیب کو طلب کیا۔

شاہی طبیب ہانپتا کانپتا سرکاری پہرے میں حاضر ہوگیا۔

جوزیفائن نے شہزادے کو کھانا کھانے سے روک دیا تھا۔

اب جوزیفائن نے اس کنیز کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا جس کے ہاتھ سے قاب گری تھی اور اسے تسلی دے کر اپنے ساتھ کمرے میں لے گئی۔

اس وقت تک محل سرا میں کہرام مچ گیا تھا۔ ہر طرف زہر، زہر کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

ملکہ اینا کو خبر ملی تو روتی پیٹتی بیٹے کی خیریت کو دوڑی آئی۔

کسی نے کہا۔ "کتنی مکار ہے؟"

کوئی بولی۔ "گھڑیال کے آنسو دیکھو۔"

ملکہ نے شہزادے کو دیکھنا چاہا لیکن شہزادے نے ملنے سے انکار کردیا۔

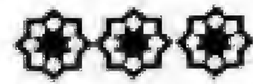
ملکہ منہ لٹکائے واپس ہوگئی۔ شہزادے سے زیادہ اسے اپنی فکر تھی۔ اسے معلوم تھا کہ زہر کسی نے بھی دیا ہو اس کا نام درمیان میں ضرور آئے گا۔

اور ہوا بھی یہی۔

جوزیفائن نے تمام باتیں اس کنیز سے اگلوالیں۔ باروچی خانے سے تعلق رکھنے والی چار کنیزیں اور دو باورچی گرفتار کر کے قید خانے پہنچادیے گئے۔

جوزیفائن نے ملکہ اینا پر شبہ کا اظہار نہیں کیا لیکن بازنطینی امراء اور سرداران نے ملکہ کو معاف نہیں کیا اور ملکہ کو اس کی خواب گاہ میں عارضی طور پر قید کر دیا گیا۔

اس کنیز نے جس نے یہ راز اگلا تھا۔ جوزیفائن نے باورچی خانہ کا ناظم اعلیٰ مقرر کر دیا۔



قسطنطنیہ سے واپس آنے کے بعد قیصران بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا۔ اس کا دل کسی کام میں نہ لگتا تھا۔ ایک ہفتہ بعد سلطان نے قیصران کو بلا کر اسے اطلاع دی۔

''قیصران! ہم یورپ میں پہلا قدم رکھنے کے لیے جا رہے ہیں۔ پتہ نہیں کیا انجام ہو؟''

قیصران نے تسلی دی۔ ''خدا کارساز ہے۔ فتح انشاءاللہ ہماری ہوگی۔''

سلطان خوش ہو گیا اور کہا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ عثمانی لشکر کے ساتھ تم بھی قسطنطنیہ جاؤ۔''

قیصران کا غنچہ دل کھل گیا۔ قسطنطنیہ اس کا وطن تھا۔ وہاں اس کی جانِ بہار جوزیفائن تھی۔ پس قیصران نے جانے سے پہلے سلطان سے درخواست کی کہ جب ہم فاتح کی حیثیت سے قسطنطنیہ میں داخل ہوں تو اسے کچھ لوگوں کی جاں بخشی کی اجازت دی جائے۔

سلطان کے پوچھنے پر قیصران نے شرمیلے لہجے میں بتایا۔ ''وہاں میری خالہ زاد بہن جوزیفائن ہے اور وہ میری منگیتر ہے۔''

سلطان کی نظر میں قیصران کی قدر اور عزت اور بڑھ گئی۔ اس نے نہ صرف ان لوگوں کی جاں بخشی کی اجازت دی جن کی سفارش قیصران نے کی بلکہ قیصران کو ملکہ اینا سے صلح کرنے کی بھی پوری اجازت دے دی۔

مگر اس کی نوبت نہ آئی۔ قیصران کی کوششوں سے مخالف جماعتوں میں صلح ہو گئی۔ قیصران نے ہی معاہدہ کی شرائط طے کی تھیں اور انہی شرائط پر معاہدہ ہوا۔ یہ شرائط مختصراً اس طرح تھیں۔

۱۔ شہنشاہ، شہزادہ جان پلیوگس قرار پایا۔

۲۔ شہنشاہ کنتا کوزین تسلیم کیا گیا۔

۳۔ شہنشاہ ملکہ اینا قرار پائی۔

۴۔ شہنشاہ لیڈی کنتا کوزین تسلیم کی گئی۔

یوں چار اشخاص شہنشاہ قسطنطنیہ قرار پائے جن میں دو مرد اور دو خواتین تھیں۔

دل صاف ہو گئے۔ دشمن گلے ملے۔ قہقہے بلند ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا قلعہ، سارا شہر، در و بام، برجیاں اور فصیلیں چراغوں سے جگمگا اٹھیں۔ مٹھائیاں تقسیم ہوئیں۔ قلعہ کے دروازے کھلوا دیے گئے۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپے ہوئے انسان شہر کی طرف دوڑ پڑے۔ ایک بہار تھی کہ رواں دواں۔ خوشیوں کا طوفان تھا کہ سمندر میں بل کھاتی لہریں۔ ڈھنڈھورچیوں نے نئے شہنشاہوں کے ناموں کا گلی گلی اعلان کر دیا۔

کنتا کوزین اپنے لشکر کے ساتھ فاتحانہ انداز میں قلعہ قسطنطنیہ میں داخل ہوا اور ملکہ اینا اور شہزادے پلیوگس نے اس کا استقبال کیا۔

عثمانی لشکر میدان میں ہی فروکش رہا۔ قرہ خیل نے ترکوں کو قلعہ کے اندر جانے کی اجازت نہ دی۔ اس کی وجہ قیصران نے یہ بیان کی کہ ترک کسی دوسرے پرچم تلے رات بسر نہیں کیا کرتے۔ یہ

سلطانی حکم تھا۔
دوسرے دن شادیاں دھوم دھام سے شروع ہوئیں۔
شہزادے پلیوگس اور کوزین کی چھوٹی شہزادی کی ان کی رسوم کے تحت شادی ہوئی۔
پھر شہزادی تھیوڈور اور سلطان بروصہ اور خان کا عقد ہوا۔ کنٹاکوزین نے یورپین ساحل پر مشہور قلعہ زنپ کی چابیاں تھیوڈور کے جہیز میں سلطان اور خان کو پیش کیں۔
قیصران اس محفل میں شریک تھا۔ عقد ختم ہوئے۔ مبارک مبارک کی صدائیں بلند ہوئیں۔ سچے موتی اور جواہرات نچھاور کیے گئے۔
قاضی عضدالدین نے سلطان سے اجازت چاہی۔
سلطان نے آہستہ سے کہا۔ "ابھی ہماری دختر کا بھی عقد ہونا ہے۔"
اس وقت ملکہ اینا، دلہن کو سہارا دیے سلطان کے قریب آئی۔ سلطان نے فرمایا۔
"قاضی صاحب! یہ ہے ہماری دلہن بیٹی۔"
قاضی نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔ "دلہا کہاں ہے سلطان عالم؟"
سلطان نے قیصران کو آواز دی۔
قیصران اپنے خیالات میں گم تھا۔ سلطان کی آواز پر چونکا وہ محفل میں ہوتے ہوئے بھی محفل سے غائب تھا۔
سلطان نے ہاتھ پکڑ کر قیصران کو اپنے ساتھ بٹھالیا۔
دلہن زیوروں اور پھولوں میں لدی پھندی سلطان کے دوسری جانب بیٹھ چکی تھی۔
سلطان نے کہا۔ "قیصران! نکاح سے پہلے دلہن کو دیکھ لو۔ بعد میں ہمیں الزام نہ دینا۔"

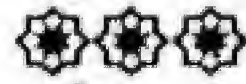
قیصران بوکھلایا ہوا سلطان کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ اور سلطان کیا چاہتا ہے۔
سلطان کو قیصران کی بوکھلاہٹ پر ہنسی آگئی۔ انہوں نے ملکہ اینا سے کہا۔
"ملکہ اینا! ہماری بیٹی کے چہرے سے سہرا ہٹادو۔"
ملکہ اینا نے دلہن کے چہرے سے سہرا ہٹادیا۔
ایک بجلی چمکی...... ایک کوندا لپکا...... ایک شعلہ بھڑکا...... قیصران کی آنکھیں حیرت اور مسرت سے پھیل گئیں۔
کیونکہ اس کی دلہن اور سلطان کی بیٹی جوزیفائن جوزی تھی۔
کنٹاکوزین کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے تو جوزیفائن کو غنڈوں سے خراب کرنے کے لیے بھجوایا تھا مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔
سلطان اور خان نے ملکہ تھیوڈور کے رخ سے سہرا ہٹانا چاہا تو عروس نے رونمائی طلب کی۔
سلطان نے منہ مانگی قیمت ادا کرنے کا اعلان کیا۔
تھیوڈور نے رونمائی کی قیمت میں جہیز میں دی گئی "قلعہ زنپ" کی چابیاں واپس مانگیں۔
سلطان نے فوراً رونمائی میں قلعہ زنپ کی چابیاں دلہن کو عطا کردیں۔
عروس نو کو قلعہ کی چابیاں مل گئیں۔ اس طرح تھیوڈور اپنے باپ کی ہوس اقتدار پر قربان ہوگئی۔ لیکن اس نے قلعہ زنپ کی چابیاں واپس لے کر ترکوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو یورپ میں داخل ہونے سے کچھ دنوں کے لیے ضرور روک لیا تھا۔
فرض شناسی......
حب الوطنی......
یا

حسین انتقام......

یا

تحفہ رونمائی

یہ سب اس رومانی یا تاریخی داستان کے نام ہیں۔



اس سچے اور دلچسپ تاریخی رومانی داستان (تحفہ رونمائی) کا اختتام ہوا۔ اب ہم آپ کو پھر کتاب کے اصل موضوع یعنی فلسطین (بیت المقدس) کی طرف لیے چلتے ہیں۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ۱۵۱۶ء میں ایشیائے کوچک کے ترکان عثمانی نے مصر و فلسطین پر قبضہ کیا تو بیت المقدس بھی ترکی کے زیر اقتدار آ گیا۔ اس وقت سلطان سلیم اول ترکان عثمانی کا قائد تھا۔ پھر کچھ عرصہ تک نپولین بونا پارٹ نے بیت المقدس اپنے قبضے میں رکھا۔ یہ مقدس شہر پہلی جنگ عظیم تک ترک حکومت کے زیر نگیں رہا۔ ترک دور حکومت میں بیت المقدس اپنی شان و شوکت کے سلسلے میں پورے عروج پر پہنچ گیا تھا۔

پھر ۱۵۳۶ء میں سلطان سلیمان اعظم نے شہر کی موجودہ فصیل کی تعمیر شروع کرائی۔ یہ فصیل سات سال میں مکمل ہوئی۔ فصیل کی تعمیر چھوٹی اینٹوں سے ہوئی تھی۔ ایک بیان یہ ہے کہ فصیل کی تعمیر دو بھائیوں کے سپرد تھی جنہوں نے باب الخلیل (یافہ گیٹ) سے مختلف سمتوں کی طرف تعمیر کے کام کا آغاز کیا۔ فصیل کا گھیراؤ ڈھائی میل ہے اور پیمائش و قتی کے لحاظ سے ۱۲۳۵۰ فٹ لمبی ہے۔

ترکی نے جولائی ۱۷۱۸ء میں ایک شاہی فرمان کے ذریعہ "مزار مقدس" فرانس کی تحویل میں دے دیا۔ ۱۸۰۸ء میں اس گرجا میں آتش زدگی کی واردات ہوئی جو بعض مورخین کے مطابق یہودیوں کی سازش کا نتیجہ تھی۔ ۱۸۳۱ء میں برطانوی وزیر اعظم لارڈ سرائیلی بیت المقدس میں آیا اور اس کے اس دورہ مشرق وسطیٰ کے بعد ہی اس علاقے میں ان فتنوں نے جنم لیا جو بعد میں خلافت عثمانیہ کی موت کا باعث ہوئے۔

۲۰ دسمبر ۱۸۳۲ء کو خدیو مصر محمد علی پاشا کے بیٹے ابراہیم نے قونیہ میں ترک فوجوں کو شکست دے کر بیت المقدس پر قبضہ کر لیا مگر مئی ۱۸۳۳ء میں ایک صلح نامہ کے ذریعے محمد علی پاشا نے شام، فلسطین اور مصر کی گورنری کے عوض سلاطین ترکی کو خراج ادا کرنا منظور کیا۔

اس کے ایک سال کے بعد فرانس کی شہ پر محمد علی نے خلافت عثمانیہ سے بغاوت کر دی لیکن شکست کھا کر شام و فلسطین سے ہاتھ اٹھا لیے۔ مگر چند سال بعد لاطینی اور یونانی عیسائیوں میں شدید جنگ ہوئی۔ اس لڑائی میں فرانس نے لاطینیوں کی اور روس نے یونانیوں کی حمایت کی۔ بعض مورخین اس حادثہ کو جنگ کریمیا کا سبب بتاتے ہیں جس کے نتیجے میں روس کو سلطنت عثمانیہ میں مقیم عیسائی رعایا کا محافظ تسلیم کر لیا گیا۔ بالآخر ۱۸۵۶ء میں شاہی فرمان کے ذریعہ مسلم اور غیر مسلم رعایا کے حقوق برابر کر دیے گئے۔ جس سے عیسائیوں اور یہودیوں کو حرم شریف میں آنے کی اجازت دی گئی لیکن مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ میں وہ داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

اس اجازت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہودیوں نے اپنی نو آبادیاں قائم کرنا شروع کر دیں اور یہ وہی دور ہے جب عالمی صیہونیت نے اپنی سازشوں کا آغاز کیا۔ مسلمانوں کی نیکی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے اپنے دور اقتدار میں عیسائیوں اور یہودیوں سے ہمیشہ فراخ دلانہ سلوک کیا لیکن ان اقوام نے اس حسین سلوک کے بدلے میں مسلمانوں کے خلاف

سازشیں کیں۔ فلسطین بھی ان کی سازشوں سے محفوظ نہیں رہا۔

۱۸۵۹ء میں سلطان محمود ثانی نے فلسطین کا دورہ کیا تو وہ بیت المقدس بھی آئے اور مقدس مقامات کی زیارت کی اور پھر یہودیوں کی ان شکایات کا جائزہ لیا جو وہ اکثر سلطانی عمال کے بارے میں کرتے تھے مگر یہودیوں کی ان شکایات کا جائزہ لیا تو وہ تمام شکایتیں بے بنیاد اور غلط ثابت ہوئیں۔

پھر ۱۸۶۲ء میں ایڈورڈ ہفتم زیارت کے لیے آیا۔ ۱۸۹۶ء میں بیت المقدس میں امریکی مشن نے اندھوں کا اسکول جاری کیا۔ یہ پہلا غیر ملکی ادارہ تھا۔ اسی دور میں یہودیوں نے سلطان سے پیش کش کی کہ اگر سلطان یہودیوں کو زمین خریدنے کی اجازت دے دے تو وہ ترکی کے قرضے معاف کر دیں گے اور انہیں مالی امداد بھی دیں گے لیکن غیرت مند سلطان نے صاف جواب دیا کہ جب تک عثمانی سلطنت کا ایک غیور فرد بھی زندہ ہے ان کا خواب پورا نہیں ہوسکتا۔

اس جواب کے بعد صیہونیوں نے سلطان مرحوم کے ذاتی دوست قیصر جرمنی کو شیشہ میں اتارنے کی کوشش کی کہ وہ سلطان سے یہودیوں کو زمین خریدنے کی اجازت دلادے۔ قیصر نے کوشش کی مگر سلطان نے صاف انکار کردیا۔

تیرھویں صلیبی جنگ

سلطان کا منہ توڑ جواب سن کر پیام بر کو پسینہ آگیا مگر اس نے مسلمانوں کو ایک برے اور خوف ناک انجام کی دھمکی دی۔ پس اپریل ۱۹۰۹ء میں ''انجمن اتحاد و ترقی'' نے سلطان عبدالحمید کو معزول کر کے محمد ارشاد کو خلیفہ بنادیا۔

اسی دور میں ترکی خلیفہ نے نیا آئین دیا جس میں شام و فلسطین کی خود مختاری کو تسلیم کیا گیا۔ لیکن اس دوران لارنس آف عریبیہ نے ترکوں اور برطانوی علاقوں میں اپنا اثر و رسوخ جما لیا۔ اس نے ایک معاہدہ کیا جس میں ترکوں، عربوں اور یہودیوں کو بھی شامل کیا گیا۔ اس گٹھ جوڑ کے خلاف عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کردی اور پہلی جنگ عظیم کے دوران ۸ اور ۹ دسمبر کی درمیانی رات کو ترکوں نے بیت المقدس خالی کردیا۔ دس دسمبر کو جنرل شیبا بیت المقدس پہنچا اور ترکوں نے شہر کی چابیاں اس کے حوالے کردیں۔ گیارہ دسمبر کو جنرل ایلن بی مصری اور فلسطینی فوجوں کے ساتھ یافہ گیٹ سے بیت المقدس میں داخل ہوا۔ اس طرح سلطان صلاح الدین ایوبی کا بیت المقدس ایک بار پھر عیسائیوں کے قدموں میں آگیا۔

اس موقع پر مصری اور فلسطینی ان کی مدد کررہے تھے۔ برطانوی افسروں نے اسے آخری صلیبی جنگ کا نام دیا ہے۔ اسے تیرہویں صلیبی جنگ بھی کہا جاسکتا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا کے مطابق ایلن بی کے داخلہ یروشلم سے پہلے ۷۲۵ء سال تک یروشلم نے کسی عیسائی فاتح یا برطانوی سپاہی کو نہ دیکھا تھا۔

چنانچہ برطانیہ کے وزیر اعظم چرچل نے اپنی تاریخ جنگ عظیم میں لکھا ہے۔

۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کو ترک بیت المقدس سے دست بردار ہو گئے۔''

ان کے چار سو سالہ دور کے بعد برطانوی کمانڈر انچیف، باشندگان بیت المقدس کے واہ واہ اور مرحبا کے نعروں کی گونج میں شہر میں داخل ہوا۔

مسٹر نکسن بعد انبساط اپنی تاریخ جنگ میں اس طرح رقم طراز ہیں۔

''آخری صلیبی جنگ اب اپنے عروج پر تھی اور سینٹ لوئیس اور رچرڈ شاہ انگلستان ان جرات افزاء افواج کو دیکھتے تو ان کی روحیں متحیر ہو جاتیں۔ کیونکہ اس کا بہت ہی قلیل حصہ مغربی اقوام (یورپین) پر مشتمل تھا۔ الجیری اور ہندی، مسلمان عرب قبائل، ہندوستان کے ہزارہا فرقوں کے ماننے والے، افریقی حبشی اور یہودی افواج ان لوگوں میں شامل تھیں جنہوں نے نصاریٰ کے مقدس شہر کو آزاد کرایا۔''

افسوس کہ وہ مسلمان جنہیں بیت المقدس کی حفاظت کرنی تھی وہ نصاریٰ اور یہود سے مل گئے تھے۔ اعداد و شمار کے مطابق جنگ عظیم اول میں شام و عراق اور فلسطین وغیرہ میں مسلمان سپاہی برطانوی فوج کی کل تعداد کا ۲/۵ تھے۔

مسٹر جارج وارنر نے اپنی کتاب گرانڈ ورک آف برٹش ہسٹری میں صفحہ ۷۵۱ء پر لکھا ہے کہ۔

بیت المقدس ۱۱۸۷ء کے بعد پہلی مرتبہ ایک عیسائی ملک کے قبضہ و تصرف میں آیا۔ جنرل ایلن بی بڑے دن (کرسمس) سے پندرہ دن پہلے باضابطہ طور پر بیت المقدس میں داخل ہوا۔''

اسی مصنف نے صفحہ ۷۵۷ پر یہ نوٹ درج کیا ہے۔

''قریب قریب اسی وقت جنرل ایلن بی نے فلسطین میں شاندار پیش قدمی کی اور پیش قدمی کے انصرام اور اہتمام کا سہرا خاص طور سے ہندوستانی افواج کے سر ہے۔''

مسٹر ٹامسن نے اپنی کتاب ''عرب میں لارنس کے ہمراہ'' میں لکھا ہے کہ۔

ایلن بی نے فلسطین کو آزاد کرایا جو یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس سرزمین ہے۔ لارنس نے عرب کو آزادی دلوائی جو لاکھوں مسلمانوں کی مقدس سرزمین ہے۔''

اور برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج پارلیمنٹ میں دہاڑا۔

''آج ہم نے مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کا بدلہ لے لیا ہے۔''

جنرل ایل بی کو انعام کے طور پر پچاس ہزار پونڈ کی رقم بھی دی گئی اور جارج پنجم نے ان کی خدمات کا بطور خاص اعتراف کیا۔

ایک روایت کے مطابق بیت المقدس حضرت عمرؓ کی فتح سے ۴۹۱ ہجری تک مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔ اس سال عیسائیوں نے اسے فتح کیا اور مسلسل سات روز تک انہوں نے مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا۔ مستند بیان کے مطابق عیسائیوں نے بیت المقدس فتح کرنے کے دن جوش و سرمستی کے عالم میں ستر ہزار مسلمانوں کو شہید کیا۔

صحرا سے سونے اور چاندی کے برتن اور بے شمار مال و دولت جو محفوظ صندوقوں میں بند تھا عیسائی لٹیرے وہ سب لوٹ کر لے گئے۔ لیکن خدائے تعالیٰ نے سلطان صلاح الدین کو بیت المقدس کی آزادی پر مامور کیا۔ کیونکہ سلطان ایوبی سب سے زیادہ جری اور شیر دل سپاہی اور سلطان تھا۔

مگر افسوس کہ بیت المقدس پھر غلام ہو گیا۔ اس کا سقوط ترکی کے زوال میں معاون ثابت ہوا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ترکوں کے دور میں بیت المقدس نے زبردست ترقی کی۔ اس مقدس شہر میں مسلمانوں کے دور میں مکروہات پر مکمل پابندی عائد رہی۔

یروشلم کا امریکی مصنف جو انیسویں صدی کے آخری سالوں میں یروشلم میں امریکی قونصلیٹ رہ چکا تھا اس نے اس شہر کی عظمت اور ترقی کو اس طرح بیان کیا ہے جس کو پڑھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں

ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

''قدیم شہر ۱۲۱۰ ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ جس میں مسجد بھی شامل ہے۔ شہر کا محل وقوع ہیرود اور اس کے جانشینوں کے دور سے مختلف ہے۔ گلیاں تنگ اور عمارتیں قریب قریب واقع ہیں۔ بعض مقامات پر قدیم محراب اور عمارتیں اب تک قائم ہیں لیکن انسان ان کے قریب سے بے خطر گزر جاتا ہے۔ وہ اہم شاہراہیں جن کا تذکرہ کرنا ضروری ہے ان میں سے ایک داؤد اسٹریٹ، یافہ گیٹ سے مشرقی جانب چلتی ہوئی شہر کے دوسری طرف سینٹ اسٹیفن گیٹ سے جا ملتی ہے۔ کرسچین اسٹریٹ، داؤد اسٹریٹ سے کلیسائے نشور تک جاتی ہے اور ایک تیسری گلی شمال کے باب دمشق کو جنوب کے صیہون گیٹ سے ملاتی ہے۔ قدیم شہر میں بہت کم زمین خالی نظر آئے گی۔ گو یہ شہر ۱۲۱۰ ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے لیکن ۱۳۵ ایکڑ رقبہ مسجد اقصیٰ میں گھرا ہے۔ اتنی ہی جگہ فوجی بیرکوں میں گھری ہوئی ہے۔ اور اس سے دوگنی زمین مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں مساجد، گرجا گھروں اور دوسری عمارتوں نے گھیری ہوئی ہے۔ یہ بطور رہائش گاہ استعمال نہیں ہوتیں اس لیے بلا جھجک کہا جا سکتا ہے کہ ۵۵ ہزار آدمی ایک سو ایکڑ زمین پر آباد ہیں۔ اس کے بازاروں میں ہر رنگ و نسل اور ہر زبان و مذہب کے لوگ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔''

بیت المقدس کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس شہر میں ہر طرف مینار ہی مینار دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی گلی یا کوچہ ایسا نہیں جہاں مسجد یا گرجا نہ ہو۔ مسجد اقصیٰ کے علاوہ ۳۷ مساجد اور ہیں اور چھوٹے بڑے گرجوں اور راہب خانوں کی تعداد ۲۰ کے قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر گھنٹہ بعد شہر کی فضا عبادت کے لیے بلاتی ہوئی گھنٹیوں سے گونج اٹھتی ہے۔ اس کے علاوہ مسجد کے بلند میناروں سے دن میں پانچ مرتبہ اللہ اکبر کی صدا مسلمانوں کو اللہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتی ہے۔''

شہر کے انتظام کے لیے سلطان ترکی نے ''پاشا'' کو مقرر کر رکھا ہے جس کی انتظامی کونسل ۹ مسلم، ایک یہودی اور ایک عیسائی رکن پر مشتمل ہے۔ اس شہر میں ہر ملک کے قونصلیٹ موجود ہیں اور وہ تمام امور جن میں فریقین غیر ملکی ہوں، مقدمہ کی سماعت اسی ملک کا قونصلیٹ کرتا ہے لیکن اگر فریق مقدمہ ترک ہو تو مقدمہ کی سماعت مقامی عدالت کرتی ہے۔

پورے شہر میں نہ کوئی اوپیرا ہے اور نہ کسی کھیل یا کنسرٹ کی اجازت ملتی ہے۔ تمام بازار آفتاب غروب ہوتے ہی بند کر دیے جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگ جلد سو جاتے ہیں اور صبح کو جلدی اٹھنے کے عادی ہیں۔ زمانہ کی تہذیبی ترقیوں کا ابھی اس شہر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ قدیم شہر کی دیواروں سے باہر شمال و مغرب میں پچھلے کئی برسوں سے ایک نیا یروشلم عالم وجود میں آ گیا ہے۔ اس نئے یروشلم نے مختصر عرصہ میں بہت ترقی کر لی ہے۔ اس نئے شہر یروشلم میں یہودیوں کی کئی کالونیاں ہیں اور ان میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ اس وقت یہودیوں کی آباد کاری پر پابندی ہے اس کے باوجود وہ مسلسل چلے آ رہے ہیں۔

ڈاکٹر رابنسن کے مطابق ۱۸۳۸ء میں شہر کی آبادی گیارہ ہزار تھی۔ ان میں تین ہزار یہودی تھے۔ ۱۸۴۹ء میں ولیم کے مطابق یہودیوں کی تعداد تین ہزار سے بڑھ کر سات ہزار ہو گئی تھی۔ پھر ۴۵ سال بعد اس کی آبادی میں دس گنا اضافہ ہوا۔ یہودی اپنے آبائی شہر کو پھر سے یہودی شہر بنانے کی فکر میں رات

دن لگے رہتے ہیں۔

برطانیہ کے زیر اثر

برطانوی انتداب کے نام سے ویلبس کی کتاب ۱۸۹۸ء میں شائع ہوئی تھی اور اس میں واضح طور پر یہودیوں کے عزائم سامنے آچکے تھے۔ اس کے باوجود عربوں نے حالات کا رخ نہیں پہچانا اور نہ پروا کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لارنس کا شکار ہوگئے۔ برطانیہ نے عربوں کو مکر و فریب سے اس جنگ میں اپنے ساتھ ملایا اور یہ وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے بعد ان کی مرضی کی حکومت قائم ہوگی لیکن ۱۹۲۰ء میں صلح کانفرنس میں فلسطین کو برطانیہ کا زیر اثر علاقہ قرار دے کر سر رابرٹ سیموئیل کو وہاں کا ہائی کمشنر مقرر کر کے اسے بیت المقدس پہنچا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہودی عزائم تکمیل کو پہنچنے لگے۔

ہائی کمشنر سیموئیل یہودی تھا۔ اس نے کھل کر صیہونیت کا ساتھ دیا۔ اس کی اس جانب داری کے بارے میں ایک برطانوی منصف مزاج مصنف نے لکھا ہے۔

''اگر حکومت یہ سمجھتی ہے کہ دنیا رابرٹ سیموئیل کو برطانوی ہائی کمشنر کے طور پر بیت المقدس بھیجنے کے پس منظر میں کارفرما سازشوں سے بے خبر ہے۔ تو یہ اس کی حماقت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیموئیل کی تقرری نے برطانیہ کی حیثیت کو نازک بنا دیا ہے۔''

سیموئیل کے ہائی کمشنر ہوتے ہی فلسطین میں یہودیوں کی آمد میں روز بروز اضافہ ہونا شروع ہوگیا اور انہوں نے برطانیہ کے زور پر اودھم مچانا شروع کردیا۔ آخر ۱۹۳۶ء میں عرب ہائی کمیٹی قائم ہوئی جس کی اپیل پر برطانیہ کے مسلم کش رویہ پر یہودی داخلہ کے خلاف چھ ماہ تک یادگار زمانہ ہڑتال رہی۔ اس کمیٹی کے صدر یروشلم کے مفتی اعظم امین الحسینی آفندی تھے۔ حکومت برطانیہ نے آفندی کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کردیے۔ آپ مسجد اقصیٰ میں معتکف ہوگئے۔ برطانوی سپاہیوں نے مسجد کا محاصرہ کرلیا لیکن مفتی اعظم بھیس بدل کر اس محاصرے سے نکلے اور شام سے ہوتے ہوئے لبنان پہنچے۔ اسی سال یہودیوں نے صیہونی ایجنسی قائم کر کے حکومت برطانیہ کے تعاون سے اپنی سازشوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کردیا۔ یہودی فلسطین کو یہودی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ پس ملک گیر فسادات شروع ہوگئے۔ بیت المقدس کی گلیاں متعدد بار انسانی خون سے رنگین ہوئیں۔ اس طرح برطانیہ کی حمایت سے یہودی روز بروز زور پکڑتے گئے۔

پھر ۱۹۲۸ء میں یہودیوں کے اور بہت سے نئے نئے محلے بن گئے۔ جبل زیتون پر یہودیوں کی یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ انگریزوں نے عربی کے پہلو بہ پہلو عبرانی کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا یہاں تک کہ ریلوے ٹائم ٹیبل بھی عبرانی زبان میں شائع ہونے لگے۔

اسی زمانہ میں قدس کی آبادی دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ اندرونِ شہر فصیل سے محصور ہے۔ جس کے سات دروازے ہیں۔ غربی دروازہ باب الخلیل کہلاتا ہے۔ جنوب کے دو دروازے باب داؤد اور باب المصاربہ، مشرق میں باب الاسباط اور شمال میں تین دروازے باب الساحرہ، باب الصخرہ اور باب الجدید تھے۔ فصیل سے باہر نیا شہر آباد ہے۔ مسجد اقصیٰ اور مسجد عمر کے علاوہ شہر میں شیخ محمد ابا میری، شیخ قرمی، شیخ المثبت، شیخ بایزید بسطامی، شیخ جلال الدین رومی، شیخ فرید، شیخ حسن کے مزارات زیارت گاہِ عوام ہیں۔ مسجد اقصیٰ کی مشرقی دیوار کے بالمقابل سیدنا شداد بن اویس انصاری اور عبادہ بن صامت

کے مزارات ہیں۔ کوہ طور الزیت کے دامن میں سید محمد علمی کا مزار ہے۔ اس کے متصل قبۃ شہداء، غربی جانب حضرت رابعہ عدویہ اور مشرقی جانب سیدنا عکاشہ، سیدنا قیحر اور مسجد کی شمالی فصیل کے قریب غار میں سیدنا سلطان ابراہیم ادھم اور شیخ حسن راہی کے مزارات ہیں۔

(حوالہ، زیارت القدس وشام)

مولانا حفظ الرحمٰن نے ۱۹۳۸ء میں اپنی تصنیف ''راہ وفا'' میں لکھا ہے۔

''ترکوں نے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے زمینوں کے ٹکڑے وقف کر دیے تھے جن پر ان ملکوں کے آنے والے زائرین کے قیام و رہائش کے لیے مسافر خانے تعمیر ہوئے جو اب تک قائم ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں مولانا محمد علی جوہر کی تحریک پر ہندوستان کے مخصوص قطعہ اراضی پر خواجہ ناصر حسن انصاری نے ''زاویہ ہندی'' کے نام سے مسافر خانہ تعمیر کیا۔ قبرستان شہداء میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے شہید ساتھی دفن ہیں۔ صحن حرم میں مولانا محمد علی جوہر مدفون ہیں۔ اقتصادی، انفرادی، سیاسی اور مذہبی شعبوں پر حکومت برطانیہ کا اثر ہے جس کی وجہ سے اس سرزمین قدس پر ہنگامہ دارو گیر برپا ہے اور مسلمانوں کے حقوق ان کی معبد گاہیں، جائیدادیں اور جان و مال خطرے میں ہیں۔ جس وقت سے برطانیہ کا قبضہ ہوا یہودیوں کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا اور حکومت برطانیہ نے چاروں طرف سے یہودیوں کو لا لا کر یہاں آباد کیا۔ مسلمانوں کی زرخیز زمینیں اور آباد محلے آج یہودیوں کے قبضے میں ہیں۔ حالانکہ آج سے ستر سال پہلے الخلیل (حبرون) کو جاتے ہوئے قدس سے باہر یہودیوں کی ایک چھوٹی سی آبادی ''ماء شورم'' (یعنی سوگھر) تھی۔ قدیم شہر میں بیس نسلوں کے لوگ آباد ہیں اور شہر میں مسجد اقصیٰ کے علاوہ ۲۸ مساجد ہیں۔''

یہ خونِ شہیداں

اقوام متحدہ نے بیت المقدس کو عالمی اہمیت کا علاقہ قرار دیتے ہوئے تقسیم فلسطین کے منصوبے میں بیت المقدس کو بین الاقوامی سرپرستی میں دینے کا فیصلہ کیا۔ یہودیوں نے اس پر خوب بغلیں بجائیں لیکن عربوں نے اس ناانصافی کے خلاف سر جھکانے سے انکار کر دیا۔

دوسری جانب تقسیم فلسطین کا اعلان ہوتے ہی یہودیوں نے عربوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ مفتی اعظم کی مختصر سی فوج یہودیوں کے مقابلے پر نکلی اور لاکھوں یہودیوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئی۔ یہودیوں کو ایک طرف صیہونی ایجنسی کی مدد حاصل تھی اور دوسری طرف بعض ممالک جن میں چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ اور رومانیہ وغیرہ پیش پیش تھے انہوں نے اسلحہ سے یہودیوں کی مدد شروع کر دی۔ سب سے آگے برطانوی حکومت تھی۔ اس نے یہودیوں کو جدید اسلحہ اور خاص کر سنچورین ٹینک فراہم کر دیے اور انہیں عرب علاقوں پر قبضے کے لیے اکسایا اور عرب آبادی کو محفوظ مقامات پر پہنچانے کے بہانے شہروں کے شہر مسلمانوں سے خالی کرا لیے۔ پس ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو جب برطانیہ رخصت ہوا تو دیر یاسین، طبریہ، حیفہ، سمغ، سلامہ، بیسان اور بیت المقدس (نیا شہر) عربوں سے بالکل خالی ہو چکے تھے۔

۱۹۴۸ قتل عام

برطانیہ نے یہودیوں کی ملی بھگت سے اعلان کیا کہ وہ فلسطین کو ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء میں خالی کر دے گا۔ صرف حیفہ کی بندرگاہ سے افواج اگست میں ہٹیں گی۔

مگر انہوں نے حیفہ کو بھی ۱۴ مئی کو خالی کیا اور ۱۵ مئی کو اسلحہ اور گولہ بارود سے بھرے جہاز حیفہ کی بندرگاہ پر آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی یہودیوں کی ایک بڑی فوج کے ساتھ بیت المقدس کا محاصرہ کرلیا۔

اخوان مجاہد گزشتہ چار ماہ سے شہر میں یہودیوں سے نبرد آزما تھے۔ ان کے پاس اسلحہ پرانا اور بہت کم مقدار میں تھا۔ لیکن وہ جوش ایمانی اور شوق شہادت کے جذبات سے سرشار تھے۔ وہ دشمن کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس وقت مقامی آبادی کے علاوہ گرد و نواح کے بیس ہزار مسلمان بیت المقدس میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ یہودی چند ہفتے پہلے دیر یاسین میں قتل عام کر چکے تھے اب بیت المقدس کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب یہ تھا کہ یہاں بھی دیر یاسین کا قتل عام دہرایا جائے۔ ادھر اخوان کے پاس گولہ بارود ختم ہو رہا تھا۔ انہوں نے عرب لیجن سے مدد مانگی لیکن جنرل گلب پاشا نے بعض سیاسی اور مذہبی وجوہ کی بناء پر ایک فوجی بنیاد کی آڑ میں شہر کو خالی کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر اس مشورے کو اخوان نے مسترد کر دیا۔

اخوان دستوں کے قائد نے کہا۔

"یہودی ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی بیت المقدس میں داخل ہوں گے۔"

عرب لیجن سے مایوس ہو کر بیت المقدس کی پوری آبادی سر سے کفن باندھ کر گھروں سے نکل آئی۔ رات بھر شدید جنگ ہوتی رہی اور صبح کے وقت یہودی پسپا ہونے لگے۔ اردنی فوج کے ایک ذمہ دار افسر کو اس صورت حال کی خبر ملی تو جنرل گلب بادشاہ کی مخالفت کے باوجود اور یہودیوں کی تازہ دم فوج سے پہلے پچھلے پہر اردنی فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیے اور اخوان کے ثبات و استقلال نے بیت المقدس کو مسلمانوں کے لیے محفوظ کرلیا۔

۸ جولائی کو یہودیوں نے پھر حملہ کیا لیکن شدید جنگ اور زبردست نقصان اٹھانے کے بعد پسپا ہو گئے۔ اس مرحلہ پر اقوام متحدہ یہودیوں کی مدد کو آگے بڑھی لیکن اقوام متحدہ کے احترام میں عربوں نے ابھی ہتھیار رکھے ہی تھے کہ ۲۵ جولائی کو یہودیوں نے ایک زبردست حملہ کر کے بیت المقدس کے چوراسی فیصد رقبہ پر قبضہ کرلیا اور مسلمان صرف قدیم شہر تک محدود ہو کر رہ گئے۔

اس کے بعد ۲۹ اگست ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ نے بیت المقدس کو غیر مسلح قرار دینے کی قرارداد منظور کی مگر اسے یہودیوں نے مسترد کر دیا اور مطالبہ کیا کہ بیت المقدس کی موجودہ پوزیشن کو برقرار رکھا جائے۔

پھر چند دنوں بعد اقوام متحدہ پر الزام لگا کہ وہ اپنی قراردادوں پر عمل کرانے کی اہلیت نہیں رکھتی اور بیت المقدس سے متعلق اقوام متحدہ کی تمام قراردادوں کو ماننے سے بالکل انکار کر دیا اس کے ساتھ ہی بیت المقدس کو اسرائیلی دارالسلطنت بنانے کی باتیں شروع کر دیں۔

ادھر اقوام متحدہ نے ایک اور قرارداد کے ذریعے یہودیوں پر واضح کر دیا کہ بیت المقدس کو دارالسلطنت نہیں بنا سکتے لیکن اسرائیل نے اسے بھی نظر انداز کر دیا اور پارلیمنٹ کی منظوری سے بیت المقدس کو اسرائیل کا مستقل دارالسلطنت قرار دے کر وزارت خارجہ کے سوا اکثر دفاتر نئے بیت المقدس منتقل کر دیے اور جون ۱۹۵۳ء میں وزارت خارجہ بھی بیت المقدس منتقل ہو گئی۔

۹ جولائی ۱۹۵۳ء کو امریکا نے بھی برطانیہ، مشرقی جرمنی، روس، فرانس، اٹلی، جاپان، ترکی، کینیڈا، آسٹریلیا، سوئٹزرلینڈ، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ کی طرح

اپنا سفارت خانہ تل ابیب سے بیت المقدس منتقل کرنے سے انکار کردیا لیکن اکثر ممالک کے سفارتی مشن بیت المقدس آ گئے۔

یہاں اس بات کا خیال رہے کہ جون ۶۷ء کی جنگ تک ذیلی دارالسلطنت تل ابیب تھا۔ یہاں بیت المقدس سے بیرونی فصیل مراد ہے۔

بیت المقدس کا اسرائیل میں انضمام

۷ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے قدیم بیت المقدس پر قبضہ کرلیا اور ۴ جولائی ۱۹۶۷ء کو اقوام متحدہ نے قرارداد نمبر ۲۲۵۳ ای۔ ایس۔ وی کے ذریعے بیت المقدس کو اسرائیل میں مدغم کرنے کے اقدام کو غیر قانونی قرار دیا۔ اس قرارداد کے حق میں ۹۹ ووٹ آئے۔ کسی نے مخالفت نہیں کی البتہ امریکا اور اسرائیل غیر حاضر رہے۔

پھر ۱۴ جولائی '۶۷ء کو جنرل اسمبلی نے اس قرارداد کی توثیق کی۔

۲۱ مئی ۱۹۶۸ء کو سلامتی کونسل نے اسرائیل کے رویے کی مذمت کی اور ۴ اور ۱۴ جولائی کی قراردادوں پر اصرار کرتے ہوئے اسرائیلی اقدام کو بین الاقوامی قانون اور رائے عامہ کے منافی قرار دیا۔ مگر اسرائیل نے اقوام متحدہ کی قرارداد اس کے منہ پر دے ماری۔

اور آج بیت المقدس اسرائیلی ظلم و استبداد کا شکار ہے۔ بے گناہ عوام ہی نہیں خواتین اور بچوں کو بھی یہودی اپنی سنگینوں اور رائفلوں کا شکار بنا رہے ہیں اور مسلمان منتظر ہیں ایک نئے صلاح الدین ایوبی کے جو انہیں یہودیوں اور ان کے حلیفوں برطانیہ اور امریکا کی ستم رانیوں سے نجات دلائے۔ (آمین)

بیت المقدس کی شہر پناہ

کتاب مقدس میں اس شہر کی دیواروں اور دروں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ آنے والی نسلیں اس پر فخر کریں گی اور اس شہر پناہ کو دیکھ کر ششدر رہ جائیں گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتاب مقدس کے عہد کا وہ شہر آج ناپید ہے۔ اور اس کی جگہ جو شہر کھڑا ہے اس کے متعلق آثار قدیمہ کے ماہرین کا یہ خیال کہ یہ اس مقام پر نہیں جہاں شہر داؤد اور سلیمان تھا۔ بلکہ اس کی جگہ اور مقام کسی حد تک تبدیل ہو چکے ہیں۔

''یروشلم مقدس'' کا امریکی مصنف ایڈون کہتا ہے کہ یہ شہر اس جگہ نہیں جہاں ہیرود اور اس کے جانشینوں کے عہد میں واقع تھا۔ بلکہ اس دور کا شہر موجودہ شہر سے تین گنا بڑا تھا اور مکانات آج کل کے مکانات سے زیادہ قریب اور تنگ تھے۔ البتہ وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ شہر کی موجودہ عمارات قدیم کھنڈرات کے ملبے سے تعمیر ہوئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اکثر عمارتوں پر عہد ہیرود کی باقیات ہونے کا گمان گزرتا ہے۔

اس شہر کی معلوم تاریخ میں یہ کئی بار اجڑا اور از سر نو تعمیر ہوا اور اس دوران اس کی شہر پناہ بھی کئی بار تعمیر ہوئی۔ پہلے عہد داؤدؑ میں تعمیر ہوا اور پھر حضرت سلمانؑ نے اس کی مرمت کرائی۔ کتاب سلاطین میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے باپ داؤدؑ کے شہر کے گرد فصیل تعمیر کرائی تو ''یربعام'' افرائیمی نے مخالفت کی۔ اس بات پر حضرت سلیمانؑ نے اسے بنی یوسف پر حاکم بنا کر شہر سے باہر بھیج دیا لیکن حضرت سلیمانؑ کے چار سو سال بعد یہ شہر پناہ بابل کے بخت نصر کے ہاتھوں تباہ ہوئی جس نے فصیل شہر کو گرا کر ہل چلوا دیے۔

دوسری فصیل کی تعمیر کا کام بابل کی قید سے واپسی پر (۴۴۵ ق۔م) کے لگ بھگ شروع ہوا۔ یہ شہر پناہ یہود کے قبائل نے آپس میں تقسیم کار کے اصول

پر بنائی اور اس کی تعمیر میں مقامی لوگوں کے علاوہ اہل فارس، رومیوں، شامیوں اور مصریوں نے مداخلت کی مگر تعمیر کا کام جاری رہا اور اسے مکمل کیا گیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ شہر پناہ پہلی فصیل کے کھنڈرات ہی پر اٹھائی گئی تھی اس لیے شہر کے محل وقوع میں کوئی زیادہ فرق نہ تھا۔ ڈاکٹر رابنسن کے اندازے کے مطابق اس شہر پناہ کی تعمیر شہر کے شمالی حصے سے شروع ہوئی۔ اس کی مغربی حد موجودہ باب دمشق کی جگہ تھی۔ یہاں سے وہ جنوب کو مڑ گئی تھی۔ لیکن یہ شہر پناہ حملہ آوروں کی ستم رانیوں کا شکار ہوئی۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ شہر پناہ کی تیسری تعمیر ہیرود کے جانشین ہیرود اغریپا نے حضرت عیسیٰ کی پیغمبری کے ۱۲ سال بعد شروع کی۔ ہیرو ذغریپا کا تعمیراتی کام اتنا عظیم اور شاندار تھا کہ شام کے رومی حکمران کے ذہن میں شک پیدا ہو گیا کہ یہ سب کچھ ایک نئی بغاوت کی تیاری ہے۔ چنانچہ اس نے ''کلاڈیس سیزر'' کے نام ایک خط میں اپنے شکوک کا اظہار کیا۔ جس کے نتیجے میں کلاڈیس نے اغریپا کو مزید تعمیر سے روک دیا۔ مگر بعد میں یہودیوں نے اپنے روایتی حربوں سے کام لیتے ہوئے اس کی جزوی تعمیر کا اجازت نامہ حاصل کرلیا۔

جوسینس نے اس شہر کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کی دیواروں میں ۲۰ ہاتھ لمبے اور دس ہاتھ چوڑے پتھر لگائے گئے تھے جن کا اٹھانا اور بلند کرنا انسانی طاقت سے بالاتر نظر آتا تھا۔ یہ فصیل ۷۱ء میں طیطس رومی کے حملے کا شکار ہوگئی اور ۶۱۴ء کے بعد تو قطعاً ملبے کا ڈھیر بن گئی تھی۔

موجودہ فصیل ترکان عثمانی کے دوسرے حکمران سلیمان اعظم نے تعمیر کرائی۔ سلطان اعظم کے والد سلطان سلیم نے ۱۵۱۷ء میں اس شہر کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا۔ سلیمان اعظم نے تعمیر کی نگرانی دو بھائیوں کو سونپی تھی جنہوں نے ۱۵۳۶ء میں یافہ گیٹ سے مخالف سمتوں میں کام کا آغاز کیا اور وہ اس کی تکمیل تک ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ سات سال بعد ۱۵۴۲ء میں موجودہ سینٹ اسٹیفن گیٹ پر ان کی ملاقات ہوئی۔ اس خوشی میں انہوں نے دروازے پر چار شیر بنائے۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ شہر پناہ کی ہر تعمیر کے ساتھ اس کے دروازوں کے ناموں میں کچھ نہ کچھ ردوبدل ہوتا رہا۔ بیشتر عرب جغرافیہ دانوں نے ان دروازوں کا ذکر ضمناً کیا اور صرف دو عرب مصنف اس کا تفصیلی حال بیان کرتے ہیں۔ یعنی مقدسی ۹۸۵ء میں اور مجیر الدین ۱۴۹۶ء میں۔ ان تاریخوں کے درمیان یہ شہر تقریباً ایک صدی تک صلیبیوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ مقدسی اور مجیر الدین کے بیان کردہ نام مختلف ہیں۔ البتہ مجیر الدین نے جن دروازوں کا ذکر کیا ہے وہ آج تک کھلے ہوئے اور زیر استعمال ہیں۔

مقدسی نے بالا حصار کے آٹھ دروازے بتائے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

باب صیہون، باب البقہ (دشت)، باب البلاط (محل یا دریا)، باب ارمیہ (حضرت ارمیہ کا گڑھا)، باب سلوان یا صلوان، باب اریحا باب ملعمود (ستون)، باب محراب داؤد۔

اس آخری دروازے یعنی باب محراب داؤد کو آج کل یافہ گیٹ بھی کہتے ہیں۔ مقامی لوگ اسے باب الخلیل یا باب حبرون کہتے ہیں۔ کیونکہ خلیل اللہ کے شہر حبرون جانے والے زائر اسی راستے سے جاتے ہیں۔ مقدسی نے اس سلسلے میں بالا حصار کا ذکر کیا ہے۔ وہ اس دروازے سے ذرا اوپر کے رخ اب تک

موجود ہے اور اس میں وہ محراب بھی سلامت ہے جس سے یہ دروازہ منسوب کیا جاتا ہے۔

مقدسی کا باب صیہون جنوبی دیوار میں باب حبرون کے بعد دوسرا دروازہ ہے جسے آج کل باب النبی داؤدؑ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مجیرالدین نے اسے "باب مارۃ الیہود" کہتا ہے۔ اس کے قریب ہی حضرت داؤد علیہ السلام کا مزار ہے۔

باب اریحا وہ ہے جسے چودھویں صدی سے سینٹ اسٹیفن گیٹ کا نام دیا گیا ہے۔ یہ دروازہ دسویں صدی عیسوی میں "جریکو گیٹ" کہلاتا تھا۔ اسے باب الاسباط یا مریم متی کا دروازہ بھی کہتے ہیں۔ برکتہ اسرائیل اس دروازے کے باہر ہے جو نہایت قدیم تالاب ہے۔

باب جب ارمیہ شمال کا چھوٹا دروازہ باب الساھرہ ہے اور قدیم زمانہ میں ہیرود گیٹ کہلاتا تھا۔ اس کے قریب ہی وہ میدان ہے جہاں بعض روایات کے مطابق روزِ محشر ساری مخلوق جمع ہوگی اور ایک خندق بھی ہے جس کے بارے میں عام روایت ہے کہ اسے سلطان صلاح الدین ایوبی نے کھدوایا تھا لیکن مقدسی اسے "گڑھا" کا دروازہ کہتا ہے جس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خندق قدیم دور سے ہے۔ البتہ اتنا ضرور ممکن ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسے مزید مستحکم اور استوار کیا ہو۔

مقدسی کا باب عمود آج بھی اسی نام سے شمالی دیوار کے وسط میں واقع ہے۔ اسے باب دمشق بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں سے ایک سڑک نابلس اور دمشق کو جاتی ہے۔ عیسائی روایات کے مطابق قبول مسیحیت کے بعد سینٹ پال اسی راستے سے شہر مقدس میں داخل ہوئے تھے۔ محاربات صلیب کے وقت یہ دروازہ سینٹ اسٹیفن سے منسوب تھا کیونکہ وہ جگہ جہاں یہود نے سینٹ اسٹیفن کو سنگسار کیا وہ اسی دروازے کے باہر چند قدم کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس مقام پر تھیوڈوسیس ثانی کی ملکہ اُدوسیا نے ۴۵۵ء میں ایک گرجا بنا دیا تھا۔ ملکہ اس گرجا میں مدفون ہے۔ اس گرجا سے کچھ فاصلے پر بادشاہوں کے مقبرے ہیں جو مشرقی میسوپوٹیمیا کے لیے تعمیر ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ دین موسیٰ قبول کرنے کے بعد ملکہ اپنے بیٹے ازیتیس کے ہمراہ شہر قدس آئی اور ازیتیس کے بیس بیٹے اس شہر میں آباد ہو گئے۔ ملکہ اور ازیتس ان قبروں میں دفن ہیں۔ ان سے کچھ فاصلہ پر مسلمانوں کا قبرستان اور حضرت سلیمانؑ کی بھٹیاں ہیں۔

مقدسی کا باب التیہ اور باب صلوان آج کل معدوم ہے لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ باب التیہ مجیرالدین کا باب السرب (چور دروازہ) ہے جو کبھی باب صیہون اور باب حبرون کے درمیان ارمنی خانقاہ کے قریب کھلتا تھا لیکن آج کل بند ہے۔

باب صلوان، مشرقی دیوار میں آج کا باب المغاربہ ہے جسے فرنگیوں نے کوٹھڑی دروازے کا نام دیا تھا۔ باب البلاط غالباً مجیرالدین کے باب الرحمیہ (الرمیہ) کا قدیم نام تھا جو کبھی باب حبرون کے شمال میں شہر پناہ کے پہلو پر تھا لیکن پچھلی صدی میں اسے بند کر دیا گیا۔ ادریسی ۱۱۵۴ء میں باب الرحمہ کا ذکر بھی کرتا ہے جسے مسیحی گولڈن گیٹ کہتے ہیں۔ ادریسی لکھتا ہے۔

"یہ دروازہ شہر کے مشرقی پہلو پر ہے مگر عام طور پر بند رہتا ہے اور صرف شاخِ زیتون کے میلے کے دن کھولا جاتا ہے۔"

او ایچ پیری اپنی "کتاب زیارات یروشلم" مطبوعہ ۱۱۹۲ میں اس دروازے کا ذکر کرتے ہوئے

لکھتا ہے۔

"یہ معبد سلیمانی کے مشرقی دروازے کی جگہ قائم ہے۔ حضرت عیسیٰ پام سنڈے کو اسی دروازے سے ہیکل میں داخل ہوئے۔ یہ دروازہ ۶۲۹ء میں مقدس صلیب ملنے کی یادگار کے طور پر ہرکولیس نے تعمیر کرایا تھا۔ عہد صلیبی میں یہ دروازہ دو مرتبہ کھلتا تھا۔ ایک مرتبہ پام سنڈے کے جشن کے لیے اور دوسری مرتبہ ۱۴ ستمبر کو مقدس صلیب ملنے کے روز۔ ترکوں نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا لیکن کبھی استعمال نہیں کیا۔

اس سے باہر ایک محراب بنی ہوئی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت مہدی آخر الزماں بعثت کے بعد اسی جگہ تشریف لائیں گے۔

پیری مزید لکھتا ہے کہ اس دیوار کا جو حصہ مسجد اقصیٰ سے ملحق ہے۔ اس جگہ واقع ایک مینار سے سینٹ جیمز کو گرا کر ہلاک کیا گیا تھا۔

مجیر الدین کے باب الداعیہ (موری دروازہ) کی آج کل نشاندہی ممکن نہیں ہے۔ البتہ قیاس کہتا ہے کہ یہ باب ہیرود سے کسی قدر مغرب میں ہوگا۔

قصر جلوہ۔ باب الحمید

پیری شمالی دیوار کے مغربی کونے میں قصر جلوہ (گولائتھ کا محل) سے متصل باب الحمید کا ذکر کرتا ہے۔ جو ۱۸۸۹ء میں تعمیر ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ نیا یروشلم اسی دروازے سے باہر ہے۔ پیری مزید بتاتا ہے کہ عہد ہیرود میں تھیٹر، سرکس اور جمناسٹک کے مقابلے مغربی دیوار سے باہر میدان میں ہوتے تھے۔ اس کے مطابق مغربی دیوار میں قدیم نکوپس گیٹ کی جگہ آج کل باب السلسلہ ہے۔ مجیر الدین نے خانقاہ شیخ ابن عبداللہ کے قریب باب الزادیہ اور شہر کے مشرقی گوشہ پر "باب خارہ طور" کا ہونا بیان کیا ہے لیکن آج کل ان کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

وادیاں

بیت المقدس کو بجا طور پر پہاڑیوں اور وادیوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ اس کے تین اطراف میں پھیلی ہوئی وادیوں نے اسے ایک عظیم اور منفرد شہر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ خاص کر "ہنوم اور کیدرون" کی وادیاں خاص طور سے بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر ان وادیوں کا رخ کسی اور سمت ہوتا تو بیت المقدس کبھی اس جگہ آباد نہ ہوسکتا۔ کیونکہ ہوریا اور زیتون کی پہاڑیوں اور کیدرون، ہنوم اور ان کی درمیانی وادی کے بغیر اس شہر کا تصور ہی ممکن نہ تھا۔

وادی ہنوم

کتابِ مقدس کے مطابق اپنے پہلے معلوم مالک ہیگ گائی یا گائی بن ہنوم سے منسوب ہے۔ ہیرد بن ہنوم نے اس جگہ اپنے ڈیرے ڈالے اور یہیں سے آگے بڑھ کر شہر پر قابض ہوگیا۔ یہ وادی شہر پناہ کے شمال مغربی کونے سے شمال میں نصف میل کے فاصلے پر شروع ہوتی ہے۔ پہلے جنوب مغربی سمت، پھر جنوب کا رخ کرتی ہے۔ اس جگہ یہ مقابلتاً ہموار ہے۔ وہاں مسلمانوں کا ایک قبرستان ہے جس کے وسط میں جیھون کا بالائی تالاب جسے اب برکتہ الممیلہ کہا جاتا ہے، واقع ہے۔ اس تالاب سے قدرے جنوب میں اترائی تیز ہوجاتی ہے اور تقریباً ڈھائی میل کے فاصلے پر جیھون کا زیریں تالاب (برکتہ السلطان) واقع ہے۔

وادی میں دائیں سمت اونچی ڈھلوان چٹانیں ہیں جن میں پتھر تراش کر مزارات بنائے گئے۔ جنہیں بادشاہوں کے مقبرے کہا جاتا ہے۔ آج کل ان عمارتوں کو ملازمین کی رہائش کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ جگہ باغ دمشق سے ایک تہائی میل کے فاصلے پر ہے۔ اس جگہ سے آگے پہاڑی راستے پر بلند ہوکر

ہل آف ایول کونسل تک چلی گئی ہے۔ اس کی بائیں جانب جیہون کی ڈھلوانیں ہیں۔"

یہ وادی قدرے تنگ ہے۔ وہاں زیتون کے درخت ہیں۔ اس کے بعد اچانک مشرق کی طرف مڑتی اور وسیع ہو کر ایک مستطیل شکل میں بدل جاتی ہے۔ وادی کے اس حصے کو پہلے "توفٹ" کہا جاتا تھا۔ بعد میں اس میں چھوٹے چھوٹے خداؤں کے بت نصب کر دیے گئے اور ان کے سامنے قربانیاں دی جانے لگیں لیکن ان کے جانشین پاک باز "جوسیاہ" نے یہ روایت ختم کردی۔ اسے وادی "الٰمس" بھی کہا جاتا ہے۔ یہودی ربیوں کے مطابق یہ وادی جہنم کے دروازے پر ہے۔ اس وادی میں ہمیشہ بے تحاشا خون بہا ہے۔ کنعانی، یہودی، فارسی، شامی، رومی، فرانسیسی اور مسلمان خون۔

ذرا آگے بڑھیں۔ تقریباً پانچ سو گز تو ہم وادی کیدرون اور وادی ہنوم کے نقطہ اتصال پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور یہاں تمیں ایکڑ تک کا رقبہ ہم وار اور مسطح ہے۔ یہ جگہ کوہ موریا پر مسجد اقصیٰ کے فرش سے تین سو فٹ نیچی ہے۔ اسی مسطح ٹکڑے کے جنوبی کونے میں بیر ایوب ہے۔ جس کے بارے میں واضح طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں کہ یہ کب سے ہے؟ اسلامی قبضہ کے فوراً بعد اس کا موجود ہونا کتابوں سے ثابت ہے اور مسلمانوں نے ہی اسے "بیر ایوب" کا نام دیا۔ کیدرون اور ہنوم کے ملنے سے جو وادی بنتی ہے اسے "وادی نار" کہا جاتا ہے۔

شہر کے مشرق میں وادی کیدرون ہے۔ کیدرون بائبل کا دیا ہوا نام ہے۔ عام طور پر اسے چوتھی صدی عیسوی سے "جیوشیفٹ" کی وادی کہا جاتا ہے۔ مقامی لوگ اسے "مریم سیتی" کی وادی کہتے ہیں۔ یہ وادی فصیل سے ایک میل تک چلی گئی ہے۔ آدھے راستے تک اس کا رخ جنوبی ہے اور خوب کاشت ہوتی ہے۔ وادی کے سرے پر پتھروں کو کاٹ کر بنائے گئے مکانات کی کثرت ہے جو کبھی مزارات تھے مگر آج کل کسانوں کی رہائش گاہیں بنے ہوئے ہیں۔ جنوبی رخ کے بعد قدرے جھکاؤ کے ساتھ چوتھائی میل تک مشرق کی طرف چلی جاتی ہے۔ پھر جنوب کا رخ اختیار کرتی ہے۔ یہاں تک کہ بحیرۂ مردار میں جا کر گم ہو جاتی ہے۔

اس وادی کے آخری موڑ پر "شمعون" کا مزار ہے۔ اس کے علاوہ فصیل شہر سے متصل اس وادی میں مسلمانوں کے مزارات، ابی سلوم کی لاٹ، سینٹ جیمز اور زکریا کے مزارات اور ان سے ذرا ہٹ کے جیسن مین باغ واقع ہے۔ بائیں طرف حضرت مریم کا گرجا ہے جہاں روایات کے مطابق مریم، ان کا خاوند جوزف اور والدین دفن ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سینٹ میری کا گرجا ملکہ "ہیلینا" نے تلاش کیا تھا۔

اس کے قریب مسلمانوں کی ایک مسجد ہے۔ یہاں سیاح حضرت مریم کے مقبرہ کی زیارت کے بعد نوافل ادا کرتے ہیں۔ قاضی مجیر الدین نے لکھا ہے۔

"حضرت عمرؓ جب سینٹ میری کے گرجا کے قریب سے گزرے تو انہوں نے دو رکعت نفل ادا کیے اور اس جگہ بعد میں مسجد تعمیر کردی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ محاربات صلیب کے دوران صلیبیوں نے اس مسجد کو شہید کر دیا تھا۔"

جیس سن کے باغ سے دو سو گز کے فاصلہ پر چار مزارات ہیں۔ جن کی اصل حقیقت مشکوک ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ابی سلوم بن سلیمان، زکریا، جیوشیفٹ اور سینٹ جیمز کے یہ مقبرے ہیں۔ ان مزارات کے قریب ہی پتھریلے ستونوں پر ایک پل بنا ہوا ہے۔ جس

کی تعمیر کی تاریخ اب تک معلوم نہ ہو سکی۔ اس سے پانچ سو گز کے فاصلے پر ''کنواری کا چشمہ'' ہے۔ چشمہ ایک غار میں وادی کی تسطح سے کم از کم بیس فٹ نیچے ہے اور وہاں تک سیڑھیاں اتر کر جانا پڑتا ہے۔ مقامی لوگ اسے ''عین الدراج'' کہتے ہیں۔ قریب ہی حزقیاہ کا تعمیر کردہ تالاب ہے۔

اس چشمے سے نیچے وادی ایک وسیع منظر پیش کرتی ہوئی وادی الوعد میں جا ملتی ہے۔ وادی الوعد کی سطح وادی کیدرون سے تیس فٹ اونچی ہے۔

وادی کیدرون کے بارے میں مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں میں عام تاثر یہ ہے کہ ''میدان حشر'' یہیں ہوگا۔

وادی الوعد جسے سینس، چیز مونگرز کی وادی اور ٹائروبین کا نام دیتا ہے۔ شہر کو تقسیم کرتی ہوئی باب دمشق میں سلوم تک چلی گئی ہے۔ کوہ زیتون اس کے مغرب میں اور کوہ موریا مشرق میں ہے۔ سلوم کا تالاب شمالی دیوار کے چھوٹے دروازے کے قریب ۵۰ فٹ لمبا، دس فٹ چوڑا اور بارہ فٹ گہرا چشمہ ہے جسے صلاح الدین ایوبی نے دوبارہ تعمیر کرایا تھا۔

پہاڑیاں

یہ مقدس شہر موریہ اور صیہون کی پہاڑیوں پر واقع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو پہاڑیاں کہنا مبالغہ ہے کیونکہ صیہون بحیرۂ روم سے صرف ۲۶۰۰ فٹ اور موریہ سے ۲۵۰۰ فٹ بلند ہے۔ ان کی اہمیت محض اس لیے ہے کہ انہیں اس شہر کے لیے منتخب کیا گیا۔ ایسا کیوں ہوا۔ بعض جغرافیہ نویس کہتے ہیں کہ شہر کے لیے موجودہ مقام کا تعین اس کی دفاعی پوزیشن کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ شہر موجودہ مقام سے جنوب مغرب کی طرف ایک میل کے فاصلہ پر ''ریفائیم'' کے میدان یا شمال کی وسیع سطح مرتفع میں تعمیر ہوتا۔

یہ شہر موریہ اور صیہون کی پہاڑی پر واقع ہے اور ان دونوں پہاڑیوں کو وادی الوعد الگ کرتی ہے۔ مشرقی پہاڑی پر پانچ ٹیلے نمایاں ہیں۔ ان میں جو انتہائی شمال میں ہے۔ آج کل وہ شہر سے باہر ہے۔ اس ٹیلے اور شہر کو ایک مصنوعی کھائی کے ذریعے الگ کیا گیا ہے۔ مسجد صخرہ بھی اس پہاڑی کے ایک ٹیلے پر واقع ہے اور یہ موریہ کی پہاڑی ہے۔ مغربی پہاڑی یعنی صیہون کی چڑھائی بتدریج اور مسلسل ہے اور اس پہاڑی کے جنوبی حصہ پر رومن دور میں بالائی شہر آباد ہے۔ آج کل ارمنی محلّہ ہے۔ کلیسائے نشور اس پہاڑی کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔

ان کے علاوہ نواح شہر میں کچھ اور پہاڑیاں بھی ہیں۔ ان میں ایک پہاڑی زیتون کی ہے جو بالا حصار سے باہر شہر کے مشرق میں ہے۔ یہ بھی ان دونوں پہاڑیوں کی طرح اہم ہیں۔ سامنے پھیلے ہوئے صحرا میں سال میں صرف دو ماہ کے لیے ہریالی نظر آتی ہے۔ یا پھر چشمے کے کنارے سبزہ نظر آتا ہے۔ سردیوں اور سخت گرمیوں میں ان ابھرے ہوئے ٹیلوں پر لگڑ بھگے اور دوسرے وحشی جانور بسیرا کرتے ہیں۔ وادی اردن جسے ''عوز'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے پرے زرد پہاڑیاں اس طرح نظر آتی ہیں جیسے آسمان کے سامنے کسی نے دیوار تان دی ہو۔

پہاڑ کی تین چوٹیاں ہیں۔ بڑی چوٹی کو لاطینیوں اور یونانیوں نے مقدس عمارات کے لیے منتخب کیا مگر ان عمارات کی وجہ سے یہاں کی زرخیزی ختم ہو گئی۔ مشہور ہے کہ اس چوٹی سے حضرت عیسیٰ نے شہر دیکھا اور رو دیئے۔ اس جگہ وہ اپنے حواریوں کو نئی شریعت کا سبق پڑھاتے رہے اور اسی پہاڑی سے ایک بادل

میں گم ہو کر لوگوں کی نظروں سے گم ہو گئے۔ ان کے صعود کی جگہ جو گرجا تعمیر ہے اس میں ایک پتھر پر قدم کے نشان کو حضرت عیسیٰ کے زمین پر آخری نقش پا کی حیثیت حاصل ہے۔

یہ بھی مشہور ہے کہ اس پہاڑی سے مختلف ادوار میں یہود نے تین ہزار انبیاء کرام کو گرا کر شہید کیا تھا اور ستر ہزار انبیاء بھوک سے ہلاک ہوئے تھے۔ اسی پہاڑی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت دی گئی تھی۔ کلام پاک میں اس آیت "والتین والزیتون" کی تفسیر بعض مفسرین یہ کرتے ہیں کہ اللہ نے چار مبارک پہاڑیوں کی قسم کھائی ہے۔ تفسیر اس طرح ہے۔

"والتین" یہ دمشق کی ایک پہاڑی کی طرف اشارہ ہے جہاں حضرت داؤد کو زبور ملی تھی۔

"زیتون" سے بھی یہی پہاڑی مقصود ہے۔

"طور سینین" سے صحرائے سینا مراد ہے۔ جہاں حضرت موسیٰ کو توریت عطا ہوئی۔

"بلد امین" کا اشارہ مکہ معظمہ ہے جو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ اور جہاں قرآن کا ایک حصہ نازل ہوا۔

اس پہاڑی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں روایت مشہور ہے کہ زمانہ قدیم میں یہاں زیتون کے درخت تھے جو امتداد زمانہ میں ناپید ہو گئے۔ البتہ انجیر کے درخت آج بھی موجود ہیں۔ جدید یروشلم کے جنوب میں "جرم کی پہاڑی" ہے جسے جبل ہارون، طور ہارون اور کوہ طور بھی کہا جاتا ہے۔

مقدسی لکھتا ہے۔

"یہ مقدس پہاڑ یروشلم کے جنوب میں واقع ہے۔ ہارون اس پر اپنے بھائی کے ساتھ چڑھے تھے مگر واپس نہ آئے۔ تب یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگائی کہ انہوں نے بھائی کو مار ڈالا۔ مگر انہوں نے پہاڑ کی مسطح چوٹی پر وہ جنازہ لوگوں کو دکھایا جو ہارون کا تھا۔

لیکن مورخ مسعودی اس واقعہ کو جبل مآب سے منسوب کرتا ہے اور صحیح یہی ہے۔

جنوب مغرب میں Hill of Evil Council ہے۔ جسے ہنوم کی گہری وادی صیہون سے الگ کرتی ہے۔ صلیبی محاربات میں یہ پہاڑی انسانی حملوں کی زد میں تھی اور اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس جگہ قبرستان تھا۔ ان ایوانوں کے پچھلے حصہ میں "مردے" کی لاش رکھ دی جاتی اور بالائی منزل پر ان کے لواحقین رہتے۔

اس پہاڑی پر باب یافہ سے مغرب میں ایک جگہ ایک یونانی مقبرہ دریافت ہوا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہیرود کی شہزادی مریم دفن ہے۔ جسے ہیرود نے ہلاک کر دیا تھا۔

بیت المقدس کا انتظام

اسلامی دور حکومت سے پہلے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے عہد میں یروشلم اپنی سلطنت کا صدر مقام تھا لیکن عہد اسلامی میں اس کی یہ کیفیت اور حیثیت ختم کر دی گئی تھی۔ حضرت عمرؓ نے جب ملک شام کی انتظامی تقسیم کی تو بیت المقدس، جند فلسطین کا حصہ بنا۔ فلسطین، شام کا ایک صوبہ تھا لیکن اہل شام "جند" کو فوجی فوجی اضلاع کے معنی میں استعمال کرتے تھے۔ عہد فاروقی میں جند فلسطین میں میدان عکہ کے جنوب میں خلیج اردن اور بحر لوط تک کا سارا علاقہ شامل تھا۔ اس جند کی مغربی سرحد پر سمندر، جنوب میں دشت تیہ اور مصر کا راستہ حد بندی کرتا تھا۔ اموی دور حکومت میں جند فلسطین کی حدود میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی البتہ عہد سلیمان بن عبدالملک میں

اس کا دارالحکومت "رہا" سے "رملہ" منتقل کر دیا گیا۔ رملہ، سلمان نے ہی بسایا تھا۔ عہد عباسیہ میں بھی کوئی تبدیلی نہ ہوئی مگر جب صلیبی قابض ہوئے تو یروشلم ایک بار پھر سیاسی حیثیت اور اہمیت اختیار کر گیا اور اسے یروشلم کی ریاست کا دارالحکومت بنایا گیا۔

فرنگیوں کا قبضہ ختم ہونے کے بعد چودھویں صدی عیسوی میں ابوالفداء نے جند فلسطین کے ماتحت اضلاع کا ذکر کرتے ہوئے الجنار اور رتیہ کے اضلاع کو بھی اس کے ماتحت اضلاع بیان کیا ہے۔ یعقوبی نویں صدی عیسوی میں بیان کرتا ہے کہ فلسطین کی ولایت میں شام کا مغربی حصہ شامل ہے۔ رفغ سے اسلجون تک اس کی لمبائی ایک سوار دو روز میں طے کرتا ہے اور اس کی چوڑائی یافہ سے اریحا تک طے کرنے کے لیے بھی اتنا ہی عرصہ درکار ہے۔

وہ مزید لکھتا ہے۔

"جند فلسطین میں زغر اور دیار قوم لوط، الجبال اور الشراہ تک کا علاقہ شامل ہے۔"

اصطخری کے مطابق ولایت شام اور فلسطین سب سے زرخیز ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں یاقوت نے یروشلم کو ولایت فلسطین کا دارالحکومت لکھا ہے۔

سیوطی کا بیان ہے:۔

فلسطین کا صدر مقام ایلیا (بیت المقدس) رام الکہ سے اٹھارہ میل پر واقع ہے۔

ترکمانِ عثانی کے دور میں ولایت فلسطین کے پاشا (لیفٹیننٹ گورنر) کے اکثر دفاتر یہیں تھے اور جب اسے برطانیہ کا انقلابی علاقہ قرار دیا گیا تو برطانیہ نے اس کے انتظام کے لیے کمشنر مقرر کیا۔

۱۹۴۸ء کی جنگ کے بعد یہ شہر اور فلسطین کے بعض دوسرے علاقے مملکت ہاشمیہ اردن کا حصہ بنے۔

بیت المقدس کی شرعی حیثیت

کلام اللہ میں بیت المقدس یا یروشلم وغیرہ کے الفاظ کے ساتھ تو بیت المقدس کا کہیں ذکر نہیں۔ البتہ اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

ترجمہ:۔

"پاک ہے وہ رب جو لے گیا اپنے بندے کو رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف کہ جس کے گرداگرد ہم نے برکت نازل کی ہے تاکہ ہم اپنی نشانیاں دکھائیں۔ تحقیق وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔"

آیئے اب ہم دیکھتے ہیں کہ اقوام متحدہ میں فلسطین (بیت المقدس) کا کیا فیصلہ ہوا؟

تقسیم فلسطین کی قرارداد کو منظور کرنے کے لیے دو تہائی ووٹوں کی ضرورت تھی۔ دو مرتبہ یہ مرحلہ آیا لیکن دونوں مرتبہ اسے ملتوی کر دیا گیا کیونکہ اس کے دونوں محرکوں (امریکا، روس) کو کامیابی کی امید نہ تھی۔ اس کے دوران ہی امریکا کی طرف سے واشنگٹن میں اعلیٰ سطح پر ان تین چھوٹی اقوام پر زبردست دباؤ ڈالا گیا اور ۲۹ نومبر کو تینوں فیصلہ کن ووٹ ہیٹی، لائبیریا اور فلپائن نے ان تین ووٹوں نے دو تہائی اکثریت کو ممکن بنا دیا حالانکہ اس سے قبل یہ تینوں ملک اس کے خلاف تھے۔

امریکی کالم نگار نے لکھا ہے۔

اس کی حمایت میں ووٹ حاصل کرنے کے لیے کئی لوگوں نے اپنا اثر و رسوخ اور دباؤ استعمال کیا۔ لائبیریا میں ربر کے باغات کے مالک ہاروے فائر سٹون نے لائبیریا کی حکومت کو مجبور کر دیا کہ اڈلف بیرل نے جو صدر کے مشیر تھے۔ ہیٹی کا ووٹ ڈلوا دیا اور بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ وہائٹ ہاؤس میں کیا ہوا۔ صدر ٹرومین نے قائم مقام وزیر خارجہ لووٹ کو بدھ پھر جمعرات کے دن وارننگ دی کہ اگر امریکا کے روایتی ساتھیوں نے اس مسئلہ پر امریکا کا ساتھ نہ دیا تو وزیر خارجہ سے جواب طلبی کی جائے گی۔

نائب وزیر خارجہ نے تائید کی ہے کہ وہائٹ ہاؤس نے ان ووٹوں کے لیے براہ راست یا بالواسطہ طور پر دباؤ ڈالا اور ہر ہتھکنڈہ استعمال کیا۔''

اور پھر وہی ہوا جو یہودی چاہتے تھے۔ کیوں نہ ہوتا۔ نیویارک کا ایک وکیل اپنی کتاب ''یہودی دنیا پر حکمران ہیں'' میں لکھتا ہے کہ:۔

''اقوام متحدہ بجائے خود وہ عالمی مملکت ہے جس کا خواب یہود کے عظیم رہنماؤں نے پروٹوکول میں دیکھا تھا۔''

قرار داد کا اعلان ہوتے ہی مسلح یہودیوں نے مسلمانوں کا قتل عام وسیع پیمانے پر شروع کر دیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ علاقے پر قابض ہونا چاہتے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی لکھتے ہیں۔

''عربوں پر جو مظالم کیے گئے وہ کسی طرح ان مظالم سے کم نہ تھے جو نازیوں نے یہودیوں پر کیے تھے۔''

''دیریاسین'' میں ۹ اپریل ۱۹۴۸ء کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے۔

''عرب عورتوں اور لڑکیوں کا برہنہ جلوس نکالا گیا اور یہودی موٹروں پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر جگہ جگہ اعلان کرتے پھرے کہ ''ہم نے دیریاسین کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے۔ اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارے ساتھ یہی کچھ ہو تو یہاں سے نکل جاؤ۔''

یہودیوں کی اس دہشت گردی کے نتیجے میں ...۷۰۰ عرب شہید اور تین لاکھ بے گھر ہو گئے تھے اور اس مرحلہ پر سلامتی کونسل میں اقوام متحدہ کی خصوصی کمیٹی کی رپورٹ زیر بحث تھی جس میں تقسیم فلسطین کو ناقابل عمل قرار دیا گیا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس مرحلہ پر امریکہ، عرب ممالک میں اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر غیر جانب دار تھا اور اس نے تقسیم کے منصوبہ کو ناقابل عمل قرار دے دیا تھا کہ روسی نمائندہ گرومیکو نے تقسیم فلسطین کی حمایت میں زبردست تقریر کی اس صورت حال سے امریکا گھبرا گیا۔ اسے خطرہ لاحق ہوا کہ اگر اس نے حمایت نہ کی تو یہودی جن کے سرمایہ پر امریکی معیشت کا انحصار ہے۔ اس سے بدظن ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ بھی روس کے ساتھ اسی کشتی میں سوار ہو گیا۔ ابھی جنرل اسمبلی میں بحث جاری تھی کہ ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو برطانیہ نے واشنگٹن ٹائم کے مطابق شام کے چھ بجے فلسطین سے دست کش ہونے کا اعلان کر دیا۔ چھ بج کر ایک منٹ پر یہودیوں نے تل ابیب میں اسرائیل اور اسرائیلی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ دس منٹ بعد امریکا نے اور پندرہ منٹ بعد روس نے اسے تسلیم کر لیا۔ حالانکہ اس وقت تک اقوام متحدہ نے یہودیوں کو فلسطین میں اپنی قومی حکومت قائم کرنے کا مجاز نہ کیا تھا۔

اس اعلان کے وقت تک چھ لاکھ سے زیادہ عرب بے گھر ہو چکے تھے اور اسرائیل اقوام متحدہ کی تجویز کے بالکل خلاف بیت المقدس کے آدھے سے زیادہ حصے پر قابض ہو چکا تھا۔ اس نے عرب ریاست میں قزاز، سلامہ، سارس، بیار اور عمواس کے دیہاتوں پر قبضہ کر لیا تھا۔

پھر ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو عربوں پر یہودی حملوں میں اضافہ ہو گیا اور گرد و پیش کی عرب ریاستوں نے بے سہارا عرب آبادی کو مار دھاڑ سے بچانے کے لیے مداخلت کرتے ہوئے اپنی فوجیں فلسطین میں داخل کر دی تھیں۔ اس جنگ میں مقامی عیسائی عربوں نے غزہ کی پٹی، بیر سبع، ذوالکرم، نابلس ان سے خالی کرا لیے اور بیت المقدس کے قدیم حصہ پر قبضہ کر کے تل ابیب (اسرائیلی دارالحکومت) تک پہنچ

گئے۔ یہودیوں کی ناکامی پر بڑی طاقتوں نے مجلس اقوام متحدہ کو جنگ بند کرنے پر مجبور کیا اور عرب لیگ نے گیارہ جون کو بین الاقوامی رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے عارضی صلح کے طور پر چار ہفتوں کے لیے جنگ بند کردینے کا فیصلہ کیا۔ یہ عارضی صلح عربوں کے لیے زہر قاتل تھی جس نے عربوں کی فتح کو شکست میں بدل دیا۔

اس صلح سے یہ طے پایا کہ باہر سے کوئی یہودی فلسطین میں داخل نہ ہوگا۔ فریقین اپنے اپنے علاقوں پر قابض رہیں گے۔ باہر سے نہ کوئی اسلحہ آئے گا اور نہ کوئی جنگی اقدام کیا جائے گا۔ لیکن یہودیوں نے یہ صلح صرف دم لینے اور تیاری کی تکمیل کے لیے کی تھی۔ انہوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور چیکوسلواکیہ سے دھڑا دھڑ اسلحہ آنے لگا۔

ایک یہودی مصنف نے لکھا ہے۔

''اس عظیم تر اسرائیل میں پورا شام، پورا لبنان، اردن اور عراق کا بڑا حصہ، صحرائے سینا، بالائی نجد اور مدینہ منورہ تک شامل ہے۔ کیونکہ سرور کائنات کے زمانہ میں یہاں یہود مدینہ میں آباد تھے۔''

بن گوریان نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

''یہودیوں کے لیے الگ سلطنت کا قیام صیہونیت کا واحد مقصد نہیں ہے۔ بلکہ اسرائیل کے قیام کے بعد ہمیں اپنی تحریک کو آگے بڑھانا ہے۔ اسرائیل کی حکومت صرف ایک وسیلہ ہے۔ منزل نہیں۔''

اور مسٹر بجمن نے اسرائیلی پارلیمنٹ میں پہلے پہلے کہا تھا۔

''اسرائیل کے لوگوں اور خود اسرائیل کی اس وقت کوئی اہمیت نہیں جب تک ہم اپنا پورا علاقہ بغیر امن کے صلح ناموں پر دستخط کر کے آزاد نہ کرالیں۔''

جون ۱۹۶۷ء میں جو جنگ ہوئی۔ اسرائیل اس جنگ کے لیے مدت سے تیاری کررہا تھا۔ جبکہ عرب اس کے برخلاف اس پیمانہ کی تیاری نہ کرسکے۔ قیام اسرائیل کے بعد سے یہودیوں کا ہر قدم یہودی قوم کو ایک جنگجو فوج میں بدلنے کے لیے ہوتا ہے۔

۱۹۵۱ء میں ایک یہودی صنعت کار نے ایک صنعتی رسالہ میں لکھا تھا۔

ہر معاشی قدم اور ہر ترقیاتی پروگرام فوجی نقطہ نظر سے بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسرائیل کی مختلف شعبوں میں تعمیر وترقی کی منصوبہ بندی، فوجی ضروریات کے مطابق کچھ اس انداز میں ہوتی ہے کہ اسے کسی بھی وقت فوجی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔''

مسٹر شیرٹ جو پرانے وزیر خارجہ تھے، انہوں نے یروشلم میں ہجانہ کے ایک اجلاس میں کہا تھا۔

''میں اسرائیل کے لوگوں سے کہتا ہوں کہ وہ خود کو مضبوط اور طاقت ور بنائیں۔ تمام اسرائیل کو جنگ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

اس نے اپنی کتاب ''میدان جنگ'' میں لکھا ہے۔

''تنہا فوج فتح کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ بلکہ پوری قوم کو اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

اسرائیل میں جس قدر جنگی تیاریاں ہورہی تھیں اس نے ایک یہودی جرنلسٹ کو بھی اس نئے رجحان کی مذمت کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں ایک کتاب لکھی۔ جس پر اس کے خلاف زبردست ایجی ٹیشن ہوا اور اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ چنانچہ اس نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا۔

''میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسرائیل میں اولیت انتہائی متشدد یہودیوں کی نئی نسل پیدا کرنے

کو حاصل ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ جوانوں کو کس طرح جنگی پیمانے پر تربیت دی جاتی ہے اور فوجی کارروائیوں کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ بالکل وہی ہے جو نازیوں اور فاشسٹوں نے اپنایا تھا۔ انہیں بالکل ان جارحانہ اصولوں پر تعلیم دی جاتی تھی۔ جو فوجی طاقتیں اپنے جوانوں کی تربیت کے لیے اختیار کرتی ہیں۔ بچوں کی پرورش خالصتاً جنگی لائنوں پر ہوتی ہے۔ اسرائیل کی فضا میں جارحیت اور حملہ آوری کا جذبہ طاری ہے اور میں نے سارے اسرائیل میں ایک ہی پکار سنی ہے...... جنگ کی پکار اور یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کا سالانہ جنگی بجٹ ۱۹۴۸ء سے اب تک کبھی بھی تین کروڑ ڈالر سے کم نہیں ہوا۔''

جون ۶۷ء کی جنگ سے پہلے امریکی فوجی ماہرین نے اس کی جنگی تیاریوں کے پیش نظر واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ وہ صرف چار پانچ یوم میں اپنے گردوپیش کی عرب ریاستوں کو پیٹ ڈالے گا۔ سیاسی حیثیت سے ہر موقع پر امریکا اور اس کے ساتھی اس کی پشت پناہی کرتے رہے ہیں اور انہی کی حمایت کی وجہ سے اقوام متحدہ اس کی پے درپے زیادتیوں کا تدارک نہ کرسکی۔ نومبر ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۷ء تک اقوام متحدہ کی ۲۸ ریزولیشنز وہ مسترد کرچکا تھا۔

نومبر ۱۹۶۶ء تک اقوام متحدہ نے اس کے خلاف گیارہ مرتبہ قرارداد مذمت پاس کی مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کی جرأت و بے باکی کا اندازہ آپ اس سے کرلیجیے کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ اسرائیل کے وزیراعظم لیوی اشکول نے علی الاعلان کہا۔

''اگر اقوام متحدہ کے ۱۲۲ ممبروں میں سے ۱۲۱ بھی فیصلہ دے دیں اور تنہا اسرائیل کا اپنا ووٹ ہو اور وہ ہمارے حق میں رہ جائے تب بھی ہم اپنے علاقوں سے نہیں نکلیں گے۔''

اور یہ سب کیوں؟ اس لیے کہ اسرائیل کو تمام بڑی طاقتوں کی حمایت حاصل ہے۔ کفر، اسلام کے خلاف متحد ہے۔ جنگ شروع ہونے سے قبل امریکا اس قدر مضطرب تھا کہ امریکا کے ایک خاص فوجی وفد نے اسرائیلی انتظامات کا معائنہ کیا اور جنگ سے ایک ہفتہ قبل امریکی فوج کے جوائنٹ چیف آف اسٹاف جنرل وہیلر نے صدر جانسن کو رپورٹ دی کہ اگر اسرائیل پہل کرکے ایک کامیاب ہوائی حملہ کردے تو تین چار دن کے اندر عربوں کو مار لے گا۔ اس کے بعد جانسن نے روس سے یہ یقین دہانی حاصل کی کہ وہ جنگ میں عملاً کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ اس پر بھی چھٹا امریکی بحری بیڑہ مصر اور اسرائیل کے سواحل کے نزدیک مستعد کھڑا رہا۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ کا ایک طیارہ بردار جہاز مالٹا میں، دوسرا عدن میں اسرائیل کے ایک منٹ کے نوٹس پر مدد کے لیے تیار کھڑا تھا۔ ''لندن ٹائمز'' نے جنگ کے بعد جون ۱۹۶۷ء کی مقدس جنگ کے نام سے جو کتاب شائع کی ہے وہ واضح طور پر ثابت کرتی ہے کہ اسرائیل کے ساتھ فرنگی ہمدردی کے پس منظر میں صلیبی جذبہ کارفرما تھا۔ چنانچہ اس کتاب کے جس باب میں ''بیت المقدس پر یہودی قبضہ'' کا بیان ہے اس کا عنوان (Back After 896 years) ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ۸۹۶ برس پہلے بیت المقدس پر سے صلیبی عیسائیوں کا قبضہ ختم ہوا تھا۔ نہ کہ یہودیوں کا۔ جنگ میں روس نے جو کردار ادا کیا اس پر یوگوسلاویہ کے ایک ڈپلومیٹ کا یہ تبصرہ بہترین ہے کہ۔

''ایک بڑی طاقت جب تمہارا ساتھ چھوڑتی ہے تو وہ تم کو پیراشوٹ کے بغیر ہوائی جہاز سے گرادیتی ہے۔''

بہر حال، یہودی منصوبے کا تیسرا مرحلہ مکمل ہوچکا ہے۔ فلسطین اور جزیرہ نمائے سینائی پر اسے تسلط حاصل ہوگیا ہے۔ اب وہ اس منصوبے کے آخری مرحلہ کی تکمیل کررہا ہے۔ اس مرحلے کے دواجزا اہم ترین ہیں۔

ایک یہ کہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو منہدم کرکے اس کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کیا جائے۔

دوسرا یہ کہ اسرائیل اپنی میراث کے ملک پر قبضہ کرلے۔

خیال رہے کہ مسجد اقصیٰ میں آتشزدگی کا واقعہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا اور اگر وہ اس مرحلہ میں کامیاب ہوگیا تو پھر اس کا دوسرا دارز مین بطحا پر ہوگا کیونکہ اس کی میراث کا ملک ''نیل سے فرات تک'' ہے اور اس میں دریائے نیل تک مصر، پورا اردن، پورا شام، پورا لبنان، عراق کا بڑا حصہ، ترکی کا جنوبی حصہ اور مدینہ منورہ تک حجاز کا پورا بالائی علاقہ شامل ہے۔

دیگر زیارتیں

مہد مسیح

حرم کے احاطہ میں جنوب مشرقی گوشے میں ایک چھوٹی سی زمین دوز مسجد ہے جو مہد مسیحؑ کے نام سے مشہور ہے۔ ابن عبدربہ نے محراب مریم بنت عمران اور مقدسی نے محراب مریم وزکریا کے نام سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ محراب مریم میں فرشتے حضرت مریم کے واسطے گرمیوں میں سردی اور سردیوں میں گرمیوں کے پھل لایا کرتے تھے۔ محراب زکریا اس کے قریب ہی ہے جہاں فرشتوں نے انہیں ولادت کی بشارت دی تھی۔ مہد مسیح میں قدیم زمانہ سے حضرت مسیح کا جھولا رکھا ہے۔ یہ جھولا پتھر کا اور اتنا چوڑا ہے کہ ایک آدمی اس میں نماز پڑھ سکتا ہے۔ یہ زمین میں گڑا ہوا ہے۔ حضرت مسیح اسی میں لٹائے گئے تھے اور انہوں نے عالم شیر خوارگی میں لوگوں سے گفتگو فرمائی تھی۔ اس کو مسجد کی محراب بنادیا گیا ہے۔ محراب زکریا اور محراب مریم اس کی مشرقی جانب ہیں۔ روایت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اسی جگہ پیدا ہوئے تھے۔

یہاں ایک ستون پر انگلیوں کے نشان ہیں جن کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت مریم نے دردزہ کی شدت میں اس پتھر کو زور سے پکڑا تھا اور یہ ان کی انگلیوں کے نشان ہیں۔ ناصر خسرو کے الفاظ میں اس میں چاندی اور پیتل کے فانوس لٹکے ہوئے ہیں جنہیں ہر شب روشن کیا جاتا تھا۔

صلیبیوں نے اپنے دور میں حرم شریف کے ان زمین دوز مقامات سے اصطبل کا کام لیا۔ آج یہ اصطبل مہد عیسیٰ کے مغرب میں ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک دروازہ کھلتا ہے۔ صلیبیوں کے قبضہ سے قبل حرم شریف کے شمالی پہلو میں واقع محراب داؤد ختم ہوگئی۔ البتہ اس کے قریب ''کرسی سلیمان'' جو قد آدم بلند چٹان ہے باقی ہے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ حضرت سلیمانؑ ہیکل کی تعمیر کے زمانہ میں اس پر بیٹھتے تھے۔ سیوطی لکھتا ہے کہ ہیکل کی تعمیر کے بعد حضرت سلیمانؑ نے اس جگہ تین ہزار بچھیاں اور سات ہزار بھیڑیں قربان کی تھیں۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ محراب داؤدؑ قلعہ بیت المقدس کے اندر ہے۔ جب وہ حرم میں تشریف لاتے تو محراب کلاں میں نماز ادا کرتے اور حضرت عمرؓ نے حضرت داؤدؑ کی پیروی میں یہاں نماز ادا کی تھی اور اسی روز سے یہ ''محراب عمر'' مشہور ہوگئی۔

منبر داؤدؑ جسے مجیر الدین قبہ سلیمان کہتا ہے، حرم

شریف کی جنوبی دیوار میں دربستہ محراب ہے اور باب العلم کے سامنے اور اس دروازے کے قریب ہی جنوب مغرب میں واقع ہے۔ ناصر خسرو نے حرم شریف کے شمالی حصہ میں منبر داؤدؑ کے علاوہ دو اور گنبدوں (۱) قبۂ یعقوب (۲) محرابِ زکریا کا ذکر کیا ہے۔ قبۂ یعقوب سے غالباً وہ گنبد مراد ہے جو آج کل قبۂ سلیمان کہلاتا ہے اور محرابِ زکریا کا کوئی اثر آثار باقی نہیں۔

مجیر الدین لکھتا ہے کہ باب السلسلہ کے مقابل قبۂ موسیٰ بنا ہوا ہے لیکن اس کو حضرت موسیٰ سے کوئی نسبت نہیں۔ یہ ۶۴۹ھ (۱۲۵۱ء) میں ازسرِ نو تعمیر ہوا اور اس سے پہلے قبۃ الشجرہ کہلاتا تھا۔ مجیر الدین کے الفاظ میں حرم شریف کے چاروں مینار اسی مقام پر قائم ہیں جہاں عبدالملک کے زمانہ میں تھے۔

حضرت سلیمانؑ کا مصلیٰ یا کرسی

بابِ حطہ میں داخل ہوکر داہنی طرف مسجد کے شمالی دروازہ شرف الانبیاء پر نظر پڑتی ہے۔ باب الحطہ اور اس باب کے درمیان چار ستونوں پر قبلہ قائم ہے جس میں قبلہ رُو محراب بنی ہوئی ہے۔ اسے حضرت سلیمانؑ کا مصلیٰ کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان معبد کی تعمیر کے وقت یہیں بیٹھ کر فیصلہ دیا کرتے تھے۔

روضۂ سلیمانؑ

یہ روضہ حرم شریف میں مسجد صخرہ کی جانب مشرق میں تین سو قدم کے فاصلے پر بیرونی دیوار سے متصل ایک مقفل کمرے میں واقع ہے۔ کمرے کے دونوں جانب جالی دار کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں جن سے قبر دیکھی جاسکتی ہے۔ قبر کی لمبائی سات گز ہوگی۔ قبر شمالاً جنوباً ہے اور کمرے کے متصل حبس سلیمانؑ (قید خانہ) ہے جہاں شریر جنات کو قید و بند میں رکھا جاتا ہے۔ اصطبل یہاں سے ذرا فاصلہ پر ہے۔

دیوار براق

یہ وہ جگہ ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات براق کو یہاں باندھا تھا۔ اس کے علاوہ حرم میں خواتین کے لیے ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہے جس میں ظہر، عصر اور مغرب کی نماز ایک اندھا امام عورتوں کو پڑھاتا ہے۔

مزار محمد علی جوہر

مولانا محمد علی جوہر کا مزار مسجد صخرہ کے بالمقابل جانب مغرب ایک بند کمرے میں ہے۔ کتبہ پر عربی عبارت لکھی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

اللہ تعالیٰ مومنوں کو ان کے جان و مال کے صدقے جنت دے گا۔ یہ مجاہد عظیم مولانا محمد علی جوہر ہندی کی قبر ہے۔ (اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت میں جگہ دے) انہوں نے پندرہ شعبان کو لندن میں وفات پائی اور جمعہ کے دن پانچ رمضان ۱۳۴۹ ہجری کو قدس میں دفن کیے گئے۔

دیوارِ گریہ

حرم شریف کی مغربی دیوار میں پچاس فٹ کے ایک ٹکڑے کے بارے میں یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ ہیکل سلیمانی کی باقیات میں سے ہے۔ چنانچہ وہ اس مقام پر آتے اور گریہ وزاری کرتے ہیں اور اسی نسبت سے اس کا نام دیوارِ گریہ پڑ گیا۔ اس مقام کو مسلمان "البراق" کہتے ہیں کیونکہ شب معراج کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ براق سے اترے اور براق کو باندھا اور مسجد میں تشریف لے گئے۔ اس جگہ کی نشاندہی کرنے کے لیے یہاں ایک گول کڑا لگا ہوا ہے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب حضرت عمرؓ

بیت المقدس میں داخل ہوئے اس وقت دیوارِ گریہ کا کوئی وجود نہ تھا۔ حضرت سلیمان کے بعد معبد کو تباہ ہوئے صدیاں بیت چکی تھیں اور ہیرود نے اس کی جگہ جو عمارت تعمیر کرائی تھی اسے بھی ۷۰ء میں طیطس رومی مکمل طور پر تباہ کر چکا تھا اور اس کے جو آثار باقی رہ گئے تھے اسے ملکہ ہیلینا نے مٹا دیا تھا۔ خلیفہ عبدالملک نے قبۃ الصخرہ اور خلیفہ ولید بن عبدالملک نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کرائی۔ حرم شریف کی موجودہ چار دیواری ترکان عثمانی کے دور میں تعمیر ہوئی جو بعض قدیم آثار پر اٹھائی گئی تھی۔ سر رابرٹ نے اپنی کتاب ”مشرق و مغرب میں طوفانی مرکز“ میں لکھا ہے کہ:

”فتح بیت المقدس کے بعد جب سلطان سلیم اول مسجد اقصیٰ میں زیارت کے لیے آیا تو اس نے مسجد کے نواح ہی میں قیام کیا۔ ایک صبح اس نے اس مقام پر جہاں آج کل دیوارِ گریہ ہے ایک عیسائی خاتون کو غلاظت پھینکتے دیکھا اور اس کی طبیعت پر یہ ڈھیر گراں گزرا۔ دریافت حال پر معلوم ہوا کہ عیسائی اکثر کوڑا کرکٹ اسی مقام پر ڈالتے ہیں۔ اس پر سلطان سلیم نے مسجد کے قریب کوڑا کرکٹ پھینکنے کی مکمل ممانعت کر دی اور سلیمان اعظم کے دور میں شہر کی فصیل کے ساتھ حرم شریف کی چار دیواری بھی ۱۵۴۲ء میں مکمل ہوئی۔“

اس کے علاوہ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ شاہ ہیڈرین نے ۱۳۵ء میں یہودیوں کو بیت المقدس سے نکالا تو صدیوں ان کا شہر میں داخلہ بند رہا۔ البتہ ایک یہودی مصنف کے مطابق ۴۱۰ء میں وہ عیسائی حکمرانوں سے اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ نواحی پہاڑیوں سے بیت المقدس کو دیکھ سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ جب فاتح بن کر آئے اور عیسائیوں سے معاہدۂ صلح ہوا اس میں عیسائیوں نے خاص طور پر مسلمانوں کو پابند کیا تھا کہ یہودی ان کے ساتھ شہر میں آباد نہیں ہو سکیں گے۔ گو بعد میں اس معاہدہ کی بہت کم پابندی ہو سکی مگر اس کے باوجود شہر بیت المقدس میں یہودی کبھی آباد نہیں ہوئے۔ البتہ جب تحریک صیہون شروع ہوئی تو انہیں ہیکل کا خیال آیا اور صیہونی رہنماؤں نے انہیں دیوارِ گریہ کی زیارت کے لیے اکسایا۔ یہ انیسویں صدی کی بات ہے جب یہودی ربیوں نے ترکوں سے درخواست کی کہ ان کا مذہب انہیں حرم کے باہر گریہ وزاری کرنے کا حکم دیتا ہے تو فراخ دل ترکوں نے ان کے مذہبی احساسات کا احترام کرتے ہوئے انہیں مغربی دیوار کے باہر اس کی اجازت دے دی لیکن حکم دیا کہ وہ دیوار سے تیس فٹ پیچھے رہیں۔ یہ اجازت حاصل کرنے کے لیے یہودیوں نے انتہائی مکروہ فریب سے کام لیا اور طویل جدوجہد کی۔ یہ اجازت انہیں کب ملی؟ تاریخ اس بارے میں قطعاً خاموش ہے۔ البتہ تاریخ سے اتنا معلوم ہوا ہے کہ انیسویں صدی تک مقدس مقامات کے خادموں اور سربراہوں کے سوا کسی غیر مسلم کو شہر کی فصیل کے اندر قیام کی اجازت نہیں تھی۔

اس سلسلے میں اس قدر سختی برتی گئی تھی کہ کوئی سفارتی نمائندہ بھی فصیل کے اندر نہیں رہ سکتا تھا۔ البتہ سال کے ایک مقررہ وقت میں سیاحوں اور زائرین کو اندر جانے کی اجازت تھی مگر انیسویں صدی کے اوائل میں پہلے اسپین پھر مشرقی یورپ کے یہودی مہاجرین کو اس پابندی سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا جو انتہائی بے بسی اور افسوس کی حالت میں یہاں پہنچے اور اپنے یہودی رشتہ داروں کی خیرات پر گزارہ کرتے تھے لیکن جب ۱۸۳۱ء میں فلسطین اور شام پر حاکم مصر قابض ہو گیا تو قدیم

بیت المقدس کی ہیئت میں تبدیلی کی رفتار کسی قدر تیز ہوگئی۔ ملک میں ابتری پھیل گئی اور فلسطین کے دروازے یہودی تاجروں' مشنریوں اور سیاحوں پر کھول دیئے گئے۔ مصری انتظامیہ نے یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں خاص فراخدلی کا مظاہرہ کیا اور بیت المقدس میں پہلا برطانوی قونصلیٹ قائم ہوا جس کا ایک حق یہودی کی نگرانی اور حفاظت تھا۔ برطانیہ نے یہودیوں کو عیسائی بنانے کے لیے ایک خفیہ بشپ کا تقرر کیا اور مصری انتظامیہ پر زبردست دباؤ ڈال کر شہر میں نئے پروٹسٹنٹ چرچ کی تعمیر کی اجازت حاصل کرلی۔

یہ عہد اسلامی میں غیر مسلموں کا پہلا نیا معبد تھا جو شہر کے اندر تعمیر ہوا۔ مصر کے دورِ اقتدار میں بیت المقدس میں یہودیوں کے دو گروہ تھے جو ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ سفارڈم' جن کی اکثریت اسپین سے آنے والوں پر مشتمل تھی' جو عثمانی کنیوں کی رعایا تھے جنہوں نے نہایت محتاط انداز میں اور عیاری سے متصل عمارتوں کو چار کنیوں میں تبدیل کردیا تھا لیکن ان کی چھت ایک ہی تھی۔ ترک حکام نے ان کی نمائندگی کے لیے ایک حال ہی میں پروشیا' آسٹریا' پولینڈ اور روس سے آئے تھے اور جن کی حفاظت اور نگرانی برطانوی قونصلیٹ کے ذمہ تھی۔ انہوں نے چونکہ اپنی غیر ملکی شہریت برقرار رکھی تھی اس نئے ''کنیے'' کی تعمیر اور مقدس مسلم جائیداد پر قبضہ کرنے اور خرید زمین کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی۔ عثمانی قوانین کے تحت کسی غیر ملکی کو فلسطین میں جائیداد خریدنے کا کوئی حق نہ تھا اور مصری انتظامیہ نے عثمانیوں سے بغاوت کے باوجود ان قوانین کو نہیں بدلا تھا۔ اس لیے علی پاشا نے انہیں اجازت دینے میں کوئی مشکل محسوس نہ کی۔ البتہ جب کہ مسجد اقصیٰ کے ضمن میں آچکا ہے انہوں نے برطانوی قونصلیٹ کی وساطت سے مصری کمانڈر ابراہیم پاشا کو انہیں اجازت دینے پر رضامند کرلیا لیکن شہر کی مشاورتی کونسل اور شیخ المغاربہ کی مخالفت نے ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ باب المغاربہ کے باہر کی زمین کو جس میں ''مقام گریہ'' کی جگہ بھی شامل تھی' سلطان صلاح الدین کے بیٹے الافضل نے مسلم اوقاف قرار دے کر اسے شمالی افریقہ کے زائرین' علماء اور صوفیا کے لیے وقف کردیا تھا۔ ۱۳۰۳ھ میں اس جگہ زائرین کے لیے ایک زاویہ تعمیر ہوا۔ بعدازاں ۱۳۲۰ھ میں شعیب ابومدین مغربی نے اس وقت میں شمالی اور مغربی افریقہ کے زائرین اور طلباء کے زاویہ اور رہائشی مکانات تعمیر کیے۔ افریقی مسلمانوں کی مسجد اقصیٰ سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ سلطان مراکش علی بن عثمان نے ۱۳۵۲ھ میں اپنا کتابت کردہ قرآن مجید اقصیٰ کے لیے بھجوایا اور ۱۶۳۰ء میں ابومدین کی نگرانی میں باب المغاربہ کے باہر کی تمام زمین ازسرنو رجسٹر کرالی گئی۔ اس طرح ۱۸۳۹ء میں جب انہیں یہودی عیاری کا سامنا کرنا پڑا' شمالی افریقہ کے مسلمان اس زمین پر تہرا استحقاق رکھتے تھے۔ زاویہ ابومدین کے شیخ نے افریقی مسلمانوں کی طرف سے لکھا کہ ان کے مقبوضات دیوار حرم سے متصل ہیں اور یہی وہ دیوار حرم ہے جہاں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج براق سے اترے اور جہاں براق باندھا گیا۔ اس نے اس پر افسوس ظاہر کیا کہ یہود کو بلاجواز ان کے علاقے میں دخل کا حق دیا گیا لیکن یہ اجازت اس سے مشروط تھی کہ وہ کوئی شور نہیں کریں گے۔

اس میں شک نہیں کہ پچھلے چند سالوں سے ان کی تعداد میں قدرے اضافہ ہوگیا ہے اور وہ اپنی آواز کو

اس طرح بلند کرتے ہیں جیسے وہ کنیا میں ہوں لیکن اس کے باوجود انہیں مقام گریہ پختہ کرنے یا اس تک پختہ سڑک بنانے کی اجازت نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کے کسی انتہائی مقصد کی ابتداء ہے۔

مشاورتی کونسل نے اس بیان میں یہ اضافہ کیا کہ مقام گریہ زادیہ کے ساتھ ساتھ ایک تنگ گلی ہے۔ یہ گلی اور نواحی مکانات ابو مدین کے وقف میں شامل ہیں۔ یہ معاملہ بالآخر محمد علی پاشا کے سامنے پیش ہوا۔ اس نے ۲۶ مئی ۱۸۴۰ء مطابق ۲۴ ربیع الاول ۱۲۵۶ھ گورنر بیت المقدس کو لکھا کہ:

مشاورتی کونسل کی رپورٹ سے واضح ہے کہ یہود جس جگہ کو پختہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ حرم شریف سے متصل ہے اور وہ جگہ ہے جہاں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے براق کو باندھا تھا۔ اس کے علاوہ ابو مدین کا وقف ہے۔ نیز اس سے قبل یہود نے کبھی اس جگہ کی مرمت نہیں کی۔ مزید برآں شرع اسلامی کے تحت بھی ان کی درخواست قابل قبول نہیں۔ اس لیے یہود کو اس جگہ کو پختہ کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ انہیں اس جگہ شور مچانے یا اپنی آوازیں بلند کرنے کی بھی سرزنش کی جائے اور واضح کر دیا جائے کہ انہیں صرف اس جگہ کی زیارت کی اجازت ہے۔

یہ دیوار گریہ پر یہود کی حاضری کا پہلا مستند تذکرہ ہے۔ انہیں کسی مسلم مقدس مقام کی عقیدت کے طور سے زیارت کی اجازت دی گئی۔ جہاں تک کہ انیسویں صدی کے باقی سالوں کا تعلق ہے اس میں تارکین وطن یہود نے دو مرتبہ شاہی حکم سے فائدہ اٹھایا۔ ۱۸۵۴ء میں انہوں نے برطانوی قونصلیٹ کی مدد سے ایک تباہ شدہ عمارت کی جگہ معبد تعمیر کرنے کی اجازت حاصل کر لی کہ یہاں کبھی معبد تھا۔ حالانکہ کسی قدیم مسیحی یہودی یا اسلامی مصنف نے اس مقام پر کسی "معبد" کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے جو دستاویزات پیش کیں وہ جعلی تھیں اور ان کی زبان بذات خود مشکوک تھی لیکن برطانوی سفیر نے اپنا پورا اثر و رسوخ استعمال کر کے یہود کو "قدیم معبد" کی تعمیر نو کی اجازت دلوا دی اور یوں شہر قدس میں یہود کے دو معبد بھی تھے۔

اس وقت یہود کی تعداد کتنی تھی؟ اس بارے میں ترک ریکارڈ خاموش ہے کیونکہ خود یہود نے ممتاز یہودی مصنف سرموس مونٹ فونر کے مطابق ۱۸۴۹ء میں مردم شماری کی حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک یہود کی فلسطین میں آمد انتہائی بے کسی کے عالم میں تھی۔ صرف معمر یہودی اپنی زندگی کے آخری دن اس سرزمین موسیٰ میں گزارنے کے لیے آتے تھے لیکن ۱۸۸۱ء میں جب روس سے یہودیوں کا انخلاء شروع ہوا تو یہود کی آمد نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ آخر اپنی تمام فراخ دلی اور انسانیت کے باوجود عثمانی خلافت کو ۱۸۸۷ء میں ایک حکم جاری کرنا پڑا۔ جس کے تحت یورپی یہودیوں کی فلسطین میں آباد کاری اور زمین حاصل کرنے پر پابندی لگانا پڑی لیکن ناقص انتظامیہ کی وجہ سے بیرونی یہود کی آمد فلسطین و بیت المقدس میں جائیداد کی خریداری اور آباد کاری بدستور جاری رہی۔ حتیٰ کہ دس سال کے مختصر عرصہ میں یہود نے بیت المقدس میں سخت معاشی بحران پیدا کر دیا جس سے مسلمان بری طرح متاثر ہوئے۔ مسلمانوں نے ۱۸۸۱ء میں وزیر اعظم سے زبردست احتجاج کیا۔ اس کے باوجود آئندہ بیس سال میں کوئی موثر کارروائی نہ ہوئی اور اس کا ثبوت ایوانِ نائبین کی کارروائی سے ملتا ہے جہاں ۱۹۱۱ء میں صیہونیت کے طوفان پر شدید بحث ہوئی۔

۱۹۱۱ء بیت المقدس کی تاریخ میں اس لحاظ سے

نہایت اہمیت رکھتا ہے کہ یہود نے دیوار گریہ کی زیارت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس تک جانے والے راستہ پر قبضہ جمانے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا اور وہ مقامِ گریہ پر کرسیاں ساتھ لے جانے لگے۔ اس پر ابو مدین وقف کے نگراں نے احتجاج کیا لیکن ترک حکام کی ممانعت کے باوجود یہود کی روش میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ آخر حکومت نے ۱۸۴۰ء کی طرح ایک نیا حکم جاری کیا۔ ۱۲ نومبر ۱۹۱۱ء کو انتظامی کونسل نے بیت المقدس کے گورنر کو حسب ذیل مسودہ برائے حکم پیش کیا:

شعیب ابو مدین (خدا اس کی یاد ہمیشہ باقی رکھے) کے وقف کے نگراں نے شکایت کی ہے کہ یہود جو حرم شریف کی دیوار البراق کے مغربی حصہ کی زیارت کے عادی ہیں بشرطیکہ وہ زیارت کے دوران کھڑے رہیں انہوں نے اب اس روایت کے برعکس زیارت کے دوران بیٹھنے کے لیے کرسیاں لانا شروع کردی ہیں چونکہ یہ جگہ اس وقف کی ملکیت اور بند گلی ہے اس لیے نگراں نے درخواست کی ہے کہ یہود کو اس سے روکا جائے۔ کہیں وہ مستقبل میں اس پر ملکیت کا دعویٰ نہ جتادیں۔ نگراں کی درخواست پر قابل احترام مفتی اعظم مذہبی اوقاف کے محکمہ اور دینی عدالتوں نے غور کیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ جگہ ان رہائشی مکانات سے متعلق ہے جو مسجد اقصیٰ سے متصل مغربی جانب ہیں۔ یہ ایک بند کوچہ ہے جو کہ ابو مدین وقف کی ملکیت ہے اور اسلامی قوانین کے تحت اس جگہ یہود کا کرسیاں رکھنا، پردے لگانا یا کوئی ایسی شے لانا یا کوئی ایسی ایجاد کرنا جو بالآخر اقصیٰ کی مبارک مسجد کی دیوار پر ملکیت کا باعث بنے، غیر قانونی ہے۔ اس لیے یہود کو ان اختراعات سے روکنے کے لیے مناسب اقدام کیے جائیں۔

بے عزتی

ادریس: ''آج ایک دوست نے میری بڑی بے عزتی کی۔''

وقار: ''وہ کیسے؟''

ادریس: ''وہ مجھ سے پوچھنے لگا، تمہیں گانا آتا ہے۔''

وقار: ''اس میں بے عزتی کی کیا بات ہے، بالکل سیدھی سی بات پوچھی اس نے۔''

ادریس: ''لیکن اس نے کافی دیر تک میرا گانا سننے کے بعد یہ سوال کیا تھا۔''

عبدالرحمان...... کراچی

انتظامی کونسل نے تفصیلی غور وخوض کے بعد فیصلہ کیا کہ کسی ایسی شے کو اس جگہ رکھنے کی اجازت نہ دی جائے جو اس جگہ یا مسجد اقصیٰ کی دیوار پر ملکیت کا حق جتانے کا باعث بنے۔ لہٰذا حکم دیا جاتا ہے کہ اس قسم کی اختراع کا کوئی موقع نہ دیا جائے بلکہ قدیم روایت ہی کو برقرار رکھا جائے۔

پہلی جنگ عظیم کے آغاز میں جو فلسطین پر مسلمانوں کے صدیوں پرانے دور حکومت کے خاتمہ اور برطانوی قبضہ کے باعث بنی یہ پوزیشن تھی۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں صورت حال بالکل بدل گئی۔ عرب، ترکوں سے باغی ہوگئے اور برطانیہ نے آزادی کا کچھ ایسا فریب دیا کہ بیت المقدس میں ترک کمانڈر جمال پاشا کی ہر اپیل بے کار ثابت ہوئی جو اس نے اس شہر مقدس کو عیسائی قبضہ سے بچانے کے لیے تمام مسلمانوں سے مشترکہ دفاع کے لیے کی۔ جنرل ایلن بی شہر میں داخل ہوگیا اور اس نے اعلان کیا کہ:

"تینوں مذاہب کی ہر مقدس عبارت، یادگار اور عبادت کی روایتی جگہ کو خواہ وہ کسی صورت میں بھی ہو اس مذہب کے پیروکاروں کے موجودہ عقائد کے مطابق برقرار رکھا جائے گا۔"

لیکن نصف فلسطین پر ابھی ترک قابض تھے اور برطانیہ کی قطعی فتح میں ایک سال باقی تھا کہ صیہونیوں نے اس اعلان کی خلاف ورزی شروع کردی اور ۳۰ مارچ ۱۹۱۸ء کو صرف اجتماعی طور پر آہ وبکا کی بلکہ شوروہنگامہ مچایا اور دس دن بعد ویزمن کے صیہونی کمیشن نے اس حرکت کو دہرایا۔ صیہونی کمیشن کی آمد نے مسلمانوں اور عربوں میں سخت خوف وہراس پیدا کردیا تھا۔ ایک طرف مصر کے حاکم نے برطانوی حکام کو مسلمانوں کے خوف سے آگاہ کیا تو دوسری طرف لبنان کے مسیحی عرب مصنف ڈاکٹر فارس نمیر نے کمیشن کے برطانوی رابطہ افسر کو عیسائیوں کے خوف و ہراس سے باخبر کیا۔ مگر اسے یہود دشمن پروپیگنڈے کا اثر قرار دے کر نظر انداز کردیا۔ آخر ۳۰ مئی ۱۹۱۸ء کو خود وزمین نے لارڈ بالفور کے نام اپنے خط میں انکشاف کردیا۔ اس نے لکھا:

"دیوارِ گریہ فوراً حوالے کردی جائے۔ فلسطین میں یوں تو ہمارے کئی مقدس مقامات ہیں لیکن دیوارِ گریہ ہمارے قدیم ہیکل کا حصہ ہے۔ جس سے ہمارا تعلق اب تک باقی ہے۔ اس کے علاوہ باقی تمام مقامات عیسائیوں اور مسلمانوں کے قبضے میں ہیں۔ اس کے گرد بھی انتہائی غیر صحت مندانہ ماحول ہے جو یہود کے لیے ذلت اور ندامت کا باعث ہے۔ ہمارے مقدس ترین شہر میں ہماری مقدس ترین یادگار ایک مشکوک مذہبی فرقہ کے تصرف میں ہے۔ ہم اسے اس کے معاوضہ میں گرانقدر رقم دینے کے لیے تیار ہیں کیونکہ اس جگہ کو ہم صاف ستھرا، باوقار اور قابل احترام بنانا چاہتے ہیں۔"

اس پر بیت المقدس کے فوجی گورنر نے مفتی اعظم کو محتاط انداز سے مغربی دیوار سے متصل مکانات کی خریداری کے لیے رابطہ کیا لیکن ان کا جواب صرف ایک ہی تھا کہ کسی مسلم اوقاف کی کوئی جگہ کسی قیمت پر فروخت نہیں کی جاسکتی۔ مسلمان اس قدر مقدس مقام کو کسی قیمت پر فروخت کرنے کی اجازت نہ دیں گے۔

مگر یہودی کل بھی فتنہ پرور اور بے ایمان تھے اور آج بھی ان کا وہی رویہ ہے۔

فلسطین ختم ہوگیا۔ مسلمانوں کو جو کچھ بھی ملا اس سے یہودی بدظن ہیں اور اپنے حمایتی برطانیہ اور امریکہ سے ہمہ وقت آس لگائے بیٹھے کہ وہ بیت المقدس کا وہ حصہ بھی مسلمانوں سے چھین کر پورے فلسطین پر یہودیوں کو قابض کرادے۔ مگر ہم بھی مسلمان ہیں۔ ان شاء اللہ نہ صرف مسلمان بیت المقدس کے اپنے حصے کی پوری پوری حفاظت کریں گے بلکہ مقبوضہ بیت المقدس کو بھی یہودیوں سے آزاد کرائیں گے۔

اس کے ساتھ ہی قیصران نے "جوزی" کے نام کا ایک گھٹا گھٹا نعرہ لگایا اور جوزیفائن کو پھر اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ پھر دیر تک وہ دونوں سسکیاں بھرتے اور آنسو بہاتے رہے۔ جب آنسو بہانے سے دل کا غبار کچھ چھٹا تو جوزی نے کہا۔

"ممی پہلے ہی کمزور تھیں۔ اس دہرے غم نے انہیں بستر سے لگادیا۔ پھر انہوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ اب اس دنیا میں میں اکیلی تھی۔ سر پر ہاتھ رکھنے والا یا ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا۔"

جوزیفائن کے پھر آنسو بہنا شروع ہو گئے۔ قیصران کا بھی جوزی جیسا ہی حال تھا اور وہ بھی اس

کے ساتھ چپکے چپکے آنسو بہا رہا تھا۔ اس نے جوزیفائن کو تسلیاں اور دلاسے دے دے کر خاموش کرایا۔
جوزیفائن کا دل جب ذرا ٹھہرا تو اس نے بتایا۔
"تمہیں یاد ہوگا کہ ہمارے گھر کے برابر کھلونوں کی ایک دکان تھی۔ وہ لڑکوں کے لیے چھوٹی توپیں اور لکڑی کے گھوڑے بناتا تھا۔ بوڑھے دکان دار کو میرا حال معلوم تھا اس نے مجھ پر ترس کھا کر اپنی دکان پر بٹھالیا۔ اور اب میں اس کی بیٹی تھی۔ مجھے کھانے، پینے اور کپڑے لتے کی کوئی فکر نہ تھی۔ میں دن بھر اس کے کھلونے بیچتی تھی اور رات کو اسی گھر میں ایک کوٹھری میں پڑی رہتی تھی اور پھر...... ایک دن خداوند یسوع مسیح نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں کھلونوں کی دکان سے ایک دم شاہی محل پہنچ گئی......"
اسی وقت دروازے پر تین بار دستک ہوئی۔ جوزیفائن جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گئی اور دروازے کی طرف دیکھ کر بولی۔
"کیا بات ہے آمرینہ...... اندر آجاؤ۔"
دروازہ کھلا اور آمرینہ اندر آئی۔ دروازہ بند کیا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی جوزیفائن کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ جوزیفائن نے چڑ کر پوچھا۔
"کیا قیامت آگئی؟ ہماری تقدیر میں ایک لمحہ کا بھی سکون نہیں؟"
جوزیفائن کا انداز اس وقت کسی ملکہ یا شہزادی جیسا تھا۔ وہ جوزیفائن جو چند لمحے پہلے قیصران کے سینے سے لگی آنسو بہا رہی تھی وہ اس وقت ایک باوقار شہزادی کی طرح بول رہی تھی۔
آمرینہ جو قرینے سے کنیز معلوم ہوتی تھی وہ ذرا اور خم ہوگئی پھر ادب سے بولی۔
"گرانڈ سسٹر! ملکہ اینا کی خواب گاہ کے تمام

ذرا مسکرائیے

ایک سکھ نے تین سوئمنگ پول بنوائے گرم پانی کا، ٹھنڈے پانی کا اور ایک خالی۔
دوسرے سکھ نے گرم پانی اور ٹھنڈے پانی والے سوئمنگ پول بنوانے کی وجہ دریافت کی تو وہ بولا۔
"جب سردی لگے گی تو گرم میں نہاؤں گا اور جب گرمی لگے گی تو ٹھنڈے میں۔ دوسرے سکھ نے پھر پوچھا۔
مگر یہ خالی سوئمنگ پول کس لیے ہے۔
وہ بولا۔ یار! کبھی کبھی نہانے کو دل نہیں بھی چاہتا۔

نورالدین ...... کراچی

فانوس ایک ساتھ روشن ہوگئے ہیں۔ داروغہ محلات نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے آپ کو اطلاع دینے کا حکم دیا ہے۔"
جوزیفائن کچھ سوچنے لگی پھر فیصلہ کن انداز میں بولی۔
"داروغہ سے کہو فکر نہ کرے۔ ملکہ نے آج پھر کوئی نیا شکار پھانسا ہوگا۔"
"شکار......؟" قیصران کی زبان سے خود بخود نکل گیا۔
جوزیفائن نے مسکرا کر قیصران کو دیکھا اور پھر آمرینہ کی طرف۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے سامنے سوال نہ کیا جائے۔
آمرینہ واپس ہونے لگی تو جوزیفائن نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "اور داروغہ سے یہ بھی کہنا کہ اگر ملکہ واقعی اس طرف آرہی ہے تو اس کا راستہ نہ روکا جائے۔ ہم خود جواب دے لیں گے؟"

آمرینہ نے آہستہ سے سر ہلایا۔ پھر دروازہ بند کر کے واپس ہوگئی۔

قیصران فکر مند ہوگیا تھا۔ اس نے آمرینہ کے جاتے ہی کہا۔ "جوزیفائن! یہ کچھ اچھا نہ ہوا۔ اگر ملکہ یہاں آگئی تو ہماری محبت کا راز فاش ہو جائے گا۔"

جوزیفائن نے اس کے گلے میں اپنی جگمگاتی ہوئی بانہیں ڈال دیں اور بولی۔ "قیصران! میں جانتی ہوں کہ ملکہ یہاں آنے کی غلطی نہیں کرے گی۔ میں اس کے ہر راز سے واقف ہوں۔ وہ ہی کیا۔ میں تو سلطنت کے رازوں سے بھی واقف ہوں۔ اگر میں زبان کھول دوں تو قیامت آ جائے اور خون کی ندیاں بہہ جائیں۔"

قیصران کو اطمینان نہ ہوا۔ اس نے کہا۔ "جوزیفائن! ملکہ اپنا آخر ملکہ ہے۔ فوج اس کا حکم مانتی ہے۔ تبھی تو وہ کنٹا کوزین جیسے دشمن سے جنگ کر رہی ہے۔"

جوزیفائن نے قیصران کو بستر پر بٹھا دیا اور خود اس کے برابر مسہری پر ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"قیصران! تم نہیں جانتے ملکہ اور کنٹا کوزین دونوں اندر سے ایک ہیں۔ ان کی رنگین راتوں کی داستان بڑی طویل ہے۔ کوزین اگر آج بھی آ جائے تو ملکہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لے۔ مگر وہ ضدی ہے۔"

"پھر دونوں میں اختلاف کیوں ہوا؟" قیصران نے سوال کیا۔

اور جوزیفائن نے بتانا شروع کیا۔

"تخت و تاج کی ہوس بری ہوتی ہے قیصران۔ ملکہ نے اپنا سب کچھ کوزین کے حوالے کر دیا لیکن تخت و تاج اس کے اختیار میں نہ تھا۔ شہزادے کے ہوتے ہوئے کوزین شہنشاہ نہیں بن سکتا تھا۔ ممکن تھا ملکہ اپنی ہوس پر بیٹے کو بھی قربان کر دیتی لیکن......"

اور جوزیفائن نے خاموش ہو کر بڑے پیار سے قیصران کو دیکھا۔

قیصران کے سامنے محل اور سلطنت کے راز خود بخود کھلتے جا رہے تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے جوزیفائن کی باتیں سن رہا تھا۔ جوزیفائن نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ دروازے پر پھر تین بار دستک ہوئی۔ اس دفعہ جوزیفائن بھی پریشان ہو گئی۔ اس نے فکر مند نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آ جاؤ آمرینہ۔"

آمرینہ اندر آگئی۔

"کیا ملکہ ادھر آ رہی ہے؟" جوزیفائن نے پوچھا۔

"نہیں سسٹر! شہزادہ پلیوگس جاگ اٹھے ہیں اور آپ کا پوچھ رہے ہیں۔" آمرینہ نے بتایا۔

شہزادے کا نام سن کر جوزیفائن کھڑی ہوگئی۔ اس نے آمرینہ کو جانے کا اشارہ کیا۔ پھر قیصران سے کہا۔

"پیارے قیصران۔" وہ کہتے ہوئے جوزیفائن شدت جذبات سے قیصران سے لپٹ گئی۔ قیصران قریب ہی کھڑا تھا۔ جوزیفائن جواب نہ پا کر بولی۔

"مجھے اس جہنم سے نکالو قیصران...... مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔"

(ختم شد)